''آپ کیا پینا پسند کریں گی'' مادام موزیل؟'' سانتا نے بار کے فرنچ بارٹینڈر کی آواز تھرتھرائی۔
''بلڈی میری.....! اوڈکا۔ ٹومیٹو جوس۔ لائم کارڈیل کالی مرچ کے ساتھ'' ''اور آپ' موسیٹو؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔

بلڈیس میری'' ٹومیٹو جوس۔ لائم کارڈیل۔ کالی مرچ۔ بغیر ودکا کے' Is ita Dring? لڑکی نے بڑی حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھا۔'' جی ہاں.....! مقدس مریم کے نام کے ساتھ خون آشام کا لفظ کچھ اچھا نہیں لگتا'' ''یہ تو محض شراب کا نام ہے۔!''

''نام رکھنے میں بھی احتیاط برتنی چاہیے!''

''لیکن وہ جو شیکسپیئر نے کہا تھا کہ گلاب کے پھول کا کوئی سا بھی نام رکھ دیں اس کے رنگ اور خوشبو میں کوئی فرق نہیں پڑے گا؟''

''شیکسپیئر نے شاید گلاب ناطق کی بات کی تھی''..... میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ بڑی حیران کن بات ہے کہ نیواڈا کے صحراؤں میں بھی گلاب کھلتے ہیں۔

تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ حیا کی ہلکی سی لہر اس کے چہرے پر ابھری۔

کیا تم نے غور نہیں کیا کہ پیک بناتے وقت معمر فرانسیسی کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ یہ مرحلہ عمر بھی ہو سکتا ہے۔! اس کے لہجے میں بھولپن تھا۔ ہو سکتا ہے اس کا نہیں بلکہ تمہارا! پال چرچ کی گھنٹیاں بج ڈالی تھیں۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ کو سیم وزر کی جستجو نہ تھی۔ اس طرح ایک چینی نظم سے پتہ چلتا ہے کہ دو جواریوں کے پاس جب کھیلنے کیلئے کچھ نہ بچا تو انہوں نے اپنے کان دؤ پر لگا دیئے۔ شرط یہ تھی کہ BIRVHLEA کس سمت گرتا ہے۔ پتا گرا۔ ہارنے والے جواری نے بڑے سکون کے اپنے کان کی لویں کاٹیں اور پتے پر ڈال کر جیتنے والے کو پیش کر دیا۔

کمال ہے! کیا انسانی خواہش اس قدر شدید ہو سکتی ہے؟

بالکل فرائیڈ کو تو اس میں بھی سیکس نظر آئی تھی۔

اچھا..... وہ کیسے.....؟

ضروری نہیں کہ ہر بات تفصیلاً بیان کی جائے..... مسٹر رائٹر! وہ میرے لہجے کی شرارت بھانپتے ہوئے مسکرائی۔

تمہیں غالباً SNOBBERY نے مجبور کیا ہوگا۔

بوریت..... انسان بسا اوقات زندگی کی یکسانیت اور یک رنگی سے اکتا جاتا ہے اور کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہے جس میں تھوڑا بہت ایڈونچر ہو۔ تھوڑی سی کسک ہو' کچھ کچھ رومانس ہو۔ یہی چیز مجھے ویگاس لے آتی ہے..... پھر اس شہر کا انوکھا مزاج ہے۔ تمام دنیا نے اس کے ساتھ پیار کیا ہے۔ تعلق قائم رکھا ہے۔ رنگ اور نور کا اس قدر حسین امتزاج تم نے کہاں دیکھا ہوگا۔

اگر یقین کرو تو رنگ اور نور کا اس قدر حسین امتزاج لاس ویگاس میں بھی پہلی بار دیکھ رہا ہوں..... میں نے اس کا ہاتھ ایک بار پھر تھام لیا۔

پھر شاعری شروع کر دی تم نے..... اب کے وہ کھل کر مسکرائی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مبالغہ آرائی سے کام لیا جا رہا ہے۔ آدمی کو بسا اوقات اپنی تعریف اچھی لگتی ہے۔

میں نے کہا..... یہ شہر ایک آئینہ خانہ ہے۔ جس میں داخل ہوتے ہی انسان کے خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اسے فوراً ہی احساس ہو جاتا ہے کہ اس کا قد کاٹھ کتنا ہے۔ کیا اب تک تمہیں اس آئینے نے کچھ نہیں بتایا؟

بولی میں نے اس آئینے کو کبھی اس زوایے سے جانچنے اور پرکھنے کی شعوری کوشش نہیں کی..... ویسے تمہیں کیا نظر آتا ہے؟

مجھے تو ایسے لگ رہا ہے جیسے شہر میں بھونچال آ گیا ہو۔ موج مے لرز رہی ہو اور بوڑھے فرنچ بارٹینڈر کی رگوں میں کوئی آتش فشاں پھٹ رہا ہو.....!

یہ مدھ بھرا گیت پہلے کتنی بار گا چکے ہو.....؟ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آئی۔

یہ گیت پہلے بھی کئی بار گایا گیا ہے۔ اسے ٹرائے کی رزم گاہوں نے سنا۔ صحرائے نجد سے اٹھتی ہوئی ہواؤں نے سنا۔ اس کی تانیں زمین بوس ہوتے ہوئے محلوں میں بکھریں۔ اس کے بول تاریخ کے ہر موڑ پر

بلند ہوئے۔ کیا تمہیں یاد نہیں پڑتا کہ تم نے بھی اسے پہلے کہیں سنا ہو.....؟

دراصل میں آواگون کی قائل نہیں ہوں۔ مسٹر شاہ! باتوں میں تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ اگر تم گیمبلنگ بھی اسی ڈھب سے کرو تو آدھا لاس ویگاس تو یوں جیت سکتے ہو..... اس نے چٹکی بجائی۔

دراصل میں یہاں جوا کھیلنے نہیں، دیکھنے آیا ہوں۔ میں یہ دیکھنے آیا ہوں کہ یہ شہر جس کے ایک کیسینو کا بجٹ غریب ملکوں کے سالانہ بجٹ سے کہیں زیادہ ہے۔ کس طرح شب و روز گزارتا ہے۔.....

اگر یہ بات ہے تو پھر مجھ سے بہتر کوئی گائیڈ نہیں ہو سکتی۔

وہ کیسے؟

کیونکہ میں لاس اینجلس کی رہنے والی ہوں اور قریباً دوسرے ہفتے یہاں آتی ہوں۔ کیا لاس اینجلس میں تم سروس کرتی ہو؟ میں نے پوچھا۔

اس کی ضرورت نہیں۔ میرا باپ ایک وسیع و عریض جائیداد چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوا ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں اور بیورلے ہلز میں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی ہوں۔

بیورلے ہلز میں تو ہالی وڈ کے ایکٹر اور ایکٹریسیں رہتے ہیں؟

بیورلے ہلز میں ہالی وڈ کے سٹار ضرور رہتے ہیں لیکن یہ ان کی جاگیر نہیں ہے۔ کوئی بھی امیر شخص وہاں رہائش رکھ سکتا ہے۔ اس نے وضاحت کی۔

تو کیا ایک اجنبی کے لیے اتنا وقت نکال سکو گی۔

پتہ نہیں اجنبیت سے تمہاری مراد کیا ہے۔ جو باتیں ابھی ابھی تم نے کی ہیں۔ ان سے تو ایسا احساس نہیں ہوتا۔ انسان بسا اوقات ایک گھر، ایک معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے اور کبھی کبھی صحراؤں میں بھی اپنائیت ہوتی ہے۔ اس کا لہجہ فلسفیانہ ہو گیا۔

ویسے ہم امریکی بھی کبھی کبھی اجنبیوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

لیکن تم خالص امریکی نہیں ہو۔

مائی گاڈ..... اس نے بڑی حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ تمہیں کیسا پتہ چلا؟

تمہاری ماں اٹلی کی رہنے والی اور باپ گریک نژاد امریکی ہے۔

کہیں میرا شجرہ نسب تو تمہارے ہاتھ نہیں لگ گیا؟ وہ مزید حیران ہو کر بولی۔

ہر بات تمہارے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ یہ بڑی بڑی پرکشش نیلی آنکھیں، تر و تازہ چہرے پر چنبیلی اور گلاب کی آمیزش، یہ بانکپن، یہ گداز.....لب و لہجے میں جو آہنگ ہے وہ قدرت نے خالص امریکیوں کو ودیعت نہیں کیا۔ جہاں گردی نے یہی باتیں تو مجھے سکھلائی ہیں۔ قیاس اور قیافہ.....

کہنے لگی اگر تم دست شناس ہوتے امریکہ میں بے شمار حسینوں کو رام کر سکتے تھے۔ میں نے کہا یہ فن مرز اغالب اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے!

گالب.....گالب کون تھا؟

اردو شاعری کا شیکسپیئر.....!

مادام موزیل! آپ ایک اور ڈرنک لینا پسند کریں گی؟ بارٹینڈر کے لہجے میں استفسار سے زیادہ التجا تھی۔

نہیں! بس ایک ہی کافی ہے۔ چیک لاء.....

اگر تم محسوس نہ کرو تو بل میں ادا کر دوں؟

آخر کیوں؟ تم امریکہ میں ہو۔ میں پاکستان میں نہیں ہوں۔

شاید اس لئے کہ بل کی رقم بہت کم ہے۔

بالفرض زیادہ ہوتی تو.....؟

تو پھر سوچنا پڑتا۔ ہم دونوں مسکرا دیئے۔

چلو اس کے بدلے آج تمہیں ایم جی ایم گرینڈ کی مفت سیر کرائیں۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

شام ہو چلی تھی۔ لوگ ٹولیوں کی شکل میں اندر آ رہے تھے۔ ہر ملک اور نسل کے لوگ امریکن، یورپی، جاپانی، چینی، عرب، ایشیائی، یہ ایک کیسینو نہیں، بین الاقوامی آماجگاہ ہے۔ اقوام متحدہ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔

بھانت بھانت کی بولیاں' نت نئے لباس' رنگوں کی برسات' جہاں تردد وتشویش کی جگہ شوخی اور شرارت نے لے لی ہو۔ فکر فرداور غم روزگار بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے ہوں' حزن وملال اور غم ویاس کو خیر باد کہہ دیا گیا ہو۔ اقلیم طرب ونشاط ہر طرف رنگ ہی رنگ' چار سو نغمہ وچنگ' بادہ گلرنگ' جسم پر لباس کی تہمت چپکائے تو خیز ساقی' ہر گیمبلنگ ٹیبل کے گرد حسین تتلیوں کی طرح ڈولتی ہوئی لڑکیاں' نظریں شرابی' ادائیں دشمن ایمان وآگہی' باتیں راہزن تمکین وہوش' گھاتی'' عقدہ وخرد کی دشمن' نقد دل تو آدمی کھیلنے سے پہلے ہی ہار جاتا ہے۔ جیب کا صفایا کھیلنے کے بعد ہوتا ہے۔

کیا ماحول اور سماں پیدا ہو گیا ہے یہ شداد کی جنت لگتی ہے۔

کہنے لگی ایک بنیادی فرق ہے یہاں جنت اور جہنم کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ جیتنے پر اگر بادلطیف کے جھونکے آتے ہیں ہارنے کی صورت میں جہنم کی تپش بھی محسوس ہو سکتی ہے۔ صحیح معنوں میں لطف اندوز تو وہی ہوتے ہیں جو تمہاری طرح تماشائے اہل جہاں دیکھتے ہیں۔

ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ ایم جی ایم گرینڈ صحیح معنوں میں اول واعلیٰ ہے یہ دنیا کا سب سے بڑا کیسینو ہوٹل ہے۔ اس میں پانچ ہزار کے لگ بھگ رہائشی کمرے ہیں۔ اس کے مختلف ہالز میں بلاشبہ چھبیس ہزار آدمی سما سکتے ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں گیمبلنگ ٹیبل ہیں۔ ہزاروں لوگ ملازم ہیں۔ بے شمار کنسرٹ ہالز کانفرنس رومز' تھیٹر' ریستوران' شراب خانے اور زیر زمین مارکیٹیں ہیں۔ جہاں دنیا بھر کی ہر چیز مل سکتی ہے۔ ہالی وڈ کے اداکار اور اداکارائیں یہاں شاپنگ کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق بھی ہالی وڈ سے ہے۔ کہ میٹرو گولڈن میئر فلم کمپنی کی ملکیت ہیں۔ جس کی فلموں کی ابتدا میں ایک ببر شیر دھاڑتا ہے۔

کیا وہ اصلی شیر ہے یا پیپر ٹائیگر؟

سو فیصد اصلی۔ کمپنی کی ذاتی ملکیت۔ یہ ایک طویل عرصہ تک یہاں رہا۔ لیکن آج کل نظر نہیں آ رہا۔

شاید بوڑھا ہو گیا ہو گا۔؟ میں نے کہا۔

یہ بڑھاپا بھی کیا ظالم چیز ہے۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ اگر ساری دنیا کی دولت دے کر بھی جوانی خریدی جا سکتی تو میں خرید لیتا۔

جس دن جوانی نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا وہ غالباً یوم حساب ہوگا!

کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولی۔ تم نے میری ماں کو نہیں دیکھا۔ وہ اپنے وقت کی حسین ترین عورت تھی۔ بیورلے ہلز پر رہنے والے ایکٹر اس کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بے تاب رہتے ہیں۔ فلم ڈائریکٹر ڈیوڈ لین نے تو اسے اپنی فلموں میں ہیروئن بنانے کی پیشکش بھی کی۔ بڑا زندہ دل شخص تھا۔ ممی کو کہتا اگر ساندرہ سے پہلے میں نے تمہیں دیکھ لیا ہوتا تو آج مسز ڈیوڈ لین تم ہوتی۔ بلکہ ڈیوڈ لین کی بیوہ۔

وہ کیسے؟ میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

یہی سوال ممی نے بھی ہنس کر پوچھا۔ کہنے لگا میں تمہارے حسن جہاں سوز کی تاب نہ لا کر چل بستا۔

کہیں تمہارے والد بھی اسی حادثے کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔ ایسی بات نہیں۔ پپا اور ممی نے تاخیر سے لو میرج کی تھی۔ غالباً دونوں کو بڑی دیر کے بعد آئیڈیل ملا تھا۔ جیسا کہ میں کہا ہے پپا امیر آدمی تھے۔ چاہتے تو بیسیوں فلمیں خود بنا سکتے تھے۔ لانگ بیچ پر ان کے تیل کے کنویں تھے۔ جب وہ ممی کے اردگرد ان فلمی اداکاروں کو شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتا ہوا دیکھتے تو رقابت کی بجائے ایک عجیب قسم کا احساس برتری ان کے چہرے سے مترشح ہوا۔ انہیں ممی پر پورا اعتماد تھا۔

تو گویا تم نے ایک قسم کی نیم فلمی فضا میں آنکھ کھولی۔

بولی بیورلے ہلز پر رہنے والے ماحول سے بچ نہیں سکتے۔ پارٹیاں' ڈنر' سوشل گیدرنگز' اس قدر زیادہ ہوتی ہیں کہ سب لوگ ایک دوسرے سے لامحالہ متعارف ہو جاتے ہیں۔

تم نے کیا اثر لیا؟

شاید مجھ پر الٹا اثر ہوا ہے۔ جنہیں سکرین پر دیکھ کر لوگ دیوتا سمجھتے ہیں اندر سے وہ بڑے ہی کھوکھلے اور پلپلے ہوتے ہیں۔ ان کے تعصبات' ان کی رقابتیں اور چھوٹا پن دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اگر لوگ ان کی نجی زندگی کا محض ایک دن دیکھ لیں یا ایک اوراق پڑھ لیں تو شاید ساری عمر فلمیں دیکھنا بند کر دیں۔ اس قدر تصنع' اس قدر ریاوٹ' اتنی مکاری اور منافقت اور کہیں نہیں ملے گی۔ ان مشاہدات نے میری زندگی پر گہرا

اثر ڈالا ہے۔ میرا بار بار یہاں آنا دراصل اس یرقان زدہ ماحول سے دور رہنے کی ایک شعوری کوشش ہے۔ ایک قسم کا ESCAPISM ہے۔ کہیں میری باتوں سے بھی تم نے اس قسم کا تاثر تو نہیں لیا؟ میں مسکرایا۔

ہرگز نہیں..... اگر یہ بات ہوتی تو میں تمہارے ساتھ ایک قدم بھی نہ چل پاتی۔ اس قدر بے ساختہ پن گھڑا نہیں جا سکتا۔

ہم چلتے چلتے کیسینو کے جنوبی حصے میں آ گئے۔ اتنے میں بڑی زور کی بجلی کڑکی اور گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں۔ کہیں ہم کیسینو سے باہر نہیں آ گئے۔ دیکھو تو سہی بارش ہونے والی ہے۔ میں نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دیئے۔

اطمینان سے چلو نہ تو ہم باہر نکلے ہیں نہ ہی بارش کا خطرہ ہے۔

تو پھر یہ سب کیا ہے۔؟

VESUAL EFFECTS منصوعی نیلگوں آسمان، مصنوعی بادل اور مکینکل گھن گرج، لیکن یہ تو بالکل اصلی لگتے ہیں۔

یہی ویگاس کا کمال ہے۔ اصل اور نقل کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔

بادل پھر زور سے گرجا۔ بجلی کڑکی۔ اور یکا یک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ لگتا تھا کہ سارا کیسینو جل تھل ہو جائے گا لیکن پانی ایک قطرہ بھی فرش تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ رستے میں ہی کہیں گم ہو جا۔ تھوڑی دیر بعد بارش تھم گئی۔ بادل چھٹ گئے اور چاند نکل آیا۔ چاند کی چاندنی میں تین جادوگرنیاں افق پر نمودار ہوئیں۔ سب سے بوڑی اور خرانٹ ڈکرائی۔

When shall we meet again,an thunder lightening or in دوسری rain?

When the hurly burly in done, when the battle lost or won. that would be befre the setting of s

تیسری صرف مسکرادی۔ اور اس کے جبڑوں میں سے مکروہ پیلے دانت جھانکنے لگے۔ یہ مکالمے میں پہلے بھی لیں پڑھ یا سن چکا ہوں میں نے کہا۔

مون کے کہنے لگی۔ یہ شیکسپیئر کے ڈرامے میکبتھ کا پہلا سین ہے۔ یہ جادوگرنیاں ہیں۔ جن کا شغلہ اور شیوہ ہی لوگوں کی تباہی اور بربادی ہے۔ یہ میکبتھ اور کنگ ڈنکن کی تباہی اور بربادی کے منصوبے بارہی ہیں۔

کیا اچھوتا خیال ہے۔ میں نے تعریف کی۔

یہ تو مشتے از خروارے ہے۔ آگے چل کر اور بہت کچھ دیکھو گے۔ چلو اب کچھ شاپنگ ہو جائے۔ ویگاس میں شاپنگ کوئی احمق ہی کرے گا۔ عقلمند یہاں آتے ہی نہیں۔ تم انہیں صرف کلیساؤں' مندروں یا مساجد میں پاؤ گے۔ یہ اپنی گپھاؤں سے کم ہی نکلتے ہیں۔

کیسینو کی دکانیں انڈر گراؤنڈ ہیں۔ پوری مارکیٹ ہے۔ دنیا بھر کی چیزیں پڑی تھیں۔ ڈائمنڈ جیولری' ہیرے جڑی ہوئی گھڑیاں اٹلی کے بنے ہوئے فرکوٹ' فرانس کی پرفیومری' بالی اور چرچل کے جوتے' ایو سلارا' کرچین ڈائر' پیرے کارڈن اور ڈن ہل کی منصوعات۔ اس کے علاوہ بھی کئی نام تھے۔ جو ابھی ہم لوگوں کو حفظ نہیں ہوئے۔ یورپ میں فیشن بدلی رتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ فیشن ڈیزائنرز کی چاندی ہوتی رہتی ہے۔ سال میں کئی مرتبہ یہ کبھی لباس کے کام مروڑ دیتے ہیں۔ تو کبھی جیولری کی کمر کو ختم دیتے ہیں۔ پاجامہ نما پتلون کو ٹخنوں سے اوپر گھٹنوں تل لے جاتے ہیں تو کبھی بالکل ہی زمین بوس کر دیتے ہیں۔ فیشن کے متوالے اور پرستار صرف ادھر دیکھتے ہیں جدھر ان کی شہادت کی انگلی اٹھی ہے۔ وہی سوچتے ہیں جو خلل ان کے دماغ کا ہوتا ہے..... یہ عجیب پاگل دنیا ہے۔ یہاں عجیب پاگل دنیا ہے۔ یہاں حقیقت وہ نہیں ہوتی جو دراصل ہوتی ہے بلکہ اسے مانا جاتا ہے جو معدودے چند لوگ باور کراتے ہیں۔

قیمتیں دیکھیں تو جی اور "خوش" ہوا۔ ان کا ارض خدا کے ساتھ کوئی رابطہ نہ تھا۔ امریکی راکٹ کی طرح اوپر ہی اوپر اٹھتی نظر آتی تھیں.....

"یہاں جو مصنوعات ہیں"..... مون ایک فرکوٹ ٹرائی کرتے ہوئے بولی، "وہ تمہیں زیورچ کے بہانوف اسٹراسے، پیرس کے شانزالیزے، لندن کے ہیرڈز یا نیویارک کے بلومنگ ڈیل میں بھی نہیں ملیں گے..... یہ ڈائمنڈ کف لنکس دیکھتے ہو تمہیں بڑا سوٹ کریں گے۔ قیمت صرف پانچ ہزار ڈالر ہے"۔

''انہیں وہیں رکھ دو جہاں سے اٹھایا ہے۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے کھانسی آنے لگی ہے''۔

''تمہاری حس مزاح کی داد دینی پڑتی ہے۔ اتنی ساری باتیں کہاں سے سیکھی ہیں؟''

اتنے میں سیلز مین آ گیا..... کیا میں آپ کی مدد اور رہنمائی کر سکتا ہوں؟''

''شکریہ.....! پھر کبھی تمہاری خدمات سے استفادہ کریں گے''۔ مون نے فرکوٹ شوکیس میں رکھ دیا اور ہم باہر نکل آئے۔ مارکیٹ اس قدر بڑی تھی کہ ونڈو شاپنگ کیلئے بھی ایک دن چاہئے تھا۔ ہم اوپر مرکزی ہال میں آئے تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

میں نے کہا، ''کہنا کھائیں! ڈنر ٹائم ہو گیا ہے!''

''اتنی جلدی.....! پہلے کیسینو تو دیکھ لو''۔

''کیا کوئی حصہ باقی رہ گیا ہے؟''

''ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے.....!'' وہ میری حیرت سے لطف اندروز ہوتے ہوئے بولی ''یہ اتنا بڑا کیسینو ہے کہ نو وارد باہر جانے کا رستہ بھول جاتا ہے!''

مون نے درست کہا تھا۔ ہم بے شمار بارز اور ریستورانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے کاریڈور میں پہنچے۔ بائیں طرف کنسرٹ ہال تھے اور دائیں جانب میکڈونلڈ، کینٹکی فرائڈ چکن، چینی اور جاپانی کھانوں کے ریسٹورنٹ تھے۔ ان کے آگے مرکزی عمارت سے ملحقہ اوپن ایئر ان ڈور سٹیڈیم تھا جس میں تیس ہزار لوگوں کیلئے کھیل دیکھنے کی گنجائش تھی۔ باکسنگ میچ کے ٹکٹ کی قیمت دو سو ڈالر سے شروع ہو کر ہزاروں ڈالرز تک پہنچتی تھی۔ دنیا کے اکثر مشہور میچ یہاں ہوتے ہیں۔ اسی جگہ محمد علی تتلی کی طرح ناچتا اور بھڑ کی طرح کاٹتا تھا۔ بڑا وحشیانہ کھیل ہے۔ ایک کھلاڑی کا ہونٹ پھٹا پڑا ہے تو دوسرے کا کان کٹ گیا ہے۔ آنکھیں سوج کر کپا بن گئی ہیں۔ چہرہ لہولہان ہو گیا ہے، ٹانگیں کپکپا رہی ہیں لیکن شائقین حظ اٹھا رہے ہیں۔ تالیاں بجا رہے ہیں.....

اس قسم کے کھیل قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں ہوتے تھے۔ مجرموں کو اکھاڑے میں ڈال کر وحشی درندوں کی زنجیریں کھول دی جاتی تھیں۔

''باکسنگ بڑا وحشیانہ کھیل ہے'' میں نے سٹیڈیم میں داخل ہو کر کہا۔

بولی ''اگر تمہارا استدلال مان لیا جائے پھر کوئی کھیل خطرے سے خالی نہیں۔ کرکٹ بال سے دماغ کی رگیں چٹخ سکتی ہیں..... ہاکی سے ٹانگ ٹوٹ سکتی اور فٹ بال سے ہڈی پسلی ایک ہو سکتی ہے..... تو کیا سب کھیل بند کر دیئے جائیں۔ خطرے کا عنصر تو ہر کھیل میں ہوتا ہے..... تمہارا وہ کونسا بادشاہ تھا جو پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر مرا تھا۔ آنی ہو تو آدمی ٹھوکر لگنے سے بھی پار ہو جاتا ہے..... پھر موت تو ایک دن آنی ہوی ہے۔ رزم میں آگئی یا بزم میں آگئی.....!''

''کیا تم نے فلسفہ پڑھا ہے؟'' میں نے پوچھا

''تمہیں یہ خیال کس طرح آیا ہے؟''

''یہ عمر اور خیالات میں اس قدر پختگی.....!''

''ویسے میں اتنی کم سن نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ میں نے کیلیفورنیا یونیورسٹی سے فلسفے' تاریخ اور بین الاقوامی تعلقات میں آنرز کیا ہے۔ میری عمر اکیس سال ہے''۔

''اوہ پھر تو تم بوڑھی ہو گئی ہو!'' میں نے چہرے پر مصنوعی تشویش طاری کی۔

''بوڑھا بھی تو آخر ایک دن ہونا ہی ہے'' وہ مسکرائی۔ ''عورتیں عمر کے معاملے میں اکثر حساس ہوتی ہیں..... ہوتے تو مرد بھی ہیں لیکن وہ اکثر منافقت سے کام لیتے ہیں''۔

چلتے پھرتے رات کے نو بج گئے..... ''اب واپس چلنا چاہئے!'' میں نے گھڑی دیکھی۔

''جیسے تمہاری مرضی.....!'' اس نے کندھے اچکائے۔

''غالباً تم نے آج صبح کی سیر نہیں کی!''

''وہ کیسے.....؟''

''بے خیالی میں ہم سٹیڈیم کے تین چکر لگا چکے ہیں''۔ ''صبح کی سیر کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ آدمی اتنی آکسیجن لے لیتا ہے جو سارے دن کیلئے کافی ہوتی ہے۔ شام کو تو صرف ڈیزل کا دھواں اور گرد و غبار ہی ملتا ہے''۔

ہم واپس مڑے تو میکڈونلڈ کے بالمقابل ہال میں بیس پچیس زن و مرد ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے لئے کھڑے تھے۔ اتنے میں مخالف سمیت سے دلہن سہیلیوں اور شہہ بالیوں کے جھرمٹ میں نمودار ہوئی۔ اس نے سفید لباس پہنا ہوا تھا جس کا نچلا سرا پانچ فٹ لمبا ہوگا۔ اور اسے شہہ بالیوں نے اٹھایا ہوا تھا۔ جیسے ہی دلہن قریب آئی سب سے پہلے دولہا میاں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ پھر باراتیوں نے گلدستے پیش کئے اور وہ سب ہال کے اندر چلے گئے۔

''بڑی مختصر شادی ہے.....'' میں نے کہا..... ''نہ بینڈ بجا جے' نہ نفیری' نہ شہنائی اور نہ ہی باراتیوں کا جم غفیر۔ کیا ویگاس کے لوگ ان سے ناراض ہیں.....؟''

''یہ ویگاس کے باشندے نہیں۔ کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں''۔

''تم سمجھے نہیں''..... اس نے وضاحت کی..... امریکہ کی اکثر ریاستوں میں جب ایک دفعہ جوڑے میاں بیوی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں تو پھر چھٹکارا مشکل سے ملتا ہے۔ طلاق کا طریقہ کار بڑا مہنگا اور پیچیدہ ہے۔ طلاق کی صورت میں خاوند کی کمر دہری ہو جاتی ہے، اسے اپنی کمائی کا کم از کم نصف حصہ مطلقہ کو دینا پڑتا ہے..... ویگاس کے قوانین نرم ہیں۔ یہاں طلاق دینے میں زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑتی۔ اس لئے سارے ملک سے آزاد خیال جوڑے یہاں آتے ہیں''۔

''گویا اس تعمیر میں بھی خرابی کی ایک صورت مضمر ہے۔ جس عمارت کی بنیاد ہی شک کی خشت اول سے رکھی گئی ہو، وہ کتنی دیر قائم رہے گی؟''

'دیہاں کی عورت بڑی خوددار اور خودسر ہے۔ وہ مشرقی عورت کی طرح خاوند کی ذرا سی بھی ڈانٹ ڈپٹ یا ناجوازی برداشت نہیں کرتی اور بعض اوقات معمولی اختلاف بھی طلاق پر منتج ہوتا ہے''۔

''شاید اسی وجہ سے اب شادیوں کا رواج ہی ختم ہوتا جا رہا ہے اور جوڑے بغیر شادی کے زندگی گزار دیتے ہیں؟''۔

''کسی حد تک یہ بات درست ہے۔ جس معاشرے میں شخصی آزادیاں اور انفرادیت انتہا کو پہنچ چکی ہو وہاں اس قسم کی ناپسندیدہ باتیں بھی ناگزیر ہو جاتی ہیں''..... وہ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

چلتے چلتے کارڈیور کے آخری سرے پر چائنیز ریسٹورنٹ نظر آیا تو کہنے لگی ''آج چائنیز فوڈ کھایا جائے ..... کیا خیال ہے.....؟

''لیکن وہ جو چھ ڈالر میں تیس کورسز کا بوفے ڈنر ملتا ہے اس پر بھی غور کیا ہے؟

''وہ پھر کسی دن کھالیں گے۔ وہاں چائنیز کھانا اور Cavier سرو نہیں ہوتے''۔

''جیسے تمہاری مرضی.....!''

ریسٹورنٹ لوگوں سے کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ اس لئے ہمیں آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ انتظار گاہ میں صوفے بچھے تھے۔ منیجر نے ہمیں وہاں بٹھا دیا۔

''کیا آپ لوگ کچھ ڈرنکس لیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''دو اورنج جوس.....'' مون مسکرائی۔

''لیکن وہ بلڈی میری.....؟'' میں نے معذرت خواہانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''تم نے اس لفظ کی ایسی انوکھی تشریح کی ہے کہ اب مقدس نام کی بے حرمتی کرنے کو جی نہیں چاہتا''۔

جب ویٹر مینو کارڈ لایا تو کھانوں کے نام قریباً وہی تھے جو پاکستان کے چینی رستورانوں میں ملتے ہیں۔ البتہ ذائقہ کافی حد تک مختلف تھا۔ دراصل ہر ملک میں چائنیز فوڈ کے اپنے ورژن ہوتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے کھانے چین میں نہیں ملتے جیسے ٹرکش باتھ کا ترکی میں وجود نہیں یا جس طرح اہل یونان یونانی دواخانوں اور ان کی کرامات سے یکسر نا آشنا ہیں.....

بحیرہ کیسپین کے 'کے وی آر' اور ٹراؤٹ مچھلی بہت مزیدار ہوتے ہیں۔ 'کے وی آر' سٹرجن مچھلی کے نمکین انڈے ہوتے ہیں جن کا سائز گندم کے دانے کے برابر ہوتا ہے اور رنگ سیاہی مائل۔ بہت قیمتی ڈش ہے لیکن ہر آدمی اس سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔ اس کیلئے ذائقہ بنانا پڑتا ہے۔ ویسے بھی بل دیکھ کر سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

کھانا کھا کر ہم باہر نکلے تو مرکزی ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ بلیک جیک، رولے، بانکو پانٹو، سلاٹ مشین، پوکر، باکرا، ہر ٹیبل فل تھا۔

''کہاں سے آتے ہیں یہ لوگ.....؟''میں نے پوچھا۔

''تمام دنیا سے ایک لاکھ سے زائد لوگ ہر روز آتے ہیں۔ ویک اینڈ پر سارے ویگاس میں رہائش کیلئے کمرہ نہیں ملتا۔ کوئی نہ کوئی فنکشن کوئی نہ کوئی ایونٹ ہوتا ہی رہتا ہے..... سارا سال جشن کا سا سماں ہوتا ہے۔ ہالی وڈ کا کوئی ایسا ایکٹر، ڈائریکٹر یا فلمساز نہیں جو یہاں ایک تسلسل کے ساتھ نہ آتا ہو..... کھلاڑی، صحافی، ادیب، سیاستدان..... عاشق..... کامیاب اور نامراد..... سبھی یہاں آتے ہیں''۔

زیادہ تر کامیاب ہوتے ہیں یا ناکام.....؟''میں نے آخری جملے کی کاٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے.....''

''میرے ستارے کیا کہتے ہیں.....؟''میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''اس کیلئے وقت اور فیس کی ضرورت ہوگی۔ ویسے تمہاری لکیریں گڈمڈ ہو رہی ہیں''It is a vary complicated Han''، وہ بھی کھل کر مسکرائی۔

ہم ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ دائیں جانب ایک کاؤنٹر نظر آیا۔ کاؤنٹر کے ساتھ ایک بورڈ لگا تھا جس پر جلی حروف میں 'جاپانی ڈیسک' لکھا تھا..... ''کیا جاپانی بھی جوا کھیلتے ہیں؟''..... میرے پاؤں ٹھٹکے۔ ''یہ تو بڑی باعمل قوم ہے دن رات محنت کرتی ہے.....''

''جاپانی مرد و زن، چینیوں کی طرح زبردست جواری ہیں۔ چونکہ یہ لوگ زبان اور کیسینو کے قواعد و ضوابط سے ناواقف ہیں اس لئے ان کی مدد اور رہنمائی کیلئے خصوصی انتظام کیا گیا ہے''۔

''بڑی حیران کن بات ہے.....؟''

''اگر تم نے ان کی تاریخ پڑھی ہوتی تو شاید اس قدر حیران نہ ہوتے۔ 858ء میں وارث تخت کا فیصلہ جوئے کے ذریعے کیا گیا تھا''۔

''واقعی..... وہ کیسے.....؟''میرا اشتیاق بڑھنے لگا۔

''جاپان کے شہنشاہ بنتوکا BUNTOKA کے دو بیٹے تھے۔ کورے شیتو KORESHITO اور

کورے ٹاکا KORETAKA۔ دونوں تخت کے طلب گار تھے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر دو شہزادے اپنے اپنے پہلوان نامزد کریں۔ جس کا پہلوان دنگل جیت جائے گا، وہ ہی اپنے باپ کا جانشین ہوگا۔ کورے شیٹو نے بوشارا پہلوان کو نامزد کیا جب کے دوسرا شہزادہ نتورا کو میدان میں لایا۔ دنگل میں بوشارا کی جیت ہوئی اور اس طرح بادشاہت کورے شیٹو کو مل گئی..... ان کے شوق اور دولت کی فراوانی کو دیکھ کر انہیں مشرق بعید کے عرب شیخ کہا جا سکتا ہے....."

"عرب شیوخ کو تو اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ جو کام یہاں ہونا تھا وہ امریکہ بہادر خود وہاں جا کر کر رہا ہے"۔

حیران ہو کر بولی "وہ کیسے....."

"مقصد تو حجامت بنوانا ہے۔ یہاں بن گئی یا سر وہاں منڈھ گیا"۔

"میں کچھ سمجھی نہیں.....؟" وہ غالباً تجاہل عارفانہ سے کام لے رہی تھی۔

'دبڑی ناسمجھ ہو، کیسے سمجھاؤں.....!" میں مسکرایا۔ "یہ جو مجبور کویت ہے، یہ جو مقہور ایران ہے، وہ جو معتوب عراق ہے، بے بس سعودی ہیں، یہ جو نادان عرب ہیں، سب امریکہ کی چشم ناز کے فقیر ہیں..... پہلے ایران عراق جنگ کرائی۔ دس سالہ طویل جنگ۔ ان گنت لوگ سر بریدہ ہوئے، بیس لاکھ انسان خاک اور خون میں غلطیدہ ہوئے، بوڑھے باپوں کی کمریں کمان بنیں۔ کتنی پتھرائی ہوئی بے نور آنکھوں نے اپنے سہاگ لٹتے ہوئے دیکھے۔ 345 بلین ڈالر بارود بن کر بھک سے اڑ گئے..... پھر کویت کی جنگ۔ آپریشن ڈیزرٹ سٹارم، یہ غالباً دنیا کی واحد جنگ تھی جس میں متحارب مغربی ممالک نے کچھ کمایا، گنوایا نہیں....."

کہنے لگی "میں تمہاری زبان سے یہ باتیں کہلوانا چاہتی تھی اس لئے عمداً ناسمجھ بنی رہی..... تاریخ گواہ ہے کہ انسان کو انسان کے زیر کرنے کی قوموں کو مفتوح بنانے کی حرص اور ہوس نے کبھی دم نہیں توڑا۔ آج سب سکندر یونانی کو سکندر اعظم کہتے ہیں۔ کیا تمہیں اس کی عظمت کی نشانیاں..... یہی کہ لاکھ بے گناہوں کو تہ تیغ کیا، سینکڑوں بستیاں جلا ڈالیں، کھیت کھلیان ویران کر دیئے۔ تم اپنی تاریخ پر ہی نظر ڈالو۔ عرب مسلمان سپین فتح کر کے فرانس تک پہنچ گئے۔ آخر وہ کونسا جذبہ تھا جو انہیں بحر قلزم تک لے گیا۔ تم

اسے چاہے کچھ بھی نام دو، یہ جذبہ جہانگیری تھا..... امریکہ لاکھ قصوروار سہی لیکن ان عربوں کو کیا ہو گیا ہے۔ دنیا میں ایک ارب سے زائد مسلمان ہیں اگر یہ متحد اور متفق ہو جائیں تو امریکہ چھوڑ تمام دنیا بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ اگر یہ سب مل کر ایک پھونک ہی مار دیں تو اسرائیل بحر احمر میں جا گرے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا..... ایسا شاید کبھی نہ ہو سکے۔ جب تک مطلق العنان حکمران اپنے عوام کا خون چوستے رہیں گے جب تک قرومی دولت نام ونمود، شراب وشباب، لاس ویگاسوں اور مانٹی کارلوؤں میں لٹتی رہے گی، کچھ بھی تو نہیں ہوگا۔ ایک ایک عرب حکمران کے پاس بیسیوں ذاتی جہاز ہیں، درجنوں حرم ہیں، سینکڑوں غلام ہیں، بے بس خوبصورت کنیزیں ہیں، خواجہ سراؤں کی فوج ہے۔ آخر یہ لوگ ہیں کون.....؟ یہ وہی لوگ ہیں جو آج سے نصف صدی قبل دانے دانے کو ترستے تھے اور سوسمار.....!'' .....اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا..... کچھ دیر خاموشی رہی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے اب کچھ کہنے کو باقی نہیں بچا..... ہم چلتے جا رہے تھے۔ ہر ٹیبل پر کارڈ ڈیلر بڑے انہماک سے پتے بانٹ رہے تھے۔ کھلاڑی بھی دنیا مافیہا سے بے خبر بے نیاز ہو کر کھیل رہے تھے۔

''آؤ، تھوڑا سا بلیک جیک کھیلیں؟'' مون خاموشی کا طلسم توڑتے ہوئے بولی۔ ''میں معذرت خواہ ہوں اگر میں نے کوئی سخت بات کہہ دی، لیکن تاریخ کی اپنی منطق ہوتی ہے۔ یہ کسی کو معاف نہیں کرتی، ویسے بھی "You can not corrupt history"۔ میں اسے کیا جواب دیتا۔ پہلے تو ابتدا میں نے کی تھی۔ حملہ آور خود ہوا تھا، پھر سب باتیں درست تھیں۔ اس نے ایک تلخ حقیقت کی نشاندہی کی تھی، ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ ہمارا دشمن باہر نہیں ہمارے اندر ہے۔ مسلمانوں کی باہمی چپقلش، کدورتیں، مخاصمتیں، ریشہ دوانیاں اپنا رنگ لا رہی ہیں اور یہ اس قدر کمزور ہو چکے ہیں کہ گرتی ہوئی دیوار کو ایک اَور دھکا لگانے کی بھی شاید ضرورت نہ پڑے۔ امریکہ ہو یا کوئی دیگر ملک، وہ اُسی وقت فائدہ اُٹھائے گا جب یہ اُسے موقع فراہم کریں گے۔ اِس وقت دنیائے عرب کو اللہ تعالیٰ نے تیل کی دولت سے نوازا ہے لیکن اُس کا فائدہ یا تو اُن کے اَزلی دشمن اُٹھا رہے ہیں یا پھر چند حکمران..... دنیائے اسلام میں دو قسم کے حکمران ہیں، ایک وہ جو قومی دولت کو الّلوں تلّلوں میں اڑا دیتے ہیں اور دوسرے وہ مذہبی جنونی جو مخصوص

مسلک کے پرچار کے لئے فرقہ واریت پھیلا رہے ہیں۔ جو مذہبی دہشت گرد تنظیموں کو امداد دیتے ہیں اور یہ جو ہر طرف تشدد اور قتل و غارت ہو رہا ہے اُس کے یہ بالواسطہ اور بلاواسطہ ذمہ دار ہیں۔ پاک و ہند کے علاوہ ہانگ کانگ، ملائشیا اور جاپان تک اِن کی جڑیں پھیل گئی ہیں..... اس وقت دنیائے اسلام کی واحد ایٹمی بڑی طاقت پاکستان ہے۔ باایں ہمہ اس کے ساتھ اکثر مسلم ممالک کا رویہ یا تو معاندانہ ہے یا پھر منافقانہ..... چاہئے تو یہ تھا کہ سب ملک اپنے وسائل یکجا کر کے اسلحہ کی فیکٹریاں لگاتے، ریسرچ سنٹر قائم کرتے اور اپنے عوام کا معیارِ زندگی بلند کرتے، لیکن اس قسم کی تجاویز عیاش حکمرانوں کے لئے ایک تازیانہ ہیں، سوہانِ روح ہیں۔

''کہاں کھو گئے ہو۔ تم نے میری باتوں کا جواب نہیں دیا؟'' مون نے مجھے جھنجھوڑا۔

''ضروری نہیں کہ ہر درست بات کا توڑ تلاش کیا جائے.....!''

''تو چلو پھر ہو جائیں بلیک جیک کی چند بازیاں!''

''کیا اِن نوسربازوں کی مالی امداد ضروری ہے؟''

''یہ فراڈ نہیں کرتے''..... اُس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

''تو پھر یہ گلشن کا کاروبار کیسے چلتا ہے۔ اتنا بڑا کیسینو۔ پانچ ہزار کمرے، چھبیس ہزار لوگوں کو اکاموڈیٹ کرنے والے ہال، ٹنوں وزنی شینڈ لیئر، دیوار تا دیوار قیمتی قالین، تمازتِ آفتاب کو پسینہ پسینہ کرنے والی مؤثر ایئر کنڈیشننگ، برماٹیک کی پینلنگ، نایاب پینٹنگز..... اَن گنت لوازمات۔ یہ سج دھج اور شان و شوکت۔ تاریخ انسانی کا کون سا بادشاہ تھا جسے ایسے محل نصیب ہوئے ہوں۔''

''یہ سب اِس لیے ممکن ہے کہ کیسینو ہار نہیں سکتا''.....

''تو پھر درست ہوئے ناں میرے خدشات؟''

''تمہارے قیافے اَور قیاس درست نہیں۔ یہ کیسینو ایک چھوٹی سی لڑکی نہیں ہے جس کے نقوش سے تم نے اس کی نسل کا اندازہ کر لیا تھا..... یہاں کوئی دھوکہ بازی، فراڈ، چالاکی یا بدمعاشی نہیں ہوتی۔ سب سسٹم کمپیوٹرائزڈ ہے۔ کیسینو کو کچھ ابتدائی فائدے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے یہ بالآخر ہار نہیں

سکتا۔ لوگ آپس میں ہارتے جیتتے رہتے ہیں۔ جو لوگ بظاہر کیسینو کے ساتھ کھیل رہے ہوتے ہیں، وہ دراصل ایک دوسرے کے خلاف شرطیں باندھتے ہیں۔"

"تم Initial Advantage کی بات کی ہے وہ کیسینو کو کیسے حاصل ہوتا ہے؟"

"سلاٹ مشین میں 14%، بلیک جیک میں بارہ فیصد، بانکو پانٹو، باکرہ اور رولیٹ میں 4% ہے۔ اسے تم ایک طرح کی کمیشن کہہ سکتے ہو۔ جہاں دن میں چوبیس گھنٹے، ہفتے میں سات دن اور سال میں باون ہفتے نان سٹاپ گیمبلنگ ہوتی ہو، وہاں کمپیوٹر بتاتا ہے کہ کیسینو ہار نہیں سکتا۔"

"یہ بلیک جیک کیا ہوتا ہے؟" میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ "مجھے تو یہاں ہر چیز صاف، چمکدار اور روشن دکھائی دے رہی ہے، تمہارے چہرے کی طرح!"

"چہرے کے اندر بھی ایک چہرہ ہوتا ہے جسے تمام آسانی سے نہیں پڑھ سکتے" وہ مسکرائی۔

"جس شخص میں تمہارا چہرہ دیکھنے کی تاب نہ ہو وہ بھلا پڑھے گا کیا۔"

"پھر کرنے لگے شاعری.....!"

"غزل کو شعر نہیں سناتے.....!"

قدرے شرما کر کہنے لگے..... "یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ چلو میں تمہیں بلیک جیک کے بنیادی اصول سمجھاتی ہوں۔ بظاہر یہ بڑی آسان گیم لگتی ہے لیکن درحقیقت سب سے مشکل کھیل ہے۔ اس کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لئے آدمی کا حسان دان ہونا ضروری ہے اور یادداشت بھی کیمرے کی طرح ہونی چاہئے، یعنی جو منظر ایک دفعہ سامنے آ گیا وہ آنکھ نے محفوظ کر لیا..... 260 پتوں کے پیک سے نکلے ہوئے ہر پتے کی شناخت ہونی چاہئے۔ کتنی تصویریں اور یکے نکل چکے ہیں اور قانونِ اوسط کی رُو سے اگلا پتا کون سا ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر اس قدر گنجلک گیم آسان کیسے ہوئی؟ میرا دماغ چکرا رہا تھا۔

"آسان اس اعتبار سے ہے کہ کارڈ ڈیلر یا کروپیئر تین تین پتے بانٹتا ہے جن کی ظاہری قدر کے مطابق انہیں جمع کر دیا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اکیس نمبر ہوتے ہیں۔ بائیس کی صورت میں

کھلاڑی ہار جاتا ہے اس کو کیسینو کی اصطلاح میں برسٹ Burst ہونا کہتے ہیں۔ جو بڑا ہو وہ جیت جاتا ہے۔ ڈیلر دو پتے بانٹ کر کھلاڑی سے پوچھتا ہے کہ اسے تیسرا پتا چاہئے یا نہیں۔ یہی مشکل اور نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ غلط پتا مانگنے سے نہ صرف وہ خود ہارتا ہے بلکہ سارے ٹیبل کو نقصان پہنچ سکتا ہے کیونکہ ٹیبل پر اس کے علاوہ بھی دیگر پانچ کھلاڑی بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ قواعد ہیں جو تمہیں دیکھ کر پتہ چل جائیں گے۔

''اس اعتبار سے تو واقعی مشکل کھیل ہے، پھر لوگ اِسے رولیٹ یا بانکو پانٹو پر ترجیح کیوں دیتے ہیں؟''

''دراصل اس میں تھرل زیادہ ہے۔ 1326 مختلف طریقے ہیں جن میں کھلاڑی دو پتوں میں دو سے اکیس تک پہنچتا ہے۔ اِسی طرح 564 ایسے Combination ہیں جن کے ذریعے 16 سے 21 نمبر تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہاں یا تو بہت شاطر، حاضر دماغ اور اچھی یادداشت والا شخص جیت سکتا ہے یا جس پر قسمت کی دیوی مہربان ہو تیسرے، وگرنہ ہارنے کے امکانات زیادہ ہیں۔''

''کیا کوئی ایسا کھلاڑی بھی آیا جس نے کیسینو کو مات دی ہو؟''

''معدودے چند.....! اُن میں سے ایک Edward Thorp تھا۔ جو امریکہ میں حساب کا پروفیسر تھا۔ اس نے اپنی یادداشت اور حساب کی مدد سے چند فارمولے بنائے اور مسلسل جیتنا شروع کیا۔ نتیجتاً کیسینو نے ہاتھ جوڑ دیئے اور اُس کا داخلہ بند کر دیا گیا۔''

''گویا جیتنے والے شخص کیسینو کو کھلتا ہے؟''

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ لاکھوں لوگ جیت کر جاتے ہیں''، یہ پروفیشنلز کو اجازت نہیں دیتے۔ اگر کوئی شخص ایک طویل عرصے تک مسلسل جیتے تو باقاعدہ انکوائری شروع ہو جاتی ہے اور یہ اپنے ذرائع سے اُس کا حسب نسب تک جان لیتے ہیں۔''

''اور ہارنے والوں کے ساتھ اِن کا رویہ کیسا ہوتا ہے؟''

''مشفقانہ.....! اُن کے متعلق کسی انکوائری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنا تعارف خود

ہوتے ہیں۔ کیسینوان کی بڑی آؤ بھگت کرتا ہے، اُنہیں مفت کمرہ اور فری کھانا دیا جاتا ہے۔ بسا اوقات ٹکٹ کا انتظام بھی کیسینو کرتا ہے۔ لیکن یہ تمام بڑے گیمبلرز کے متعلق ہوتا ہے۔ دس بیس ہزار ڈالر ہارنے، جیتنے والوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔"

"تو کیا تم نے رقم ضرور ہارنی ہے؟ کسی غریب کو دے دو!"

"اگر سارے امریکہ کی دولت بھی بانٹ دو تو بھی دُنیا سے غربت دُور نہیں ہو سکتی۔ کیا تم نے اُس لاکھ پتی کا لطیفہ نہیں سنا؟"

"کون سا لطیفہ.....؟"

"ایک غریب ایک امریکن کروڑ پتی کے پاس گیا اور اُسے کہنے لگا کہ ہم سب اولادِ آدم ہیں اور اُس رشتے سے میں تمہارا بھائی لگتا ہوں۔ اِس لئے برادرانہ شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ بھائی کا حصہ اِس غریب بھائی کو دے دو۔ اُس پر اُس کروڑ پتی نے جیب سے ایک سینٹ نکالا اور اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا..... جب بھکاری بھائی نے احتجاج کیا تو وہ امیر آدمی منہ پر انگلی رکھ کر بولا خاموش ہو جاؤ، اگر باقی بھائیوں کے کان میں بھنک پڑ گئی تو ایک سینٹ بھی تمہارے حصے میں نہیں آئے گا".....

"تو چلو آج تمہارے ہنر کا اعجاز دیکھتے ہیں!"

ہال میں بے شمار ٹیبل لگے ہوئے تھے۔ جن میں زیادہ تر بلیک جیک کے تھے۔ ہر ٹیبل کی اپنی ایک Limit تھی۔ یعنی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ رقم داؤ پر لگانا۔ اس کے علاوہ بڑے آدمی سپیشل ٹیبل بھی لگوا سکتے ہیں، جن پر کوئی لمٹ نہیں ہوتی۔ ان کے لیے الگ انکلوژر ہوتے ہیں۔ یہاں زیادہ تر جاپانی ٹائیکون، امریکن سرمایہ دار، عرب شیخ یا تیسری دنیا کے بگڑے تگڑے، کرپٹ حکمران اور سیاستدان آتے ہیں..... میں نے لندن کے میکسم کیسینو میں ایک پاکستانی کو دیکھا جو ہر داؤ پر پانچ لاکھ روپے کے لگ بھگ رقم لگا رہا تھا۔ کریدنے پر پتہ چلا کہ حضرت لاہور کے رہنے والے ہیں اور نیوی میں کسی بہت بڑے آفیسر کے سالے ہیں۔ اُن کی ملی بھگت سے ایک سب میرین ڈیل میں لمبا ہاتھ مارا ہے۔ اُسی رقم کو اُڑانے کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔

ہم چلتے چلتے سپیشل انکلوژر میں پہنچ گئے جہاں جاپانی سرمایہ دار ایک گروپ کی شکل میں بلیک جیک کھیل رہے تھے۔ اُس کے ساتھ ہی دوسرا ٹیبل لگا ہوا تھا جس کی Bet نسبتاً کم تھی۔ مون وہاں جا کر ایک اسٹول پر بیٹھ گئی، کہنے لگی ''تم میرے پیچھے کھڑے ہو جاؤ کیونکہ تم ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ نہیں سکتے۔ اس کے لئے کھیلنا ضروری ہے۔'' میں اُس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ کوئی نصف گھنٹہ کھیلی۔ میں اُس کی مہارت کا معترف ہو گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اُس نے دماغ میں کوئی کمپیوٹر نصب کروا رکھا ہے، جو پتا بھی مانگا، عین توقع کے مطابق نکلا۔ قسمت کی دیوی مہربان تھی۔ نصف گھنٹے میں وہ بیس ہزار ڈالر جیت گئی۔

''میرے خیال میں اب بس کر دو۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''تمہیں خدشہ ہے کہ جیتی ہوئی رقم ہار نہ جاؤں؟'' اُس نے میری طرف دیکھا۔

''تم نے گھڑی نہیں دیکھی رات کا ایک بج رہا ہے!''

''اِس سے تو رات جوان ہوتی ہے۔'' اُس نے دیگر کھلاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''کون سی آخری رات ہے، کل بھی کھیلا جا سکتا ہے۔'' دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ میری موجودگی میں وہ ہار جائے۔

''چلو تمہاری بات مان لیتے ہیں۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اتنے میں سپروائزر آ گیا۔ پوچھنے لگا کہ وہ کیش لینا پسند کرے گی یا چیک کاٹا جائے۔

بولی ''اتنی کم رقم کے لئے چیک کیا لینا ہے!''

کاؤنٹر سے کیش لے کر جب ہم لفٹ تک پہنچے تو رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ میرا کمرہ ہوٹل کی چودھویں منزل پر تھا جبکہ اُسے ساتویں منزل پر رہائش دیگئی تھی..... جب لفٹ چلی تو مون کہنے لگی۔

''شاہ، اُمید ہے تمہیں لکھنے کے لئے کافی مواد مل گیا ہو گا؟''

''بلاشبہ یہ ایک حسین شام تھی۔ اُمید ہے کل پھر ملاقات ہو گی؟''

''اوہ، شوئر.....!'' اُس نے ہاتھ ملایا اور ساتویں فلور پر اُتر گئی۔

جب میں کمرے میں پہنچا تو میری عدم موجودگی میں مینجر نے ایک فروٹ باسکٹ، شیواز ریگل کی ایک بوتل اور ہالی وڈ شو کے دو ٹکٹ بھجوا رکھے تھے، میز پر رکھے ہوئے تحائف کے ساتھ ایک کارڈ بھی تھا "With Compliments From the Casino Managment" اس قسم کی کرٹسی ہر گاہک کو پیش نہیں کی جاتی۔ شاید یہ چیزیں مادی اعتبار سے زیادہ اہم نہ ہوں لیکن یہ تکریم کا ایک اچھوتا انداز ہے جو مخصوص کسٹمرز کے لئے مختص ہے۔ میرا شمار کیسینو کے اُن گاہکوں میں ہوتا تھا جو کیسینو کو کچھ کھٹاتے نہیں، تھوڑا بہت خرچ ہی کرواتے ہیں۔ میں اپنے ایک دوست کے توسط سے ہوٹل گیسٹ تھا۔ موصوف نیویارک والڈارف اسٹوریا ہوٹل میں ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ بڑے آدمیوں کی طرح بڑے ہوٹل بھی ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات استوار رکھتے ہیں۔ فروٹ باسکٹ میں چند سیب، انگور، انناس اور تربوز کی ایک پھانک بڑے سلیقے سے سجائے گئے تھے۔ میں نے سیب کاٹ کر چند قاشیں کھائیں۔ کیلیفورنیا کا سیب آدھا کچا، آدھا پکا اور کسی حد تک ترش ہوتا ہے۔ امریکیوں کی ہر بات اُلٹ ہوتی ہے۔ ہماری طرح میٹھے گولڈن شیب نہیں کھاتے بلکہ کچے پکے سیب پسند کرتے ہیں اور جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ اُن کے سیب جوسی ہیں۔ اُن کی کلچرل برتری کا یہ عالم ہے کہ اب یار لوگوں نے بھی اُن کی تقلید شروع کر دی ہے۔ اب تربوز کو ہی لیں۔ جس طرح آم کو سلطان الاثمار کہا جاتا ہے، اِسے پھلوں کا فقیر سمجھا جاتا تھا۔ اِس کا نام زبان پر آتے ہی بے اختیار ہنسی آ جاتی تھی اور شرفاء کی محفلوں میں اسے کھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جس وقت سے امریکہ نے اِس سے رغبت کا اظہار کیا ہے اور یہ اپنا دیسی نام چھوڑ کر واٹر میلن بنا ہے، لوگ اس کے رسیا اور متوالے ہو گئے ہیں۔ اور اِس کی نرمی، حلاوت، مٹھاس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے..... مشروبات میں اگر کسی محفل میں کوکا کولا اور پیپسی کی جگہ سکنجبین یا لسی دی جائے تو میزبان کے ساتھ مہمان بھی شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے..... جینز Jeans گھوڑوں کی زین کے لئے تو شاید موزوں ہو، لیکن اِس شدت کی گرمی میں اِسے پہننا یقیناً جان جوکھوں کا کام ہے۔ بایں ہمہ گھٹنوں تک پسینہ بہہ رہا ہوتا ہے لیکن نوجوانوں نے یہی دریدہ لباس زیب تن کیا ہوتا ہے۔

سیب کی ترشی دُور کرنے کے لئے میں نے تھوڑا سا انناس کھایا جو میٹھا اور خوش ذائقہ تھا۔

وہسکی کو اٹھا کر دراز میں ڈال دیا اور ٹکٹوں کے ساتھ بھیجا ہوا بروشر پڑھنے لگا..... ہالی وڈ سے باب ہوپ اور دیگر فنکار آ رہے تھے اور اگلے دن اُن کا شو تھا۔

میں نے کپڑے بدلے اور کمرے کی غربی کھڑکی کھول دی۔ سامنے ہلٹن فلیمنگو اور سیزر پیلس کے نیون سائن نظر آ رہے تھے۔ رنگ برنگی روشنیاں جن کا کمپیوٹر کے ذریعے حسین امتزاج پیدا کیا گیا تھا..... سڑک پر اب بھی خاصا رش تھا۔ دراصل یہ شہر کبھی سوتا نہیں ہے۔ تھکتا بھی نہیں۔ اِس کی ہفت رنگ روشنیاں کبھی ماند نہیں پڑتیں۔ یہ غالباً دنیا کا واحد شہر ہے جس کے اندر کئی شہر آباد ہیں۔ ہر کیسینو بجائے خود ایک شہر ہے، خود کفیل اور خود پسند.....!

O

نیواڈا کے صحرائے بے نوا میں یہ شہر صدا کیسے آباد ہو گیا؟ عناصر کو کیونکر شکست ہوئی؟ بنجر زمین کا کچھا حصہ کیسے گل و گلزار ہو گیا؟ نیواڈا کی تاریخ حیرت و دلچسپی کے کئی در وا کرتی ہے..... اِس کی ترقی کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1950ء میں اس کی آبادی ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اب صرف لاس ویگاس اور رینو میں اس قدر ٹورسٹ ہر روز آتے ہیں۔ اُس وقت اس کی آبادی سب امریکی ریاستوں سے کم تھی۔ اس کے دارالخلافہ کارسن سٹی میں کل تین ہزار انسان بستے تھے اور یہ شہر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا تھا..... ساری ریاست چار چیزوں پر زندہ تھی۔ کان کنی، مویشیوں کے ریوڑ، جوا، اور طلاق۔ ایک تو ریاست غریب، پھر کیلیفورنیا جیسی امیر اور رنگین ریاست کے سائے تلے، اِس کا احساس کمتری بڑھتا گیا۔ لیکن اِس نے ہمت نہ ہاری اور اہل ریاست نے فیصلہ کیا کہ اُن چیزوں کی طرف توجہ دی جائے جو دیگر ریاستوں میں مفقود ہیں یا جن کی قانونی ضابطوں کی وجہ سے حوصلہ افزائی نہیں ہوتی.....

اِس کا پہلا مسئلہ تو یونین کے ساتھ انضمام تھا۔ اِس کی غربت اِس کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔ 1864ء تک یہ صرف Territory تھی اور امریکہ اِس کو ساتھی بنانے میں ہچکچا رہا تھا..... لیکن اچانک ہی حالات نے پلٹا کھایا۔ ابراہیم لنکن کی نظریں اُس کھوٹے سکے پر پڑیں، جو اُسے وقتی طور پر سہی،

بڑا کارآمد نظر آیا۔ وہ تاریخ کی دہلیز پر کھڑا تھا اور غلامی کی لعنت ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتا تھا۔ تیرہویں ترمیم کے لئے اُسے ایک ریاست کے ووٹ کی ضرورت تھی..... اِس طرح ایک بے نوا کو نوا ملی..... نیواڈا کو کہا گیا کہ وہ اپنا آئین تار کے ذریعے واشنگٹن بھیجیں..... آئین کا مسودہ بھیجنے کے لئے رقم کی ضرورت تھی۔ تین ہزار ڈالر ریاست کے خزانے میں نہیں تھے۔ اِس کا انتظام بھی لنکن کو کرنا پڑا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ابدیت کے مقام تک پہنچنے کے لئے صرف چند لفظوں کا فاصلہ تھا..... اِدھر آئین کی کاپی واشنگٹن پہنچی اور اُدھر اسے ریاست کا درجہ مل گیا۔ اِس طرح یہ رقبے کے لحاظ سے چھٹی بڑی ریاست بن گئی۔ اِن کی تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ بھیڑوں اور مویشیوں کے قاتل Coytes کا خاتمہ بھی نہ کر سکتے تھے۔

لیکن جن دو چیزوں کی وجہ سے نیواڈا مشہور ہوا اور اہل امریکہ کی توجہ کا مرکز بنا وہ طلاق اور گیمبلنگ تھی..... طلاق کے حوالے سے منفعت کے علاوہ اہل نیواڈا کا نکتہ نظر یہ تھا کہ اگر دو شخص کسی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو انہیں موقع دینا چاہئے کہ الگ ہو کر ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔ اس کے لئے پہلے نیواڈا میں چھ ماہ کی رہائش ضروری تھی جو بالآخر چھ ہفتے کر دی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نیواڈا کی اکثریت رومن کیتھولک تھی اور وہ مذہبی ضابطوں کی وجہ سے طلاق کے خلاف تھے۔ اس لئے جتنی بھی طلاقیں ہوئیں وہ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی تھیں..... اب طلاق باقاعدہ ایک ٹریڈ بن چکی ہے، اور دو شہر..... رینو اور ویگاس ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کیلئے بے قرار ہیں۔ لاس ویگاس کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ رینو بیچارے نے کیا مقابلہ کرنا ہے۔ بڑے بڑے جغادری شہر اس کے آگے ہاتھ جوڑتے نظر آتے ہیں۔

لیکن جس چیز نے نیواڈا کو دنیا میں مشہور کیا ہے وہ گیمبلنگ ہے۔ اتفاق سے اس کی بدنامی کی وجہ بھی یہی ہے..... لاس ویگاس کا نام سنتے ہی زاہدان خشک، لاحول کا وِرد شروع کر دیتے ہیں، اور وہ جو اتنے زیادہ خشک نہیں ہوتے اُن کے چہرے کھل اُٹھتے ہیں اور سارے وجود میں گدگدیاں سی ہونے لگتی ہیں۔ اِسے بیک وقت شہر گناہ اور شہر بے پرواہ کہا جاتا ہے۔ نیواڈا کو ریاست کا درجہ ملتے ہی جوئے کو قانونی تحفظ مل گیا۔ اِس پر مذہبی گروہ نے بڑا احتجاج کیا کہ اِس لعنت کو ریاست بدر کیا جائے۔ بالآخر ریاست نے

ہتھیار ڈال دیئے اور 1910ء میں قمار بازی ممنوع قرار دے دی گئی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف غیر قانونی جواء خانے کھل گئے۔ بدمعاشوں، دلالوں اور گینگسٹرز کی چاندی ہوگئی اور اس کے رسیا لوگوں کو دِن دہاڑے لوٹنے لگے..... دراصل کان کنی کے علاقے سے جواء ختم کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص بالٹی لے کر یہ کہے کہ دریائے مسس پی کا پانی خشک کردے گا۔ چنانچہ 1931ء میں پھر سے اسے قانونی تحفظ مل گیا۔ اس طرح نہ صرف غیر قانونی اڈے بند ہوگئے بلکہ ریاست کو معقول آمدنی بھی ہونے لگی۔ ابتدا میں گیمبلنگ پر ٹیکس نہیں تھا۔ صرف لائسنس فیس لی جاتی تھی..... لیکن جیسے جیسے یہ ''انڈسٹری'' پھلتی پھولتی گئی، کیسینو..... ٹیکس کی زد میں آتے گئے..... اِس کا محرک سینیٹر کینتھ جانسن تھا۔ وہ خود بھی ایک جواء خانے کا مالک تھا۔ اُس کا استدلال یہ تھا کہ اگر عوام کی مخالفت روکنی ہے تو اِن کو اِس کے ثمرات میں شریک کرو۔ اُس وقت نیواڈا کی غربت کا یہ عالم تھا کہ وزیرِ داخلہ کی تنخواہ تین ہزار ڈالر سالانہ تھی..... شروع میں یہ ٹیکس 10% تھا جس کو بعد میں گھٹا کر ایک فیصد کر دیا گیا۔ 50-1949ء میں اسے دو فیصد کر دیا گیا۔ اُس سال ریاست کو بارہ لاکھ ڈالر کی آمدن ہوئی۔

اِن پچاس برسوں میں ایک معاشی انقلاب آگیا ہے۔ ساری دنیا کی فالتو دولت ویگاس پہنچ جاتی ہے۔ ایک بلین ڈالر سے کم قیمت پر اچھا کیسینو نہیں بنتا۔ مقابلہ اِس قدر سخت ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر تیس سال پہلے بنے ہوئے کیسینو متروک ہوگئے ہیں۔ اُن کو گرا کر نئے بنائے جا رہے ہیں یا پھر پرانوں کی تزئین و آرائش اس طرح کی جا رہی ہے کہ بالکل نئے پن کا گمان ہوتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں یہ لوگ آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ جو لوگ دنیا کے SEVEN WONDERS کی باتیں کرتے ہیں وہ جلد ہی یہاں کے HEAVEN WONDERS کے گیت گائیں گے۔

ایک سوال جو لامحالہ عام آدمی کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے، یہ ہے، کہ اگر گیمبلنگ اِس قدر منفعت بخش ذریعہ آمدنی ہے تو دیگر ریاستیں اِس کی حوصلہ افزائی کیوں نہیں کرتیں۔ ہر ریاست کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگوں کا معیارِ زندگی بلند کیا جائے اور خوشحالی کا دَور دَورہ ہو۔ نیویارک کی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ اس کی بلند و بانگ عمارات میں بہترین کیسینو کھولے جا سکتے ہیں۔ اِسی طرح شکاگو، لاس

اینجلس، ڈلاس اور بیسیوں دوسرے شہر ہیں جن کی اپنی آبادی اتنی زیادہ ہے کہ کوئی مالی دشواری پیش نہیں آ سکتی اور کیسینو کو با آسانی چلایا جا سکتا ہے۔ پھر میامی بیچ، نیاگرا فال اور سان فرانسسکو جیسے خوبصورت اور صحت افزا مقامات ہیں، جہاں ''گلشن کا کاروبار'' چل سکتا ہے۔ سوائے نیوجرسی کے دیگر ریاستیں کسی جوش و جذبے کا مظاہرہ نہیں کرتیں۔ اِس کی بظاہر دو وجوہ ہیں۔ مافیا کنٹرول اور اخلاقیات۔ چونکہ اکثر کیسینوز میں مافیا کے 'ڈانوں' نے سرمایہ کاری کی ہوتی ہے اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ اس نفع بخش کاروبار میں دیگر لوگ بھی شریک ہوں۔ اِن کے ڈر اور خوف کا یہ عالم ہے کہ ؎ کانپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں..... دوسرے طبقے کو یہ تشویش لاحق ہوتی ہے کہ اِس سے جرائم بڑھیں گے۔ گناہ آلود کاروبار سے لوگوں کی اخلاقی صحت متاثر ہوگی۔ اب صرف نیویارک کو لیں۔ وہاں اکثر سیاحوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ باہر نکلتے وقت جیب میں کچھ نہ کچھ رقم ضرور رکھیں چور، ڈاکو ناکامی کی صورت میں نقصان پہنچا سکتا ہے..... ان حالات میں اگر کوئی شخص جیب میں ہزاروں ڈالر ڈال کر کیسینو میں داخل ہوگا یا باہر نکلے گا تو اس کا حشر کیا ہو گا؟ لاس ویگاس کے کیسینوز میں پولیس داخل نہیں ہوتی۔ اُن کا اپنا سکیورٹی کا نظام ہے جو اِس قدر مضبوط اور مؤثر ہے کہ جرم کرنا بہت مشکل ہے۔ پھر شہر سے باہر سینکڑوں میل تک وسیع و عریض اور بے آب و گیاہ صحرا ہے۔ مجرم جائے گا کہاں؟ لومڑی کی طرح پکڑا جائے گا اور سُور کی طرح مارا جائے گا۔ کہیں پناہ ملنے یا چھپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ویگاس ایک دن میں نہیں بنتے، ان کے پیچھے برسوں کی سوچ، محنت اور کاوش ہوتی ہے۔ انسانوں کی طرح شہروں کا بھی مقدر ہوتا ہے بعض قسمت کے دھنی ہوتے ہیں جن پر دولت اور شہرت کی ہمہ وقت پھوار پڑتی رہتی ہے کسی بھی شہر کی مقبولیت کا اندازہ سیاحوں کی آمد اور دلچسپی سے لگایا جا سکتا ہے..... جنیوا' زیورچ' لندن' پیرس' روم' بنکاک' ہانگ کانگ اور سنگاپور سب مقبول ہیں' لیکن ان میں وہ مولوی مدن والی بات نہیں ہے..... ایک ایسا شہر جس میں کوئی قابل ذکر انڈسٹری نہیں ہے جو کسی بڑی ریاست کا دارالخلافہ نہیں ہے' دنیا کے کراس روڈز پر واقع نہیں' جہاں سرسبز پہاڑ' آنکھوں کو طراوت بخشنے والے مرغزار' نیلے پانیوں والے سمندر نہیں' جس تک پہنچنے کیلئے تمام دنیا کا سفر درکار ہے ایک بے آب و گیارہ ریگستان کو عبور کرنا پڑتا ہے..... ایک طرح سے وقت اور رقم کا ضیاع

..... باایں ہمہ جس تسلسل اور تواتر سے لوگ آتے ہیں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے یہ شہر دیکھنے نہیں' یاترا کرنے آئے ہوئے ہوں ..... پیرس کا شانزالیزے بہت رنگین ہے لندن کا ٹریفالگر اسکوائر منفرد ہے۔ روم کے آثار قدیمہ اپنی عظمت گم گشتہ کے امین ہیں لیکن جو بات لاس ویگاس بلیوارڈ میں نظر آتی ہے کہیں اور نہیں روشنیوں کا اس قدر حسین امتزاج' ہر عمارت فن تعمیر کا نادر شہکار' دامن نگاہ تھامتی ہوئی' اندر ایک دنیا آباد باہر ایک جہاں روشن' نہ نگاہیں دیکھ دیکھ کر تھکتی ہیں نہ قدم چل چل کر ڈگمگاتے ہیں میلوں چل کر بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سفر کا آغاز کیا ہو حیرتیں اور حسرتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں نگاہیں ایک جگہ ٹکتی نہیں ہیں پھسلتی رہتی ہیں ایک بے نام سی وشی انجانے جذبے' خواہشیں مچلتی ہوئیں تفکرات' غم واندوہ' الجھنیں' جیسے ان سب کو شہر بدر کر دیا گیا ہو شہر کی رونق اور رعنائیوں کا یہ عالم ہے کہ 1951ء کا ایٹمی دھماکہ بھی لوگوں میں خوف وہراس نہ پیدا کر سکا۔ ویگاس سے صرف ستر میل کے فاصلے پر اٹامک انرجی کمیشن نے پانچ دھماکے کئے وہ اس قدر شدید تھے کہ پانچ لاکھ مربع میل کے علاقے میں ان کی روشنی دیکھی گئی۔ تین سو میل دور لاس اینجلس کے دھند ختم ہوگئی اور مبینہ طور پر Radio Active Snow نیویارک جا کر گری چند جگہوں کو چھوڑ کر ریاست کی سازی زمین بے آب وگیاہ اور بنجر ہے صحرا میں سفر کرتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی چاند پر اتر گیا ہو۔ ڈیزرٹ صحرائے نجد کی طرح نہیں ہے زمین نیم سخت ہے جس پر جگہ جگہ چھوٹی جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں پانی کی قلت نے ریاست کو انوکھا طریقہ اپنانے پر مجبور کر دیا ہے ہوائی جہاز کے ذریعے ان بدلوں پر دوائی چھڑکی گئی جو بن برسے گزر جاتے تھے اس پر ریاست یوٹا (Utah) نے 1948ء میں ایک طوفان کھڑا کر دیا کہ ان کے بادلوں کو زبردستی برسنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ یوٹا کا استدلال یہ تھا بادل حسب دستور گرجیں تو نیواڈا پر لیکن برسیں اس کی سرزمین پر نیواڈا کا موقف تھا کہ ابر کرم سب کیلئے ہوتا ہے اور رینو میں واحد اسکیٹنگ ریزارٹ کیلئے برف کی ضرورت صرف اسی طریقے سے پوری کی جا سکتی ہے ..... دو ریاستوں کے اس باہمی جھگڑے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیواڈا کے ایک زمیندار نے مقامی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ جو بادل اس کی جاگیر پر سے گزرتے ہیں ان کے پانی پر صرف اس کا حق ہے لہٰذا ریاست کو روکا جائے کہ اس پانی سے استفادہ نہ کرے۔ یہ غالباً دنیا کا پہلا مقدمہ تھا۔ جس کی بنیاد پر اڑتے

ہوئے آوارہ بادلوں کو بنایا گیا تھا۔

نیواڈا کی سیاست میں شخصی عنصر نمایاں ہے کسی بھی کامیاب سیاستدان کیلئے ووٹروں کو انفرادی طور پر جاننا ضروری ہے۔ ہر شخص سے ہاتھ بھی ملانا پڑتا ہے۔ ایسا شاید اسی لئے ممکن ہے کہ آبادی بہت کم ہے کیونکہ نیویارک میں کوئی پالیٹیشن ہینڈشیک شروع کردے تو اسکے ہاتھ کی ہڈیاں چیخ جائیں گی یا پھر گھڑی غائب ہو جائے گی۔ (ویسے ہمارے ہاں جب کوئی سیاستدان ہاتھ ملائے تو لوگ بعد میں اپنے ہاتھوں کی انگلیاں گنتے ہیں)۔ اور ہاتھ اگر کسی نیگرو کے ساتھ ملا رہا ہو تو گھڑی کے ساتھ ساتھ بازو بھی سنبھالنا پڑتا ہے۔

1916ء سے لے کر روز ویلٹ کے اقتدار تک نیواڈا ری پبلکن تھا۔ اس کے دور صدارت میں یہ ڈیموکریٹک رہا۔ 1950ء میں اس نیری پبلکن گورنر Charles H. Russel چنا۔ سوئٹزرلینڈ کی طرح یہاں بھی بلاواسطہ طریقہ رائج ہے Primary Initiative Refrendum Recall کے طریقے رائج ہیں۔

26 نومبر 1951ء میں نیواڈا نے بائیسویں ترمیم کی منظوری دے دی اس سے قبل 35 ریاستیں اسے منظور کر چکی تھیں۔ اس کی رو سے صدارت کو دو TERMS تک محدود کر دیا گیا چونکہ جارج واشنگٹن نے تیسری مرتبہ الیکشن لڑنے سے انکار کر دیا تھا اسلئے اس وقت سے ایک روایت پڑ گئی کہ کوئی صدر تیسری مرتبہ الیکشن نہیں لڑے گا فرینکلن روز ریلٹ تک اس پر عمل ہوتا رہا۔ جب اس نے تیسری مرتبہ الیکشن لڑنے کا عندیہ دیا تو اس کی توجہ مروجہ روایت کی طرف مبذول کرائی گئی اس پر وہ گرجا Do you want to change the horses in the Midstream" (کیا تم بیچ منجھدار کے راکب بدلنا چاہتے ہو؟) اس کا اشارہ جنگ عظیم کی طرف تھا جو اس وقت لڑی جا رہی تھی اور جس میں امریکہ بادل نخواستہ کود گیا تھا۔

نیواڈا نے امریکی سینٹ میں ہمیشہ ایک طاقتور سینیٹر بھیجا بظاہر یہ بڑی حیران کن بات ہے کہ اتنی چھوٹی ریاست کا سینیٹر اس قدر طاقتور ہو اس کی وجہ یہ تھی کہ سٹرانگ سینیٹر آبادی کی وجہ سے نہیں بلکہ Strong

issue کی وجہ سے بنتا ہے اور وہ طاقت نیواڈا کے پاس تھی..... چاندی.....! چاندی کی دولت سے مالا مال ہوتے ہوئے بھی نیواڈا معاشی طور پر بدحال تھا۔ اس کی وجہ اس دھات کی گرتی ہوئی ساکھ تھی۔ ایک دفعہ تو نوبت باایں جارسید کہ 1930ء میں اس قیمت 27 سینٹ گر گئی۔ اور کانکنی کی لاگت سے اس روپہلی دھات سے بڑھ گئی جس قدر چاندی والی ریاستیں وفاق سے قیمت بڑھانے کا اصرار کرتیں' مشرقی ریاستوں نے اتنا ہی احتجاج کیا۔ لیکن سات ریاستوں کے چودہ سینیٹر وفاق کے لئے بہت اہم تھے انہوں نے ایک محاذ بنالیا..... 1934ء میں اس کی قیمت بڑھا کر سوا ڈالر فی اونس کر دی گئی اور سونے کے ساتھ 1.16 کی اوسط مقرر کی گئی چاندی کی قیمتیں بڑھانے اور ان میں استحکام پیدا کرنے کیلئے سینیٹر میکارن نے بڑا کام کیا اس کی شخصیت اور شر سے ہر حکومت ڈرتی تھی اور اسے نظر انداز نہ کر سکتی تھی۔

صبح جب میں اٹھا تو دن کے گیارہ بج رہے تھے اس قدر پرسکون نیند بڑے عرصے کے بعد نصیب ہوئی تھی ایک طویل عرصے سے ایک عادت سی بن گئی تھی کہ صبح پانچ بجے آنکھ کھل جاتی چند بے ہنگم انگڑائیاں 'دل ہی دل میں زندگی کی ناجوازیوں کا گلہ شکوہ اور پھر جوگرز پہن کر پانچ میل کی لمبی اور تھکا دینے والی سیر واپسی پر میکنکی انداز میں شیو باتھ' بغیر چینی چائے کا ایک کپ اور خشک رسک جو ناشتے کا جواز بنتا ..... سیر و سیاحت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تمام احتیاط فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے جتنا جی چاہا' کھالیا جب دل کیا سولیا راتیں جاگ کر گزاریں دن سو کر کاٹے انسان کے اندر باغی سب حفاظتی یواریں پھلانگ جاتا ہے زندگی ضابطوں سے آزاد ہو جاتی ہے اور ہر وسوسہ ذہن کے زندان سے باہر آ جاتا ہے۔

تیار ہو کر میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سورج نصف النہار پر آ چکا تھا۔ گرم ہوا کا جھونکا اندر آیا تو میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور کھڑکی بند کر دی۔

ناشتے کا وقت گزر چکا تھا..... میں نے باسکٹ سے انناس نکالا اور ابھی کھانے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کئے اور دروازہ کھول دیا..... سامنے مون کھڑی تھی ..... بلیون جین اور ہاف سلیو سفید شرٹ پہنے ہوئے بولی کیا گھوڑے بیچ کر سوتے ہو۔ صبح سے دو دفعہ فون کر چکی ہوں تم تو کہتے تھے کہ سحر خیز ہو؟''

''ہوں تو سہی لیکن ایسے محسوس ہوتا ہے کہ رات پی تو تم رہی تھیں اس کا اثر مجھ پر ہو گیا''۔اسے تم پینا کہتے ہو؟ بلڈی میری کا ایک پیگ.....اس سے تو کوکا کولا کے گلاس میں زیادہ نشہ ہوتا ہے!''

''پھر تم نے کچھ پھونک دیا ہوگا.....!''

کہنے لگی ''غالباً تم تھکے ہوئے تھے۔جیٹ لیگ سے قوئی مضمحل ہو جاتے ہیں میں بھی جب ٹرانز اٹلانٹک سفر کرتی ہوں تو دو دن سے پہلے سو کر نہیں اٹھتی ویسے بھی مجھے نیند بہت پسند ہے!''

''ایک اعتبار سے تمہارا سونا ہی بہتر ہے!''

''بھلا وہ کیوں؟'' اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

''کیا تم نے حجاج بن یوسف کا قصہ نہیں سنا؟''

''نہیں تو.....وہ کون تھا.....؟''

گلستان سعدی میں ایک حکایت ہے کہ بصرہ میں ایک درویش آیا۔اموی حکمران عبدالملک کا گورنر حجاج بن یوسف اس سے ملنے گیا اور کہا کہ وہ کوئی نصیحت کرے اس پر درویش نے کہا' جتنا ہو سکے سویا کرو!''

حجاج بڑا حیران ہوا کہ یہ کس قسم کی نصیحت ہے۔درویش بولا ''جتنا عرصہ تم سوئے رہو گے خلق خدا تمہارے ظلم سے بچی رہے گی اور تم گناہوں سے!''

''تو تم مجھے ظالم سمجھتے ہو؟'' وہ حکایت کا مفہوم بھانپتے ہوئے بولی۔

''شاید خلق خدا ایسا سمجھتی ہو!'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

بولی ''مسٹر شاہ! یہ امریکہ ہے یہ بڑا مصروف معاشرہ ہے لوگ پورے باغ سے گزر جاتے ہیں لیکن پھولوں پر ایک نظر تک نہیں ڈالتے''.....باتیں کرتے کرتے اس کی نگاہ میز پر پڑے ہوئے ٹکٹوں پر پڑی۔اس نے بڑی حیرت کے ساتھ انہیں دیکھا اور پوچھنے لگی' کیا یہ تمہارے ہیں؟

''ہمارے ہیں.....!'' میں مسکرایا۔

''لیکن تمہیں ملے کہاں سے ہیں؟''

''چرائے ہیں.....!''

''مذاق چھوڑو ۔سچ سچ بتاؤ کہاں سے خریدے ہیں۔ میں دو دن سے کوشش کر رہی ہوں لیکن کامیاب نہیں ہو سکی' ایک ہی جواب ملتا ہے Sold out۔

''منیجر نے بھجوائے ہیں۔''

''کیا وہ تمہارا رشتہ دار یا واقف کار ہے''

''کزن.....!'' میں ایک پرانے واقعہ کو یاد کر کے مسکرایا۔ میں پنجاب یونیورسٹی کے پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کا صدر تھا ایک دفعہ ہم نے قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے سلسلے میں فنڈز اکٹھا کرنے کیلئے فلم لگوائی جب میں ٹیکس معاف کرانے کے سلسلے میں ایکسائز ڈیپارٹمنٹ گیا تو ETO پھٹ پڑا تم لوگوں نے چیریٹی کے نام پر رقم اکٹھا کرنے کا بہانہ بنا رکھا ہے حکومت کو نقصان پہنچاتے ہو۔ میرے اصرار پر ٹالنے کے انداز میں اگلے روز آنے کو کہا دوسرے دن جب میں گیا تو اتفاق سے میری جائنٹ سیکرٹری بھی ساتھ تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس' نین بخت' کا لب ولہجہ بدل گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں وطن عزیز میں نہیں بلکہ فرانس میں بیٹھا ہوں۔ مہذب لب ولہجہ' چائے کا ایک کپ' تھری کیسل کا سگریٹ' جس کے تیسرے کش کے ساتھ ہی ایگزیمشن آ گئی۔ وہ ہمیں دروازے تک چھوڑنے آیا۔ محترمہ اس مہمان نوازی سے بڑی متاثر ہوئیں۔ پوچھنے لگیں ''بڑا خوش اخلاق انسان ہے' کیا لگتا ہے تمہارا؟

''کزن.....!'' میں اس بدخو کے آخری کش لیتے ہوئے بولا۔ مون کہنے لگی' ایک امریکی تمہارا رشتہ دار نہیں ہو سکتا۔ سچ سچ بتاؤ یہ چکر کیا ہے۔ جب میں نے اسے اصل قصہ سنایا تو ہنسی۔ بولی ویسے تو یہ شہر کیسینوز سے بھرا پڑا ہے لیکن میں تمہیں صرف وہ جگہیں دکھاؤں گا جنہوں نے اس کی شہرت میں اضافہ کیا ہے!

شہر یا بدنامی؟

''شہرت.....!'' وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولی' ایک وقت تھا کہ ویگاس کو شہر گناہ سمجھا جاتا تھا۔ جہاں جوئے' شراب اور شباب کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اس شہر نے تفریح کا مفہوم بدل دیا

ہے۔اس کے اتنے سامان پیدا کر دیئے ہیں کہ اب سیاح' ادیب' شاعر' کھیلوں کے شوقین یہاں آنے سے قطعاً نہیں ہچکچاتے۔ڈزنی لینڈ کی طرز کے یہاں سینکڑوں عجوبے ہیں۔جہاں جا کر بچوں کے ساتھ بڑے بھی بچے بن جاتے ہیں۔امریکی مقبول کھیل باکسنگ کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔لاکھوں آدمی یہ کھیل دیکھنے آتے ہیں۔جو سٹیڈیم کے ٹکٹ حاصل نہیں کر پاتے وہ کلوز سرکٹ ٹی وی پر انجوائے کرتے ہیں۔پھر میوزک شوز جو لاس اینجلس میں کم اور یہاں زیادہ چلتے ہیں۔دنیا کے اس قدر زیادہ ایکٹرز اور کہیں بھی دیکھنے کو نہیں ملتے۔کوئی ایسی تفریح نہیں جس کا یہاں اہتمام نہ کیا گیا ہو۔کوئی ایسا فوڈ نہیں جو یہاں دستیاب نہ ہوتا ہو..... ہر سہولت ہر کمفرٹ یہاں موجود ہے۔پتہ نہیں اسے شہر گناہ کیوں سمجھا جاتا ہے؟ مون قدرے توقف کے بعد بولی دنیا کا ایسا کونسا شہر ہے جو معصیت سے پاک ہو۔نیویارک' لندن' پیرس یا ایمسٹرڈیم.....؟ کیا تم نے ایمسٹرڈیم میں نہر کے کنارے بنے ہوئے ان آئینہ خانوں کو نہیں دیکھا جہاں برہنہ عورتیں اپنے جسم کی نمائش اور تجارت کرتی ہیں۔نیویارک کی بیالیسویں سٹریٹ جہاں ویشیائیں شہد کی مکھیوں کی طرح گاہکوں کے گرد بھنبھناتی ہیں۔لندن کی پکاڈلی میں اتنی طوائفیں نہیں جتنے دلال نظر آتے ہیں۔پیرس میں شیشے کی سڑکیں تو نہیں لیکن بلور بدن آپ کو ہر مشہور جگہ پر دعوت گناہ دیتے نظر آئیں گے۔شہر گنہگار نہیں ہوتے انسان شیطان ہے۔اپنی لغزشوں اور عیاشیوں کا ذمہ دار کبھی ابلیس کو ٹھہراتا ہے تو کبھی بے جان چیزوں کو۔

لیکن تمہیں یہ ساری باتیں کس نے بتائی ہیں؟

میں نے خود مشاہدہ کیا ہے۔سنی سنائی بات نہیں کہہ رہی۔وہ میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے کہنے لگی۔ تمہاری طرح مجھے بھی سیاحت کا بڑا شوق ہے میں جتنا یورپ میں گھومی ہوں شاید ایل اے میں نہیں نہیں پھری۔

مردوں کا جانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن تمہیں کونسی چیز وہاں لے گئی؟ تجسس.....! جب بھی کوئی شہر دیکھتے ہیں تو گائیڈ لامحالہ وہاں ضرور لے جائے گا۔جو لوگ کسی شہر کا کلچر دیکھنا چاہتے ہیں۔وہ وہاں کے بازار حسن کو دیکھے بنا نہیں رہ سکتے۔

تم نے کیا محسوس کیا۔

تاسف.....! کتنے دکھ کی بات ہے مرد نے عورت کو کس مقام پر پہنچا دیا ہے۔

تو کیا عورت مورد الزام نہیں ہے۔

ہرگز نہیں..... یہ صرف Male Chauvenism کہنے کو تو مغربی عورت آزاد ہو گئی ہے لیکن صحیح آزادی اب بھی دور ہے۔ بہت دور اس کے لہجے کا کرب محسوس کیا جا سکتا تھا۔ چلو کھانا کھائیں۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

آج لگزر میں لنچ کرتے ہیں۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

جب ہم کمرے سے باہر نکلے تو ایک بج رہا تھا۔ کمرے اور لفٹس کے درمیان ایک طویل راہداری تھی۔ جب ہم کاریڈور کے درمیان پہنچے تو اچانک ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس میں سے ایک نہایت متناسب جسم والی نوجوان نیگرو لڑکی نکلی۔ اس نے نیم برہنہ سفید نائٹی پہن رکھی تھی۔ بال بکھرے ہوئے۔ لپ اسٹک کے کچھ دھبے ہونٹوں سے پھسل کر گردن تک آ گئے تھے۔ ہیلو! ہمیں دیکھ کر وہ بے حیائی سے مسکرائی اور تیز قدم اٹھاتی ہوئی لفٹ کی طرف چل دی۔

کیا یہ کسٹمر ہے۔ میں نے پوچھا؟

یہ کوئی کال گرل ہے۔ ہوٹل کسٹمر نے بلائی ہوگی۔

اس وقت؟ یہاں وقت کا تعین دن رات سے نہیں کیا جاتا بلکہ فرصت اور فراغت پر منحصر ہوتا ہے۔ بعض لوگ ہار کر غم غلط کرتے ہیں تو دوسرے جیت کر جشن مناتے ہیں ویسے بھی رات کے وقت شاید ہی کوئی ایسا کمرہ ہوگا جہاں تمہیں روشنی نظر آئے گی۔ سب لوگ گیمبلنگ ٹیبلز پر یا بار اور رقص گاہوں میں ہوتے ہیں۔

تو گویا یہاں رات کو دن کا سماں ہوتا ہے اور دن رات کا نعم البدل۔

کافی حد تک جہاں کیسینو چوبیس گھنٹے کھلا رہے اور لوگ آتے جاتے رہیں وہاں وقت کا حساب اپنی اپنی سہولت کے مطابق کیا جاتا ہے۔

جب ہم مرکزی دروازے سے باہر نکلے تو ایسے محسوس ہوا جیسے ہم کسی مرغزار سے نکل کر تپتے ہوئے

صحرا میں آ گئے ہوں۔ ویگاس کی گرمی عروج پر تھی۔ سڑک پر گاڑیوں کی ایک لمبی قطار تھی جو چونٹیوں کی طرح رینگ رہی تھی..... میں نے ٹیکسی پکڑنے کا مشورہ دیا۔

مگر کس لئے؟ ہمیں سڑک کراس کرنا ہے۔ سڑک کے دوسری طرف لگزر ہے اور لگزر میں لنچ.....

پھر کیا کرنا ہے۔؟

پھر کارڈز کھیلنے ہیں۔ شام کو پاپ ہوپ کا شو دیکھنا ہے اور پھر اپنے کمروں میں جا کر خواب دیکھنے ہیں۔

تم خواب بھی دیکھتی ہو؟ مجھے اس لہجہ بڑا مسحور کن لگا۔

ہر شخص خواب دیکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا خزانہ ہے جس میں قدرت نے تخصیص نہیں برتی۔ ہر امیر غریب کو یکساں بانٹا ہے۔

لیکن ہر خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا۔

نہ ہو.....! اس نے میری طرف دیکھا۔ اگر خواب نہ ہوتے تو زندگی عذاب بن جاتی بلکہ میں کہوں گی کہ زندگی خود ایک خواب ہے۔

گیٹ سے نکل کر ہم بائیں طرف بڑھے تو پیتل سے بنے ہوئے شیر کا ایک بہت بڑا مجسمہ نظر آیا۔ شیر کے پاؤں زمین پر تھے اور سر کیسینو کی پانچویں منزل کو چھو رہا تھا۔ وہ ایم جی ایم کے فلمی شہر کی طرح دھاڑ رہا تھا جیسے بہت بھوکا ہو یا پھر غصے میں ہو۔ ہم کچھ دیر مجسمے کے سائے میں کھڑے رہے۔ مون نے کیمرہ نکالا۔

کیوں نہ شیر کے ساتھ ایک فوٹو بنوایا جائے۔ کسی ٹورسٹ کو کہتے ہیں کہ ہمارا فوٹو کھینچے۔ ایسا غضب نہ ڈھانا۔ تمہاری قربت سے مجسمے میں جان پڑ جائے گی اور دنیا کا یہ سب سے بڑا شیر دھاڑنے لگے گا۔

کیا یہ ہمیں کھا جائے گا؟ وہ مسکرا دی۔

تمہیں نہیں، صرف مجھے .....

کیا تمہارا خون بہت میٹھا ہے؟

جانوروں میں بھی رقابت کا جذبہ ہوتا ہے۔

گھبراؤ نہیں..... میں شیر کی منت سماجت کرلوں گی۔

اس صورت میں تو میں مرنے سے پہلے مرجاؤں گا۔

ہنستے ہنستے وہ دہری ہوگئی۔ بولی ایسے پتہ چلتا ہے جیسے کوئی مووی چل رہی ہو اور دو کردار رومانٹک ڈائیلاگ بول رہے ہیں۔

اتنے میں ایک پپی جوڑا ہمارے قریب سے گزرا۔ لمبے میلے کچیلے بال جنہیں غالباً پیدائش سے پہلے دھویا گیا تھا۔ نشے کی وجہ سے گال پچکے ہوئے' آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی' نیلی نیکریں پہنے ہوئے اور پشت پر قریباً آدھا ٹن بوجھ اٹھائے ہوئے۔ مون نے لڑکی کو کہا کہ وہ ہماری تصویر اتار دے۔ اوہ شوئر کہہ کر اس نے کیمرہ پکڑا اور تصویر اتار دی Padestrian Bridge عبور کر کے ہم سڑک کے دوسری طرف پہنچے تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ اہرام مصر نیو اڈا میں؟ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کالے پتھروں سے بنا ہوا مخروطی مینار' جس کے اردگرد مصر کے بادشاہوں کے مجسمے بنے ہوئے تھے اور مرکزی دروازے پر ایم جی ایم گرینڈ کے شیر سے چھوٹا ابوالہول کھڑا تھا۔

کہنے لگی' یہ اہرام مصر نہیں' احترام مصر ہے۔ یہ جو تم کالی مخروطی چٹان دیکھ رہے ہو یہ لگژری کیسینو ہے اور اس کے اندر ایک جہاں آباد ہے۔ دو ہزار کمرے ہیں۔ ہر وہ چیز ہے جو ایم جی ایم گرینڈ میں دیکھ چکے ہو۔ اس کے علاوہ تہہ خانے میں دریا ہے۔ اس میں جہاز چلتے ہیں۔ جن میں بیٹھ کر مصر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور جانتے ہو یہ کس بادشاہ کا مجسمہ ہے؟۔ اس نے ایک بدہیئت مجسمے کی طرف اشارہ کیا۔ یہ ریمسز دوم ہے۔ فرعون مصر۔ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور بالآخر لشکر و سپاہ کے ساتھ غرق نیل ہوگیا تھا۔

میرا ذہن تاریخ کے پردوں کو چیرتا ہوا بہت پیچھے چلا گیا۔ ہارون رشید شکار کھیلتے بہت دور نکل گیا۔ جنگل میں گرمی کی شدت اور پیاس نے اسے ہلکان کر دیا۔ بڑی مشکل سے اس کے سپاہی ایک گلاس پانی لے کر آئے۔ اس کے مضطرب ہاتھ پانی کی طرف بڑھے اور گلاس ابھی لبوں تک ہی پہنچا تھا کہ اس کے مشیر نے کہا عالم پناہ رکیے..... ہارون نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا

اگر اس جرعہ آب کی اس وقت آپ کو قیمت دینی پڑے تو کس بھاؤ خریدیں گے؟

آدھی سلطنت دے سکتا ہوں۔ ہارون بغیر کسی توقف کے کہا اور گلاس کو ڈیک لگا دی۔ جب وہ پانی پی چکا تو وہی مشیر بولا

اگر یہ پانی آپ کے جسم سے خارج نہ ہو تو.....؟

بقیہ سلطنت.....! پھر سوچ لیں۔ جس سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی ہو اس کے لئے اس قدر تگ ودو کس لئے کی جائے'' ہارون پر رقت طاری ہو گئی۔

ہارون جب خلیفہ بنا تو اس نے اپنے حبشی غلام کو مصر کا گورنر بنا دیا..... مشیروں نے بڑے تعجب کا اظہار کیا کہ دنیا کے ایک نہایت ہی ترقی یافتہ اور زرخیز صوبے کی عملداری ایک جاہل اور گنوار کو سونپ دی گئی ہے ..... ہارون کہنے لگا' میں نے بچپن میں پڑھا تھا کہ مصر نافرمان لوگوں کی سرزمین ہے۔ یہاں پر لوگوں نے خدائی کے دعوے کئے۔ اس وقت سے میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جس دن خلیفہ بنا' سلطنت کے ذلیل ترین انسان کو ان کا حاکم بنا کر بھیجوں گا..... اس سال دریائے نیل میں طغیانی آئی دریا کی بے رحم موجوں نے ہر چیز تباہ کر دی کپاس کی فصل کو شدید نقصان پہنچا..... حسب دستور لوگ روتے پیٹتے حاکم کے پاس گئے اور مالیہ کی معافی کی درخواست کی..... استفسار پر انہوں نے بتایا کہ کپاس کی فصل بوئی تھی جو سیلاب کی وجہ سے تباہ ہو گئی ہے..... یہ سنتے ہی حبشی گورنر درندے کی طرح دھاڑا..... ''چلے جاؤ بدبختو یہی تمہارا علاج ہے تمہیں کپاس کی جگہ اون کاشت کرنی چاہئے تھی.....''

''کن سوچوں میں گم ہو گئے ہو.....؟'' مون نے مجھے جھنجھوڑا۔ ''وہ سامنے دیکھو قلوپطرہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہی ہے۔ یہ مصر کی وہ حسین ملکہ تھی جس نے جسموں پر حکومت کی اور دلوں پر راج کیا۔ اس قدر زیرک' اتنی معاملہ فہم' دور اندیشن اور دلیر' دنیا کی شاید ہی کوئی حکمران عورت ہو۔ پانچ ہزار سال کی تاریخ میں اس کا ثانی نہیں ملتا۔ حسن وجرات کا انوکھا امتزاج۔ عیار' خود پسند اور مطلبی' بادشاہ اس کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوتے گئے۔ تاریخ کے سینے پر اس نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔''

''عورت نے مرد کی کمزوریوں سے ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے'' میں نے چوٹ کی۔

''وہ جرنیل جنہوں نے تلواروں کے زور سے لاکھوں سروں کو جھکایا تھا خود جھک گئے ..... جولیس سیزر کی تلوار نیام میں چلی گئی اور سر اس کی گود میں ..... تم نے سکندر اعظم کے اتالیق ارسطو کا قصہ تو پڑھا ہوگا 'کس طرح رخسانہ نے اسے گھوڑے کی طرح نچایا تھا''۔

''شاید یہی وجہ ہے کہ عورت اب تک ناچ رہی ہے!.....''

ایک حیرت انگیز تاثر کے ساتھ ہم لگژری میں داخل ہوئے۔ وہ عمارت جو باہر سے اہرام نظر آئی تھی اندر سے حرم سرا نکلی جہاں ہزاروں دوشیزائیں' حسینائیں اور بن جل پریاں اپنی اداؤں سے لوگوں کو مسرور اور مخمور کر رہی تھیں مخروطی عمارت کے اندر دو ہزار سے زائد پر تعیش کمرے بنانا فن تعمیر کا کمال تھا ہر منزل ایک لائن میں نہیں تھی دوسری پہلی سے دس بارہ فٹ آگے بڑھی ہوئی تھی ہال میں جگہ جگہ پانی کے فوارے ابل رہے تھے کئی ٹن وزنی شینڈ یلیر خاص طور پر ڈیزائن کروائے گئے تھے۔ اس قدر وزنی نفیس اور قیمتی فانوس تو شاید کسی عرب بادشاہ کو بھی نصیب نہ ہوئے ہوں گے دیوار تا دیوار منقش قالینوں کا ڈیزائن ایران سے خصوصی طور پر بنوایا گیا تھا ٹیک اس قدر استعمال کی گئی تھی کہ عقل حیران ہوئی تھی..... سلاٹ مشین اس طرح نصب کی گئی تھیں جیسے ہزار سپاہ رنگین وردیاں پہنے پریڈ کیلئے کھڑے ہوں۔ کیسینو سٹاف نے نہایت صاف ستھری اور قیمتی یونیفارم پہن رکھی تھی ایگزیکٹو Pinstripe Suit اور Bow لگائے ہوئے' سپر وائزرز گرین بلیزر اور لیکر دار کالی پتلونوں میں ملبوس اور کارڈ ڈیلرز آدھا لباس پہنے ہوئے تھیں اسکرٹ گھٹنوں سے کافی اونچی' گریبان گلہ کرتا ہوا' قمیض بغیر بازوؤں کے..... ساقیان مے کا لباس آدھے سے بھی آدھا جس کو بیان نہیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے..... اگر منٹو مرحوم اس مقام سے ایک بار گزرتے تو ٹھنڈا گوشت کے بجائے ٹھنڈے گوشت لکھتے اور بقیہ عمر آرام سے قفس کے کسی گوشے میں گزارتے اور فیض اس رائے کے گناہ سے بچ جاتے جو انہوں نے لکھ کر دی تھی کہ ''اتنا فحش تو نہیں لیکن کوئی اتنا بڑا ادب پارہ بھی نہیں ہے''۔

جب ہم لنچ کیلئے ڈائننگ ہال پہنچے تو آگے لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں ایک قطار کے سامنے بورڈ لگا تھا ''ہوٹل گیسٹ! دوسرا کاؤنٹر عام گاہکوں کیلئے تھا۔ ہر چند کہ ہال میں چھ سو آدمیوں کیلئے ٹیبل لگائے گئے تھے لیکن کھانے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ سات ڈالر میں تیس کورسز کا لنچ..... حلوائی کی دکان تھی

لیکن اس کو خاص مصلحت کے تحت سجایا گیا تھا ہر کیسینو کسٹمرز کو لبھانے کیلئے عمدہ اور سستے کھانوں کا بندوبست کرتا ہے یہ لوگ انسانی نفسیات کے ماہر ہیں..... لذت کام و دہن کے بعد آدمی زیادہ چلنا پھرنا پسند کرتا ہے اور وقت گزارانے کے لئے اسی کیسینو میں قسمت آزمائی شروع کر دیتا ہے..... ہمیں کھڑے کھڑے پندرہ منٹ ہو گئے تو مون کہنے لگی "مجھے قطار میں کھانے کیلئے کھڑا ہونا عجیب سا لگتا ہے کیوں نہ ہم دوسرے ڈائننگ روم میں A.La.Carte لے لیں یا اٹالین پیزا کھالیں؟"

"دیکھو تو سہی قطار سکڑ گئی ہے پھر ایک دفعہ کا تجربہ کوئی بری بات نہیں....." میں نے اسے تسلی دی۔

کہنے لگی ..... "آدمی کی نفسیات بھی بڑی عجیب ہے لوگ ہزاروں ڈالر کا ٹکٹ خرید کر آتے ہیں دو چار ہزار ڈالر ہنسی خوشی جوئے میں ہار جاتے ہیں لیکن چند ڈالر بچانے کیلئے گھنٹہ بھر قطار میں لگے رہتے ہیں"

انسان واقعی عجیب جانور ہے۔ خان پور کا راجہ عزیز بری امام کے میلے میں ہزاروں روپے ناچنے اور گانے والیوں پر لٹا دیتا تھا۔ ویلیں دیتے ہوئے نئے نوٹ اس کی انگلیوں سے یوں کڑکڑ کر کے نکلتے تھے جس طرح مشین گن سے تڑتڑ گولیاں نکلتی ہیں..... لیکن صبح واپس پنڈی جانے کے لئے ٹانگے والے سے جھگڑتا تھا کہ ایک روپیہ کرایہ بہت زیادہ ہے۔

خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں ایک نہایت چلبلی ہوسٹس ہمارے پاس آئی ہیلو کے بعد بولی میں آپ کی ہوسٹس لوسی ہوں۔ آپ کا ٹیبل نمبر 18 ہے جو ہال کے غربی کونے میں ٹیرس نمبر 2 پر ہے آپ وہاں بیٹھیں میں کافی لاتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ عملاً کلانچیں بھرتی ہوئی دوسرے گاہک کے پاس چلی گئی۔

"ہم تو کھانا کھانے آئے ہیں، یہ کافی کا کہہ کر گئی ہے؟"

"ہم کافی کھانے سے پہلے پیتے ہیں امریکیوں نے ہر چیز میں جدت پیدا کر لی ہے۔ الفاظ کے مفاہیم بدل ڈالے ہیں انگیریزی زبان کیکس بل نکال دیئے ہیں تلفظ بدل ڈالا ہے ہجے تبدیل ہو گئے ہیں"۔

؟؟ مثلاً.....؟ میرا اشتیاق بڑھنے لگا۔

"یہاں بار بر کو ہیئر مینجر بھی کہتے ہیں..... مالی اب لان ڈاکٹر کہلوانا پسند کرتا ہے اور ٹائلٹ ریسٹ روم

بن گئے ہیں"۔

کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ ہر چیز نفاست سے رکھی گئی تھی۔ ہر قسم کا پھل دستیاب تھا پائن ایپل' سیب 'انگور' کیلے' پپیا' چیکو' انار' ایوا کیڈو' اورنج اور واٹر میلن ..... سیلاد کی بے شمار قسمیں چھ قسم کا سوپ ہاٹ اینڈ ساور' ملگاٹونی' تھائی' چکن کریم سوپ' چکن کریم ..... مچھلی کا پورا بازار' پرانز' لابسٹر' سول' پامفرے' ٹراؤٹ 'کیوی آر مرغ روسٹ' چکن جنجر' جلفریزی' چکن' آلا کیومٹن' بیف' اسٹیکس اور پورک ..... پنیر مکھن' جیم 'جیلی ..... کوئی پندرہ قسموں کی سویٹ ڈشیں ..... لوگ ماکولات پر یوں جھپٹ رہے تھے جیسے صحرائے گوبی عبور کر کے آئے ہوں' بھوکے' پیاسے ..... جیسے اپنی ہار کا بدلہ کیسینو کی بجائے اس کے کھانوں سے لے رہے ہوں میں نے پرانز اور لابسٹر لیا مون نے تھائی سوپ لے کر پلیٹ سلاد سے بھری۔

"کیا آج گھاس پھونس پر ہی گزارا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگی "میں لنچ نہیں کرتی صرف تمہیں کمپنی دینے کیلئے بیٹھ گئی ہوں' نہیں تو میرا لنچ ایک سیب اور ایک گلاس اورنج جوس ہوتا ہے"۔

"اور ایک پیگ بلڈی میری .....!" میں نے لقمہ دیا۔

"ایسا نہیں ہے' وہ تو جب میں بہت تھک جاتی ہوں یا پریشان ہوتی ہوں تو تھوڑی سی چکھ لیتی ہوں۔"

"تمہیں کیا پریشانی لاحق ہو سکتی ہے .....؟"

"کیا میں انسان نہیں ہوں .....؟ ایک بے نام سا خوف مجھے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے سب چراغ بجھ گئے ہوں اور شب کی سیاہی میرے وجود میں اتر رہی ہو۔"

؟۔ ایسا کیوں ہوتا ہے .....؟"

"ایسا کیوں ہوتا ہے .....؟" اس کا لہجہ سوگوار ہو گیا۔ "کوئی ماہر نفسیات یا ڈاکٹر اس کی تہہ تک نہیں پہنچ پایا۔ سائیکاٹرسٹ کہتے ہیں کہ غالباً یہ کیفیت مجھے اپنی ماں سے ملی ہے۔"

"حسن جہاں جرات آزما ہوتا ہے وہاں خائف بھی رہتا ہے" میں نے کہا۔ "تمہیں غالباً ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے!"

بولی ''کوئی سہارا مضبوط نہیں ہوتا' وقت آنے پر ریت کی دیوار ثابت ہوتا ہے۔''

کھانا کھا کر ہم باہر نکلے تو دن کے تین بج رہے تھے ہم سلاٹ مشینوں کی غلام گردشوں سے گزرتے ہوئے تہہ خانے میں آ گئے..... دریائے نیل' میں سفر کے لئے بجرا تیار تھا۔ مائیک پر اعلان ہو رہا تھا کہ جن لوگوں نے مصر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کے خال وخد دیکھنے ہوں وہ دس ڈالر کا ٹکٹ کٹوائیں اور جہاز میں بیٹھ جائیں..... ہم ٹکٹ لے کر جہاز میں بیٹھے ہی تھے کہ وسل بجی اور تاریخی سفر شروع ہو گیا۔..... جس طرح سویز کینال میں داخل ہونے کیلئے جہازوں کو Deck پر اتارا اور چڑھایا جاتا ہے اسی طرح لگژر کے نیل میں جہاز رانی کے لئے جہاز کو نیچے گہرے پانی میں اتارا جاتا ہے دریا کے دونوں کناروں پر سیمنٹ کے بڑے بڑے پلیٹ فارم بنے ہوئے تھے جہاں مختلف ادوار کو دکھایا گیا تھا جیسے جیسے جہاز چلتا ہے ساتھ مصر کی تاریخ بھی چلی ہے..... یہ کون شخص ہے جو غرق نیل ہو رہا ہے؟ کس طرح بچوں کی طرح بلبلا رہا ہے وہ موت وحیات پر قادر ہونے کا دعویدار تھا اور اس نے قادر مطلق کو اقتدار کے نشے میں للکارا تھا۔..... یہ ریمسز دوم ہے' فرعون مصر' بزعم خود خدائے عصر' جس کی کم علمی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے ہی گھر میں موت کو پالا' پوسا اور جوان کیا..... اور یہ بزرگ کون ہیں جن کی ریش سفید آنسوؤں سے تر ہو چکی ہے اور آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئی ہیں..... یہ کیسا حسن جہاں سوز ہے جس کی سرد آگ میں زلیخا کا سارا وجود پگھل رہا ہ اور اس کی بوڑھی رگوں میں خون اسپ تازی کی طرح سرپٹ دوڑ رہا ہے..... میدان کارزار میں اتری ہوئی یہ کونسی ملکہ ہے جو بیک وقت داد شجاعت اور فصاحت دے رہی ہے جس کی ہر نگاہ ترہے ابرو چشم شمشیر ہے آواز میں بادلوں کی سیگن گرج بھی ہے اور موسیقیت بھی..... جس کی خوشی اور خوشنودی کے لئے سپاہ خاک وخون میں نہا رہی ہے..... تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی، آدمی زمان ومکان کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے.....

چلتے چلتے جہاز کو جھٹکا لگا اور مون کا سر ڈھلک کر میرے شانوں پر آ لگا۔ اس کے خوبصورت ریشمی بال بکھر گئے۔

''اس قدر گھنے اور لمبے بال یورپین لڑکیاں تو نہیں رکھتیں!'' میں نے اسے چھیڑا۔

''شاید اس کے بال گھنے اور لمبے نہیں ہوتے!'' اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ کہنے لگی، ''شاہ یہ بڑا طلسمی ماحول ہے، تمہیں کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

''مجھے تو ایسے محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی انطونی قلوپطرہ کے حضور سر نیوڑائے کھڑا ہے اور بھرائی ہوئی زبان میں کہہ رہا ہے اے ملکہ حسن! ہاری ہوئی جنگ تو کبھی نہ کبھی جیتی جا سکتی ہے، تاراج بستیاں بھی دوبارہ آباد ہو سکتی ہیں لیکن جب اقلیم دل اجڑ جائے تو پھر یہ سلطنت کبھی نہیں بستی..... اس لئے میں نے فیصلہ کیا..... اس لئے میں نے آخری فیصلہ کیا..... کہ.....''

''کہ رولیٹ کھیلا جائے!'' مون میرے ادھورے فقرے کو مکمل کرتے ہوئے مسکرائی۔

''فیصلے عجلت میں نہیں کرنے چاہئیں''۔

''کیوں.....؟''

''کیونکہ اس سے فاصلے بڑھ جاتے ہیں''۔

ہم رولے ٹیبل پر پہنچے تو ہال میں خاصا رش ہو چکا تھا۔ اس ٹیبل کی کم سے کم شرط سو ڈالر تھی اور زیادہ سے زیادہ دس ہزار۔ یعنی ایک داؤ پر اس قدر رقم لگائی جا سکتی تھی..... مون کہنے لگی، ''کھیلنے سے پہلے میں تمہیں اس گیم کے بھی بنیادی اصول سمجھا دوں تو بہتر ہوگا''۔ ''اس کی ضرورت نہیں'' میں نے کہا۔ ''ایک تو میں نے کھیلنا نہیں کیونکہ یہ بہت مہنگا سودا ہے پھر بلیک جیک کی نسبت رولے بڑا آسان کھیل لگتا ہے۔ میز پر بنے ہوئے سینتیس (37) خانوں میں کسی پر رقم رکھ دیں، اگر وہیل میں پھرتی ہوئی سفید گولی اس خانے میں گر گئی تو وارے نیارے ہیں، نہیں تو بری قسمت تو انسان کے ساتھ ساتھ چلتی ہی ہے''۔

کہنے لگی، '' اب تو مجھے کچھ نہ کچھ ضرور بتانا پڑے گا۔ تم نے اس کی تعریف تو کر دی ہے لیکن تاریخ نہیں پڑھی۔ یہ اتنا آسان کھیل نہیں جتنا نظر آتا ہے''۔

''کیا اس کی بھی تاریخ ہے.....؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بالکل..... طویل اور دلچسپ..... ! رولے فرانسیسی زبان کے لفظ ROUE سے ماخذ ہے، جس کے معانی پہیہ کے ہیں۔ یہ بہت پرانا کھیل ہے۔ اہل یونان اپنی گول ڈھالوں کو تلوار کی نوک پر کھڑا کر کے

یہ کھیل کھیلا کرتے تھے..... شہنشاہ فرانس لوئی چہاردم کے کارڈنیل مزارین MAZARIN نے بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اگر اس کھیل کی ترقی اور ترویج کی جائے تو اس کا خزانہ سونے چاندی سے بھر جائے گا۔ بادشاہ کا خزانہ تو خیر بھرنا ہی تھا جب مزارین 1661ء میں مرا تو اس کی اپنی جائیداد کا بھی کوئی حساب کتاب نہ تھا۔ یہ کھیل تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف شکلیں اختیار کرتا گیا اور اس کے قواعد میں معمولی ردوبدل ہوتا رہا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس کو موجودہ شکل فرانس کے مشہور فلاسفر حساب دان پاسکل نے دی۔ کھیل اس قدر دلچسپ تھا کہ روس کی ملکہ کیتھرین دوم کے محلات میں اس کے کئی ٹیبل لگائے گئے۔ 1798ء میں جنگ اہرام میں کچھ فرانسیسی قید ہوئے۔ انہوں نے جب ترک کے سلطان سلیم سے اس کا ذکر کیا تو اس نے شاہی معماروں کو حکم دیا کہ ایسے گول چکر تیار کئے جائیں جن پر یہ کھیل کھیلا جا سکے..... ہندوستان میں بھی ایک سفیر ایڈورڈ کلائیو نے 1799ء میں اسے اہل ہند سے متعارف کرایا..... لیکن اس کو موجودہ شکل میں پہنچانے کا سہرہ فرانسیسی بلانک BLANC کے سر جاتا ہے، جس سے مانٹی کارلو میں کیسینو کھول کر اس کی ابتدا کی"۔

"اس نے بڑا نیک کام کیا۔ اب تک یقیناً اس کی روح کو مکتی مل چکی ہوگی.....!" میرے لہجے میں طنز تھا۔

وہ اس طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی، "یورپ میں گول چکر کے 37 خانے ہوتے ہیں۔ چکر کلاک وائز گھومتا ہے جبکہ اس میں ایک چھوٹی سی سفید گولی کو مخالف سمت میں گھمایا جاتا ہے۔ گولی جس خانے میں گرتی ہے وہی جیت کا خانہ ہوتا ہے۔ ایک خانہ صفر کا ہوتا ہے، اگر گولی اس میں گر جائے تو پھر لوگوں کی چھٹی ہو جاتی ہے اور ساری رقم کیسینو سمیٹ لیتا ہے..... ہم امریکی ذرا زیادہ تجارتی ذہن رکھتے ہیں" وہ مسکرائی۔

"اس لئے ہم نے صفر کے دو خانے رکھے ہوئے ہیں.....!"

"قسمت کی دیوی تم لوگوں پر پہلے ہی بہت مہربان ہے!" میں نے کہا۔

اس نے کریڈٹ کارڈ نکال کر پانچ ہزار ڈالر کے ٹوکن خریدے اور انہیں اپنے سامنے رکھتے ہوئے

کہنے لگی، ''اب کھیلوں یا مزید کچھ جاننا چاہو گے؟''

''بڑی دلچسپ تاریخ ہے لیکن تمہاری یادداشت اور طرز بیان نے مزید تجسس پیدا کر دیا ہے.....''

بولی، ''یہ غالباً دنیا کی سب سے زیادہ مقبول اور پر کشش گیم ہے۔ رولے ٹیبل کو بنیادی طور پر چھ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ PASSE-MANQUE PAIR-IMPAIR ROUGE-NOI جس کے معنی جفت، طاق، اونچا، نیچا، سرخ اور کالا ہیں۔ کھلاڑی حسب خواہش ان میں سے کسی ایک یا سب پر داؤ لگا سکتا ہے۔ کالے اور سرخ پر جتنی رقم لگائی جائے اتنی ہی ملتی ہے۔ کسی ایک نمبر پر ٹوکن رکھا جائے اور گولی اس خانے میں آ کر گرے تو پھر چھتیس گنا رقم ملتی ہے''

''قانون اوسط یہاں کام نہیں کرتا۔ اگر گولی پچیس مرتبہ مسلسل کالے خانے میں گرے تو چھبیسویں مرتبہ اس کے سرخ خانے میں گرنے کے امکانات پچاس فیصد ہی رہیں گے، اکاون نہیں ہو جاتے..... پھر ہر ٹیبل کی ایک LIMIT ہوتی ہے۔ جو لوگ اس قسم کے تجربات کرتے ہیں وہ اکثر ہوٹل کی بجائے ہسپتال پہنچ جاتے ہیں، یا پھر چاک گریبان صحرائے نیواڈا کی خاک چھانتے ہیں''۔

''ایک پتلی سی سلاخ پر اتنے بڑے چکر کا توازن کیسے قائم کیا جاتا ہے؟'' میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی.....

''یہ واقعی مشکل کام ہے۔ خاص ماہرین ہر روز اس میں توازن قائم کر کے سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں۔ اگر گول چکر ذرا سا بھی غیر متوازن ہو تو پھر گولی مخصوص خانوں میں جا گرتی ہے اور اس سے ہشیار لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں''

''کبھی ایسا ہوا ہے.....؟''

''ہاں..... پرانی بات ہے۔ ایک برطانوی انجینئر ولیم جیگر زمانٹی کارلو گیا وہ کئی دن رولے کے گول چکر کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اس نے نوٹ کیا کہ چکر غیر متوازن تھا اور گولی مخصوص خانوں میں زیادہ گرتی تھی۔ چنانچہ اس نے ان خانوں میں رقم رکھنی شروع کر دی اور چند دنوں میں پندرہ لاکھ فرانک جیت گیا۔ جلد ہی کیسینو کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہیل Wheel کو پوری طرح Balance کر دیا گیا''۔

''کیا کوئی لکی نمبر بھی ہوتے ہیں.....؟''

''نہیں۔ لیکن بعض لوگ ایسا سمجھتے ہیں۔ آئین فلیمنگ کی فلموں کے ہیروشین کونری نے سینٹ ونسٹ (اٹلی) کے ایک کیسینو میں 17 نمبر پر تین مرتبہ مسلسل شرط لگا کر تیس ہزار ڈالر جیتے۔ حالانکہ ایک خانے میں تین مرتبہ مسلسل گولی کا گرنا ایک کے مقابلے میں چھیاسی ہزار گنا مشکل کام ہے''۔

''کیا تمہارا بھی کوئی خاص لکی نمبر ہے.....؟''

'' ابھی تمہیں پتہ چل جائے گا.....'' یہ کہہ کر مون نے مختلف نمبروں پر ٹوکن رکھنا شروع کر دیئے.....ایسے پتہ چلتا تھا جیسے گولی وہ خود گھما رہی ہے یا اس کے پاس کوئی مقناطیس ہے۔ آدھے گھنٹے میں وہ پندرہ بیس ہزار ڈالر جیت گئی۔

''بس کرو.....!'' میں نے کہا'' کیا کیسینو بند کرانے کا ارادہ ہے؟''

''یہ تو اونٹ کے منہ میں زیرہ بھی نہیں.....!'' وہ ٹوکن سمیٹتے ہوئے بولی۔

''پھر میں نے کونسا رقم گھر لے جانی ہے، بالآخر انہیں کو لوٹا دینی ہے.....''

میں نے کہا،''شو بھی دیکھنا ہے.....دیر ہو جائے گی!''

''ابھی کافی وقت پڑا ہے!'' اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

''زیادہ دور نہیں ہے۔ دونوں کیسینو ایک ہی شخص کی ملکیت ہیں۔ دونوں کے درمیان مونو ریل چلتی ہے۔ جو لوگ پیدل نہ جانا چاہیں وہ اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لگزر کی طرح اس نے بھی اپنی انفرادیت قائم کر رکھی ہے۔ اگر لگزر باہر سے اہرام مصر دکھائی دیتا ہے تو یہ ایک ایسے قلعہ نما محل لگتا ہے جسے یورپ کے بادشاہوں نے مل کر بنایا ہو۔ اس قدر کلس، گنبد، جھروکے، مینار اور محرابیں ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے۔ ہر مینار کا الگ الگ رنگ اور اس کے اندر رنگا رنگ روشنیاں۔

یہ سولہویں صدی کا ایسا محل نظر آتا ہے جسے بیسویں صدی کے لوگوں کے لئے بنایا گیا ہو''۔

ہم کیسینو کے اندر جانے کی بجائے باہر کھڑے ہو گئے۔

''جب تک قوسیں اور دائرے نہ ہوں عمارت میں حسن پیدا نہیں ہو سکتا''۔ اس نے اپنی رائے دی۔

''ان کے بغیر تو کوئی چیز بھی حسین نہیں کہلا سکتی!'' میں نے اس کی طرف دیکھا بولی، ''ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے پھر تمہیں کوئی شرارت سوجھ رہی ہے!''

''شرارت تو نہیں البتہ ایک بات پہ حیرانی ضرور ہو رہی ہے!''

''کس بات پر.....؟''

''برطانوی انشاپرداز سر رچرڈ سٹیل Richard Steels نے کہا تھا کہ ہر وہ چیز جو روح کو مجروح کرتی ہے جسم کی شکست وریخت کا بھی موجب بنتی ہے اور سے چہرے کا حسن گہنا جاتا ہے اور ذہن کسی حد تک ماؤف ہونے لگتا ہے۔ جوا اور تاش کا کھیل سب برائیوں کی جڑ ہیں۔ خصوصاً وہ عورتیں جو ان خرافات میں ملوث ہو جاتی ہیں، ان کی صحت بری طرح متاثر ہوتی ہے..... بجھی بجھی سی آنکھیں، ڈوبتی ہوئی نظریں Laggard looks اور مرجھایا ہوا چہرہ۔ یہ سب اس مرض کی نشانیاں ہیں۔ مرد اگر ہارتا ہے تو وہ زمین بیچتا ہے، اور بالفرض عورت ہار جائے تو..... تو پھر وہ سب کچھ ہار جاتی ہے.....''

''تو اس میں حیرانی کی کونسی بات ہے.....؟''

''اگر تمہیں دیکھ لیتا تو شاید ان تعصبات کا اظہار نہ کرتا.....!''

''اچھا.....! وہ کیسے.....!''

''کیونکہ تمہارے چہرے کو دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کاروان بہار تازہ تازہ خیمہ زن ہوا ہو۔ چار سو پھول کھلے ہوں۔ چمپا اور گلاب گلے مل رہے ہوں۔ اس قدر جھیل سی نیلی روشن آنکھیں جنہیں بیان کرتے ہوئے لفظ لودینے لگیں..... آواز جیسے دور کہیں شہنائی بج رہی ہو یا کانچ کی بہت سی چوڑیاں ایک ساتھ کھنک رہی ہوں.....''

بولی، ''اگر مجھے دیکھنے کی بجائے تمہاری یہ باتیں سن لیتا تو بھی اپنا نظریہ بدل دیتا..... ویسے میں تمہیں بتا ہی چکی ہوں کہ حصول زر میرا مقصد نہیں ہے۔ نہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ میرے لئے یہ صرف گڈ پاسٹ ٹائم ہے''۔

''ہو سکتا ہے اس کا مشاہدہ محدود ہو؟''

''یقیناً.....! نہیں تو کئی مرد مصنفین نے اس نگر کی خاک چھانی ہے اور خاصے ذلیل اور رسوا بھی ہوئے ہیں''.....اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

لکھاریوں کا مقدر ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ ذکر گل و بلبل کا کرتے ہیں اور ہوتے خاک بسر ہیں۔ دماغ افلاک پر ہوتا ہے اور گرد آلود پاؤں زمین کے اندر دھنسے ہوتے ہیں.....''

کہنے لگی، ''شاہ! ایک حقیقت کو فلسفیانہ رنگ نہ دو۔ داستووسکی کچھ اتنا غریب نہ تھا البتہ گیمبلنگ نے اسے ضرور تباہ کیا''۔

''ہاں جس شخص کے نام کے ساتھ وسکی جڑا ہو وہ غریب نہیں ہوسکتا۔ ہمارے ہاں بھی کئی مولانا وسکی ہیں جو اتفاق سے ادیب بھی ہیں''۔

''داستووسکی کا قصہ دلچسپ بھی ہے اور کسی حد تک باعث عبرت بھی۔ 1962ء سے لے کر 1872ء تک اس پر گیمبلنگ کا بھوت سوار تھا۔ جب تک وہ آخری پنی ہار نہ جاتا رولیٹ کے ٹیبل کو نہ چھوڑتا۔ کوئی ایسا دوست نہ تھا، کوئی ایسا پبلشر اور کباڑیا نہ تھا جس سے اس نے قرض نہ لیا ہو۔ یہ لت بعض اوقات اسے اجنبیوں کے آگے دست سوال دراز کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس عادت بد کی وجہ سے اس کی ساری زندگی عسرت و تنگدستی میں گزری۔ اس کی دوسری بیوی اینا Anna سوچتی تھی کہ ایسی شہرت کس کام کی جو دو وقت کی روٹی کی محتاج ہو''۔

''بڑی حیران کن بات ہے۔ شاید بہت کم لوگ اس عظیم ادیب کی نجی زندگی کے اس پہلو سے واقف ہوں گے..... مجھے خود حیرت ہو رہی ہے!''

''واقعی حیران کن بات ہے۔ اگر تم اینا کی ذاتی ڈائری کے چند ورق پڑھ لو تو تمہیں حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہوگا!''

''کیا لکھا ہے اس نے.....؟''

ایک جگہ لکھتی ہے، ''ایک دن وہ سب کچھ ہار کر آیا اور بولا مجھ تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ پیار کرتا رہا اور پھر اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے کہنے لگا، اینا.....! تم میری زندگی

ہو۔ تمہیں علم نہیں، میں تم سے کس قدر پیار کرتا ہوں۔ میری ہر تخلیق کا محرم تمہارا حسن ہے۔ اگر تم نہ ہوتیں تو یقیناً میں کچھ نہ لکھ پاتا اور دنیا ان ادب پاروں سے محروم رہتی..... لیکن اس وقت..... اس سمے مجھے تمہارے پیار کی نہیں صرف پانچ لوئی (LOUIS) کی ضرورت ہے۔ اگر تم مجھے یہ رقم نہیں دوگی تو میں پاگل ہو جاؤں گا..... اس کے بعد وہ رونے لگتا اور کہتا تم فرشتہ صفت ہو اور میں ایک جواری' آوارہ' ناکارہ اور کمینہ انسان ہوں جس کی ان کمزوریوں نے اسے کہیں کا نہیں رکھا''.....

''یہ درست ہے!'' میں نے کہا۔'' ادیب اور شاعر کسی حد تک ایب نارمل ہوتے ہیں۔ ہمارے مشرقی شعرا بھی دوستووسکی کی طرح کئی کمزوریوں کا شکار رہے۔ مرزا غالب شراب کیلئے گھر کے برتن تک بیچ دیتے تھے..... میر بن پیئے ہی مخمور ہوگئے۔ غربت ان کے در پر دن رات دستک دیتی تھی۔ زلفوں کے اسیر کیا ہوئے' فقیر ہوگئے! خیام نے ایک 'جرعہ آب' پی کر پوری کتاب لکھ ڈالی.....''

''لیکن تم تو ایب نارمل نہیں ہو؟''

''اب ہو جاؤں گا.....!''

''یقین نہیں آتا''..... وہ کھل کر ہنسی۔'' جن لوگوں کو بنانے کا فن آتا ہو وہ دوسروں کو ایب نارمل کر دیتے ہیں.....''

''تو کیا میری باتوں میں تمہیں تصنع یا بناوٹ نظر آتی ہے؟''

''مبالغہ..... کم از کم میری حد تک.....'' اس نے شوخ نظروں سے میری طرف دیکھا۔'' تو آج شو میں ہالی وڈ کے ایکٹروں کے ساتھ تمہیں بھی سٹیج پر کھڑا کر دیتے ہیں اور فیصلہ ناظرین پر چھوڑ دیتے ہیں.....''

بولی،'' امریکن فن کے دیوانے ہیں، ہنر کی قدر کرتے ہیں، شکل وصورت پر اس قدر نہیں مرمٹتے.....''

''اس قدر سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''جس قدر.....!'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

جب ہم ایم جی ایم گرینڈ واپس پہنچے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ رش کم تھا۔ کیونکہ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب لوگ کمروں میں جا کر تازہ دم ہوتے ہیں اور شغل شب کی تیاریاں کرتے ہیں..... مون کہنے لگی، ''وقت کم رہ گیا ہے لہٰذا کمروں میں جا کر لباس تبدیل کر لیا جائے..... میں نے اسے کہا کہ وہ کمرے میں جا کر تیار ہو جائے۔ شاید شو میں اسے جان پہچان والے لوگ مل جائیں۔ مجھے وہاں کون جانتا ہے.....

کہنے لگی، ''ٹھیک ہے۔ تم فلائنگ منکی بار میں بلڈیس میری پیو، میں تھوڑی دیر بعد پہنچ جاؤں گی''۔

''فلائنگ منکی بار بڑا عجیب نام ہے! اڑتا ہوا بندر۔ بھاگتے ہوئے خرگوش۔ چلتا ہوا چیتا' بلز اینڈ بیئرز۔ کیا امریکیوں کو اچھے نام نہیں سوجھتے؟''

''مرد زیادہ پی کر بیل اور ریچھ ہی تو بن جاتا ہے۔ اس کے اندر کا سویا ہوا وحشی درندہ ڈکارتا ہوا بیدار ہو جاتا ہے''۔

''تم جلدی سے تیار ہو جاؤ میں اس درندے کو دو چار گلاب جوس پلاتا ہوں''..... وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی.....

فلائنگ منکی بار کیسینو کے اس حصے میں ہے جو باکسنگ سٹیڈیم کی طرف کھلتا ہے۔ میں جا کر سٹول پر بیٹھ گیا..... ''وائین یا بیئر.....؟'' بار میڈ میرے قریب آئی۔

''اورنج جوس.....!''.....

''ودسم تھنگ.....؟''

''بادام کی پلیٹ کے ساتھ''

''مزلم..... مسلمان ہو.....؟''.....

''Almost''.....

مجھے مرزا غالب یاد آ گئے۔ جن کا جواب سن کر کلکتہ کا انگریز جج بھی مسکرا دیا تھا اور وہ حاضر جوابی ان کی بریت کا عنوان بن گئی تھی۔

میں انہیں خیالات میں مگن تھا کہ نہایت قریب سے آواز آئی۔ ہیلو.....! اتنے قریب سے کہ سرگوشی کا

گمان ہوتا تھا..... پہلے تو میں سمجھا کہ مون آ گی ء ہے لیکن وہ مون نہیں کیرن تھی جس کی نون مجھے خاصی مشکوک نظر آئی۔

''کیا آپ نے مجھے کچھ کہا ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں۔ کیا تم مجھے ایک ڈرنک آفر کرنا پسند کرو گے؟''

''میرے خیال میں ہم ایک دوسرے کیلئے اجنبی ہیں!''

''ویگاس میں کوئی شخص اجنبی نہیں ہوتا۔ یہاں آتے ہی اجنبیت کی برف پگھلنا شروع ہو جاتی ہے''۔

''تم چاہتی کیا ہو.....؟''

''یہی تو میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔ کیا تمہیں کمپنی چاہئے۔ ایک گھنٹہ' دو گھنٹے' ہفتہ' دو ہفتے.....؟ اس کا اظہار تمہاری جیب اور ہمت پر ہے۔

''دونوں کمزور ہیں۔ تمہیں مایوسی ہوگی.....!''

''مایوسی گناہ ہے..... مسٹر.....!'' اس نے میرا نام جاننے کیلئے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

''اور یہ کونسا کارِ ثواب ہے.....؟''

اس نے غصے کے ساتھ کندھے اچکائے اور اٹھ کر دوسری میز پر چلی گئی۔

اتنے میں مون آ گئی..... ''کیا راز و نیاز ہو رہے تھے؟''

''شو کا ٹکٹ مانگتی تھی.....!''

''لیکن ٹکٹ تو تمہاری جیب میں ہے۔ اسے کیسے پتہ چل گیا؟''

''جیب میں ہی تو جھانک رہی تھی.....''

بولی، ''اس قسم کی بے شمار عورتیں سرِ شام آ جاتی ہیں اور گاہکوں کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں''۔

''لیکن فحاشی تو یہاں جرم ہے؟''

''اس کیلئے موثر شہادت چاہئے۔ یہاں کمروں میں چھاپے نہیں پڑتے''۔

مجھے وطن عزیز کی مستعد پولیس یاد آ گئی۔ جوڑے چاہے بند کمرے سے ہی کیوں نہ پکڑے جائیں،

ایف آئی آر کے مطابق بوس و کنار چاندنی چوک میں کر رہے ہوتے ہیں"۔

شو ٹھیک نو بجے شروع ہوا۔ ہاؤس فل تھا۔ تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ زرق برق لباس پہنے ہوئے۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے فیشن پریڈ ہو رہی ہو یا فرانس کی خوشبوؤں اور اٹلی کے ہیروں کا مقابلہ ہو رہا ہو..... ہلکی ہلکی موسیقی، مدھم روشنیاں، لیزر گائیڈڈ، جوڑوں کی سرگوشیاں، محبت بھری نظریں، بوس و کنار۔ ہر بوسہ دل کے دروازے پر دستک دیتا ہوا، ہر نظر ایک سندیسہ، ایک پیغام، ایک آرزو۔ یکا یک ساز کی لے تیز ہو گئی۔ سارا ہال روشنیوں میں نہا گیا۔ پردے رقص کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ تیس نوجوان لڑکیاں، نیم برہنہ لباس پہنے سٹیج پر نمودار ہوئیں اور رقص شروع ہو گیا۔

"کیا پاکستان میں اس قسم کے شو ہوتے ہیں؟" مون پوچھنے لگی۔

"پہلے بڑے شہروں میں ہوتے تھے لیکن اب برہنہ رقص کی ممانعت ہے۔"

بولی، "اِن کے لباس پر مت جاؤ۔ یہ بہترین رقاصائیں ہیں جنہوں نے برسوں ریاض کیا ہے۔ جب یہ رقص کناں ہوتی ہیں تو اِن کا انگ انگ نہ صرف تھرکتا ہے بلکہ بولتا ہوا دکھائی دیتا ہے..... کیا تم نے اس سے پہلے بھی ایسا رقص دیکھا ہے؟"

"ہاں۔ بنکاک کی پیٹ پانگ سٹریٹ میں....."

"بولی، "برہنگی اور آرٹ میں بڑا فرق ہوتا ہے..... وہاں کا شو انسان کے سفلی جذبات کو بھڑکاتا ہے اور یہاں اُس کی جمالیاتی حِسوں کی تسکین ہوتی ہے جس سے زن و مرد برابر محفوظ ہوتے ہیں"۔

"تم نے وہ شو دیکھا ہے؟".....

"نہیں تو۔ میں نے صرف سنا ہے تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تم نے درست کہا ہے۔ ایسا شو جسے الفاظ بیان کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔ انسانیت کی اِس قدر تذلیل شاید کہیں اور ممکن نہ ہو۔ حسرتِ گناہ، نفرتِ گناہ میں بدل جاتی ہے۔"

رقص و سُرود کا پروگرام ختم ہوا تو باب ہوپ سٹیج پر آیا۔ اگر موصوف ہندوستان کی فلم انڈسٹری میں قدم رنجہ فرماتے تو باب گوپ کہلاتے۔ کامیاب مزاحیہ اداکار وہ ہوتا ہے جو بن بولے ہی لوگوں کو ہنسا

دے۔ اپنی چال ڈھال، اپنی حرکات وسکنات، اپنے چہرے مہرے سے..... یہ کمالش فن باب ہوپ کو حاصل ہے۔ امریکہ کا شاید ہی کوئی کامیڈین اِسکے ہم پلہ ہو۔ اس کا نام دنیائے مزاح کا سکہ رائج الوقت ہے..... مزاح کو انسانی زندگی میں ہمیشہ بڑی اہمیت رہی ہے۔ کاروبار دنیا اور زندگی کی چیرہ دستیوں سے گھبرائے ہوئے لوگ تفریح کے طالب ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو آدمی کی رگیں چٹخ جائیں اور وہ چاک گریباں جنگلوں میں نکل جائے..... قرونِ اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں بادشاہوں نے اِس کام کے لئے پیشہ ور مزاح گو رکھے ہوتے تھے۔ ہندوستان میں انہیں بھانڈ کہا جاتا تھا اور یورپ میں کورٹ جیسٹر۔ یہ لوگ بات سے بات پیدا کرنے کے ماہر ہوتے تھے اور سخت طیش کے عالم میں عالم پناہ کو ہنسا دیتے تھے۔ بعض اوقات معتوب بھی ہو جاتے کیونکہ مزاح میں توازن رکھنا مشکل کام ہے..... جب بادشاہت دَم توڑنے لگی اور جاگیریں ختم ہوئیں تو یہ لوگ تھیٹروں اور فلموں میں چلے گئے۔ ٹیکنالوجینے ترقی کی تو وہ مزاح جس سے چند لوگ خط اُٹھاتے تھے، سب میں بٹنے لگا۔ پھر ایسا وقت آیا کہ کامیاب سیاستدان اور حکمران کے لئے بھی حس مزاح ضروری ہوگئی۔ چرچل کے متعلق اتنے قصے مشہور ہیں کہ اگر سب کو رقم کیا جائے تو شاید لطائف کی ایک کتاب مرتب ہو جائے..... لیڈی ایسٹر Aster جو کہ پارلیمنٹ کی رکن تھی اور چرچل کی سخت دشمن..... وہ ایوان میں ہر زہ سرائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی..... ایک مرتبہ نہایت غصے کے عالم میں چرچل کو مخاطب کرتے ہوئے دھاڑی.....

''اگر میں تمہاری بیوی ہوتی تو تمہارے کافی کے کپ میں زہر ملا دیتی، کیونکہ تم جیسے انسان کا اس دنیا سے چلے جانا ہی بہتر ہے.....''

''اور میں اُسے فوراً پی جاتا'' چرچل نے دھیرج سے جواب دیا۔

جارج برنارڈ شا نے اپنے ڈرامے کی مہورت پر چرچل کو دو ٹکٹ بھیجے اور ساتھ ایک طنزیہ تحریر لکھی

Come to see my play with a frient, if you have a friend....

چرچل نے فوراً جواب دیا

I am bysy for the opening, but I will come the second night if there is a second nigh

جب وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد الیکشن ہار گیا تو خاصا اُداس تھا۔ اُس کی بیوی اُسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی۔

Don't loose heart! Winston! This may well be a blessing in disguise...

"Yes, At the moment it is quite effectivaly disguised."

باب ہوپ نے چند لطیفے سنائے، کچھ لطیفہ نما باتیں کیں۔ سامعین ہنسی سے لوٹ پوٹ گئے۔ ایک آدھ لطیفہ ایسا بھی تھا جو فحاشی کی سرحدوں کو چھو رہا تھا۔ خواتین بلش کر گئیں..... یہ حقیقت ہے کہ جب تک لطیفے میں تھوڑا بہت لچر پن نہ ہو اُسے عامۃ الناس پسند نہیں کرتے۔ لطیفہ بہت حقیقت پسندانہ بھی نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اُس صورت میں اسے خواص بھی پسند نہیں کرتے..... انشاء اللہ خان کی جو دُرگت نواب سعادت علی خان کے ہاتھوں بنی تھی وہ تاریخ عبرت کا ایک سوگوار قصہ ہے۔

باب ہوپ کے جاتے ہی اعلان ہوا..... خواتین وحضرات! اب جگر تھامئے مائیکل جیکسن آ رہا ہے۔ یہ سنتے ہی ایسے محسوس ہوا جیسے سارے ہال میں بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا ہے۔ تالیاں شور، ہاؤ ہو، جیسے کرسیوں پر سپرنگ لگ گئے ہوں۔ ہزاروں بوسے، چھو چھو کرتے سٹیج پر پھینکے گئے.....

ایک عجیب سا لنگور نما انسان سٹیج پر آیا۔ ایک لمحے کے لئے چار سُو خاموشی چھا گئی۔ اور پھر جیسے ہی اُس نے ہائے کہا ہر طرف سے ہائے، ہائے ہونے لگی۔ اُس نے گانے سے پہلے اپنا کوٹ اتارا۔ ایک نظر حاضرین کو دیکھا اور پھر اُسے سٹیج سے نیچے پھینک دیا۔ نوجوان لڑکیاں اُس پر اس طرح جھپٹیں جیسے کوٹ نہ ہو، پرساد بٹ رہا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے کوٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور وہ ٹکڑے لڑکیوں نے سینوں سے لگا لئے۔

''اس کی شکل کو کیا ہو گیا ہے.....؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے پلاسٹک سرجری کروائی ہے۔ اس کی شکل نہ دیکھو۔ آواز سنو۔ کیا جادو جگا رہا ہے۔ اتنی میٹھی، مدھر اور سریلی آواز امریکہ میں کہیں اور نہیں ہے۔''

میں اُسے کیا جواب دیتا۔ ہمارے لئے ان گانوں کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی وقت اہل مغرب لتا منگیشکر یا نور جہاں کے گانوں کو دیتے ہیں۔ جب بلبل نیل، اُم کلثوم قاہرہ ریڈیو سٹیشن سے گاتی تھی ''جمال اور نیل نے اسوان ڈیم بنایا ہے'' تو اُس کی سریلی آواز عرب دنیا کے ہر کونے میں سنی جاتی تھی۔ قہوہ خانوں میں، کلبوں میں، شرفا کی محفلوں میں ہر طرف وجد طاری ہو جاتا تھا..... یا حبیبی..... یا قلبی..... کہتے ہوئے عرب زمین پر تڑپتے تھے لیکن اہل مغرب اُس آواز کو ایک ایسی محبت زدہ بلی کی غراہٹ سمجھتے تھے جو سردیوں کی ادھی رات کو مخصوص آوازیں نکالتی ہے.....

ایلوس پریسلے، فرینک سناٹرا، میڈونا، مائیکل جیکسن..... اتنی دولت، شہرت اور مقبولیت تو کسی امریکی صدر کو نصیب نہیں ہوئی۔

شورات کے دو بجے ختم ہوا۔ اُس وقت تک ہال میں ایک پتا بھی نہ ہلا۔ سوائے چند وقفوں کے محفل نغمہ و چنگ جاری رہی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وقت نہیں گزار رہے لمحوں کو سمیٹ رہے ہیں۔ اُن کا حساب کر رہے ہیں، اُنہیں چسکیاں لے کر پی رہے ہیں۔ ہال سے باہر نکل کر میں نے مون کو خدا حافظ کہا اور کمرے میں چلا آیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے شدید تنہائی کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ کوئی واضح جواب نہ پا کر میں نے ٹائی کی گرہیں کھول دیں اور سگار سلگا کر کرسی پر بیٹھ گیا..... یکے بعد دیگرے کئی کش لگائے لیکن اضطراب بڑھتا گیا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے ایک بہت بڑا خلا ہے جس میں میں بے مقصد چل رہا ہوں..... ہر طرف پھیلی ہوئی اداسی، چار سُو اندھیرا، اِس قدر روشن دن کی رات اتنی تاریک ہو سکتی ہے..... انہیں خیالات میں غرق نہ جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی..... لیکن زیادہ دیر سو نہ سکا اور جلد ہی آنکھ کھل گئی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ سگار کا کسیلا دھواں بھی حلق میں اٹکا ہوا محسوس ہوا۔ میں کافی دیر اسی حالت میں لیٹا رہا۔

O

صبح جب میں تیار ہو کر ناشتہ کے لئے ریسٹورنٹ میں گیا تو خیال آیا کہ فون کر کے مون کو بھی بلا لیا جائے پھر یہ سوچ کر اِرادہ بدل دیا کہ وہ دن بھر کی خاشی تھکی ہوئی ہو گی، اُسے جگانا نامناسب ہو گا..... چونکہ مجھے ناشتے کی اتنی اشتہا نہ تھی اس لئے میں نے سوچا کہ لائٹ بریک فاسٹ کیا جائے..... ویٹر کسی دوسرے کسٹمر سے آرڈر لینے میں مصروف تھا، اس لئے میں نے ریسٹورنٹ کا سرسری جائزہ لینا شروع کر دیا..... تقریباً چار سو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی لیکن اِکا دُکا لوگ نظر آئے۔ ایک تو شب بیدار لوگ علی الصبح ناشتہ نہیں کرتے۔ آرام سے اُٹھتے ہیں اور سکون کے ساتھ ناشتہ کرتے ہیں۔ پھر بوفے بریک فاسٹ کو چھوڑ کر یہاں ناشتہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے آدمی شہد کو چھوڑ کر شربت پی لے..... مینو دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ چھ ڈالر کا صرف آملیٹ تھا۔ اتنی ہی رقم جوس، چائے اور ڈبل روٹی کی تھی۔ May I help you۔ ویٹر نے میری طرف دیکھا۔

''بریک فاسٹ۔ آملیٹ، توس، مکھن، پنیر.....! لیکن انڈوں میں پیاز ڈالنا نہ بھولنا.....!''

''تمہیں سپیشل آملیٹ چاہئے.....!'' وہ مسکرایا اور کچن میں چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی دو لڑکیاں منکر نکیر کی طرح نمودار ہوئیں۔ اور میرے دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں۔ ایک نے پتلون پہن رکھی تھی اور دوسری نے بھی شاید کچھ پہن رکھا ہو گا کیونکہ وہ جو کچھ بھی تھا گھٹنوں سے اوپر اُٹھتی ہوئی منی سکرٹ کے نیچے اور غالباً بہت پیچھے چھپا ہوا تھا۔ پتلون والی ویٹرس پیالی میں چائے اُنڈیلتی ہوئی بولی ''لائٹ یا سٹرانگ چائے پینا پسند کرو گے۔''

میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''پہلے ناشتہ تو کر لینے دو۔'' کہنے لگی ''یہاں چائے ناشتے سے پہلے پیتے ہیں۔ تم چاہو تو ناشتے کے بعد بھی پی لینا۔''

''اور تم کیا پلانے آئی ہو؟'' میں نے دوسری کی طرف دیکھا۔

بولی ''میں پلانے نہیں کھلانی آئی ہوں، کیا تم کھیلنا پسند کرو گے؟''

''کیا ناشتہ اور گیمبلنگ ایک ساتھ ہو سکتے ہیں؟''

''وائے ناٹ!''.....اس سے ناشتہ کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ وہ سامنے الیکٹرانک بورڈ ہے اُس پر جو نمبر اُبھریں گے اگر وہ تمہارے کوپن والے نمبروں سے مماثلت کر گئے تو بس وارے نیارے ہیں۔ پھر تم چاہو تو چکن رینچ میں کئی ہفتے گزار سکتے ہو! اُس نے بے حیائی سے دائیں آنکھ میچی۔

''وہاں کیا ہوتا ہے؟''

''وہاں کیا نہیں ہوتا..... ہر خواہش کی تکمیل، ہر جذبے کی تسکین۔ رنگ اور خوشبو کا اس قدر حسین امتزاج اور کہیں نظر نہیں آتا۔''

''صرف پندرہ ڈالر۔''

''اور اگر نمبر نہ نکلے تو؟''

''تو سمجھ لینا تم نے ڈبل ناشتہ کیا ہے'' وہ مسکرائی۔

جب ویٹر بل لے کر آیا تو میرے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ بل پندرہ کی بجائے اکیس ڈالر تھا۔ میں نے کہا مینو کارڈ میں آملیٹ کی قیمت چھ ڈالر لکھی تھی تم بارہ ڈالر کا بل لے آئی ہو؟..... بولی تم نے سپیشل آملیٹ مانگا تھا اور اُس کی قیمت دوگنی ہے۔''

''کیا پیاز ڈالنے سے یہ سپیشل ہو جاتا ہے؟''

''بالکل! تم چاہے اس میں چکن ڈلوالو، بیف یا ہیم یا اونین، ان میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ایکسائز ڈیوٹی الگ ہے۔''

''خوش کیتا ای!'' مجھے اپنے دوست ملک صاحب یاد آ گئے جو اس قسم کے موقع پر گلے کی سرنگ سے یہی سرم اُچھالتے تھے۔

جب میں ریسٹورنٹ سے باہر نکلا تو سلاٹ مشینوں کے قریب مون کھڑی تھی۔ اُس نے ''ہاتھ میں درمیانی سائز کا سفری بیگ پکڑا ہوا تھا۔''

بولی، ''ناشتہ کر لیا ہے؟''

''اتنا مہنگا ناشتہ!'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''یہ ایم جی ایم گرینڈ ہے۔ یہاں ہر چیز بہت مہنگی ہے۔ بوفے بریک فاسٹ نسبتاً سستا ہے لیکن اکثر لوگ ٹیبل سروس پسند کرتے ہیں۔''

میں نے کہا ''تم اتنی جلدی کیسے تیار ہو گئیں؟''

''میں نے تمہیں عمداً نہیں جگایا کہ کل بہت مصروف دن گزارا ہے۔''

بولی، ''اس لئے کہ آج ہمیں بہت دور جانا ہے'' تم کمرے میں جا کر جلدی سے اپنا سفری بیگ لے آؤ۔ شاید آج رات ہمیں ویگاس سے باہر گزارنی پڑے۔''

''کیا چاند پر جانے کا ارادہ ہے؟''

''وہ دن بھی دور نہیں؟ انسان چاند پر اس طرح جائے گا جس طرح ایل اے سے لاس ویگاس آتے ہیں۔''

''بڑا عجیب منظر ہوگا، جب ایک چاند دوسرے چاند پر اُترے گا؟''

بولی، ''فی الحال تو ہم ہوور ڈیم اور گرینڈ کینین GRAND CANYON دیکھنے جا رہے ہیں۔ وہاں سے کالوراڈو کے شہر ڈینور جائیں گے۔''

''گرینڈ کینن؟ کیا اُس گڑھے کو دیکھنا ضروری ہے۔ تم امریکیوں کی یہی خوبی ہے کہ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہو اور رائی کا پہاڑ.....!''

''تم نے غالباً تصویر دیکھی ہوگی۔ دُنیا کی کوئی تصویر بھی اُس کا حسن اور ہیبت بیان نہیں کر سکتی۔''

''کیا حسن اور ہیبت بھی کبھی یکجا ہوئے ہیں؟''

''غالباً یہ واحد جگہ ہے جہاں ہو گئے ہیں!''

ہیلی پیڈ، ایم جی ایم گرینڈ سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ہلٹن فلیمنگو کا زیبرا کراسنگ عبور کرتے ہی سڑک کے دوسری جانب۔ ہیلی پیڈ تو بکنگ آفس کے پیچھے ہے لیکن جہاز میکارن ایئرپورٹ

سے چلتے ہیں، البتہ ٹکٹ اُس آفس سے مل جاتے ہیں۔ ہر گھنٹے کے بعد ہیلی کاپٹر سروس ہے۔ ہر دو گھنٹے کے بعد جہاز چلتا ہے۔ جب ہم پہنچے تو ہیلی کاپٹر تیار تھا۔ ڈیڑھ سو ڈالر کا ریٹرن ٹکٹ ہے.....

ہیلی کاپٹر اُڑا تو میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ آٹھ سیٹوں والا ہیلی کاپٹر فل تھا۔ ہمیں پائلٹ کے بالکل پیچھے پہلی سیٹ ملی۔ ہمارے بائیں طرف ایک امریکن جوڑا بیٹھا تھا۔ میاں بیوی ستر کے پیٹے میں ہوں گے۔ بیوی نے بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے بوڑھے خاوند کی بانہیں تھام رکھی تھیں۔

''کیا اسے ڈر ہے کہ مرد کہیں اُڑتے ہوئے کاپٹر سے چھلانگ نہ لگا دے؟''

کہنے لگی، ''یہاں عمر کے ساتھ ساتھ محبت بڑھتی ہے۔ یہ اظہارِ محبت ہے اور محبت وقت کی غلام نہیں ہوتی''..... اُن کے پیچھے ایک نوجوان جوڑا بیٹھا تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر پرندوں کی طرح چونچیں لڑاتا ہوا، اپنے آپ میں گم۔ لڑکا وقفے وقفے سے لڑکی کے کان میں سرگوشی کرتا جس سے اُس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو جاتیں "NEWLY WEDS" مون نے بتلایا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

BODY LANGUAGE؟ زبان کے علاوہ اعضاء بھی بولتے ہیں اور اُن کی زبان زیادہ واضح ہوتی ہے۔''

''اسی لیے تو میں تمہیں شاعرہ سمجھتا ہوں۔

''وہ کیسے؟

جب تم چلتی ہو تو اعضاء شاعری کرتے ہیں''

ہمارے پیچھے دو نوجوان لڑکے بیٹھے تھے۔ ان کی حرکات و سکنات بھی شادی شدہ جوڑے جیسی تھیں۔

انہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

بولی 'GAYS'..... یہ سوسائٹی نظر آتا ہے۔

فکر نہ کرو۔ اگر ایسا ہوتا تو آج آدھے امریکی جہاز کریش کر گئے ہوتے۔ اس نے مجھے تسلی دی۔ ہیلی کاپٹر کو اڑتے قریباً دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ کیپٹن کی مائیک پر آواز گونجی 'ہائے فوکس! ہم ہوور ڈیم کے

اوپر سے گزرنے والے ہیں۔ ہمارے لئے یہاں اترنا ممکن نہیں ہوگا۔ البتہ نہایت نیچی پرواز کر کے دو چکر لگائیں گے تاکہ آپ اس ڈیم کا نظارہ کر سکیں جو ویگاس کی لائف لائین ہے اور جس کی بدولت یہاں رونقیں ہیں۔

تم امریکیوں نے انگریز کی زبان اور اپنی کیٹس کا ستیاناس کر دیا ہے۔ پائلٹ نے لیڈیز اینڈ جنٹلمین کیوں نہیں کہا! ہائے فوکس بڑا کروڈ لگتا ہے۔

کہنے لگی' تکلفات کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ رکھ رکھاؤ صرف رواج کے لئے ہے۔ امریکن طرز تکلم میں تصنع اور بناوٹ کم ہے۔ خیالات اور نظریات کی طرح زبان میں بھی وقت کے ساتھ تبدیلیاں آنی چاہئیں۔ میں اس موضوع پر پہلے بھی تو کہہ بول چکی ہوں۔

ڈیم کے قریب پہنچ کر پائلٹ ہیلی کاپٹر کافی نیچے لے آیا..... دیکھنے میں سبھی ڈیم خوبصورت لگے ہیں لیکن صحیح مزہ اپریل ویوکا ہے۔ کولوریڈو دریا کو پچکار کے' رام کر کے یہ ڈیم بنایا گیا ہے جس کے ایک طرف ایریزونا ہے اور دوسری طرف نیواڈا۔ پانی کے علاوہ اس سے بجلی بھی پیدا کی جاتی ہے۔ جو ویگاس کی راتوں کو جوان رکھتی ہے اور دلوں کو توانائی اور رعنائی بخشتی ہے..... دریاؤں نے ایک طویل عرصے تک انسان کو زچ کیا ہے۔ ان کی طغیانیوں نے بستیوں کو غرقاب کیا ہے اور مکینوں کو بے گھر' ڈیم بنا کر انسان نے منہ زور دریاؤں کو کیل ڈال دی ہے۔ نہ پانی کناروں سے باہر چھلکتا ہے اور نہ جل دے کر سمندروں میں جا گرتا ہے۔ اس کی طاقت کو HARNESS کیا گیا ہے۔ سستی اور ویگاس کو شہرت دوام بخش گیا ہے۔ چونکہ پہاڑ خاصے اور چنے اور تنگ ہیں اس لئے ڈیم پر نسبتاً کم لاگت آئی ہے۔

کیا تمہارے ہاں بھی اس قسم کے ڈیم ہیں؟ اس نے استفسار کیا۔ ہیں تو سہی لیکن کچھ زیادہ نہیں۔

وہ کیوں؟ ہمارے ہاں تو بیسیوں ڈیم ہیں۔

میں اسے کیا بتاتا کہ ہمارا اصل مسئلہ ڈیم فول ہیں۔ پچاس سالوں میں ہم تین ڈیم بنائے ہیں۔ اس عرصے میں ہندوستان چھبیس ڈیم بنا چکا ہے۔ چین نے چون' لوگ بوند بوند پانی کو ترس رہے ہیں۔ زمینوں کا بانجھ پن دیکھا نہیں جاتا۔ اہل چولستان وتھر کی پتھرائی ہوئی آنکھیں آسمان پر لگی رہتی ہیں۔ تشنہ لب سے

دست دعا تک نہیں اٹھتے۔ خوشیاں بارش کے ساتھ بانٹتے ہیں۔ ہر طرف العطش العطش! چوکڑیاں بھرنا بھول گئے ہیں۔ ڈھور ڈنگر ریت چاٹتے نظر آتے ہیں سیاست' تعصب' صوبائیت' شکوک وشبہات'

یا مظہر العجائب! کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔

تقسیم کے وقت پنجاب کے تیس میں انیس اضلاع ہمارے حصے میں آئے۔ گیارہ ہندوستان کو ملے۔ آج وہ گیارہ انیس پر بھاری ہیں۔ مشرقی پنجاب آج Grainery of India کہلاتا ہے۔ صحرائے بیکانیر اور جیسلمیر کی زمیں سونا اگل رہی ہیں۔ انہوں نے دھرتی کو گلزار بنا ڈالا۔ دختر دہقان آج بھی بارڈر کے دونوں اطراف گیت گاتی ہیں لیکن گیت اور بین میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہاں طرب ونشاط اور یہاں حزن و ملال!

پہاڑی سلسلہ طویل نہیں طویل نہیں تھا۔ اس کے بعد نیواڈا کا صحرا شروع ہوگیا۔ نیچے ریت اور جھاڑیوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ چند جگہوں کے علاوہ کہیں آبادی نظر نہ آئی۔ ہم صحرا پر ایک گھنٹہ تک پرواز کرتے رہے۔ جونہی نیواڈا کی ریاست سے نکلے تو ساتھ ہی صحرا بھی ختم ہوگیا۔ ریت کی جگہ ہریالی نے لے لی۔ خوبصورت بستیاں' پائین اور یوکلپٹس کے جھنڈ۔

ہم گیارہ بجے فلیگ اسٹاف کے قصبے میں اترے پائلٹ نے اعلان کیا کہ ہیلی کاپٹر پندرہ منٹ رکے گا۔ اگر سواریاں کافی یا بیئر پینا چاہیں تو قریبی ریسٹورنٹ میں دونوں مشروب دستیاب ہیں اور ساتھ سروس رومز بھی' کیوں نہ بیئر پینے کے بعد آدمی سیدھا وہیں جائے۔ فلیگ اسٹاف بڑا خوبصورت قصبہ ہے۔ سارا شہر پائین کے درختوں میں گھرا ہوا ہے اور سطح سمندر سے خاصا بلند ہے۔ اس کے مشرق میں بلند پہاڑی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ وہاں سے گرینڈ کینین اسی میل کے فاصلے پر ہے۔ جو لوگ گاڑی پر جانا چاہتے ہیں وہ چالیس منٹ ویسٹ دائیں ہاتھ مڑ کر 180 پر ہولیں۔ یہ سڑک سیدھی گرینڈ کینین تک جاتی ہے۔ سڑک کے ساتھ ہوٹلز اور بے شمار ریستوران ہیں۔ جہاں عمدہ کھانے مناسب نرخ پر دستیاب ہیں۔ ہر چند کہ سڑک سنگل ہے۔ لیکن خاصی کشادہ ہے۔ یہ COCONINO نیشنل فارسٹ سے گزرتی ہوئی کیباب نیشنل فارسٹ سے جاملتی ہے۔ جو بیس مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس جنگل میں پائین کے علاوہ

یوکلپٹس سے ملتے جلتے درخت بھی ہیں۔

ہیلی کاپٹر فلیگ اسٹاف سے اڑا تو دیکھتے ہی دیکھتے بیڈراک سٹی اتر گیا۔ سٹی میں گرینڈ کینین ایئر لائن کا دفتر ہے۔ اس کے علاوہ یہاں بھی ہیلی کاپٹر سروس ملتی ہے۔ مضافات میں ریڈ انڈینز کے خیمے ہیں۔ جو الگ ہوائی جائزہ لینا چاہیں یا جن کے پاس وقت کم ہو وہ جہاز یا کاپٹر سے جا سکتے ہیں۔

ہم کاپٹر سے اترے تو ایئر لائن کی طرف سے ہمیں ہوائی جہاز یا بائی روڈ سفر کرنے کی چوائس دی گئی۔ سب مسافروں نے زمینی سفر کی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ ہمیں کوچ میں بٹھا دیا گیا۔ بیڈراک سٹی سے کینین تک نصف گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ سڑک اتنی کشادہ تو نہیں لیکن خاصی ہموار ہے۔ دائیں طرف قدرے ہٹ کر پہاڑی سلسلہ ہے جو آدھے سفر کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دور دور یہ جنگل ہے۔

جب ہم کینین کے مرکزی گیٹ پر پہنچے تو ڈرائیور نے اعلان کیا کہ اپنے پرس نکال لیں کیونکہ اندر جانے کے لئے ٹکٹ خریدنا پڑے گا۔ چار ڈالر فی کس یا دس ڈالر فی خاندان۔

یہاں کوئی چیز مفت بھی ہے؟ میں نے پوچھا' لگتا ہے کسی دن ہوا بھی خریدنا پڑے گی۔ یہیں ہماری ترقی کا راز ہے۔ دولت کی گردش' ارتکاز سے ترقی رک جاتی ہے۔ تو کیا فورڈ اور راک فیلر صبح کی کمائی شام کو ہوا میں اڑا دیتے ہیں؟ میں نے طنز کیا۔ تیس کروڑ کی آبادی میں کتنے بزنس میگنیٹس ہوں گے۔ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ہماری نوک جھونک جاری تھی کہ گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ کوچ کیپٹن بول رہا تھا۔

خواتین و حضرات اتریئے اور خدا کی شان دیکھیئے۔ سب سواریاں کوچ سے باہر آ گئیں۔ جب ہم کینین Cayon کے جنوبی کنارے پر پہنچے تو مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایسے پتہ چلتا تھا کہ ہزاروں لاکھوں جہاز سینکڑوں سال سے بمباری کرتے رہے ہیں اور اربوں ٹن مٹی بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو گئی ہے۔ یا پھر اتنا بڑا بھونچال آیا ہے جس کے لئے ریکٹر پر کوئی سکیل ہی نہیں۔ شکست و ریخت کا اس وسیع پیمانے پر عمل! کئی میل کے قطر میں ایک ایسا دائرہ جس کی لمبائی' گولائی اور گہرائی برابر ہو۔ جب ہم کریٹر کے قریب پہنچے تو نہایت تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ چیختی چنگاڑتی' پہاڑوں سے ٹکرا کر سیٹیاں بجاتی

ہوئی۔ جگہ جگہ بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر متنبہ کیا گیا تھا کہ مائیں بچوں کی صرف انگلی نہ پکڑیں بلکہ انہیں سینے سے چمٹائے رکھیں کیونکہ اس تیز ہوا میں اڑ کر کریٹر گرنے کا خدشہ تھا۔ بچے چھوڑ بڑوں کے گرنے کا بھی احتمال تھا۔ لڑکیاں اپنے بوائے فرینڈز کی بانہوں سکڑی میں ہوئی تھیں اور ساتھ ساتھ خوشی اور خوف سے چلا بھی رہی تھیں۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم تھے۔ انہوں نے کنارے پر لگی ہوئی ریلنگ کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ چلتے چلتے مون کا پاؤں پھسلا تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ کہنے لگی۔ شاہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں یہ طوفانی ہوائیں مجھے اڑا کر ہی نہ لے جائیں۔

ہاں دھان پان سی تو ہو! میں نے اس کی بات کی تائید کی لیکن فکر نہ کرو ساری امریکن ایئر فورس حرکت میں آ جائے گی۔

وہ کیوں؟ اس نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔

امریکہ نہیں چاہے گا کہ اس کی اتنی قیمتی چیزیوں فضا میں تحلیل ہو جائے۔

بولی فی الحال تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے امریکہ سے زیادہ تمہیں فکر ہو!

ہونی بھی چاہیے! اتنا اچھا گائیڈ مقدر سے ملتا ہے۔

ہم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ زمین کے اندر پہاڑ تھے۔ پہاڑوں کے اندر پہاڑ تھے۔ ان کے اندر پانی کے چشمے' دریائے کولوریڈو بہتا ہوا۔ کینین کی گہرائی اس قدر کہ بغیر دوربین کے اصل تہہ میں چیزیں صاف نظر نہ آتی تھیں۔

نیچے اترنا بڑا مشکل اور مہارت کا کام ہے۔ بمشکل تین چار گھنٹوں میں اس کی تہہ تک پہنچا جا سکتا تھا لیکن اس کے باوجود کچھ مہم جو لڑکے اور لڑکیاں نپے تلے قدموں سے نیچے اتر رہے تھے۔ انہوں نے کوہ پیمائی کا سامان اٹھایا ہوا تھا اور ضروری ہدایات دی گئی تھیں۔ آکسیجن کی کمی کا واضح طور پر ذکر کیا گیا تھا۔ کچھ ادویات کا بھی اندراج تھا کہ اترتے چڑھتے ہوئے طبیعت کے بگڑنے کا احتمال ہو سکتا تھا۔ یہ تمام باتیں بطور حفظ ماتقدم لکھی گئی تھیں۔ کیونکہ پاؤں پاؤں پھسلنے پر بھی لوگ مقدمہ دائر کر دیتے ہیں کہ عدالتیں اس قدر بھاری جرمانے کرتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں نیویارک یا شکاگو

میں دس بیس ڈالر کی خاطر غنڈے بے گناہ لوگوں کو دن دہاڑے قتل کر دیتے ہیں اور صاف بچ جاتے ہیں۔ چھ گھنٹے بلک اوٹ پر چھ ہزار دکانیں لوٹ لی جاتی ہیں وہاں اگر ایک حاملہ عورت کھانے کی پلیٹ میں مکھی دیکھ لے تو اس کی ہرجانے کے طور پر لاکھوں روپے مل جاتے ہیں کہ اس کی کراہت سے پیدا ہونے والے بچے کی صحت اور شخصیت پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ ایک بوڑھی عورت میکڈونلڈ کے ریسٹورنٹ پر جاتی ہے' کافی پیتے ہوئے اس کے کمزور ہاتھوں پر رعشہ طاری ہوتا ہے۔ گرم کافی اس کی رانوں پر گرتی ہے۔ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے کہ گلاس پر درجہ حرارت درج نہیں تھا۔ عدالت کمپنی کو دو ارب روپے جرمانہ کرتی ہے۔ دو ارب ایک ایسی عورت کو ادا کئے جانے کا حکم ملتا ہے جس نے غالباً ساری زندگی میں دو کروڑ بھی نہیں کمائے ہوں گے اور بقیہ زندگی میں دو کروڑ خرچ نہیں کر سکتی۔ اخبار چیخ اٹھتے ہیں Are lawyer Burning America ایک زال پیر تیس سال تک تسلسل اور تواتر کے ساتھ ہر روز تین پیکٹ سگریٹ پیتی ہے۔ اسے ناقابل علاج لنگ کینسر ہو جاتا ہے۔ وہ سگریٹ کمپنی پر مقدمہ دائر کر دیتی ہے کہ کمپنی نے پیکٹ پر یہ نہیں لکھا تھا کہ نوشی مضر صحت ہے۔ جیوری تین ارب روپے ادا کرنے کا حکم دیتی ہے۔ ایک ایسی خطیر رقم جسے وہ گن تو سکتی ہے خرچ نہیں کر سکتی کہ مرض لاعلاج ہو گیا ہے۔ ایک کار سوار راستے میں تھکے ہارے پیدل چلتے ہوئے مسافر کو اس کی درخواست پر لفٹ دیتا ہے۔ چلتے چلتے گاڑی ایک دوسری گاڑی سے ٹکرا جاتی ہے ڈرائیور بچ جاتے ہیں۔ مسافر مقدمہ کر دیتا ہے کہ کار کے مالک نے اسے بتایا نہیں تھا کہ وہ لاپرواہ ڈرائیور ہے یا لاابالی طبیعت کا مالک ہے۔ پلک جھپکنے میں لوگ کروڑ پتی بن جاتے ہیں اور چشم زدن میں فقیر ہو جاتے ہیں۔

ایک عورت سپریم کورٹ کے نامزد جج پر مقدمہ کر دیتی ہے کہ اس کرپٹ شخص کو عدالت عظمیٰ کا جج نہ بنایا جائے کیونکہ اس نے بارہ سال قبل اسے ایک گندا لطیفہ سنایا تھا۔ امریکن سینٹ فوراً سماعت کے لئے دروازے کھول دیتی ہے۔ کیا یہ معاشرہ ترقی کر گیا ہے یا زوال پذیر ہے۔

وکیل متاثر لوگوں کو خط لکھتے ہیں کہ ہم آپ مقدمہ مفت لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ ہمیں فیس نہیں چاہیے بس ہرجانے کی رقم ففٹی ففٹی۔

ہم نے کوچ پر بیٹھ کر کینین کے کچھ حصے کا چکر لگایا۔ جس سے سے بھی دیکھتے' اس کی ہیبت' عظمت اور پراسرار ہونے کا ایک نیا احساس اجاگر ہوتا۔ مرکزی کینین کے غربی سمت میں میوزیم' دکانیں' ریسٹورنٹ اور سینما ہال ہیں۔ اردگرد پائین اور یوکلپٹس کے درخت ہیں۔ رہائش کے لئے درمیانہ درجے کے ہوٹل ہیں کیونکہ اکثر سیاح رات یہیں گزارتے ہیں۔ چھوٹا سا ہسپتال' ڈسپنسری اور ایمرجنسی سکواڈ Rescue operation کے لئے ہیلی کاپٹر کیونکہ عمودی ڈھلوانوں اور چٹانوں پر اترتے چڑھتے کسی نہ کسی حادثے کا امکان رہتا ہے اور کینین کی چاک وچوبند انتظامیہ تساہل اور تغافل کے مضمرات سے پوری طرح خبردار ہے۔

گرینڈ کینین Grand canyon ریاست ایری زونا کے شمال مغربی کونے میں واقع ہے۔ اس کا شمار دنیا کے بہترین قدرتی عجوبوں میں ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی 277 میل اور چوڑائی 18 میل اور گہرائی 6000 فٹ عموداً ہے۔ اس کا زیادہ اور قابل دید حصہ گرینڈ کینین نیشنل پارک میں واقع ہے۔ یہ جغرافیائی طور پر تین حصوں میں منقسم ہے Nowrth rim, Surth rim Inner Canyon جنوبی حصہ سارا سال کھلا رہتا ہے۔ زیادہ لوگ اپریل تا ستمبر آتے ہیں۔ شمالی حصہ وسط اکتوبر سے وسط مئی تک بند ہوتا ہے۔ جنوبی حصے میں ہوٹل' دکانیں وغیرہ ہیں۔ شمالی حصے میں برف بہت پڑتی ہے۔ وہاں صرف پرائیویٹ گاڑیاں جاسکتی ہیں۔ جنوب سے شمالی حصے کا فاصلہ چکر کے ذریعے دوسو بیس میل ہے۔ پچاس لاکھ ہر سال آتے ہیں۔

اندر کے حصے میں جانے کے لئے یا تو پیدل جانا پڑتا ہے یا پھر خچر پر سواری کرنی پڑتی ہے یا پھر کشتی کے ذریعے دریائے کولوریڈو کے ذریعے سفر کیا جاسکتا ہے۔ Trails16 کینین میں داخل ہوتی ہیں لیکن ان میں BRIGHT ANGEL TRAIL ساؤتھ کیباب ٹریل اور شمالی کیباب مشہور ہیں۔ ہائیکنگ کے لئے Bark Country Permit کی ضرورت ہے۔ نیچے ٹھہرنے کے لئے PHANTOM RANC۔ اس کیلئے سپیشل بکنگ ضروری ہے۔ ایک سے چار بجے تک نیچے اترنے کی ممانعت ہے۔ اس کی وجہ درجہ حرارت ہے جو بسا اوقات 120 الیف تک پہنچ جاتا ہے۔ شمالی رم سطح

سمندر سے 8000 فٹ بلندی پر موسم کا تغیر و تبدل آناً فاناً ہوتا ہے۔

کینین کا چکر لا کر کوچ ڈرائیور نے گاڑی فلورل شاپ کے پاس پارک کی اور اعلان کیا کہ لنچ کر لیں کیونکہ ایک بجے واپسی ہوگی۔ فلورل شاپ کیا تھی پورا گلستان کھلا تھا۔ ایک چھوٹی سی دکان میں اس قدر پھول، ہر قسم کے گلاب، نرگس، ٹیولپ، ڈیفوڈل، رنگوں کی ایک قوس قزح تھی جو دامن نگاہ تھام رہی تھی۔ ہم تھوڑی دیر وہاں کھڑے رہے۔ مون نے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ خریدا۔

کیا کسی کو تحفہ دینا ہے؟ میں نے پوچھا۔

کہنے لگی ہاں! پھولوں سے بہتر کیا تحفہ دیا جاتا ہے؟

کیا کسی ایسی ہی بات ہے۔؟

کچھ ایسی ہی بات ہے۔

وہ میری بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے بولی۔

آج یہ تحفہ میں ان مست ہواؤں کی نذر کروں گی۔ جب گلاب کی سرخ، سفید، پیلی، نیلی، عنابی اور نارنجی پتیاں ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی فضاؤں میں بکھریں گی تو کتنا لطف آئے گا۔ ایسے پتہ چلے گا جیسے ہر طرف رنگ برنگی تتلیاں اڑ رہی ہیں۔

پھر تم بچوں کی طرح اچھلو گی، کودو گی اور تالی بجاؤ گی؟

کبھی کبھی بچپن کی طرف لوٹ جانے کو بڑا جی کرتا ہے۔ وہ ماضی میں کھو گئی۔

☆

میکڈونلڈ ریسٹورنٹ لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ چھ کاؤنٹر تھے اور ہر کاؤنٹر پر ایک لمبی قطار لگی تھی۔ کہنے کو تو یہ بچوں کا ریسٹورنٹ ہے لیکن یہاں آ کر بوڑھے بھی بچے بن جاتے ہیں۔ یہ امریکہ کلچرل Dominator کا مظہر ہے۔ سوچو تو یہاں ڈبل روٹی، قیمے کی ٹکیہ اور آلوؤں کے چپس وغیرہ کے سوا ہے ہی کیا۔ لیکن ان عمومی اشیاء نے ساری دنیا کو اپنا گرویدہ بنا ڈالا ہے۔ کمیونسٹ روس ہو، افریقہ ہو یا یورپ و ایشیا، لوگ یہ برگر اس قدر شوق سے کھاتے ہیں گویا نیاز یا پرشاد بٹ رہا ہو۔ اب اس کی ہزار ہا شاخیں دنیا کے

کونے کونے میں پھیلی ہوئی ہیں Frenchise لینے کیلئے لاکھوں ڈالر چاہیں اور برسوں انتظار کرپڑتا ہے۔ ماکولات ہوں' مشروبات ہوں یا لباس' امریکہ ساری دنیا پر چھا گیا ہے۔ ہم نے فش برگر اور فرنچ فرائز لیے اور کولا کے جمبو گلاس اٹھا کر باہر لان میں آ گئے کہ ریسٹورنٹ میں بیٹھنے کے لئے کوئی میز خالی نہ تھی۔ سبز مخملیں گھاس دبیز قالین سے کم نرم ملائم نہ تھی۔ عمارات کی وجہ سے ہوا کا دباؤ بھی کم تھا۔ کھانا کھا کر ہم نے خالی ڈبے ڈسٹ بن' میں پھینکے اور کوچ میں آ کر بیٹھ گئے۔

واپسی سفر نسبتاً خاموشی سے گزرا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ سب پر کینین کی ہیبت طاری ہوگئی ہے۔ کچھ تھکن کے آثار بھی چہروں پر ہویدا تھے۔ راستے میں بارش شروع ہوگئی ہے۔ پہلے رم جھم پھر موسلا دھار۔ ساری فضا جل تھل ہوگئی۔ ڈرائیور بڑی احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ہر چند کہ امریکی شاہراہوں پر نکاسی آب کا بڑا موثر انتظام کیا گیا ہے اور کیچڑ بھی نہیں جمتا لیکن بارش اس قدر تیز تھی کہ پانی نالے کی شکل میں بہہ رہا تھا اور دھندلاہٹ کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ نصف گھنٹے کا سفر دو گھنٹوں میں طے ہوا۔ بیڈراک سٹی پہنچتے پہنچتے بارش تھم گئی۔ شہر کے مضافات میں ریڈانڈین لوگوں کے خیمے بارش میں دھل کر خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔

یہ امریکہ کے اصل باشندے ہیں جو تم لوگوں کی وجہ سے آج دوبدر' خاک بسر ہیں۔ میں نے خاموشی کا طلسم توڑا۔

جب آدمی آسٹریلیا کے ایب اور جنیز' نیوزی لینڈ کے اصلی باشندوں' ساؤتھ افریقہ کے حبشیوں اور امریکہ کے ریڈ ایڈینز کو دیکھتا ہے تو بڑا دکھ ہوتا ہے۔ گھر کے مالک تو بے گھر ہوگئے ہیں۔ نان جویں کوترستے ہیں لیکن باہر سے آئے ہوئے مہم جو مزے لوٹ رہے ہیں۔ ان ممالک کے تمام وسائل ان کے صرف میں ہیں۔

بولی تو کیا ہم خلائی مخلوق ہیں؟ جس نے کمایا ہے وہ اڑا رہا ہے۔ ہم لوگوں کو آئے ہوئے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ دو سو سال! قوموں کی زندگی میں یہ کوئی اتنا لمبا وقت نہیں ہوتا۔ ہم سے پہلے یہاں کیا تھا۔ بھوک' جہالت' افلاس' بیماریاں' کھانے کو جنگلی جانوروں کا گوشت اور جڑی بوٹیاں رہنے کو یہ غاریں گھاس پھونس

کے گھونسلے اور تن ڈھانپنے کو کیلے کے پتے' زبان صرف طاقت کی سمجھی جاتی تھی۔ قانون فرد واحد کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ تھا۔ بیماری موت کا پروانہ لے کر آتی تھی' اب کونسی سہولت ہے جو انہیں میسر نہیں ہے۔ خیموں میں بھی ٹیلی وژن لگے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ فون نصب ہیں۔ یہ بھی وہی خوراک کھاتے ہیں جو ہمیں نصیب ہے۔ بات بات پر سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔

یہی استدلال انگریز نے ہندوستان میں اختیار کیا تھا۔ ایک غیر مہذب قوم کو سدھانے کا اخلاقی فریضہ White Man,s Burden کہتا تھا۔ ہم نے سکول کھولے ہیں' ریل کی پٹڑیاں بچھائی ہیں۔ شہر بسائے ہیں فیکٹریاں لگائی ہیں۔ کیا ان کیلئے وہ لوگ زرکثیر یورپ سے لائے تھے؟ ہندوستان سونے کی چڑیا کہلاتا تھا۔ امیر کہ قدرتی وسائل سے مالا مال تھا۔ ان ممالک کے وسائل کو استعمال کیا گیا۔ اس کے پیچھے کسی کار خیر کا جذبہ نہیں تھا بلکہ ذاتی اغراض و مقاصد تھے۔

کہنے لگی یہ دھرتی کسی کی میراث نہیں ہے۔ یہ لوگ بھی تو کبھی نہ کبھی کہیں یہاں سے آئے ہوں گے۔ تمدن ایب اور جنیز کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ دان حیران ہیں کہ ان لوگوں کا اصل مسکن کونسا تھا۔ یہ امریکہ سے آئے تھے۔ ہندوستان کے دراوڑ تھے یا پھر جنوبی امریکہ کا کوئی قبیلہ' اگر یہ مان لیا جائے کہ ہم سب آدم کی اولاد ہیں تو پھر اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ جب حضرت آدم عرش بریں سے زمین پر اترے تھے تو کوئی خاص خطہ زمین مختص نہیں کیا گیا تھا۔ اس اعتبار سے تو اولاد آدم وارث زمین ہے اور جہاں چاہے زندگی بسر کر سکتی ہے۔ اب تم اپنے برصغیر کو ہی دیکھو' وہ قدرے رک کر بولی' کیا تم لوگ یہاں کے اصل باشندے ہو' آریاؤں نے مار مار کر دراوڑوں کا بھرکس نکال دیا تھا۔ بھیل' ہریجن' کول ان سے تو ہماری کانوں سے نکلا ہوا کوئلہ زیادہ قیمتی ہے۔

عربوں کو دیکھو' کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ سپین پر آٹھ سو سال حکومت کی! کیا تمہیں صحرائے نجد کی ریت اور غرناطہ کے کھیت میں کوئی مماثلت نظر آتی ہے؟

بالآخر تم نے ان کا کیا حشر کیا؟ تم چاہتی ہو کہ ریڈ انڈینز بھی تمہارے ساتھ وہی سلوک کریں؟

''اگر مٹھی بھر آدمی تیس کروڑ لوگوں کو نکال سکتے ہیں تو بے شک نکال دیں۔ مجھے ذاتی طور پر کوئی

اعتراض نہیں ہوگا....." وہ مسکرائی۔

☆

اعلان ہوا کہ جہاز ڈینور کیلئے تیار ہے۔ مسافر بھی تیار ہو جائیں..... مسافر تھے ہی کتنے؟ چند امریکی جوڑے اور ہم دونوں جہاں میں بھی صرف بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی چھوٹا سا سیسنا ہم نے اپنے سفری بیگ اٹھائے اور پیدل ہی جہاز کی طرف چل پڑے..... جہاز چھوٹا تو تھا ہی ہوائی کمپنی نے اکانومی کا بھی خاصا خیال رکھا تھا۔

ایک پتلی سی نوجوان لڑکی جس نے جہاز اڑانا تھا دوسرا کو پائلٹ جو بیک وقت لاسکر اور اسٹیورڈ بھی تھا۔ ہر چند کہ جہاز چھوٹا تھا۔ کسی قسم کے مشروبات یا ماکولات کا اہتمام نہ کیا گیا تھا سیٹ پر بیٹھنے کیلئے بھی کمر کو دہرا کرنا پڑا تھا۔ لیکن طریقہ کار بڑی کمپنیوں جیسا تھا۔ وہی رٹا رٹایا اعلان کہ سیٹ بیلٹ باندھ لیں۔ کرسی کی پشت سیدھی رکھیں۔ ایمرجنسی کی صورت میں سمندر میں کودنے کا طریقہ اور آخر میں ایک خوشگوار سفر کی دعا Have a pleasent flight۔

یہ آخری بات دل کو بھاتی ہے میں نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ کیسے؟

تمہارے ساتھ سفر کا تصور ہی روح کو بالیدگی بخشتا ہے۔ اس سے زیادہ خوشی اور خوش قسمتی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

لیکن ابھی ابھی تو ہمیں مطعون کر رہے تھے۔ اس نے ہلکی پھلکی ناراضی کا اظہار کیا۔

تاریخ سے تعصب نہیں برتا جا سکتا۔ ایک تلخ حقیقت بہت جس کا اظہار بھی ضروری تھا۔

تاریخ کو دیکھنے کے بھی کئی زاویے ہیں۔ اکثر لوگ تعصبات کی عینک لگا کر اسے پڑھتے ہیں۔

ایسا بھی ہو سکتا ہے..... میں نے اس کی تائید کی۔

کیا ڈینور میں بھی کوئی کینین ہے جس کیلئے ہم نے یہ طویل سفر اختیار کیا ہے۔؟ میں نے موضوع بدلا۔

یہاں تم گہرائیاں نہیں بلکہ بلندیاں دیکھو گے۔ پائیکس پیکس PIKES PEAKS..... چودہ

ہزار فٹ بلند..... کیا تمہارے ہاں بھی اس قدر اونچے پہاڑ ہیں؟

اگر کے ٹو' نانگا پربت یا راکاپوشی کا سفر اختیار کریں تو چودہ ہزار فٹ پر Peak نہیں ہوتی بلکہ پہلا پڑاؤ ہوتا ہے۔

واقعی اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

اٹھائیس ہزار فٹ سر بفلک کوہسار۔ چوٹیاں جن کی ثریا سے ہیں سرگرم سخن!

تو پھر واپس چلیں! وہ مسکرائی۔

واپسی کا سفر ہمیشہ اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔

جہاز ڈینور کے اوپر پہنچا تو میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا شہر نے شام کے ستاروں والی شال اوڑھ لی تھی۔ ہر طرف روشنیوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا جس سے بلند و بالا عمارتیں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ کشادہ سڑکیں' سکائی سکیر پر زان گنت گاڑیاں چونٹیوں کی طرح رینگتی ہوئی' جلتے بجھتے نیون سائین' امریکہ کے بڑے شہروں کی شناخت یہ ہے کہ یہاں ڈاؤن ٹاؤن سارے شہر سے اونچا ہوتا ہے۔ سارے شہر سے زیادہ دولت مند ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کس منچلے نے اس مرکزی حصے کا نام ڈاؤن ٹاؤن رکھا۔ یہ ایسے ہی جیسے سارا سال برف سے ڈھکے ہوئے ملک کو شرارتاً گرین لینڈ کہا گیا ہے۔ اور نسبتاً سرسبز علاقے کو آئس لینڈ! ویسے بھی ڈینور کو MILE HIGH CITY کہا جاتا ہے۔ اس کی سطح سمندر سے بلندی 5237 فٹ ہے ہر چند کہ کولوریڈو کی ریاست کا دارالخلافہ Santa-fe ہے لیکن سب سے بڑا اور بارونق شہر ڈینور ہی ہے۔ دریائے کولوریڈو نے ریاست کو ہیالی بخشی ہے اور اس کی زرعی خوشحالی کا ضامن بھی ہے۔ دریا کے دونوں اطراف باغات کا ایک لمبا سلسلہ ہے ہر طرف آڑو' سیب' انگور اور تربوز کے درخت اور بیلیں نظر آتی ہیں۔

سیسنا جب ایئرپورٹ پر اترا تو ایسے محسوس ہوا جیسے ایک بہت بڑی سڑک پر چھوٹا سا کھلونا اتر گیا ہو۔ جمبو ایئربس اور دیگر جہازوں کے تناظر میں یہ جہاز کھلونا ہی نظر آتا تھا پھر ڈینور ایئرپورٹ بذات خود اتنا بڑا ہے جس پر اہل امریکہ بھی ناز کرتے ہیں نیا ایئرپورٹ جس پر دنیا کی ہر متعلقہ سہولت میسر ہے ہر چند کہ ماڈرن ایئرپورٹس کا بنیادی ڈھانچہ ایک جیسا ہوتا ہے لیکن ان کے سائز سج دھج اور سہولتوں میں بڑا فرق ہوتا

ہے۔لندن کی ٹیوب (ٹرین) ہیتھرو ایئرپورٹ کے رن وے تک پہنچ گئی ہے۔مسافروں کو ایئرپورٹ سے باہر جانے کی تکلیف نہیں کرنا پڑتی۔بس سامان کی ٹرالی پکڑی اور آرام سے نیچے اتر گئے اور اوپر آ گئے۔ٹوکیو کے نئے ایئرپورٹ کے خودکار ایکسیلیٹر بلٹ ٹرین کے سٹیشن تک پہنچا دیتے ہیں۔سنگاپور اور بنکاک کی CIP لاؤنجز تمام دنیا میں مشہور ہیں۔دنیا کی کوئی ایسی شراب نہیں جو وہاں مفت دستیاب نہ ہو۔پھر سنیکس میں پرانز فش، چکن، کاجو، بادام، پائین ایپل، سیب، پپایا، کافی جوسز، یار لوگ تو جہاز پر بیٹھنے سے پہلے ہی اوورلوڈ ہو جاتے ہیں۔

ایئرپورٹ پر بڑا رش تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا میلہ لگا ہو۔جس تعداد میں جہاز آ جا رہے تھے ایسا لگتا تھا جیسے بادامی باغ سے بسیں نکل رہی ہوں۔ہم ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو میں نے مون سے پوچھا کہ ٹھہرنا کہاں ہے؟

''ڈینور ہلٹن! میں نے ویگاس سے چلتے وقت بکنگ کرا دی تھی''.....

میں ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے گھنٹہ لگ گیا۔ہر چند کہ سڑکیں بڑی کشادہ اور یکطرفہ تھیں لیکن بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ڈاؤن ٹاؤن ہلٹن بڑا خوبصورت ہے۔ریسیپشن دوسری منزل پر ہے۔ہم کاؤنٹر پر پہنچے تو مون نے ریسپشنسٹ کو اپنا کریڈٹ کارڈ دکھایا۔اُس نے کمپیوٹر پر ریزرویشن دیکھی اور کوائف لکھنے کے لئے رجسٹر ہماری طرف بڑھایا۔میں نے کوائف لکھتے ہوئے اپنا پاسپورٹ دکھایا۔اُس نے کارڈ کو مشین میں گھمایا اور دو پلاسٹک کی چابیاں دیتے ہوئے بولا HAVE A GOOD TIME۔ہم نے اپنے بیگ اٹھائے اور لفٹ کی طرف چل پڑے۔

''آج ہم نے بڑا مصروف دن گزارا ہے اور پھر کل بھی خاصا سفر کرنا ہے۔کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ کھانا کمرے میں ہی کھا لیا جائے اور پھر آرام کیا جائے!''میں نے مشورہ دیا۔

''میرے خیال میں تمہیں کچھ لکھنا ہوگا؟''.....وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

میں نے اُسے شب بخیر کہا اور کمرے میں آ گیا.....تھکن اِس قدر زیادہ تھی کہ کچھ لکھنے کی نوبت ہی نہ آئی اور میں جلد سو گیا۔

○

صبح چھ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے غسلخانے میں جا کر منہ پر پانی کے چھپکے مارے اور روایتی تین کلیاں کیں۔ گزشتہ تین دن سے میں سیر نہ کر سکا تھا جو ایک طویل عرصے سے میرا معمول تھا اور مجبوری بھی!..... میں نے جوگرز پہنے اور جیکٹ اُٹھا کر نیچے اُتر آیا..... کاؤنٹر پر جب پہنچا تو ریسپشنسٹ نے ایک تعریفی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے 'ہیلو' کہا۔ امریکی صحت کا بڑا خیال رکھتے ہیں!!□ ○ ہر اُس شخص کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو اس کارِ خیر میں مصروف ہو۔ میں نے کمروں کی چابیاں اُس کے حوالے کیں اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ فضا میں کافی خنکی تھی۔ صبح کاذب نے صدق کی طرف سفر شروع کر دیا تھا اور اپنے گلے سے اندھیرے کا طوق اُتار رہی تھی۔ پتہ نہیں کس ذاتِ شریف نے صبح پر کذب کی تہمت لگائی ہے کیونکہ اُس سے بڑا جھوٹ نہیں بولا جا سکتا اور اِس سے بڑی سچائی بھی دُنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ صبح جس کا ہر لمحہ رُوح کو بالیدگی عطا کرتا ہے اور سارے وجود کو سرشار کرتا ہے۔ جب سارا ماحول نور کی چادر میں لپٹا ہوتا ہے۔ ہر کثافت بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ انسان معصوم پرندوں کی طرح گنگنائے، چہچہائے اور مست گیت گائے۔ صبح، جب فطرت اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ صبح، جو پتھر دلوں کو موم کرتی ہے اور جوش جیسے تشکیک زدہ انسانوں کو وحدانیت کا قائل کرتی ہے۔ صبح، جو ثبوتِ حق بھی ہے، جو آخری سچ بھی ہے جو حسن لازوال ہے، جو بے مثال خیال ہے۔

چلتے چلتے میں کافی دُور نکل آیا۔ کشادہ سڑکیں، سڑکوں کے دو رویہ درخت، درختوں کے ساتھ رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں اور اُن سے اُٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو۔ بہت کم لوگوں نے محسوس کیا ہوگا کہ صبح کی اپنی بھی ایک خوشبو ہوتی ہے جو دراصل تمام خوشبوؤں کا مرکب ہوتی ہے۔

کارپوریشن کا عملہ سڑکوں کی صفائی کر رہا تھا۔ درختوں اور پودوں کو پانی دیا جا رہا تھا۔ پھولوں کی کیاریوں کی تراش خراش جاری تھی۔ یہ روز کے معمولات ہیں جو دفتری اوقات شروع ہونے سے پہلے ہی مکمل ہو جاتے ہیں.....

کسی شہر کو دیکھنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اُس کو صبح کی سیر کرتے ہوئے دیکھا جائے تب

اُس کے صحیح خدوخال نظر آتے ہیں۔ ہر چند کہ ڈینور ایک بہت بڑا شہر ہے اور یہاں بھی سیمنٹ، اینٹ اور شیشے نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ لیکن اس میں ماحول کی آلودگی نسبتاً کم ہے۔ اس کی وجہ ایک تو سطح سمندر سے بلندی ہے پھر لوگ بھی زیادہ صفائی کا خیال رکھتے ہیں اور ماحول کو آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ میں کافی دیر تک شہر کی سڑکوں پر بے مقصد پھرتا رہا۔ چند باغوں کا چکر لگایا اور جب واپس لوٹا تو سورج نکل آیا تھا۔ کمرے میں پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی..... یہ مون تھی۔

''کہاں غائب ہو گئے تھے؟ آدھ گھنٹے سے مسلسل وقفوں سے فون کر رہی ہوں!''

''باغ کی سیر کرنے گیا تھا''۔

''تو مجھے بھی ساتھ لے چلتے!''

''تم نے باغ میں کیا کرنا تھا؟''

''سیر! اَور کیا کرنا تھا!'' اُس نے کہا۔ ''مجھے پتہ ہے اب تم مہیں ضرور کوئی تشبیہ یا استعارہ سوجھے گا۔''

''اگر تم حقیقت کو شرارت سمجھتی ہو تو پھر میں اظہار نہیں کروں گا۔''

بولی، ''کر ہی ڈالو۔ خواہ مخواہ ایک پھانس تمہارے دل میں رہے گی.....!''

''پھانس تو کسی صورت نکل ہی جاتی ہے لیکن جب دل میں گرہیں پڑ جائیں تو پھر بڑی تکلیف دہ صورت ہوتی ہے!''

''فکر نہ کرو! اگر ایسا ہوا تو میں نکال دوں گی!''

ہم تیار ہو کر نیچے آئے اور چیکٹ آؤٹ کیا۔ مون نے مشورہ دیا کہ جلد نکل جائیں کیونکہ اچھا خاصا سفر کرنا ہے اَور پھر شام سے پہلے واپس بھی آنا ہے۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ اُس نے ایک کار کرایہ پر لے لی ہے اور ڈرائیور کی بجائے وہ خود گاڑی چلائے گی۔

''کیا تمہیں راستے کا پتہ ہے؟''

''ہاں۔ میرے پاس نقشہ ہے۔ اُس کی مدد سے ہم جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔'' امریکہ میں

روڈ میپ بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر آدمی چند میل بھی نہیں چل سکتا۔"

اُس نے درست کہا تھا جہاں ہر طرف سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہو اور وہ گورکھ دھندے کی طرح ایک دوسرے سے خلط ملط اور گڈ مڈ ہو رہی ہوں وہاں نقشے کی مدد لئے بغیر چلنا غیر دانشمندانہ فعل ہے۔ مجھے نیویارک میں سجاد علی شاہ کا نیگرو ڈرائیور یاد آ گیا جس نے ہمیں یہ باور کایا تھا کہ وہ امریکہ کی سڑکوں کو ہاتھ کی لکیروں کی طرح پہچانتا ہے اور اٹلانٹک سٹی پہنچانے کی بجائے پتہ نہیں کہاں کہاں سے گھما پھرا کر شام کو واپس نیویارک لے آیا تھا۔

جب کالی بی ایم ڈبلیو پورچ سے باہر نکلی تو مون کہنے لگی کہ پہلے شہر کا ایک چکر لگاتے ہیں اور پھر پائیکس پیک دیکھنے جائیں گے۔ میں نے اُسے بتایا کہ ڈاؤن ٹاؤن تو میں نے پیدل چل کر ہی دیکھ ڈالا ہے۔ تو MILEHIGH STANDUIN اور کور Coor بیئر کی بروری ہی دیکھ لیتے ہیں۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ بروری ہم واپسی پر دیکھیں؟" میں بلندیوں کو چھونا چاہتا ہوں پستیاں تو روز دیکھتے ہیں۔"

کہنے لگی، "ہر بلندی بھی تو بالآخر پستی کی طرف جاتی ہے۔ ویسے تم نے بیئر کے کارخانے کو پستی کیونکر سمجھ لیا ہے۔"

"میں نے دیکھا ہے کہ اسے پی کر بھی آدمی آسمان پر پہنچ جاتے ہیں!"

"آسمان پر پہنچتے نہیں آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں اور جب نشہ اُترتا ہے تو پھر اس کی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں!"

بولی، "شاہ مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر تمہاری باتیں سنیں تو اُن میں دنیا جہان کا نشہ ہے لیکن عملاً تم ایک جرعہ آب سے بھی بدکتے ہو.....؟"

"کیا میں نے اس کی شان میں کوئی گستاخی کی ہے یا اس کے خلاف کوئی بات کی ہے؟"

"اشارتاً اور کنایتاً! تم نے کوئی اچھی تشبیہ بھی تو نہیں دی۔ میں نے عمر خیام کا انگریزی ترجمہ پڑھا ہے۔ وہ تو غالباً غسل بھی بادۂ گلرنگ سے کیا کرتا تھا....."

''سب تشبیہات اور استعارے میں نے تمہارے لئے وقف کر رکھے ہیں۔ انہیں ایک بوتل کی نذر کیسے کر دوں۔''

''کوئی ایک آدھ اس بے چاری کو بھی دے دو'' اُس نے قہقہہ لگایا۔

ہم شہر کی مختلف شاہراہوں پر ہوتے ہوئے مائیل ہائی سٹیڈیم پہنچے۔ مون نے پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی اور ہم سٹیڈیم میں داخل ہو گئے۔ سٹیڈیم کی سج دھج، وسعت اور شان و شوکت دیکھنے والی تھی۔ میں نے دنیا میں ایسے سٹیڈیم بہت کم دیکھے ہیں۔ یہ دراصل کثیر المقاصد کمپلیکس تھا۔ سات منزلہ عمارت۔ تقریباً ساٹھ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ لال نیلے اور پیلے رنگ کی کرسیاں بڑی ترتیب کے ساتھ لگائی گئی تھیں۔ تیسرے منزل پر جمنیزیم تھا جہاں ہر قسم کی ورزش کا سامان پڑا ہوا تھا۔ سوئمنگ پولز، الیکٹرانک گیس جسٹس، ٹریڈمل پر دوڑتے ہوئے آدمی کو پتہ چلتا رہتا ہے کہ وہ کس قدر فاصلہ طے کر چکا ہے۔ اُس کا ہارٹ ریٹ کہاں پہنچ گیا ہے اور نبض کس رفتار سے چل رہی ہے۔ ورزش کی ورزش، ڈاکٹری کی ڈاکٹری۔ ایک پنتھ اور دو کاج کا محاورہ تو آپ نے سنا ہو گا یہاں ایک پنتھ سو کاج کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مرکزی گراؤنڈ میں بے شمار لڑکے اور لڑکیاں نیکریں پہنے جوگن ٹریک پر دوڑ رہے تھے۔ کچھ بوڑھے بھی بغیر سینگ کٹوائے ان بھیڑوں میں شامل ہو گئے تھے۔ ہر کوئی اپنے گرد و پیش سے بے نیاز یکسوئی کے ساتھ ورزش کر رہا تھا۔ سٹیڈیم کے ایک کونے میں باسکٹ بال کھیلا جا رہا تھا تو دوسرے میں رگبی کی پریکٹس ہو رہی تھی۔ ہم چلتے چلتے رگبی دیکھنے رک گئے۔

''کہو! پسند آیا ہمارا سٹیڈیم؟'' مون کے لہجے میں تفاخر تھا۔

''بہت خوب! میں نے بے ساختہ جواب دیا۔ یہ امریکہ کی امارت، سوچ اور جدت کا آئینہ دار ہے۔ سات منزلہ سٹیڈیم بنانا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں!''

''اور ہماری رگبی کیسی لگی ہے!''

''ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے مست بھینسے ٹکرا کر ایک دوسرے کو ٹکریں مار رہے ہوں۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو بکتر بند نہ ہو''۔

بولی، ''اگر ایسا نہ کریں تو ان کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں یہ بہت ٹف گیم ہے۔ امریکہ کی طاقت اور توانائی کی مظہر! رگبی کا کھلاڑی بڑا پاپولر ہوتا ہے اور سال میں کروڑوں ڈالر کماتا ہے۔''

''یہی تو تم لوگوں کی خوبی ہے اگر پتھر کو بھی ہاتھ لگا دو تو سونا بن جاتا ہے۔ ہمارا اپنا ایک گویا جو طویل عرصے تک محض ایک قوال تھا دیکھتے ہی دیکھتے لازوال ہو گیا۔ کیونکہ اُس کی موسیقی کو ایک امریکن میوزک ڈائریکٹر نے پسند کیا تھا۔''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام نئے خیالات یہاں جنم لیتے ہیں اور بالفرض کہیں اَور بھی پیدا ہوں تو اُن کا خالق فوراً امریکہ منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں اُس کی مانگ اور مارکیٹ بہت وسیع ہے نیز مزید ریسرچ کے مواقع بھی زیادہ ہیں!''

اس نے درست ہی کہا تھا کیونکہ جب بھی کوئی شخص زندگی کے کسی شعبے میں برتری حاصل کرتا ہے تو فوراً ہی امریکہ کا رخ کرتا ہے۔ تمام اچھے ڈاکٹر، انجینئر، ادیب، سائنس دان حتیٰ کہ ایکٹر یہاں پہنچ جاتے ہیں۔

''اس ملک کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے!'' وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی ''کہ یہ بہت وسیع و عریض ہے۔ بہت امیر ہے۔ یہاں چار ٹائم زون ہیں۔ یہ سابق روس کو چھوڑ کر سارے یورپ سے بھی بڑا ہے۔ تم اپنے برصغیر کو ہی دیکھ لو اس کی کمر تک بھی نہیں پہنچتا۔ ایک سرے سے دوسرے تک پہنچتے پہنچتے موسم بدل جاتا ہے۔ کیا تمہیں پتہ ہے کہ نیویارک سے لاس اینجلس تک جہاز کتنی دیر میں پہنچتا ہے؟ جتنی دیر میں آدمی کراچی سے سنگاپور پہنچتا ہے!''

''کیا وجہ ہے کہ امریکہ میں کھیلی جانے والی اکثر گیمز دیگر ممالک میں متعارف نہیں ہیں یا بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دُنیا کے مقبول کھیل از قسم فٹ بال، کرکٹ، ہاکی یہاں نسبتاً اجنبی ہیں؟''

''اس کی ایک وجہ واس ملک کا مخصوص مزاج ہے۔ ہم لوگ مانگی تانگی حرارت پر گزارہ نہیں کرتے بلکہ اپنی آگ خود جلاتے ہیں۔ پھر ہر قوم کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی کھیلیں کھیلے۔ یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ دُنیا امریکن کھیل کیوں نہیں کھیلتی حالانکہ ان میں بڑی توانائی ہے، جدت ہے، جاذبیت ہے اور لطف

ہے۔"

ہم نے سٹیڈیم کے دو چکر لگائے اور واپس آ گئے۔ ہمیں شہر سے نکلتے نکلتے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ 25 ساؤتھ پر ہم کولوریڈو سپرنگ کے لئے روانہ ہوئے۔ جب بلند و بالا عمارات کا سلسلہ ختم ہوا تو ہر طرف ہریالی نظر آئی۔ کھیت سرسبز، درختوں کے جھنڈ اور سڑک دورویہ اور نہایت ہموار۔

"یہ تمہاری ڈرائیونگ کا کمال ہے یا سڑک اتنی ہموار ہے کہ پتہ چلتا ہے جیسے گاڑی سڑک پر دوڑ نہیں رہی بلکہ تیر رہی ہے" میں نے مون کی طرف دیکھا۔

"بی ایم ڈبلیو کی برکت ہے۔ ناہموار سڑک پر بھی یوں چلتی ہے جیسے فضا میں پرواز کر رہی ہو!"

"امریکہ ٹیکنالوجی میں یقیناً بہت آگے ہے۔ پھر جرمنی کی گاڑیاں اس قدر پسندیدہ کیوں ہیں؟"

"اس کی بنیادی وجہ تو قیمتیں ہیں۔ جرمن خصوصاً جاپان کی گاڑیاں بہت سستی ہیں۔ یہی وجہ ہے اکثر چیزیں حتیٰ کہ تیل بھی باہر سے خریدا جاتا ہے۔ ملک میں تیل کے وسیع ذخائر ہیں لیکن اس کی ڈولنگ مہنگی پڑتی ہے۔"

"اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ امریکہ عمداً اپنا تیل استعمال نہیں کرتا۔ یہ چاہتا ہے کہ پہلے دنیا کے ذخائر سے فائدہ اٹھایا جائے پھر اپنا تیل خرچ کیا جائے۔"

"یہ تاثر سراسر غلط ہے جیسا کہ تمہیں بتا چکی ہوں ہمارے اپنے تیل کے کنویں ہیں اور ہماری طرح بیشیوں لوگ تیل نکال کر بیچ رہے ہیں۔ یہاں ہچ چیز پرائیویٹ پراپرٹی ہے حکومت کاروبار نہیں کرتی صرف اسے کنٹرول اور ریگولیٹ کرتی ہے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً جہاز، اسلحہ اور کمپیوٹر وغیرہ پرائیویٹ فرمیں بناتی ہیں، قیمتیں وہ مقرر کرتی ہیں۔ انہیں بیچنے کے لئے حکومت کی اجازت درکار ہوتی ہے۔ کیونکہ ٹرانسفر آف ٹیکنالوجی بہت بڑا مسئلہ بن گیا

ہے۔ اکثر ملک ہماری ٹیکنالوجی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم سے زیادہ سستی چیزیں مارکیٹ میں لے آتے ہیں۔"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ کار کو ایک چھچکا لگا۔ اُس کی رفتار کم ہوگئی اور مون نے شولڈر پر گاڑی کھڑی کر لی۔

"خیریت تو ہے؟" میں حیران تھا۔

"ٹائر پنکچر ہوگیا ہے!" وہ نیچے اُترتے ہوئے بولی۔

"ابھی ابھی تو تم اس کی تعریف کر رہی تھیں۔ ٹائر کیسے جواب دے گیا ہے؟"

"کیا امیر آدمی بیمار نہیں ہوتے؟ اسی طرح قیمتی گاڑیاں بھی خراب ہو جاتی ہیں۔"

"اُس نے گاڑی کو بونٹ اُٹھایا۔ ڈگی کھول کر جیک اَور ٹائر نکالا۔ مجھے ٹائر بدلنا نہیں آتا تھا۔ غالباً پہلی دفعہ افسوس ہو رہا تھا کہ یہ معمولی سا ہنر کیوں نہیں سیکھا۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے اُسے بتایا کہ مجھے ٹائر بدلنا نہیں آتا وگرنہ اُسے یہ تکلیف نہ کرنا پڑتی۔

پانچ منٹ میں اُس نے ٹائر بدل کر جیک باکس اَور پنکچر ٹائر ڈگی میں ڈال دیا۔ ہمارے قریب سے سینکڑوں گاڑیاں گزر گئیں۔ کسی نے گاڑی روکنے کی تکلیف نہ کی۔ شاید اُس کی ضرورت ہی نہ رہی۔ جگہ جگہ فون لگے ہوئے تھے۔ بریک ڈاؤن کی صورت میں کمپنی کو اطلاع دی جا سکتی ہے۔ وہ نہ صرف گاڑی بدل دیتے ہیں بلکہ خراب گاڑی کو لے جانا بھی اُن کا دردِ سر ہوتا ہے۔ مون نے ڈگی بند کر کے سائیڈ میں لگے ہوئے شیشے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ اُس کے چہرے پر سیاہی کے کئی دھبے لگ گئے تھے۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" اُس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"جیسے چاند کالے بادلوں میں گھر گیا ہو!"

بولی! "مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں میکبتھ کی چوتھی جادوگرنی ہوں۔" وہ رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

"میکبتھ میں تو تین بوڑھی جادوگرنیوں کا ذکر ہے یہ چوتھی کہاں سے ٹپک پڑی ہے۔"

''ناقدین کہتے ہیں کہ چوتھی اُس کے لاشعور میں کلبلا رہی تھی جسے وہ صفحہ قرطاس پر نہ اُتار سکا۔''

''وہ لیڈی میکبتھ ہی ہو سکتی تھی۔''

''شاید!'' اُس نے میری بات کی تائید کی۔ ''ڈیڈی نے جب مام کو چھیڑنا ہوتا تو اکثر اسے مائی فیر لیڈی میکبتھ کہہ کر پکارتے۔ اس پر ممی بڑی زچ ہوتیں اور جھلا کر کہتیں ''مجھے اُس حرافہ کے ساتھ تشبیہ نہ دو..... پھر خود ہی کچھ سوچ کر کہتیں تم کون سا میکبتھ ہو! اُس نے تو اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے کنگ ڈنکن کو مار دیا تھا تم تو میری خاطر ایک مچھر تک نہیں مار سکتے۔''

''تمہاری خاطر بادشاہ چھوڑ میں خود بھی مرنے کے لئے تیار ہوں۔ تم ایک بار حکم تو کرو، میری جان!'' باتیں کرتے کرتے اُن کا لہجہ یکسر بدل جاتا جیسے بول نہ رہے ہوں، رس گھول رہے ہوں۔ وہ ایک دوسرے کو عجیب نظروں سے دیکھتے۔ پھر ڈیڈی بانہیں کھول دیتے۔ ممی لپک کر اُن کے سینے سے جا لگتیں اور ڈیڈ بوسوں کی بارش شروع کر دیتے..... مام گھبرا کر میری طرف دیکھتیں اور پیار بھرے غصے سے کہتیں، ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟..... جاؤ باغ میں جا کر تتلیاں پکڑو۔''

''تو تتلیاں پکڑنے کی عادت تمہیں بچپن سے ہی ہے؟'' ہم دونوں مسکرا دیئے۔

ہم تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ مون نے گاڑی مین روڈ سے ہٹا کر دائیں ہاتھ موڑ لی۔ گاڑی کے مڑتے ہی سامنے ایک بہت بڑا بورڈ نظر آیا اس پر لکھا تھا "UNITED STATES AIR FORCE ACADEMY۔ بیس منٹ کے بعد ہم مرکزی گیٹ پر پہنچ گئے۔ ہر چند کہ وہاں پہرہ تھا لیکن کسی نے پوچھ گچھ نہ کی۔ گیٹ سے دو میل کے فاصلے پر ایک بہت بڑے گراسی لان میں امریکن ایئر فورس کا B-52 بمبار طیارہ کھڑا تھا۔ کالے رنگ کا دیو ہیکل جہاز جس کی ہیبت سے ہی ڈر اور خوف طاری ہوتا تھا۔ جہاز کے چاروں طرف رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔

THIS WAS AMERICAN PRIDE۔ مون کہنے لگی ''یہ ویت نام کی جنگ میں استعمال ہوا تھا!''

''تو اس کے پَر بے گناہ لوگوں کے زردخون سے رنگے ہوئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اُس کے لہجے میں تھوڑی سی جھنجھلاہٹ آ گئی۔

''ویت نامیوں پر ایک ایسی جنگ مسلط کی گئی جس کا کوئی اخلاقی جواز نہ تھا۔ سینکڑوں بستیاں تاراج کر کے اَور اَن گنت لوگوں کو موت کی نیند سلا کر بھی شکست ہی امریکہ کا مقدر بنی۔''

''امریکہ کو شکست کمیونسٹوں نے نہیں دی بلکہ خود اس کے عوام کے ہاتھوں ہوئی۔ ایک غیر مقبول جنگ، جسے رائے عامہ کی تائید حاصل نہ تھی وگرنہ ایٹم بم شوکیس میں رکھنے کے لئے نہیں بلکہ استعمال کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔''

''یہ غالباً روس کا ڈر تھا جس نے اس کے استعمال سے باز رکھا ورنہ ہوسکتا ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی کی تاریخ یہاں بھی دہرائی جاتی۔''

ہم نے اکیڈمی کا ایک چکر لگایا۔ خاصی بڑی اکیڈمی ہے جہاں نوجوان کیڈٹوں کو ہوابازی کی تربیت دی جاتی ہے۔ کروکٹ اور نیلی یونیفارم میں ملبوس کیڈٹ ہر طرف گھوم رہے تھے اُوپر فضا میں ہر طرف تربیتی جہاز اُڑ رہے تھے۔ اُس اکیڈمی میں دو ہزار لڑکوں کی تربیت کا بندوبست تھا۔ بظاہر یہ بہت بڑی تعداد نظر آتی ہے لیکن یہ دنیا کی واحد سپر پاور کی ضرورت ہے۔ جس ملک کے سینکڑوں جہاز دُنیا کے ہر کونے میں ہر وقت پرواز کرتے ہوں، جو سمندروں، پہاڑوں اَور میدانوں کی نگرانی کر رہے ہوں، جنہوں نے 160 ملکوں کی حربی صلاحیتوں پر نگاہ رکھی ہوئی ہو اَور جس کے چار سو جہاز ایٹم بم لئے ہر وقت روس پر حملہ کرنے کے لئے فضا میں اُڑ رہے ہوں وہاں پائلٹ بھی اتنی تعداد میں درکار ہوتے ہیں۔

O

جب ہم کولوریڈو سپرنگ پہنچے تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ کولوریڈو سپرنگ ڈینور سے سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ امریکہ میں فاصلے میلوں کے حساب سے نہیں بلکہ گھنٹوں کے حساب سے بتائے جاتے ہیں۔

مون کہنے لگی ''شاہ ناشتہ کر لیں۔ جلدی میں بغیر کچھ کھائے پیئے ہی آ گئے

ہیں"..... کولوریڈو سپرنگ چھوٹا سا شہر ہے جس کی سطح سمندر سے بلندی 6025 فٹ ہے اور یہاں ایئر فورس اکیڈمی کے علاوہ یونیورسٹی آف کولوریڈو بھی ہے۔ پائیکس پیک جانے والی شاہراہ پر ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ نظر آیا تو مون نے گاڑی روک لی۔ "یہاں کا ناشتہ بڑا مزیدار ہوتا ہے۔"

"کیا تم پہلے بھی یہاں آئی ہو؟"

"صرف ایک بار!" وہ گاڑی لاک کرتے ہوئے بولی۔ ہم ریسٹورنٹ کے اندر گئے تو وہاں اِکا دُکا ٹورسٹ نظر آئے۔

مون ناشتے کا آرڈر دے کر واش روم میں چلی گئی تو میں نے ریسٹورنٹ کا سرسری سا جائزہ لیا۔ تیس چالیس آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اس کی مالکہ ایک پختہ عمر کی عورت تھی جو چبھتی ہوئی نگاہوں سے ہر آنے جانے والے کو تاک رہی تھی۔ تین نوعمر لڑکیاں کسٹمرز سے آرڈر لے رہی تھیں۔ ریسٹورنٹ کا ہیٹنگ سسٹم خراب تھا اِس لئے خاصی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ مون منہ ہاتھ دھو کر آئی تو ناشتہ آ چکا تھا۔ اُس نے پین کیک اَور اُن پر ڈالنے کے لئے اسٹرابری کا شربت منگوایا تھا اور ابلے ہوئے انڈے۔ ساتھ جیم، مکھن اور ٹوسٹ۔

کیا آج لنچ گول کرنا ہے؟" میں نے اُس کی طرف دیکھا۔

بولی! "پہاڑ پر چڑھنا ہے، پھر غاروں میں بھٹکنا ہے کچھ کھا لو۔ پتہ نہیں وہاں وقت ملتا ہے یا نہیں۔"

ہم ناشتہ کر کے نکلے تو سورج بڑی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ایسی روشن صبح یہاں کبھی کبھی نصیب ہوتی ہے ورنہ مطلع اکثر ابر آلود رہتا ہے۔ کولوریڈو اسپرنگ سے پائیکس پیکس بیس میل کے فاصلے پر ہے لیکن چونکہ مشکل چڑھائی ہے اس لئے دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ راستے میں پائین کا گھنا جنگل شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں جانب سرسبز اور تناور درخت سنتریوں کی طرح ایستادہ تھے۔ خلافِ توقع مون راستہ بھول گئی لیکن جلد ہی اُسے غلطی کا احساس ہو گیا۔ اُس نے پہلے ایگزٹ سے دائیں ہاتھ ٹرن لیا اور تھوڑی دیر بعد ہی ہم اُس سڑک پر آ گئے جو سیدھی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتی تھی..... بتانے لگی ہم ایک

گھنٹہ تک نسبتاً کشادہ سڑک پر چلیں گیا اس کے بعد ڈرٹ روڈ شروع ہوگا۔

''کیا تمہارے ملک میں بھی Dirt Road ہیں؟''

''بہت زیادہ!'' میں اسے کیا بتاتا کہ ہمارے یہاں نہ صرف ڈرٹ روڈ ہیں، گندی گلیاں اور گندے محلے ہیں بلکہ اب تو بعض شہروں کو بھی یہ اعزاز حاصل ہوگیا ہے..... البتہ مجھے اِس بات کی حیرانی ہورہی تھی کہ اتنے مشہور پہاڑ پر گندی سڑک کیسے بن گئی..... مجھے کچھ اچنبھا سا ہورہا تھا اس لئے میں نے استفسار کرنا مناسب سمجھا۔

بولی! ''ڈرٹ سے مراع کچی سرک ہے، گندی سڑک نہیں۔''

''کچی سرک بنانے کی کیا تک تھی؟''

''یہ ضروری ہے۔ سردیوں میں یہاں اس قدر برف باری ہوتی ہے کہ پکی سڑک پر گاڑیاں چل نہیں سکتیں سکڈ کرتی ہیں۔ ڈرٹ روڈ کی گرفت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔''

''کیا یہ امریکہ کی بلند ترین چوٹی ہے؟''

''نہیں۔ امریکہ کا بلند ترین پہاڑ تو ماؤنٹ وٹنی ہے جو 16000 فٹ بلند ہے۔ پائیک پیک 14110 بلند ہے۔ لیکن یہ واحد اُونچی چوٹی ہے جہاں گاڑیاں جاسکتی ہیں اور ریل بھی جاتی ہے۔''

''اس کے لئے خاص ریل تیار کی گئی ہے جسے COG Railway کہتے ہیں جس کے تین وہیل ہیں۔ تیسرے وہیل Tooth Wheel کہتے ہیں۔ یہ گاڑی کو سلپ ہونے سے روکتا ہے اور اس کی رفتار میں ایک توازن قائم کرتا ہے۔

''اسے پائیکس پیک کیوں کہتے ہیں؟''

''It is a good question''۔ اُس نے گاڑی سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

''اس کی تاریخ حیرت وحسرت کے کئی در وا کرتی ہے۔ یہ غالباً دُنیا کا دوسرا بڑا ہائی وے ہے۔ اس پہاڑ کو لیفٹیننٹ زبلون منٹگمری نے 1806ء میں دریافت کیا۔ سو میل کے فاصلے پر اُس نے اس چوٹی کو تعریفی نگاہوں سے دیکھا اور اس کا نام Grand Peak رکھا۔ اس کی کشش اسے دیوانہ وار اُوپر

کھینچ لائی لیکن چوٹی پر وہ پھر بھی نہ پہنچ سکا۔ نومبر کے ایک یخ بستہ طوفان نے اُس کے اعضاء شل کر دیئے اور حوصلوں کو پست کر دیا۔ وہ اس قدر نا اُمید ہوا کہ اُس نے پیشین گوئی کی کہ کوئی شخص بھی اس کی چوٹی تک نہیں پہنچ پائے گا..... لیکن یہ محض خام خیالی تھی۔ یہ انسان کی سرشت میں ہے کہ وہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے سے بھی نہیں چوکتا۔ کئی کوششیں ہوئیں اور بالآخر 1820ء میں ڈاکٹر ایڈون جیمز Dr. Eswin James نے چوٹی پر پہنچ کر انسانی عظمت اور ہمت کا جھنڈا گاڑ دیا۔ مرد تو مرد عورتیں بھی اس مہم جوئی میں پیچھے نہ رہیں اور Julia Archibald Hocmes بھی 1853ء میں ہانپتی کانپتی پہنچ گئی۔"

"امریکی عورت مرد کا مقابلہ کرنے پر تل گئی ہے" میں نے لقمہ دیا۔

"بالکل!" وہ روحِ معانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

"تمہاری ہم پیشہ مصنف کیتھرائین لیبیٹس (Katherine Lee Bates) وہاں پہنچ گئی اور دلکشمنا ظر سے اس قدر مسحور ہوئی کہ وہیں کھڑے کھڑے اُس نے مشہور گیت America the Beautifu لکھ ڈالا۔

"یہی تو شاعروں کا کمال ہے۔ بالفرض اگر خود نہ بھی پہنچ سکیں تو اُن کا تخیل ہر اونچائی تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ جب میں نے اُسے علامہ اقبال کی نظم ہمالیہ کے اس شعر

ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

کا ترجمہ اُسے سنایا تو وہ بہت محظوظ ہوئی۔

کہنے لگی "شاہ تم لوگوں کے پاس عظمت ہے مگر تمہیں اس کا احساس نہیں، حسن ہے مگر آئینے نہیں، وسائل ہیں مگر ان کا استعمال جانتے۔ اگر ماؤنٹ ایورسٹ، کے ٹو اور ناگا پربت اس ملک میں ہوتے تو دیکھتے یہاں کیا ہوتا۔ پچاس لاکھ کی بجائے پچاس کروڑ انسان یہاں آ کر لطف اندوز ہوتے۔"

وہ کس قدر سچی اور کھری باتیں کر رہی تھی۔ ندامت سے میرا سر جھک گیا..... کچھ دیر خاموش رہی پھر مجھے تاسف کی کیفیت سے نکالتے ہوئے بولی "ہاں تو میں تمہیں اس پہاڑ کی تاریخ اور

جغرافیہ بتا رہی تھی COG Railway کی پٹریاں 1891ء میں بچھائی گئیں جبکہ سڑک 1916ء میں بنی اور اس پر اس وقت ساڑھے تین لاکھ ڈالر خرچ ہوئے۔ ویسے تو سارا سال سیاح آتے ہیں لیکن جولائی میں تو یہاں میلے کا سماں ہوتا ہے۔ جولائیکو ساری دنیا سے یہاں موٹر اور بائیک ریسرز آتے ہیں۔ کاروں اور موٹر سائیکلوں کی دوڑ کا مقابلہ ہوتا ہے۔ بارہ میل کا فیصلہ 10 منٹ میں طے کرنا ہوتا ہے۔ راستے میں 156 خطرناک موڑ آتے ہیں۔"

"بڑا خطرناک کھیل ہے" مجھے جھرجھری سی آئی۔

"ہے تو سہی۔ ذرا سی غفلت، معمولی سی ذہنی اُپج، تھوڑی سی ہاتھوں کی لرزش، موت کا پروانہ ثابت ہوتی ہے۔ پہاڑ سے گاڑیاں یوں نیچے گرتی ہیں جیسے کسی اُونچے رن وے سے ٹیک آف کیا ہو.....!"

"کیا لوگ پیدل بھی جاتے ہیں؟"

"بے شمار۔ اُن کے لئے الگ راستہ بنایا گیا ہے جسے BARA TRAIL WINDS کہتے ہیں۔ یہ راستہ تیرہ میل لمبا اور ساڑھے سات ہزار فٹ عموداً اونچا ہے۔ اگست میں یہاں میراتھن ریس کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اب تک چھبیس میل دوڑنے کا جو ریکارڈ قائم ہوا ہے وہ تین گھنٹے اور چوبیس منٹ کا ہے۔

O

کولوریڈو سپرنگ سے چلے ہوئے ہمیں ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ سڑک بتدریج اونچی ہو رہی تھی۔ اردگرد کوئی گھنا جنگل تو نہ تھا لیکن ہر طرف چیڑ، دیودار کے درخت کثرت سے نظر آئے۔ پہاڑ کو بڑے طریقے سے کاٹا گیا تھا۔ سڑک نہایت چوڑی اور ہموار تھی۔ جن لوگوں نے گلگت سے خنجراب پاس تک شاہراہ ریشم پر سفر کیا ہے انہیں کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ اِن دونوں کی بلندی بھی تقریباً ایک جیسی ہے۔ اگر فرق ہے تو اتنا کہ گلگت سے خنجراب پاس تک طویل سفر کرنا پڑتا ہے جبکہ کولوریڈو سپرنگ سے پیک تک دو گھنٹے کی مسافت ہے۔ بعض اوقات حیرانی ہوتی ہے کہ چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر گھنٹے دو گھنٹے میں کیسے پہنچا جا سکتا ہے..... دراصل کولوریڈو سپرنگ بذات خود سطح سمندر سے ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ اس لئے زیرو پوائنٹ سے چوٹی تک کا سفر دراصل آٹھ ہزار فٹ کا ہے۔

ہم تین چوتھائی سفر طے کر چکے تو سامنے بہت بڑا گیٹ نظر آیا۔ اس کے ساتھ چند عمارتیں تھیں جو دراصل ریسٹورنٹ، سوینئر شاپس، ورکشاپ اور ہائی وے پٹرول کے دفاتر ہیں۔ یہاں گاڑیوں کی چیکنگ ہوتی ہے۔ اسبات کی تسلی کی جاتی ہے کہ گاڑی پہاڑ پر چڑھ بھی سکتی ہے یا نہیں..... یہ ضروری ہے کیونکہ اس کے بعد عمودی چڑھائی شروع ہوتی ہے اور راستے میں کوئی ورکشاپ نہیں ہے۔

چیکنگ کے بعد ہمنے سفر کا دوبارہ آغاز کیا۔ اب کے تھوڑی دیر ہی چلے تھے کہ چند خوبصورت جھیلیں نظر آئیں۔ مرکزی جھیل کے اردگرد درختوں کے جھنڈ تھے اور ہر ہرف ہرن کلیلیں بھر رہے تھے۔ بڑا خوبصورت منظر تھا۔ مون نے ایک سائیڈ پر گاڑی کھڑی کر دی۔ ہم اتر کر جھیل کنارے پہنچ گئے۔ نیلگوں جھیل کے صاف شفاف پانی میں مچھلیاں تیر رہی تھیں وہاں پہلے سیموجود بے شمار لوگ جھیل کے حسن سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور ساتھ ساتھ آزمائش کام و دہن بھی جاری تھی۔

''جھیل پسن آئی ہے؟'' اُس نے میری طرف دیکھا۔

''بہت زیادہ۔ حیران کن بات یہ ہے کہ یہاں ایک جھیل نہیں بلکہ جھیلوں کا جال بچھا نظر آتا ہے!''

''جوں جوں ہم اوپر جائیں گے اس حیرانی میں اضافہ ہوگا۔ یہاں ہر سطح پر جھیلیں ہیں۔ یہ جھیل دس ہزار فٹ کی بلندی پر ہے اس طرح گیارہ ہزار فٹ، بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بھی متعدد جھیلیں ہیں۔ موسم سرما کی برف پگھل کر ان میں جمع ہو جاتی ہے۔

''میں نے قریبی جنگل میں بے شمار ہرن دیکھے ہیں کیا اس کے علاوہ بھی وائلڈ لائف ہے؟''

''شروع میں بہت زیادہ تھی۔ یہ جنگلی ہرنو، ELK، جنگلی بھینسو، ریچھوں، مارخوروں اور شیروں سے بھرا پڑا تھا۔ لوگ یہاں خاص طور پر شکار کے لئے آتے تھے۔ اِسے شکاریوں کی جنت کہا جاتا تھا STEPHEN LONG اور جان فرمنٹ نے اہل وطن کو اس علاقے کی اہمیت سے آگاہ کیا۔''

''گویا اس علاقے کی اہمیت نیچرل بیوٹی اور وائلڈ لائف کی وجہ سے ہے؟''

''وائلڈ لائف اب اس قسم کی نہیں، البتہ قدرتی حسن میں انسان کی کوشش اور کاوش بھی شامل ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں سونے کی کشش بھی ایک زمانے میں لوگوں کو کھینچ لائی تھی جس میں 1858 YELLOW FEVER کا نام دیا گیا۔

''تو کیا سونا بہت زیادہ تھا؟''

''جن کا مقدر اچھا تھا اُنہیں مل گیا باقی ناکام لوٹ گئے لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سارے امریکہ میں پائیکس پیک کا نام زبان زدِ خاص و عام ہوگیا۔ مشہور نعرہ PIKES PEAK OR BUST یہیں گھڑا گیا تھا۔''

ہم چلتے چلتے جھیل کے اس حصے میں پہنچ گئے۔ جنگل نسبتاً گھنا تھا۔ اُس طرف لوگ نہیں تھے کیونکہ وہاں بیٹھنے کے لئے بنچ نہ رکھے گئے تھے۔ آسمان پر بادلوں کے آوارہ ٹکڑے تیر رہے تھے۔ سورج کی کرنیں جب اُن سے چھن کر جسم سے ٹکراتیں تو ہلکی ہلکی ٹکوری سی محسوس ہوتی۔ ہوا میں جنگلی پھولوں کی خوشبو تھی۔ جب بھی کبھی تیز جھونکا آتا تو جنگل کا آرکسٹرا بج اُٹھتا اور جھیل کی سطح پر دائرے سے بنتے جو پھیلتے پھولتے بالآخر معدوم ہو جاتے۔ خوبصورت ننھے ننھے پرندے ایک دم جنگل سے نکلتے۔ فضا میں چند قلابازیاں کھا کر جھیل میں غوطہ لگاتے اور پھر واپس پرواز کر جاتے..... مون نے جوتے اتارے اور پاؤں جھیل کے پانی میں ڈال کر گھاس پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کرلیں۔ میں بھی قریب ہی لیٹ گیا۔ کافی دیر تک جھیل کا ٹھنڈا پانی روح کو سرشار کرتا رہا۔ ایسا طلسماتی ماحول! یہ فراغت کے لمحات! یہ کیف آور سکون! کہاں روز روز نصیب ہوتا ہے! ایک ایسی حقیقت جو سپنوں سے بھی زیادہ حسین ہو..... دیارِ غیر، دس ہزار فٹ کی بلندی، جھیل کا شفاف نیلا پانی، چیڑ کے جنگلوں سے اُٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو، ہواؤں کا وہم ھر ساز! پرندوں کے وہ ازلی گیت زندگی میں کب میسر ہوتے ہیں! پھر ایک ایسے شخص کی رفاقت جسے دیکھ کر یوں محسوس ہو جیسے فطرت کا تمام حسن سمٹ کر ایک مجسم شکل اختیار کر گیا ہو۔ آنکھیں بند کئے میں کافی دیر لیٹا رہا، کافی دیر سوچتا رہا..... زندگی کے طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد اِس قدر راحت۔ اتنی طمانیت، اتنی بھرپور خوشی..... کیا انسان اِس نعمت غیر مترقبہ کے بعد کسی اور چیز کی خواہش کر سکتا ہے؟ کیا مانگ سکتا ہے؟

دست دعا اگر اٹھے بھی تو یہی کہیں گے اے خالق کائنات، اے مالک ارض وسما! ان لمحوں کو دراز کر دے.....!"

دور کسی گاڑی کا ہارن بجا تو ہم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ مون نے گھڑی دیکھی تو بولی، او مائی گاڈ۔ ہمیں لیٹے لیٹے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔ شاہ جلدی کرو شام کو ویگاس واپس جانا ہے۔ ہم اُٹھ کر گاڑی کی طرف چل پڑے۔

اب کے گاڑی چلی تو احساس ہوا کہ چودہ ہزار فٹ کی بلندی کیا ہوتی ہے۔ یہ چڑھائی کا آخری اور مشکل حصہ تھا۔ یہیں سے ڈرٹ روڈ شروع ہوتی تھی۔ اس قدر ہموار Compact اور خوبصورت کچی سڑک میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ محکمہ شہرات کا عملہ ہر وقت اُس کی مرمت کرتا اور نوک پلک سنوارتا رہتا ہوگا۔ گاڑی رینگنے لگی، اس کے بعد ایک اور چڑھائی آئی تو اس نے باقاعدہ ڈکرانا شروع کر دیا۔ آخری چڑھائی تو اس قدر عمودی تھی کہ وہ پھسل کر کئی گز نیچے چلی گئی۔ اوہ میرے خدا! میں نے سوچا وقت مقرر آ پہنچا۔ مون نے اپنے حواس مجتمع رکھے، سٹیرنگ پر اپنی گرفت نہ چھوڑی اور فوراً گیئر بدل دیا۔ ذرا سی تاخیر یا گھبراہٹ ہمیں کئی ہزار فٹ گہرے کھڈ میں گرا سکتی تھی۔ میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے اُمڈ آئے۔

"تمہاری حاضر دماغی نے آج ہمیں ایک بڑے حادثے سے بچا لیا!" میں نے اُس کی طرف توصیفی نگاہوں سے دیکھا۔

"حادثے بھی تو زندگی میں ہی ہوتے ہیں۔" وہ گاڑی سے نظریں ہٹائے بغیر بولی۔

پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر مون نے پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی۔ ہم نے باہر نکل کر اپنے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ چند ایکڑوں پر محیط ایک پلیٹ فارم جس کے سنٹر میں ریل کار کھڑی تھی۔ اُس کے پیچھے ایک بہت بڑا ریسٹورنٹ اور پلیٹ فارم کے چاروں کونوں پر لگی ہوئی بڑی بڑی دوربینیں، جن کی مدد سے لطفِ نظارگی دوبالا ہو جاتا تھا..... ریلنگ کے پاس کھڑے ہو کر جب میں نے نیچے دیکھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ ہم اس قدر عمودی چڑھائی چڑھ کر آئے ہیں۔ ہر سطح پر پھیلی ہوئی جھیلیں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ سورج کی چمک کی وجہ سے اُن کا پانی سنہرا لگتا تھا۔ چوٹی بالکل خشک تھی اور اُس پر کوئی درخت نہ تھا۔ اس کے

چاروں اُور ایک پہاڑی سلسلہ تھا لیکن اُن پہاڑوں کی چوٹیاں پائیکس پیک سے بہت نیچے تھیں۔ بے شمار مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے خوش گپیوں میں مصروف تھے..... فتح کا ایک عجیب سا نفسیاتی احساس..... کہ کسی طور ہی سہی..... بہر حال انہوں نے ایک ایسی چوٹی سر کی ہے جس کے متعلق ایک سو سال پہلے لیفٹیننٹ زیبلون نے پیشین گوئی کی تھی کہ کوئی بھی وہاں تک نہیں پہنچ پائے گا۔

ہم کافی دیر تک گھومتے رہے۔ جس سمت سے بھی دیکھتے ایک انوکھے لطف کا احساس ہوتا۔ جب چلتے چلتے تھک گئے تو ریسٹورنٹ میں جا کر چکن سینڈوچ کھائے اور کافی پی۔ مون نے آئس کریم کھائی اور پھر واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پہاڑ پر چڑھائی کی نسبت اترائی زیادہ آسان ہوتی ہے وہ خام خیالی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کسی نے اُونٹ سے پوچھا تھا کہ "چڑھائی اچھی ہے یا اترائی؟" "ہر دو لعنت!" اُس نے گردن کو جھٹکا دے کر جواب دیا تھا۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب گاڑی چیکنگ پوائنٹ پر پہنچی۔ الیکٹرانگ گیجٹس سے اس کی نبض ماپی گئی۔ بلڈ پریشر چیک کا گیا اور آخر میں جب ٹائروں کو تھرمامیٹر لگایا گیا تو مکینیکل ڈاکٹر نے دانت نکوس دیئے۔ گاڑی ایک گھنٹہ تک سفر نہیں کر سکتی۔ اس کے ٹائر اور ان سے ملحقہ حصہ بہت گرم ہو چکے ہیں اس حالت میں سفر گاڑی کی صحت اور آپ سیفٹی کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔!

ایک گھنٹہ تک ہم یہاں کیا کریں؟ مون نے کندھے اچکائے۔

کافی پئیں یا پھر تحائف کی دکان پر کچھ شاپنگ کریں۔ ایک دوسرے کو دینے کے لئے آپ کو بہت کچھ مل جائے گا۔ اس نے ہم پر ایک نگاہ غلط ڈالی۔

ایک گھنٹے تک ہم بے مقصد گھومتے رہے۔ ونڈ شاپنگ کی۔ کوئی کام کی چیز نظر نہ آئی پھر بھی چند Soverier خرید لیے۔ آخر خدا خدا کر کے گاڑی کی صحت یابی کا سرٹیفکیٹ ملا۔ پہاڑ سے نیچے اترے تو مون نے پہلے کراسنگ سے بائیں ہاتھ ٹرن لے لیا۔ دس منٹ کے بعد بہت بڑا بورڈ نظر آیا۔ ہوائی غاریں آپ کو خوش آمدید کہتی ہیں۔

بولی جو سیاح پائیکس پیک جاتے ہیں وہ ان غاروں کو بھی ضرور دیکھتے ہیں۔ یہ صحیح معنوں میں تضاد

بلندی اور پستی کا' جس کا تم ذکر کر رہے تھے۔ ایک آسمان کو چھو رہی ہے اور دوسری ''تحت الثریٰ'' کو جاتی ہے۔

ہم نے CAVES OF WINDS کے ٹکٹ خریدے۔ آٹھ ڈالر کا ٹکٹ تھا۔ یہ غاریں ایک پرائیویٹ کمپنی نے ٹھیکے پر لے رکھی تھیں اور گائیڈ کے طور پر امریکن نیوی کا ایک ریٹائرڈ' نہایت چرب زبان اور خرانٹ شخص ملازم رکھا ہوا تھا جو ہر ٹورسٹ کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا کہ کمپنی مسلسل خسارے میں جا رہی ہے۔ اور یہ کار خیر صرف انسانیت کی خدمت کے لئے سرانجام دے رہی ہے اور یہ کہ آٹھ ڈالر کی قلیل رقم کا ہدیہ کچھ اتنا زیادہ نہیں ہے۔ اگر امریکہ اس قسم کے چند آدمی مشرق وسطیٰ بھیج دیتا تو عربوں کی کھال اتارنے میں اتنی تگ ودو نہ کرنا پڑتی۔ ٹکٹ خریدنے کے بعد ہمیں کچھ دیر انتظام کرنا پڑا کیونکہ بیک وقت بیس آدمیوں سے زیادہ کو اندر لے جانا سیفٹی قوانین کے خلاف تھا۔

جب پہلی پارٹی باہر نکلی تو گائیڈ ڈیوڈ نے ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر طویل مختصر لیکچر دیا۔! جس کا لب لباب یہ تھا کہ ہم دنیا کی سب سے زیادہ خطرناک غاروں میں داخل ہونے والے ہیں جو کبھی ڈاکوؤں کا مسکن تھیں۔ وہ علاقے کا خزانہ اور خوبصورت عورتیں لوٹ کر یہاں جمع کرتے تھے اور خوب دادعیش دیتے۔ خوبصورت عورت بھی تو ایک خزانہ ہی ہوتی ہے۔ اس نے مون کی طرف دیکھا اور بے حیائی سے مسکرایا۔

مجھے اس کی نیت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔ میں نے مون کا بازو پکڑ لیا۔ بولی' فکر نہ کرو اس قسم کی باتیں ہم روز سنتے ہیں۔ یہ صرف اپنی حس مزاح کا بھونڈا مظاہرہ کر رہا ہے۔

غاریں صحیح معنوں میں بھول بھلیوں پر مبنی تھیں۔ تنگ' تاریک اور طویل' یہ اجنتا' ایلورا اور کوالالمپور کی غاروں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی تھیں لیکن ان کی اپنی ساخت تھی اور منفرد طرز تعمیر۔ گائیڈ ڈیوڈ ہمیں مختلف حصوں کی سیر کراتا رہا۔ سب سے پہلے وہ ہمیں مسٹری روم لے گیا جہاں واقعہ سر چکرانے لگا۔ ڈراؤنا منظر' دیواریں سکڑی اور گھورتی ہوئی محسوس ہونے لگیں اور اس پر مستزاد یہ کہ عجیب عجیب آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کبھی ایسے پتہ چلتا جیسے کوئی عورت بین کر رہی ہے۔ کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے قریب ہی کوئی پہاڑی جھرنا دریا میں

گر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد پانی گرنے اور سسکیوں کی آواز آنی بند ہوگئی اور قدموں کی آہٹ سنائی دی جیسے کوئی دبے پاؤں ہماری طرف بڑھ رہا ہو۔ ہمیں سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئی اور اس کے ساتھ پھر چیخیں سنائی دیں جو ہیلپ ہیلپ پکار رہی تھی۔ اس نے بعد ایک سنگین وحشی قہقہہ جیسے کوئی ڈاکو کہہ رہا ہو یہاں تمہاری مدد کون کرے گا۔ لڑکیاں ڈر کر ایک مرتبہ پھر مردوں سے لپٹ گئیں۔ کافی دیر تک چیخ و پکار' ہاؤ ہو اور شور و غوغا رہا پھر یکدم خاموشی چھا گئی۔ اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹنے لگا اور ایک کونے سے ڈیوڈ کی آواز ابھری۔

کہیں یہ خود ہی تو سارا ڈرامہ نہیں کر رہا تھا؟ مجھے تو بہت بڑا فنکار نظر آتا ہے۔ میں نے پوچھا اس کے حلق سے بگل تو بج سکتے ہیں نسوانی چیخ نہیں سنائی دے سکتی۔ مون نے جواب دیا چلتے چلتے ہم Magnificient Ha آ گئے۔ بہت بڑا کمرہ جہاں ایک سٹیج بنی ہوئی تھی اور اس پر پرانے لباس' ہتھیار' اوزار اور کچھ زیورات پڑے تھے۔

یہ ڈاکوؤں کے سردار کا کمرہ تھا۔ ڈیوڈ کرایا۔ تمام لوٹی ہوئی دولت یہاں رکھی جاتی تھی۔ اس سٹیج پر بیٹھ کر وہ دربار لگاتا اور اپنا لائحہ عمل تیار کرتا تھا۔ اس ہال کو سرنگ کے ذریعے باہر بہتے ہوئے دریا کے ساتھ ملایا گیا تھا۔ خطرے کے وقت ڈاکو دریا تک پہنچ کر کشتیوں کے ذریعے فرار ہو سکتے تھے۔

کیا اب بھی یہ سرنگ دریا تک جاتی ہے؟ ایک اطالوی سیاح نے پوچھا۔

بولا نہیں دریا خشک ہو گیا ہے اور سرنگ منہدم' ویسے تم چاہو تو از سر نو کھود سکتے ہو۔! اطالوی اس اچانک حملے کیلئے تیار نہ تھا۔ منہ سے تو کچھ نہ بولا صرف تلملا کر رہ گیا۔

لگتا ہے ہے تم ضرور اگلے جنم میں اس گروہ کے رکن رہے ہو! میں نے اطالوی کی اخلاقی مدد کی۔

میرے ایسے نصیب کہاں! اس نے ایک مرتبہ پھر مون کی طرف دیکھا۔

یہاں رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ بے بس اور لاچار عورتوں کو ناچ پر مجبور کیا جاتا تھا۔ مئے ناب کے جام لنڈھائے جاتے تھے۔ آنکھوں سے زیادہ ہاتھوں سے کام لیا جاتا تھا۔ ہاتھوں کی جگہ دانت استعمال ہوتے تھے۔! اس نے اپنے غلیظ بتیسی اس قدر نمایاں کی کہ اس کے گال کھنچ کر کانوں تک جا پہنچے۔

شراب' شباب' جبر' ہیبت' آ و! اور واہ! سب ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔

یہ دراصل مسٹری روم سے زیادہ ہسٹری روم ہے۔ ڈیوڈ کی لن ترانیاں قابل فہم تھیں۔ اسے تنخواہ ہی اس بات کی ملتی تھی کہ اپنی چرب زبانی سے ماحول کو سحر زدہ کر دے۔ سچ اور جھوٹ کو اس قدر گڈ مڈ کر دے کہ ان میں تخصیص مشکل ہو جائے۔ کمرشل ایتھکس عام اخلاقیات سے مختلف ہوتی ہے۔ کمپنیاں اپنی پراڈکٹس بیچتی ہیں اور ان کے سیلز مین اپنا فن! ایوی کا ایک Petty offiver ایک Petty پر معمور تھا۔ روزی کمانے کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ ان تاریک گھپاؤں میں چلتے چلتے اس کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ توند کچھ زیادہ ہی باہر نکل آئی تھی اور بادی النظر میں دمے کا مریض لگتا تھا۔

ہم کچھ دیر وہاں رکے پھر مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے گریڈ ہال میں آ گئے یہ ایک بہ بڑا ہال تھا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ ڈاکوؤں نے سخت چٹانوں کو اس قدر گہرائی میں کس طرح کاٹا ہوگا۔ تراش خراش کی ہوگی۔ مسٹری روم کے برعکس یہاں مناسب روشنی تھی۔ دیواروں کو تراش کر مینا کاری کی گئی تھی اور مختلف شکلیں بنائی گئی تھیں۔ زیادہ تصویریں نیم برہنہ عورتوں کی تھیں۔ جن کی شکلوں سے سے زیادہ ان کے اعضاء کی نمائش کی گئی تھی۔ غربی دیوار پر بیل کی تصویر غالباً! ڈاکوؤں کی طاقت کا مظہر تھی۔

یہ ان کا بینکوئٹ ہال تھا۔ ڈیوڈ نے وضاحت کی۔ کامیاب ڈاکے کے بعد جشن منایا جاتا تھا۔ وقتی طور پر اس اعصاب شکن ماحول سے فرار حاصل کیا جاتا تھا اور جشن کے بعد مال غنیمت بانٹا جاتا تھا۔ یہ بھی ایک قسم کی بندر بانٹ ہوتی تھی۔ پہلے سردار اپنا حصہ نکالتا تھا اور پھر حسب مراتب! ہر قیمتی زیور' ہر خوبصورت عورت اور قیمتی شراب پر سردار کا حق فائق تھا۔ بچے کھچے مال پر ڈاکو یوں جھپٹتے تھے جس طرح بھوکے کتے ہڈیاں چچوڑتے ہیں۔

زبردست قہقہہ بلند ہوا جس میں نمایاں آواز مون کی تھی۔ بولا ایک سپاہی شاعر نہیں ہوتا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔

کیا تم امریکن نیوی میں بھی گائیڈ نہیں تھے۔ ایک آئرش لڑکی نے پوچھا

مس گائیڈ Mis Guide اطالوی سیاح نے وار کیا۔

اس کے بعد وہ ہمیں کرسٹل روم لے گیا۔ اس کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ خاصا محتاط ہو گیا۔ کسی ممکنہ سوال یا جملے سے بچنے کے لئے کہنے لگا اب میں آپ کو پندرہ منٹ کے لئے آزاد چھوڑتا ہوں لیکن یہ نہ بھولیں کہ آزادی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ از خود باہر نکل پاتے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ راستہ تلاش نہ کر سکیں اور ان غلام گردشوں میں کھو جائیں تو پھر یہ خادم حاضر ہے۔ اس نے اپنے بھاری بھرکم وجود کو تھوڑا سا خم دیا۔ دیواروں کے ساتھ الارم بیل لگی ہوئی ہے۔ گھنٹی بجایئے اور میں آپ کی مدد کو پہنچ جاؤں گا۔

یہ سنتے ہی مردوں نے اپنی گرل فرینڈز کو بانہوں میں جکڑ لیا اور رینگتے ہوئے ادھر ادھر کھسک گئے۔ ہر چند کہ امریکی معاشرے میں کوئی خاص پابندیاں نہیں ہیں اور نہ ہی فطرت کے تقاضے جوار یا کماد کے کھیتوں کے منتظر رہتے ہیں۔ لیکن ایڈونچر کا اپنا ایک چارم ہے۔ بخطرہ جگہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے یا اسے پتہ چلاتا تھا کہ چڑیوں نے ہر جگہ گونسلے بنا رکھے ہیں اور دانے دنکے کی چگائی ہو رہی ہے۔ ایک جگہ ایک حبشی کی چمکتی ہوئی سرخ سرخ آنکھیں نظر آئیں وہ اخلاق کی سب حدیں پھلانگ چکا تھا۔

مون کہنے لگی' شاہ کتنے ظالم ڈاکو تھے۔ عورتوں کو یہاں قید کر دیتے تھے۔ کیا ان کا دم نہیں گھٹتا ہو گا؟

جب پولیس شکاری کتوں کی طرح تعاقب کرے تو پھر کونوں کھدروں میں ہی پناہ لینی پڑتی ہے۔

بالفرض تم اس زمانے میں ڈاکو ہوتے تو مجھے کہاں رکھتے۔ اس کے لہجے میں بلا کی شوخی اور شرارت تھی۔

اس سے بھی زیادہ محفوظ جگہ پر۔

وہ کونسی جگہ؟

دل میں.....

مذاق چھوڑو سچ سچ بتلاؤ؟ وہ مچل گئی۔

جب تمہاری حس مزاح پھڑک رہی ہے تو میں کیونکر سنجیدہ ہو سکتا ہوں۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ غار کے ایک کونے سے ایک سیاہ چمگادڑ اڑ کر آئی اور مون کے بالوں سے ٹکراتی ہوئی دیوار کے ساتھ جا لگی۔ ڈر کے مارے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ شاہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ باہر چلیں۔

ڈر مجھے بھی لگ رہا تھا۔ چمگادڑ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے۔ ایسے پتہ چلتا کہ الامر بیلز دیواروں پر نہیں لگی بلکہ میرے وجود میں نصب ہو گئی ہیں۔ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر میں نے مون کو اپنے بازوؤں میں سمیٹا اور غار سے باہر نکل آیا۔ غار کے کونے پر ڈیوڈ کھڑا تھا۔ اس نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا اور کہنے لگا ایسے پتہ چلتا ہے جیسے کوئی جنگلی جانور آپکے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اور آپ پسینہ پسینہ ہو کر آگے دوڑ رہے ہیں TAKEIT EASY MAN اس نے مجھے تھپکی دی۔

جنگلی جانور پیچھے نہیں آگے کھڑا ہے۔ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ ہم نے تھوڑی دیر تک اپنی سانسیں ہموار کیں اور پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کی ڈرائیو کے بعد مون نے گاڑ کا رخ کوئر بیئر کے کارخانے کی طرف موڑ دیا۔

کیا کوئی کسر باقی رہ گئی ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

کہنے لگی' لگے ہاتھوں یہ بروری بھی دیکھ لو' کونسا روز روز آنا ہوتا ہے۔ پائیکس پیک کے خوبصورت پھولوں کی خوشبو من میں رچ بس گئی ہے۔ کیا ضروری ہے کہ اسے بیئر کے بھبکوں سے کافور کیا جائے۔

بیئر کی بھی اپنی ایک خوشبو ہے۔ یہ تو ان سے پوچھو جو اس کے رسیا ہیں۔ سنہری سیال مشروب جس کے اوپر اٹھتی ہوئی جھاگ دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے سونے پر چاندی کی تہہ جم گئی ہو۔ یہاں لوگ اتنا پانی نہیں پیتے جتنی بیئر استعمال کرتے ہیں۔

کوئر بیئر کا کارخانہ ڈینور سے تیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اسے ایک اعتبار سے شہر کے مضافات بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو گیٹ کیپر نے ہمیں بتایا کہ سیاحوں نے کے لئے صرف آدھ گھنٹہ رہ گیا ہے جلدی کریں اور جو کچھ بھی دیکھنا ہے دیکھ لیں۔ جس قدر پینا ہے پی لیں۔

بروری دیکھنے کے لئے کیا ہمیں پرمٹ لینا پڑے گا؟ میں نے پوچھا۔ بولا اس کی ضرورت نہیں بس

ایک FORMEL PERMISSION لینی پڑے گی۔ آپ بھی سیاحوں کے اس آخری گروہ میں شامل ہو جائیں جو ابھی ابھی بس سے اترا ہے۔

چالیس کے قریب جاپانی ٹورسٹ تھے۔ ایک جیسی شکلیں' ایک جیسا قدک کاٹھ' ایک مخصوص قسم کی مسکراہٹ Yelliw Race جن کی جیبوں میں چمکتا ہوا پیلا سونا ہے۔ جو جنگ ہار کر بھی نہیں ہارے۔ جن کی ہمتیں جوان' دماغ روشن اور عزم غیر متزلزل ہے۔ امریکہ' یورپ اور ایشیا میں یہ لوگ یوں گھومتے ہیں جیسے کوئی جاگیردار اپنی اسٹیٹ میں پھرتا ہے۔ بڑے وثوق اور تیقن کے ساتھ' بڑے طمطراق سے۔ آدھا کیلیفورنیا انہوں نے خریدا ہوا ہے۔ نیویارک کا مین ہٹن ان کی معاشی لسٹ پر ہے۔ اگر یہ نظریں پھر لیں تو اول سٹریٹ میں شگاف پڑ جاتے ہیں۔ ہانگ کانگ کا سٹاک ایکسچینج ڈانوں ڈول ہو جاتا ہے۔ ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔

آدھے گھنٹے تک ہم بروری کے مختلف حصوں میں گھومتے رہے۔ گائیڈ ہمیں آلات کشید دکھاتے رہے۔ نہایت صاف ستھرا ماحول' بہت ماڈرن مشینری' ہر شخص اپنے کام میں جتا ہوا۔ گردوپیش سے بے نیاز' انہماک' یکسوئی اور مہارت جب یکجا ہو جائیں تو پھر پیداوار کثیر بھی ہوتی ہے اور عمدہ بھی۔ جب جو اور مکئی مختلف مراحل سے گزر کر آخری پائپ سے پانی بن کر نکلتے ہیں تو بے حس اور بے جان نہیں رہتے بلکہ سراسر حرارت بن جاتے ہیں۔ ٹھنڈی اور یخ بستہ تازہ بیئر' پیئو کہ مفت لگا دی ہے۔ خون دل کی کشید' بیئر جو مفت تھی اور اس حساب سے پی جا رہی تھی۔ ہر چند کہ خون دل نہیں بلکہ خون جو کی کشید تھی۔ ایک نفسیاتی کیفیت جو صرفہ مفت کی شراب پینے سے آتی ہے۔ لوگ نشے میں جھوم رہے اور ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ اتنا شور مشینوں کا نہیں تھا جتنا ''دختر جو'' کی وجہ سے مچا ہوا تھا۔

اب تمہارے لئے اورنج جوس کہاں سے منگوایا جائے؟ مون مجھے زچ کرنا چاہتی تھی۔

کیا میں نے تمہیں روکا ہے۔

نہیں مجھے بیر نہیں پینی۔ شراب بھی طبعاً پسند نہیں کرتی۔ بس کبھی کبھی بلڈی میری یا شمپین لے لیتی ہوں۔

لیکن امریک تو اسے اس قدر پیتے ہیں جس طرح عرب بدو صحرا میں سفر کرتے ہوئے پانی پیتے ہیں۔
یہ درست ہے' کوئر بیر امریکہ میں اتنی ہی پاپولر ہے جتنی بینی کین یورپ میں' یا فاسٹر بیئر آسٹریلیا میں ہے۔

کیا امیر کی صرف Cooer Bear ہی پیتے ہیں۔

ضروری نہیں یہاں دنیا کا ہر برانڈ ملتا ہے اور ہر شخص اپنے اپنے Taste کے مطابق پیتا ہے۔

کیا اس سے معاشرتی برائیاں نہیں پھیلتیں؟ میں نے پوچھا

کہنے لگی' یہ درست ہے اسی وجہ سے امریکہ میں 1930ء میں اس پر پابندی لگ گئی تھی لیکن لوگوں نے اس Prohibition پر بڑا شور مچایا اور احتجاج کیا۔ اس کی آڑ میں لوگ شراب کا ناجائز کاروبار کرنے لگ گئے اور راتوں رات' دیکھتے ہی دیکھتے کروڑ پتی بن گئے۔ انہیں Boot Leggers کہا جاتا تھا۔ کینیڈی خاندان اس معاملہ میں بدنام ہے۔ بالآخر حکومت نے رائے عامہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور شراب پر سے پابندی اٹھالی گئی۔

کیا اب پینے کی مکمل آزادی ہے؟

خاصی حد تک لیکن پر کر ڈرائیونگ نہیں کی جاسکتی۔ بلانوش سیاست کے میدان میں بھی پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ کئی وزیروں اور ججوں کی نامزدگی امریکن سینٹ نے صرف اس وجہ سے مسترد کردی کہ وہ بلا کے نوش تھے اور اپنے فرائض بجا طور پر ادا نہیں کرسکتے تھے۔

گویا عوام کے لئے اذن عام ہے اور خواص پر پابندیاں عائد ہیں؟

جو لوگ اونچے عہدوں کے متمنی ہوتے ہیں ان کا کنڈکٹ ہر قسم کے شک وشبے سے بالاتر ہونا چاہیے۔ یہاں سیکس پر کوئی پابندی نہیں لیکن ایک سیاستدان کے لئے لازم ہے وہ سنبھل کر چلے۔ ایڈورڈ کینڈی کی مثال بڑی واضح ہے۔ کار کے حادثے میں اس کی دوست پی کر چھیل میں کیا ڈوبی کینیڈی خاندان کا مستقبل غرق آب ہوگیا اور امریکہ کی صدارت ان کے لئے ایک خواب بن کر رہ گئی۔ اس طرح بگری ہارٹ کی محبوبہ ڈونا رائس اس کی گود میں نہیں بلکہ گھٹنوں میں بیٹھ گئی۔

لیکن رنگین جان کینیڈی پھر بھی امریکہ کا صدر بن گیا۔ میں نے کہا۔ مارلن منرو سے اس کا معاشقہ ایک طویل عرصہ تک چلتا رہا اور ایک طویل عرصہ تک جیکی کو پتہ نہ چل سکا کہ اس کی ازدواجی زندگی ہائی جیک ہو چکی ہے۔ ایک دن جب وہ یورپ کے دورے سے گھر آئی تو اپنے پلنگ پر زیر جامہ دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئی۔ اسے اٹھا کر دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ پھر بڑے غصے سے اسے کینیڈی کے منہ پر دے مارا اور کہنے لگی۔

بولی ''کینیڈی کی کامیابی کا راز اس کے معاشقے میں نہیں بلکہ اخفائے راز تھا۔ ایک طویل عرصہ تک لوگوں کو پتہ نہ چل سکا کہ ان کا محبوب صدر اپنی خانگی زندگی میں کس قدر بے وفا ہے۔ یہی ہماری زندگی کا المیہ ہے کہ آدمی اگر پکڑا جائے تو چور نہیں تو صاد۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اعلان ہوا کہ وقت ختم ہو گیا ہے۔ سب لوگ فیکٹری سے باہر تشریف لے جائیں۔ کچھ لوگ اپنے قدموں پر چل کر باہر نکلے کچھ چل کر تو باہر آئے لیکن یوں لگتا تھا کہ چل نہیں رہے فضا میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول رہے ہیں۔ جن کی ڈور مکمل طور پر کٹ گئی تھی انہیں انسانی بیساکھیوں کا سہارا دیا گیا۔ چند ایسے بھی تھے جنہوں نے ترنگ میں آخر اس قسم کی تقریر شروع کر دی جس طرح ہمارے سیاستدان موچی دروازے میں کرتے ہیں۔

جب ہم ڈینور پہنچے تو سیسانا پائلٹ جیسے ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا بولا اگر آپ لوگ ذرا سا بھی اور لیٹ ہوتے تو میں پرواز کر جاتا تھا۔ دیگر مسافر زچ ہو رہے ہیں۔ مون نے معذرت کی۔ جہاز کے انجن پھڑ پھڑائے اور کھلونا فضا میں بلند ہو گیا۔

میکارن ایئر پورٹ رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ لگزر کیسینو سے اٹھتی ہوئی سرچ لائٹ جہازوں کی رہنمائی کر رہی تھی۔ چند کہ ماڈرن ایوی ایشن میں اس قسم کی روشنیوں کی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ جہاز کمپیوٹرائزڈ ہیں اور الیکٹرانک گیجز کی مدد سے کنٹرول ٹاور سے براہ راست معلومات ملتی ہیں۔ سرچ لائٹ کی رہنمائی صرف اس حد تک تھی کہ پتہ چلتا کہ کیسینو کس سمت میں ہے۔ اس کے اہرام کی چوٹی سے یہ لائٹ نکلتی اور ایک دائرے کی صورت میں رقص کرتی رہتی ہے۔

ایئر پورٹ سے ہم نکلے تو لیموزین تیار کھڑی تھی۔ اس کا بندوبست بھی مون نے پیشگی کر لیا تھا۔ کہنے کو تو

یہ ٹیکسی کی ایک قسم ہے لیکن اس میں اور ایک عام کیپ میں وہی فرق ہوتا ہے جو مولو جولا ہے کی کھڈی پر بنی ہوئی کھدر اور شنگھائی کی دو گھوڑا بوسکی میں ہوتا ہے۔ اندر بیٹھنے پر محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی کسی ماڈرن ڈرائنگ روم میں آ گیا ہو۔ سیٹیں صوفے کی طرح نرم، دبیز اور کشادہ، ایک طرف فریج جس میں ہر قسم کے مشروبات اور پھل رکھے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف کلر ٹی وی جس پر ہر قسم کی بلیو، ڈیپ بلیو اور ویری ڈیپ بلیو فلمیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ آخری آئٹم آدمی دیکھتا نہیں بنواتا ہے۔ نیویارک اور بڑے بڑے شہروں میں کروڑ پتی لوگ ہوٹلوں میں دادِ عیش نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اخبار والے اور بلیک میلران کا کیمروں اور ٹیپ ریکارڈرز کے ساتھ پیچھا کرتے ہیں۔ اور ان کے معصوم راز طشت از بام کر کے ان کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول سکتے ہیں یا پھر اتنی بڑی رقم کا مطالبہ کرتے ہیں جسے ادا کرنے کے بعد کروڑ پتی صرف پتی رہ جاتا ہے۔ کروڑوں کے چکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ''موبائل ہوٹل'' کے طور پر لیموزین کام آتی ہے جس کے مالک، منیجر اور ڈرائیور کے ساتھ طے کیا جاتا ہے کہ فلاں موڑ پر کھڑی ہو جائے۔ عیاش لوگ ایک دم کار سے کالے شیشوں والی عینک لگا کر باہر نکلتے ہیں اور بڑی پھرتی سے لیموزین میں جا بیٹھتے ہیں اگلی گلی میں ان کی داشتہ انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ گاڑی روک کر اس سے یوں اچکتے ہیں جیسے ابز چڑیا اٹھاتا ہے۔ ڈرائیور مڑ کر دیکھ سکتا۔ اگر کوشش کرے بھی تو نہ تو کالے شیشوں کے باہر کچھ دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی سنا جا سکتا ہے۔ اگر سیٹھ نے ڈرائیور کو کوئی ہدایت دینی ہو تو مائیک کے ذریعے اس سے بات کرتا ہے۔ اس کے بعد چل سو چل سیٹ کی سیٹ، صوفے کا صوفہ، بستر کا بستر، ڈرائیور اس وقت تک شہر کی سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہے گا جب تک صاحب کی تسلی نہیں ہو جاتی۔ ویسے ان میں اکثر لوگوں کو مثال لکھنو کے ان نوابوں کی سی ہوتی ہے جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ دیکھ کر ہی سیراب ہو جاتے تھے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے۔

اتنی مہنگی گاڑی لینے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے پوچھا۔

بولی ''صرف تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے۔ نہیں تو اس قدر وسیع و عریض گاڑی میں بیٹھ

کر مجھے خود الجھن ہوتی ہے۔ ایئر پورٹ سے ہوٹل چند میل کے فاصلے پر تھا گاڑی نے چند موڑ کاٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایم جی ایم گرینڈ پہنچ گئی۔

اس رات میں گھوڑے بیچ کر سویا۔ اتنی قیمتی چیز امریکہ میں اس قدر سستی بک سکتی ہے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی ساتھ ساتھ فخر بھی ہوا کہ وطن عزیز میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہے اور ہم جب چاہیں اہل امریکہ کو شرمسار کر سکتے ہیں۔ دراصل فرق یہ ہے وہاں گھوڑوں کی قدر و منزلت تاجر متعین کرتے ہیں یہاں یہ اپنی قیمت خود لگاتے ہیں۔ جب بھی مناسب موقع آتا ہے شاہی اصطبل کے در کھل جاتے ہیں اور بلا روک ٹوک ان کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے۔ عیش و آرام راتب کا معقول بندوبست۔ جسم اندر مخملیں بہاروں میں اور ضمیر باہر بھٹکتا ہوا۔ جب بھی کوئی شخص اپنے آپ کو بیچتا ہے تو یہ ایک حادثہ ہوتا ہے اور جب عوام کا اعتماد فروخت کرتا ہے تو یہ المیہ ہوتا ہے۔ جمہوریت ہم تک پہنچا تو دی گئی ہے اس کے آداب نہیں بتلائے گئے۔ ہر کھیل کے کچھ قواعد و ضوابط ہوتے ہیں۔ حدود و قیود ہوتی ہیں۔ ہر چہ بادا باد نہیں ہوتا۔

سورج کی تیز کرنوں نے کھڑکی سے جب مسلسل جھانکا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ گھڑی دیکھی تو حیران رہ گیا۔ دن کا ایک بجنے والا تھا۔ ناشتے کی تو ویسے ہی چھٹی ہو گئی تھی۔ لنچ بھی سرک رہا تھا۔ میں نے روم سروس کو فون کر کے کافی کا آرڈر دیا اور شیو کرنے باتھ روم میں چلا گیا۔

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے اپنے سراپا کا بھرپور جائزہ لیا۔ دو تین زاویوں سے اسے جانچا پرکھا "کیا بات ہے؟ اتنے غور سے تم نے پہلے تو کبھی اپنے آپ کو نہیں دیکھا؟ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے آئینہ بول رہا ہے۔

Don't be silly۔ میں نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ اسے ڈانٹا۔

یہی بات تو میں تمہیں کہنے والا تھا Don't be silly۔ اب کے وہ کافی سنجیدہ تھا اور اس کے لہجے میں مزاح کی کوئی رمق نہ تھی۔

ہو سکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو!

یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو جاؤ!

جب میں تیار ہو کر نکلا تو ویٹر کافی کی ٹرے رکھ گئی تھی۔ نیلی کیتلی سے دودھیا بھاپ نکل رہی تھی۔ ساتھ ہی کریم کا چھوٹا سا کپ بھی پڑا تھا۔ میں نے کافی کا کپ بنایا اور سگار سلگا کر سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ بڑی مزیدار کافی تھی۔ سگار کا دھواں اور بھی بھلا لگ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہولے ہولے کوئی مساج کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں گھڑی پر نگاہ ڈالی تو دن کے دو بج رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر مون کو فون کیا لیکن دوسری طرف سے جواب نہ آیا۔ سمجھ گیا کہ وہ باہر گئی ہے۔ کپڑے بدل کر میں نیچے مرکزی ہال میں گیا۔

ہال حسب سابق فل تھا کوئی بھی ٹیبل ایسا نظر نہ آیا جو خالی ہو۔ سانتا فے بارالبہ کافی حد تک خالی تھا۔ چند بوڑھے کاؤنٹر پر بیٹھے بیئر پی رہے تھے۔ بار دراصل رات کو جاگتے ہیں اور یہ ان کی خوبی ہے کہ جب سورج غروب ہوتا ہے تو مے نوش طلوع ہوتے ہیں۔ سلاٹ مشینوں پر بھی زیادہ رش نہیں تھا۔ کچھ عورتیں بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے حلقے بتا رہے تھے کہ یہ ساری رات قسمت آزمائی کرتی رہی ہیں۔ ستے ہوئے چہرے، جھکی ہوئی کمریں اور بکھرے ہوئے بال اس کھیل میں بھی بہت چارم ہے خاص طور پر بوڑھے مرد اور عورتوں کے لئے! اول تو کسی خاص ٹیکنیک کی ضرورت نہیں ہے بس سکہ خانے میں ڈالا اور ہنڈل گھما دیا۔ اس کے بعد یا قسمت یا نصیب۔ اگر کچھ نہ نکلا تو اس عمل کو دہراتے چلے گئے جب کوئی نمبر جزوی طور پر یا پوری طرح ہٹ ہو جائے تو ان کی مسرت دیدنی ہوتی ہے۔ سنہری سکے ایک جھنکار کے ساتھ نیچے بنی ہوئی پاکٹ میں گرتے ہیں ۔چھن، چھن، چھن، ٹن ٹناٹن، یوں لگتا ہے۔ گویا عالم غیب سے ہن برس رہا ہو۔

انہی سکوں کو پھر استعمال کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ دراصل ٹوکن ہوتے ہیں۔ اس طرح آغاز چاہے کیسا بھی ہو انجام اکثر رسوائی ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ تمام سکے مشین نگل لیتی ہے اور کھلاڑی بوجھل دل اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ کمرے میں چلا جاتا ہے۔

میں کچھ دیر کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا ایک بوڑھی امریکن نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ زبان سے تو کچھ نہ بولی لیکن اس کی نظریں صاف احتجاج کر رہی تھیں۔ باڈی لینگویج اب باقاعدہ ایک سائنس بن گئی ہے۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو جسم کا انگ انگ بولتا ہے۔ اعضاء شاعری کرتے ہیں۔ خوشی اور خوف وملال کا اظہار کرتے ہیں۔ ویسے بھی ایک جواری کی مخصوص نفسیات ہوتی ہے۔ وہ اپنے دائیں بائیں لوگوں کے کھڑا ہونے کو اچھا شگون نہیں سمجھتے۔ وہ یہ بھی چاہتے کہ ان کی عجیب وغریب حرکتوں سے لوگ انہیں خبطی سمجھیں۔ کبھی دایاں پاؤں بائیں ٹانگ پر رکھ لیں گے تو کبھی ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے۔ کرسیاں بدلیں گے ہینڈل گھمانے کا انداز تبدیل کریں گے۔ وقت تاریخ اور نمبروں سے اپنے مقدر کو بدلنے کی کوشش کریں گے۔ کوئی سات نمبر کا رسیا ہوگا تو کوئی تیرہ نمبر سے متنفر اور خائف۔

مشینوں کی کھٹ کھٹ سے ہال کے اس حصے میں کافی شور ہو رہا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ جب کھیلنا نہیں تو پھر دیکھنے میں کیا تکہ۔ میں چل کر کیسینو سے ملحقہ THEME PARK میں آ گیا۔ ہر چند کہ تھیم پارک کیسینو کا ایک حصہ ہے لیکن ایک اعتبار سے الگ تھلگ بھی ہے۔ دس ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا پارک جو ڈزنی لینڈ کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ اور ایل اے کے ڈزنی لینڈ کا قریباً دسواں حصہ ہے ڈزنی کا کمال یہ ہے کہ اس نے تفریح کا اک نیا تصور دیا۔ ایک ایسی تفریح گاہ جس میں بچے اور بڑے یکساں طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں اور وقتی طور پر ہی سہی' اپنے تمام تفکرات اور غم گیٹ کے باہر چھوڑ آتے ہیں۔ آج والٹ ڈزنی زندہ نہی ہے لیکن مر کر بھی وہ امر ہو گیا ہے۔ اس کی Segacy تمام دنیا میں پھیل گئی ہے۔ امریکہ کے کونے کونے میں چھوٹے بڑے ڈزنی لینڈ یا ڈزنی اسٹائل تفریح گاہیں ہیں۔ فلوریڈا کے شہر آرلینڈو میں جو ڈزنی ورلڈ APCARTCENTER لاس اینجلس کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ اب یورپ بھی امریکہ کی نقالی پر اتر آیا ہے اور فرانس میں پیرس کے قریب EURO.DISNEY ایک کثیر رقم خرچ کر کے بنایا گیا ہے۔

ایم جی ایم بھلا کہاں پیچھے رہنے والا ہے اس نے بھی کروڑوں ڈالر خرچ کر کے اپنی چھوٹی سی دنیا آباد کر لی ہے۔ جہاں خطرناک JOYRIDES میں جو آدمی کو "سدرۃ المنتہیٰ" سے "تحت الثریٰ" تک لے جاتی ہیں۔ جو ریل کی پٹری پر یوں گھومتی ہیں جس طرح لکڑی کے بنے ہوئے بورڈ پر لٹو گھومتا ہے۔ تین مصنوعی دریا' اس کے علاوہ رنگا رنگ پروگرام۔ وہاں بھی ریسٹورنٹ مشروبات اور ماکولات کثرت کے

ساتھ ہیں۔کافی دیر تک تھیم پارک میں گھومتا رہا۔ڈرتے ڈرتے وہ چار Rides بھی لئے۔کشتی میں بیٹھ کر مصنوعی دریاؤں کی سیر بھی کی۔ایسی کشتی جس میں نہ خدا کا احسان اٹھانا پڑتا ہے نہ لنگر کو اٹھانے یا گرانے کی نوبت آتی ہے۔ہر چیز مکینکل، بجلی کے زور سے چلنے والی..... پارک میں بڑوں سے زیادہ بچے تھے۔ دراصل اس کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ لوگ بچوں کے ساتھ تفریح کے لئے ویگاس آئیں۔والدین کیسینو کے اندر اور بچے باہر۔کیونکہ قانون کے مطابق نابالغ جوانہیں کھیل سکتے۔جب چلتے چلتے تھک گیا تو کینٹکی فرائیڈ چکن کے سٹال پر جا کر تین پیس کا چکن پیک خریدا۔تھوڑا سا کول (سلاد) فرنچ فرائیز۔

تھیم پارک سے واپس آ کر میں سیدھا کمرے میں آ گیا کیونکہ تھکن محسوس ہو رہی تھی۔کپڑے بدلے اور بستر پر لیٹ گیا۔کافی دیر تک نیم غنودگی کا عالم رہا۔کبھی آنکھ لگ جاتی، کبھی کھل جاتی، شام کے سات بجے دروازے پر دستک ہوئی۔مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ کون ہو سکتا ہے۔میں نے ایک جست میں دروازے تک پہنچا تو اور جب دروازہ کھولا تو بادلطیف کا ایک نہیں تین جھونکے بیک وقت اندر آئے۔مون اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر کھڑی تھی۔

تم نے تو کمال کر دیا۔تین گھنٹوں سے تلاش کر رہے ہیں کہاں کھو گئے تھے؟

ناراضی کا اظہار ہی کرتی رہو گی یا تعارف بھی کراؤ گی۔!اس کے ساتھ کھڑی لمبے قد والی لڑکی بولی۔

آئی ایم سوری..... مون نے معذرت کی۔تمہارا غائبانہ تعارف تو میں کرا چکی ہوں۔ان سے ملو یہ میری بچپن کی دوست اور کلاس فیلو سارا ہے۔شوخ، چنچل اور چلبلی اور یہ کیتھرائن جو ہم سے ایک سال جونیئر تھی۔

سارا کا قد لمبا تھا، جسم انتہائی متناسب اور بال ہلکے سنہری رنگ کے جو کٹنے کے باوجود اس کے شانوں تک ڈھلک آئے تھے۔جب مسکراتی تو ایسے پتہ چلتا جیسے کوئی ماڈل ہے۔جو اپنے موتیوں کی طرح سفید دانتوں کی نمائش کر رہی ہے۔اس نے سفید رنگ کی نیکر پہن رکھی تھی جس کے اوپر پھولوں والی ہلکی گلابی رنگ کی شرٹ بڑی سج رہی تھی۔کیتھرائن کا قد چھوٹا اور گول مٹول چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔یوں لگتا تھا جیسے کوئی بچی ابھی ابھی سکول سے آئی ہو۔اس نے اسکرٹ پہن رکھی تھی۔مون کو پہلی دفعہ میں جین میں دیکھا

کالی جین اور اس پر سفید شرٹ۔

کہو شاہ! پسند آئیں۔ میری خوبصورت سہیلیاں؟ مون مسکرائی۔

ویری گڈ! تمہاری سہیلیاں خوبصورت ہیں لیکن عقل نہیں لگتیں۔

کیا مطلب؟ تینوں بیک وقت بول اٹھیں۔

اگر ان میں رائی بھر بھی عقل ہوتی تو تمہارے ساتھ کبھی نہ پھرتیں Absolutely correct

سارا نے قہقہہ لگایا۔

اس نے ہماری بیوٹی کو Over shadow کر دیا ہے۔ جس سے ہماری مارکیٹ ویلیو بہت متاثر ہوتی ہے۔

کیا فرق پڑتا ہے ہم نے کونسا شوبز میں جانا ہے۔ یا فلموں کام کرنا ہے۔ کیتھرائن کا لہجہ انکسارانہ تھا۔

مذاق چھوڑو، سچ سچ بتاؤ، ہم کیسی لگ رہی ہیں؟ مون مچل گئی۔

مجھے تو ایسے لگتا ہے جیسے ویگاس میں تم تینوں بیوٹی کانٹیسٹ کے وکٹری سٹینڈ پر کھڑی ہو۔

وکٹری تمہارے حصے میں آئی ہے۔ اور سٹینڈ ان کے قبضے میں؟

ویگاس کے بیوٹی کانٹیسٹ میں شاعر لوگ جج نہیں ہوتے۔ تم تو سارے میڈل اس کی جھولی میں ڈال دیتے۔ سارا غالباً تھوڑی سبکی محسوس کی۔

ہم بھی کس فضول بحث میں الجھ گئے ہیں۔ مون موضوع بلا۔ چلو باہر گھومتے ہیں۔ اور آج تمہیں سینز رپیلس کی سیر کراتے ہیں۔

لیکن پہلے ایک گرم گرم کپ کافی، سارا نے گردن کو ہلایا۔

اور نرم نرم چکن سینڈوچ'' کیتھرائن نے اس کی تائید کی۔

ہم کافی پی کر باہر نکلے تو رات اپنے جوبن پر تھی۔ ویگاس مکمل طور پر روشنیوں کے حصار میں آ چکا تھا۔ وسیع و عریض بلوارڈ میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے سیاح حیران نظروں سے اس طلسم ہوشربا کو دیکھتے ہوئے اِدھر اُدھر گھور رہے تھے۔ گرم تیز ہوا چل رہی تھی۔ جب ہم ہلٹن فلیمنگو

کے قریب پہنچے تو سارا نے مشورہ دیا کہ کچھ دیر وہاں ٹھہرا جائے۔ کیتھرائن کہنے لگی۔ ایم جی ایم اور سیزر پیلس میں گھرے ہوئے اس بونے کی حیثیت ہی کیا ہے۔ کیوں خواہ مخواہ اپنا موڈ خراب کریں۔ اب سیدھا سیزر پیلس میں چلتے ہیں! نہیں ایسی بات نہیں مون نے اسے ٹوکا۔

کسی زمانے میں ہلٹن فلیمنگو کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ 1946ء میں نیویارک کے بدنام زمانہ بینجمن ویگاس نے اسے بنایا۔ اس وقت یہ امریکہ کا سب سے بڑا کیسینو تھا۔ ہر چند کہ مخالف گروپ نے اسے قتل کر دیا لیکن وہ اس شہر کو رنگ اور روپ دے گیا۔ اس کے گیمبلنگ ٹیبلز اور خاص طور پر بوفے ڈنر مشہور تھے۔ لیکن یہ بالآخر زمانے کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکا۔ اس کے مقابلے میں بڑے بڑے اور نہایت خوبصورت کیسینو بن گئے۔ اور یہ بیچارہ اپنی قدامت پسندی کے زعم میں مارا گیا۔ فی زمانہ اولڈ گولڈ نہیں ہوتا۔ Anteque ہوتا ہے۔ جس کی عمر صرف خواص کرتے ہیں۔ سونے پر ہر کوئی مرمٹتا ہے۔ جس طرح فیشن بدل جاتے ہیں ملبوسات کے نئے سے نئے ڈیزائن بنتے ہیں۔ گاڑیوں کے نئے ماڈل آجاتے ہیں اسی طرح فنی تعمیر بھی کروٹیں بدلتا ہے۔ جس تیزی سے ٹیکنالوجی ترقی کر رہی ہے اور جو نہ ختم ہونے والی مقابلے کی دوڑ ویگاس میں شروع ہو چکی ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دس سال بعد کیسینوز کو یا تو ڈھا کر نئے عجوبے کھڑے کرنے ہوں گے یا پھر ان میں کافی ردوبدل کرنا ہوگا۔ ویسے تو سارے امریکہ میں کٹ تھروٹ کمپیٹیشن ہے۔ ہوائی کمپنیاں، ہوٹل، فیکٹریاں اور کارخانے یوں صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں جیسے کبھی بنے ہی نہ تھے۔ لیکن ویگاس کے CUTS کچھ زیادہ ہی گہرے ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ چرکہ لگ جائے تو پھر گردن سلامت نہیں رہتی۔

ہم فلیمنگو سے دو فرلانگ کے فاصلے پر گئے ہوں گے کہ ایک بلند و بالا عمارت پر ایک بہت بڑا چراغ چلتا نظر آیا۔ مون کھڑی ہوگئی۔

شاہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ بظاہر تو چراغ ہی نظر آتا ہے۔ یہ الہ دن کا میجک لیمپ ہے۔ الف لیلہٰ کا طلسماتی چراغ جو الہ دین کیسینو کے اوپر روشن کیا گیا ہے۔ جب غریب لکڑہارے کو یہ لیمپ ملا ہوگا تو اس نے کسی ایسے ہی خوبصورت محل کی فرمائش کی ہوگی۔

محل یا حرم کی۔ سارا نے گرہ لگائی۔ عربوں کو یہ دونوں چیزیں بے حد پسند تھیں۔ دولت اور عورت۔ اور وہ بھی وافر مقدار میں' کیتھرائن طنز کرتے ہوئے بولی۔

چار شادیاں' ان گنت لونڈیاں' کنیزوں کے جھرمٹ' خواجہ سراؤں کی فوج' پتہ نہیں وہ کیا کھاتے تھے۔ کھجوریں اور اونٹنی کا دودھ! سارا بولی۔

مجھے جواب دینا لازم ہو گیا۔ شادیاں زیادہ اس لئے کرتے تھے کہ ان دنوں کو کوئی ایمپلائمنٹ ایکسچینج نہیں تھی۔ جن عورتوں کے خاوند جنگوں میں کام آ جاتے تھے یا ویسے چل بستے انہیں سہارے کی ضرورت ہوتی تھی۔ تاکہ گناہ آلود زندگی سے بچ سکیں۔ اہل مغرب کی طرح نہیں تھے کہ جب جی چاہا جہاں جی چاہا منہ مار لیا۔

مون کہنے لگی۔ انسان بھی عجیب جانور ہے۔ جب بھی کبھی اسے ایسا موقع ملتا ہے شہرت کا طلبگار ہوتا ہے۔ زرد جواہر کی خواہش کرتا ہے۔ طرب و نشاط کا داعی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ اس نے اپنی آخرت سنوارنے کی دعا کی ہو۔ انسانیت کی فلاح کا سوچا ہو اور ایک پاکیزہ زندگی گزارنے کی تمنا کی ہو۔

یہ کہانیاں محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک قسم کا فرار ہیں WESH FULFILMENT ہیں' زندگی کی تلخ حقیقتوں' المیوں اور ناجوازیوں سے فرار۔

یہی وجہ ہے کہ ہزار سال گزرنے کے بعد بھی ان میں ایک تازگی ہے۔ توانائی اور کشش ہے میں نے کہا۔

سارا کہنے لگی شاہ! تمہاری باتیں کسی حد تک درست سہی لیکن یہ آج بھی حقیقت ہے کہ عربوں نے اپنی روش نہیں بدلی۔ کیا تم نے سابقہ امام یمن کا وہ قصہ نہیں سنا کہ اپنی ایک کنیز کی گمشدگی پر اس قدر برافروختہ ہوا کہ اٹلی کی حکومت کے ساتھ کئے گئے تمام معاہدے ختم کر ڈالے اور اپنے حرم کے کپتان علی کو یہ حکم دے کر واپس یمن چلا گیا کہ اس کنیز کو زندہ یا مردہ اس کے حضور پیش کیا جائے۔

اس سے بھی حیران کن بات یہ ہے کہ امام یمن فوت ہو گیا۔ اس کا بیٹا معزول ہو گیا۔ یمن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا لیکن علی اب بھی روم کی گلیوں میں اس زہرہ جمال کو تلاش کر رہا ہے۔!

اس میں حیرانی کی کونسی بات ہے اگر وہ بدقسمت مل گئی تو علی اسے امام کی قبر پر جا کر گاڑ دے گا۔ زندہ یا مردہ! کیتھرائن نے پھر طنز کیا۔

شکر کرو تم پر کسی عرب شیخ کی نظر نہیں پڑی، نہیں تو علی ایک کی بجائے دو کنیزوں کو تلاش کر رہا ہوتا میں نے طنز در طنز کیا۔

پڑی تھی! سارا بولی، اسی الہ دین کیسینو میں، شیخ نے بڑی منت، خوشامد کی، کئی بار یا حبیبی یا قلبی کہا لیکن یہ اسے جل دے گئی۔

بڑی بدقسمت ہو، میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اگر ایک آدھ دن اس کے ساتھ ویسے ہی چل پھر لیتیں تو بعد میں کروڑوں ڈالر بٹور سکتی تھی۔

وہ کیسے؟ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

دیگر امریکن عورتوں کی طرح عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتیں کہ اس نے تمہیں Sexually harass کیا ہے۔ اس پر ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا۔ جس میں وہ تینوں شریک تھیں۔

کیا تم جانتے ہو کہ جنسی طور پر ہراساں ہونا کیا ہوتا ہے؟ سارا نے پوچھا۔

ساری دنیا جاننے کی کوشش کر رہی ہے کہ آخر یہ قانون ہے کیا بلا! جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں یہ ایک امیر اور الجھے ہوئے پریشان حال معاشرے کا المیہ ہے۔ ایک ذہنی خلفشار ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ تمہیں دیکھ کر پاکستان کے رس بھرے آموں کی یاد آتی ہے یا تھائی لینڈ کے انناس کھانے کو جی کرتا ہے تو اس جرم کا مرتکب قرار پاؤں گا۔ تمہیں صرف مقدمہ کرنا ہوگا۔ باقی کام تمہارے وکیل صفائی کر لیں گے۔

لیکن تم سے اسے ملے گا کیا۔ سوائے چند کتابوں اور ایک محبت کرنیوالے دل کے؟

بحث میں مون کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

صرف کتابیں! دوسری چیز شاید اس نے کسی اور کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ سارا نے شرارتی نظروں سے مون کو دیکھا۔

Sexual Harrasment کے قانون نے امیر آدمیوں، مشہور سیاستدانوں اور نامور لوگوں کی

زندگیاں اجیرن کردی ہیں۔ اوباش عورتیں ان لوگوں کی فطری کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر چند دن ان کے ساتھ گزارتی ہیں اور پھر لاکھوں کروڑوں ڈالر کا دعویٰ کر دیتی ہیں۔ دعوے بھی اس نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس شخص نے دس سال قبل میری پنڈلیوں کو ہاتھ لگایا تھا جس سے میرے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ مجھے کروڑ ڈالر ہرجانہ دیا جائے۔ یہ شخص مجھے دیکھ کر بے حیائی سے مسکرایا تھا اور دائیں آنکھ میچ لی تھی۔ جس سے میں بہک گئی تھی۔ اس لئے اس کو کنگال اور مجھے نہال کر دیا جائے۔ اس شخص نے پندرہ سال قبل مجھے گندہ لطیفہ سنایا تھا جس نے میرے اندر لگی ہوئی جنسی الیکٹرک وائرنگ کو شارٹ سرکٹ کر دیا تھا اور ہیجان انگیز کیفیت میں' میں نے اس کو اس سے بھی بڑھ کر گندہ لطیفہ سنایا تھا اس لئے اگر ہو سکے تو اس کی جگہ مجھے سپریم کورٹ کا جج بنا دیا جائے۔

ہم باتیں کرتے کرتے سینز رپیلس کے مرکزی دروازے پر پہنچ گئے۔ جب کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے تو ایسے محسوس ہوا جیسے روم کی عظمت گم گشتہ کو بالآخر تلاش کر لیا گیا ہے۔ جیسے روم کی تاریخ اور جغرافیہ ساتھ ساتھ چل رہے ہوں۔ وسیع و عریض لان' سنگ مرمر سے تراشے ہوئے دیوتاؤں کے مجسمے جولیس سیزر اپنے جرنیلوں کے جلو میں دربار سجائے ہوئے۔ وہ دست راست جو بعد میں دست درازی پر اتر آئے تھے۔ کرسٹل سے بنے ہوئے فوارے' خودکار ایکسیلیٹر' مارک اینٹونی' سینٹ کے باہر اپنی شہرہ آفاق تقریر کے تانے بانے بنتا ہوا۔ اگر ایم جی ایم گرینڈ لاس ویگاس کی عظمت کا علمبردار ہے تو سیزر پیلس' اس کی جمالیاتی حسوں کا پیغامبر' اس سے قیمتی عمارتیں تو شاید کئی ہوں اس جیسا حسن کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ بالفرض جولیس سیزر اپنے اس محل کو دیکھ لیتا تو مستی کے عالم میں روم کی حکمرانی چھوڑ دیتا یا پھر ترنگ میں آ کر امریکہ پر حملہ کر دیتا۔ سیزر جو اپنے وقت کا عظیم جرنیل تھا۔ جو روم کی عظمت اور طاقت کا مظہر تھا' جس نے اپنی فتوحات سے تاریخ کے سینے پر انمٹ نقوش چھوڑے اور یورپی تہذیب کو کئی طریقوں سے متاثر کیا اس نے اپنے حریف پومپ POMPEY حلیف شہ PHARNACES کو ایشیائے کوچک ASIA MINOR میں شکست فاش دے کر جو الفاظ کہے وہ آج ضرب المثل بن چکے ہیں۔ VINI..... VIDI..... VICI آیا' میں نے جس کو دیکھا اور فتح کر لیا۔ وہ روم کی طاقت کو شمال مغرب تک لے گیا۔ جرمنی کو شکست فاش

دی' برطانیہ کے دانت کھٹے کئے مصر وشام کو سرنگوں کیا۔ افریقہ نے اس کے قدموں کی چاپ سنی اور اِس طرح ایک ایسی مضبوط بنیاد فراہم کی جو بعد میں رومن ایمپائر کے قیام کا سبب بنی اور اس کا بھتیجا آگسٹس AUGUSTUS روم کا شہنشاہ بنا۔

سیزر PATRICIAN پیٹریشن خاندان میں پیدا ہوا جو اپنا شجرہ نسب رومن دیوتاؤں سے ملاتے تھے۔ روایت کے مطابق یہ وینس VENUS اور AENEAS کی اولاد تھے۔ اس نسلی برتری کے احساس کی جھلک سیزر کی شخصیت میں نمایاں نظر آتی تھی۔ وہ اُس تفاخر میں اپنے آپ کو دیوتاؤں کی اولاد سمجھتے سمجھتے بالآخر سپر مین بن بیٹھا۔ کسی بھی عظیم شخصیت کی طرح اُس کی زندگی میں کئی نشیب وفراز آئے۔ ایک مرحلے پر اس نے SULLA حکمران کے خوف سے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی۔ جب حالات بہتر ہوئے تو روم واپس آیا اور قانون کی تعلیم حاصل کی۔ اُن دِنوں روم میں قانون کی تعلیم آدابِ جہانبانی کے لئے ضرور تصور کی جاتی تھی۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ فن خطابت سیکھنے موکون (MOCON) کے پاس روڈز گیا۔ وہاں بدقسمتی سے وہ پرتعیش زندگی کا ایسا عادی ہوا کہ اُس کے شب و روز جوئے اور شراب و کباب کی نذر ہو گئے۔ وہ قرض پر قرض لیتا چلا گیا۔ یہ فاقہ مستیاں ایک دن رنگ لائیں اور وہ دو لاکھ پاؤنڈ کا مقروض ہو گیا۔ اس عرصے میں اُسے سپین کی گورنری کی پیشکش ہوئی لیکن وہ اپنے آپ کو قرض خواہوں کے چنگل سے نہ چھڑا سکا۔ قرض کی ادائیگی تک انہوں نے اسے یرغمال بنائے رکھا۔ بالآخر قسمت نے یاوری کی اور روم کے امیر ترین شخص کریسس CRASUS نے اس کے سب واجبات ادا کر دیئے۔ سیزر نے بعد میں اُس کے احسان کا بدلہ یوں چکایا کہ اسے اپنے اور POMPEY کے ساتھ اقتدار کی تثلیث میں شامل کر لیا۔ لیکن صحیح معنوں میں سیزر کی جنگی حکمتِ عملی کے جوہر اُس وقت کھلے جب [redacted] کے مغربی علاقے پر قبضہ کر لیا اور رومنوں کے مقبوضہ علاقے گال کا دروازہ

جب اقتدار کی تثلیث کا اہم رکن کریسس قتل ہو گیا تو پومپی اور سیزر میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ چونکہ اب نیام میں صرف ایک تلوار ہی رہ سکتی تھی..... روم اس وقت بھی ایک ری پبلک تھا اور رومن سینٹ سیزر کے جنگی عزائم سے خائف تھی چنانچہ اُسے مشکوک نظروں سے دیکھا جانے لگا اور نتیجتاً انہوں نے پمپی کا ساتھ دیا اور سیزر کو ہدایت کی کہ اپنی فوج کو منتشر کر دے۔ سیزر نے انکار کر دیا اور پومپی کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پومپی کی فوجیں اُس وقت سپین میں تھیں۔ ''میں پہلے ایک ایسی فوج کو شکست دوں گا جس کا کوئی جرنیل نہیں اور پھر ایک ایسے جرنیل کا ٹینٹوا دباؤں گا جو بغیر فوج کے ہے.....'' یہ اس کے مشہور الفاظ تھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

جنگ فارسالس (BATTLE OF PHARSALUS) میں پومپی کو شکست ہوئی۔ وہ مصر دوڑ گیا۔ اُس کا تعاقب کرتے ہوئے سیزر بھی مصر پہنچ گیا۔ پومپی تو قتل ہو گیا لیکن سیزر کی حرکت قلب بھی بند ہوتے ہوتے بچی۔ شکاری خود شکار ہو گیا۔ یہ ہار اُسے میدان جنگ میں نہیں بلکہ اقلیم عشق میں ہوئی۔ قلوپطرہ کے حسن جہاں سوز نے اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ اس کی چوکھٹ پر یوں گرا جس طرح کوئی پجاری دیوی کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ ایک بھرپور بوسہ، ایک طویل رفاقت۔ اس ملاپ نے قلوپطرہ کے بطن سے ایک بچے کو جنم دیا۔

حکمرانی اور عشق ایک ساتھ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتے۔ ان کے عشق کے قصے جب روم تک پہنچے تو سازشیں شروع ہو گئیں۔ دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کی خبر سن کر وہ واپس اٹلی پہنچا اور اُن کے دانت کھٹے کئے..... اس کے بعد بحیرہ روم کو عبور کر کے وہ اُدھر مہم سر کرنے چلا گیا۔ واپسی پر اسے تاحیات روم کا ڈکٹیٹر بنا دیا گیا..... اقتدار کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ انسان کو بدمست کرتا ہے اور مکمل اقتدار سے بداعمالیاں مجسم شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ جمہوریت اور آمریت کہاں تک ساتھ چلتیں..... سیزر سونے کے تخت پر بیٹھ کر حکمرانی کرنے لگا۔ اپنے آپ کو دیوتاؤں کی اولاد سمجھنے والے بالآخر خود دیوتا بن بیٹھا۔ اس نے اپنے مجسمے بنوائے جن میں بڑے غرور کے ساتھ ناقابل تسخیر کے الفاظ کندہ کروائے۔ رومنوں کے لئے ان حرکات کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا چنانچہ سینیٹرز نے ایک دن سازش کر کے اُس کو اپنے ہی دوست بروٹس کے ہاتھوں

قتل کرا دیا۔ ان بشری کمزوریوں کے باوصف وہ عظیم انسان تھا۔ اُس نے علم و ادب کی آبیاری کی۔ شاعروں، ادیبوں، مصوروں کا بڑا قدر دان تھا۔ لارڈ TWEEDSMUIR نے بڑے خوبصورت الفاظ میں اس کے کردار کی جھلک پیش کی ہے۔ ''جہانگیری کا بوجھ کبھی بھی افس کے قدموں کی زنجیر نہ بن سکا۔ افس کی صلاحیتیں صرف میدانِ جنگ تک محدود نہ تھیں۔ اُس کے تخیلات اور تصورات کی اُڑان بہت ہی اُونچی تھی۔ اُسے تہذیبی قدروں اور رشتوں کا بے حد احترام تھا۔ آرٹ، شاعری، موسیقی اور فلاسفی سے بھی بڑا لگاؤ تھا اور مشکل وقت میں بھی اس نے ان اصناف کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کی شخصیت اس اعتبار مجموعہ اضداد تھی۔ ایک باعمل سپاہی، ایک حساس آرٹسٹ، ایک تخلیق کار یہ تمام خوبیاں، ایک شخص میں مشکل سے ہی یکجا ہوتی ہیں!''

کیسینو میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں۔ بلند اور عالی شان ستونوں پر کھڑی ہوئی عمارت اپنے آپ پر ناز کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس معمار نے اسے بنایا ہوگا اُس نے تاج محل ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ تاج محل تو نہ بنا سکا لیکن محلوں کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ محل بنانے کے لئے صرف زر کثیر ہی درکار نہیں ہوتی آرکیٹیکٹ کو اپنی تمام جمالیاتی حسوں کو بھی بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ دماغ کے ساتھ دل کا ہر درواکرنا پڑتا ہے اور اس میں خونِ جگر کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے تب جا کر شاہکار بنتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی نے تاج محل کی تعمیر کا بے جا گلہ کیا تھا۔

تاج بنانے والوں کے پیاروں کے مقابر بے نام و نمود رہے ہوں یا نہ رہے ہوں لیکن فی زمانہ محلات بنانے والے خود حسینوں کی آنکھ کے تارے بن جاتے ہیں۔ اور محلات پر خرچ ہونے والی رقم کا ایک معقول حصہ ان کی جیب میں چلا جاتا ہے۔

ہم کیسینو مارکیٹ میں داخل ہوئے و یوں محسوس ہوا کہ ہم بغیر چھت کے ایک بہت بڑے کاریڈور میں داخل ہو گئے ہیں جس کے دونوں اطراف بے شمار دکانیں ہیں اور اوپر کھلا آسمان ہے۔ گہرا نیلا آسمان جس پر اَن گنت سفید بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے ہیں۔ یہ فریب نظر بھی آرٹسٹ کی فسوں کاری ہے جس نے چھت کو بڑی نفاست کے ساتھ پینٹ کر کے آسمان اور بادل بنائے ہیں۔ دکانوں پر ہر قسم کا سامان

تھا۔ یہ مارکیٹ ایم جی ایم گرینڈ سے بہتر ہے بلکہ لاس ویگاس کی سب سے اعلیٰ مارکیٹ ہے۔ دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ پراڈکٹس پہلے یہاں پہنچتی ہے اور بعد میں دیگر مارکیٹوں میں بھیجی جاتی ہیں۔

چلتے چلتے ہم جیولرز شاپ کے پاس پہنچے تو مون یکدم اندر چلی گئی۔ شوکیسوں میں رکھے ہوئے ہیرے جواہرات' سونے کے زیورات اور خوبصورت گھڑیاں آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ جوہری کی دکان میں گھڑیاں؟ مجھے قدرے تعجب ہوا۔ میری حیرت کو بھانپتے ہوئے مون کہنے لگی ''شاہ! جب گھڑی سونے کی بنی ہوئی ہو اور اس پر ہیرے جڑے ہوں تو پھر وہ گھڑی کی کیٹگری سے نکل کر جیولری کی صف میں شامل ہو جاتی ہے۔

گھڑیاں واقعی بڑی خوبصورت تھیں پیاجی PIAGET' بام اینڈ مرسیئر' ایبل' رولکس اور ایوسلاران... Perpetual Gold پٹے سے لے کر گھڑی کے ڈائل تک ہیرے ٹکے ہوئے قیمتیں ہوشربا قیمتیں۔ دس ہزار ڈالر سے شروع ہو کر ایک لاکھ ڈالر تک!

مون نے ہیرے کی انگوٹھی خریدی اور ایک فرکوٹ.....

''ایل اے میں تو زیادہ سردی نہیں پڑتی پھر فرکوٹ کس لئے خریدا ہے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

بولی ''دونوں گفٹ مام کے لئے خریدے ہیں۔ اگلے مہینے اس کی سالگرہ ہے!''

''تم بھی کچھ خرید لو!'' میں نے سارا کو چھیڑا۔ ''پیسہ پرس میں پڑا پڑا زنگ آلود ہو جاتا ہے!''

کہنے لگی ''میرا باپ تیل کے کنویں چھوڑ کر نہیں مرا! تم گولڈ پین کیوں نہیں خرید لیتے' لکھو گے تو اس سے سنہری حروف نکلیں گے!''۔

''اگر ایسا ہوتا تو آج فورڈ اور راک فیلر' جارج برنارڈ شا یا برٹرینڈ رسل ہوتے اور نائے ضعیف سے لکھنے والے ادیب صرف ضعیف ہوتے' ادب سے ان کوئی واسطہ یا تعلق نہ ہوتا!''

ہم کافی دیر گھومتے رہے' کیسینو کے گیمبلنگ ہالز تین حصوں میں تقسیم ہیں..... ایک حصہ

تمام کھلاڑیوں کے لئے' دوسرا خواص کے لئے اور تیسرا خاص الخاص کے لئے جواز خود نہیں کھلتا بلکہ کہہ کر کھلوایا جاتا ہے کیونکہ اس ٹیبل کی کم سے کم شرط دس ہزار ڈالر ہے۔ اس حصے میں جو لوگ آ کر کھیلتے ہیں ان میں اکثریت عرب شیوخ کی ہوتی ہے۔ جاپانی اور چینی ٹائیکون' بزنس میگنٹس کی یا پھر ان منشیات فروشوں کی اولاد جن کا باپ تازہ تازہ مرا ہو! کس قدر عجیب نظام ہے جہاں کماتا کوئی اور خرچ کوئی اور کرتا ہے۔ دولت عوام کی ہوتی ہے اور لٹتی صرف خواص کے ہاتھوں سے ہے۔ رعایا نان شبینہ کو محتاج اور حکمران شب باشی کے انوکھے اور منفرد طریقے تلاش کرتے ہیں ایک طرف گھپ اندھیرے اور دوسری طرف سحر انگیز روشنیاں چلتے چلتے کیتھرائن' بانکو پانٹو کی ٹیبل پر رک گئی اور کہنے لگی اب تھوڑا سا کھیل بھی ہو جائے یہ منظر تو ہم سال میں کئی بار دیکھتے ہیں....."

بانکو پانٹو بڑا آسان کھیل ہے جس میں صرف تقدیر جیتتی ہے۔ انسان تدبیر سے رائی بھر بھی مدد نہیں مانگ سکتا۔ تاش کے تین پتوں کی طاقت کو جمع کر کے دس پر تقسیم..... حاصل تقسیم کھلاڑی کی طاقت ہے جو بڑا ہوا جیت جائے گا اور ہارنے والے کو سوائے "لذات آزار" کے کچھ نہیں ملے گا لوگ پٹتے ہیں' لوگ لٹتے ہیں' پھولے ہوئے بٹوے کسی مفلس کے گالوں کی طرح پچک جاتے ہیں' دل گھڑی کے پنڈولم کی طرح سینے کی پسلیوں سے ٹکراتے ہیں لیکن شوق نہیں ہارتا' کھیلنے کی خواہش نہیں مرتی۔

ہم وہاں کافی دیر تک کھیلتے رہے' ہار جیت ہوتی رہی' امید و بیم کے چراغ جلتے بجھتے رہے اور جب کھیل کر باہر نکلے تو پتہ چلا کہ کھایا پیا کچھ نہیں صرف گلاس ٹوٹا ہے..... بارہ آنے.....!

سارا اور کیتھرائن خوش تھیں کہ گھنٹہ بھر کھیل بھی لیا اور ہارا بھی کچھ نہیں۔ مون کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا کیونکہ ہارنا جیتنا اس کا مقصد نہیں تھا۔ مقصد تو محض تفریح' وقت گزاری اور Escapism تھا۔

ہم جب اٹھے تو سپر وائزر نے مون کے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے قدرے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیسینو کی طرف سے ڈنر کی دعوت ہے!" وہ میری سوالیہ نظریں بھانپتی ہوئی بولی.....

''چونکہ اکثر یہاں بڑے ٹیبلز پر کھیلتی ہوں اسلئے کبھی کبھی یہ مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہیں''۔

''کیا یہ صرف تم تک محدود ہے؟''

بولی ''نہیں مہمانوں کی فہرست بڑی طویل ہے یہ ہر شخص کی حیثیت اور اہمیت کے مطابق اسکی آؤ بھگت اور خاطر تواضع کرتے ہیں۔ مفت رہائش کے علاوہ بسا اوقات تو ٹکٹ تک بھجوا دیتے ہیں.....!''

''یعنی اپنے جوتے اور اپنا سر!'' سارا مسکرائی۔ ''ظاہر ہے پذیرائی انہی لوگوں کی ہوتی ہے جو انہیں موٹا کرتے ہیں''۔

''یہ بھی عزت افزائی کا ایک طریقہ ہے نہیں تو جہاں ہزاروں ڈالرز کی ہار جیت ہو وہاں ان سہولتوں کا کوئی مادی فائدہ نہیں ہوتا'' مون نے وضاحت کی۔

کیتھرائن کہنے لگی ''کنگ کسٹمر (یعنی گاہک بادشاہ ہے) ہر کمرشل ادارے کا یہ بنیادی ماٹو ہے۔ بنک، ہوائی کمپنیاں، انڈسٹری، بگ بزنس، سب اپنے اپنے طریقوں سے گاہکوں کو خوش کرتے ہیں۔ جاپان میں تو باقاعدہ گیشا گرلز ہیں جو ان کو بہکاتی ہیں اور دل بہلاتی ہیں''۔

''اور اگر گاہک لڑکی ہو تو؟'' میں نے پوچھا۔

''تو پھر تم جیسے چرب زبان مردوں کی خدمات لی جاتی ہیں'' سارا نے موقع کی مناسبت سے وار کر دیا۔

ہم باتیں کرتے کرتے قلوقطرہ ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ ہال کیا تھا ایک قسم کا شیش محل تھا۔ قیمتی شنڈولیرز، خوبصورت پینٹنگز، سلور کٹلری اور روزن تھال کی کراکری، نہایت قیمتی کرسٹلز کے ٹیبل لیمپ، خوشبودار موم بتیاں اور دست بستہ مودب ویٹرز..... بوفے کے برعکس یہاں ٹیبل سروس تھی۔ ویٹر نہایت دھیمی آواز میں گفتگو کرتے۔ آرڈر بھی اس طرح لیتے جیسے سمع خراشی پر معذرت خواہ ہوں..... کھانے سے پہلے ویٹر نے برف میں لگی ہوئی شمپین کی بوتل میز پر رکھی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ''آپ بھی شمپین ہی پئیں گے یا کوئی ہارڈ ڈرنگ پسند کریں گے؟''

''اس سے بھی سافٹ'' مون مسکرائی۔ان کے لئے اورنج جوس لاؤ۔ویٹر نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔میں نے سر کو ہلکی سی جنبش دی تو اس کے چہرے پر حیرانی کی لہر اٹھی اور تھوڑی دیر بعد وہ جوس کا گلاس لے آیا۔جب اس نے شمپین کی بوتل کھولی تو نرم سفید جھاگ کا ایک فوارہ سا اٹھا اور انگور کی ہلکی سی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔

''سارا کہنے لگی'' شاہ!تم خواہ مخواہ گھبرا رہے ہو۔یہ اتنی مائلڈ ہے کہ اگر تم ساری بوتل بھی پی جاؤ تو نشہ نہیں چڑھے گا''۔

''دراصل مجھے مائلڈ شراب اور وائلڈ لڑکیاں پسند نہیں!'' میں نے اس کی پیش قدمی کو روکنا مناسب سمجھا۔

مون اور کیتھرائن نے اس کی طرف دیکھا اور دونوں مسکرا کر بیک وقت بولیں'' وائلڈ چائلڈ!''

سارا بھی غالباً ہار ماننے کے موڈ میں نہیں تھی۔کہنے لگی'' شاہ!مذاق ایک طرف' سچ سچ بتاؤ تم شراب کیوں نہیں پیتے؟اتنی خوبصورت چیز سے کنارہ کشی کفران نعمت ہے!اس کا رنگ دیکھو جیسے زمرد پگھل کر سیال بن گیا ہو۔اس کی خوشبو سونگھو جیسے باغ میں تازہ شگوفے پھوٹ رہے ہوں۔اس کا ذائقہ چکھو جیسے انگور اور اناس یکجا ہو گئے ہوں پی کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم لاس ویگاس میں نہیں بیٹھے ویگاس تمہارے اندر چھپ گیا ہے رنگ ہی رنگ' روشنی ہی روشنی' ہر غم غلط' ہر خوشی دوبالا' وقتی طور پر ہی سہی' نہ فکر فردا نہ غم روزگار۔

''زیادہ پینے سے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آدمی کیا اندر چھپا ہوا ویگاس باہر آ جائے؟''.....میں نے کہا

بولی'' ہر چیز میں اعتدال ضروری ہے۔جس طرح نظام کائنات توازن پر قائم ہے اسی طرح انسانی نظام بھی توازن کا طلب گار ہے۔شراب چھوڑ' اگر پانی بھی زیادہ پیا جائے تو نقصان ہوتا ہے!.....

میں اسے کیا بتاتا کہ ہم لوگ انتہا پسند ہیں' جو کام بھی کرتے ہیں اس کا آگا پیچھا نہیں دیکھتے

من موجی ترنگ میں آ کر نفع نقصان سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ جوش تو اسرار الحق مجاز کو ساری زندگی یہی نصیحت کرتے رہے کہ اعتدال میں رہ کر پیو.....!

ذہن انساں کو بخشا ہے جمال
نشہ گر ہو بقدر نور ہلال

اس نصیحت کا اس رند خرابات پر کیا اثر ہونا تھا اس نے دو سو اشعار کے "پند نامہ" کا جواب ایک شعر میں لکھ کر بھیج دیا۔

قلب شاعر پہ جو گزرتی ہے
شاعر انقلاب کیا جانے

اپی ٹائیزرز کے بعد ویٹر ملگوٹنی سوپ لے آیا۔ دال کا سوپ! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس جنس کو غریبوں کے علاوہ امیر لوگ بھی کسی نہ کسی رنگ میں استعمال کرتے ہیں۔ سوپ کے ساتھ چاندی کی طشتری میں سجا ہوا سلاد بھی تھا جس کے اوپر پسی ہوئی برف کی ہلکی سی تہہ جمی تھی۔ گوبھی، گاجر اور ٹماٹر کو بڑی نفاست کے ساتھ کاٹا گیا تھا۔ ایک پلیٹ میں جمبو سائز کے پرانز اور فش کریکر رکھے ہوئے تھے امریکن جھینگے بڑی رغبت کے ساتھ کھاتے ہیں۔ مین ڈش بھی سی فوڈ Sea Food پر ہی مشتمل تھی۔ مون نے خاص طور پر اس کا آرڈر دیا تھا۔ لابسٹر، کریب اور سول مچھلی کا ملغوبہ۔ غالباً ریڈ وائین کا تڑکہ بھی لگایا گیا تھا۔ مین کورس کے بعد ویٹر نے آ کر سویٹ ڈش کا پوچھا۔ ہم سب نے معذرت کر لی اور مون نے گرین ٹی کا آرڈر دیا۔ سبز چائے پیتے ہوئے سارا نے کہا "یوں لگتا ہے جیسے قلوقطرہ نے اس خوبصورت ڈائننگ ہال کو بنفس نفیس سجایا ہو!"

مون اس سے اتفاق کرتے ہوئے بولی "کسی ایسی دعوت میں اس نے انتونی کو مغلوب کیا تھا"۔

"وہ کیسے؟" کیتھرائن نے اشتیاق سے پوچھا۔

"یہ بڑا دلچسپ تاریخی واقعہ ہے"۔ مون بتانے لگی "سیزر کا قتل جہاں مارک انتونی کے لئے

انسانی دکھ کا باعث تھا وہاں در پردہ ایک نوید مسرت بھی لے آیا..... غم میں ڈوبی ہوئی اس ایک تقریر نے سیزر کے قاتلوں کو تتر بتر کر دیا۔ اقتدار کی جنگ میں بالآخر مارک انتونی سرخرو ہوا لیکن اسے اس بات کا قلق بھی تھا کہ معاہدہ کی رو سے قلوپطرہ نے اس کی مدد نہ کی اس کی جواب طلبی کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ ذاتی طور پر تارسس آ کر اس کی وضاحت کرے۔ قلوپطرہ کا جہاز جب ساحل پر لنگر انداز ہوا تو مارک انتونی کے دل کے سفینے میں ہلچل پیدا ہوئی۔ جب وہ ضیافت میں شرکت کے لئے اسکے جہاز کے ڈائننگ روم میں پہنچا تو اسے محسوس ہوا جیسے جہاز ساحل پر نہیں کھڑا بلکہ متلاطم سمندر کے درمیان ہچکولے کھا رہا ہے۔ حسن' دولت' طمطراق اور خوشبو کا ایسا امتزاج اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ خالص سونے سے بنے ہوئے ظروف' چاندی کے لنگر' الطس کمخواب کے پردے..... دنیا کی بہترین خوشبوؤں اور حسین و جمیل کنیزوں کے جھرمٹ میں نیم برہنہ لباس میں لپٹی ہوئی وہ فتنہ ساز.....! انتونی نے جواب طلبی کیا کرنا تھی' خود معذرت خواہی پر اتر آیا..... یہ ڈائننگ روم اسی تاریخی واقعہ کی یاد دلاتا ہے"۔

"بڑی حیران کن بات ہے کہ آج سے دو ہزار سال پہلے بھی کوئی عورت اس قدر زیرک' ظالم' چالاک اور بے باک ہو سکتی تھی!" میں نے کہا.....

بولی "ہیلن آف ٹرائے کے متعلق آج بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آیا وہ ایک حقیقت تھی یا ہومر کے تخیل کی پیداوار!..... لیکن قلوپطرہ کو ہم تاریخ کے آئینے میں صاف طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ اس جیسی عورت دو ہزار سال میں پیدا نہیں ہوئی۔ حسین و جمیل' ریشم کی طرح نرم' کبھی برف کی طرح سرد کبھی آگ کی طرح گرم..... خالص یونانی خون' پٹولمی' سکندر یونانی کے جرنیل کی اولاد..... جس نے دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ اقتدار کی راہ میں بھائی' بہن' عزیز رشتہ دار جو بھی آیا اسے چلتا کیا۔ اسکے لئے سب رشتے ناطے بے معنی تھے۔ لاطینی' عبرانی' سریانی وغیرہ اسے کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ مرد کی نفسیات کی ماہر تھی۔ بادشاہ اس کی چوکھٹ پر غش کھا کر گرتے تھے۔ جرنیلوں کی تلواریں اسے دیکھتے ہی زنگ آلود ہو جاتی تھیں۔ وہ غالباً دنیا کی واحد حکمران تھی جس نے حسن کو بطور ایک ہتھیار کے استعمال کیا۔ مقاصد کے حصول کے لئے ہر ذریعے کو جائز سمجھا پتہ نہیں کس مٹی سے اس خمیر گوندھا گیا تھا کہ مہ و سال کی گرد اس

کے حسن کو گہنا نہ سکی اور گردش شام وسحر کے درمیان وہ ہمیشہ جوان اور تروتازہ رہی"۔

"اگر تم اس وقت مصر میں ہوتیں تو قلوپطرہ شاید اپنے حسن پر اس قدر نازاں نہ ہوتی" سارا نے مون کو چھیڑا۔

"اور تم اس کی بہن آرسنیARSINOE ہوتیں جس کو وہ پابہ زنجیر روم لے گئی تھی"۔ مون نے اس کا طنز پلٹ دیا۔

"اپنی ہی بہن کو اس قدر ذلیل وخوار کرنے میں کیا مصلحت کارفرما تھی؟" کیتھرائن کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ بڑی دلچسپ کہانی ہے"۔ مون کے لہجے میں کسی داستان گو کی سی حلاوت آ گئی "باپ کی وفات کے بعد مصر کی بادشاہت کے دو دعویدار تھے۔ دونوں نوعمر بھی تھے اور بہن بھائی بھی۔ قلوپطرہ کی عمر اکیس برس تھی اور اسکا چھوٹا بھائی صرف تیرہ برس کا تھا۔ چونکہ جھگڑا بہن بھائی میں تھا اس لئے مصر عملاً تقسیم ہو گیا۔ آدھی فوجی پٹولمی جونیئر کے ساتھ اور بقیہ قلوپطرہ کی طرفدار تھی۔ جب بھائی کا پلڑا بھاری ہو گیا تو قلوپطرہ نے شام میں جا کر پناہ لی۔ وہاں اپنی فوج کو منظم کیا اور ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے مصر روانہ ہوئی۔ پٹولمی اور اسکے حواری اسا چانک فوج کشی سے حواس باختہ ہو گئے اور سیزر سے مدد کے طلبگار ہوئے جو اتفاق سے اسوقت الیگزنڈریہ میں موجود تھا۔ سیزر نے اپنے جرنیلوں سے مشورہ کیا اور کافی بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ نوعمر بادشاہ کی مدد کی جائے کیونکہ اس وقت بھی عورتوں کے خلاف مرد متعصبانہ ذہن رکھتے تھے۔ سیزر دربار برخاست کرنا ہی چاہتا تھا کہ ایک یونانی تاجر نے شرف باریابی چاہا۔ وہ اسے کچھ قیمتی قالین دکھانا چاہتا تھا تھکا ہوا سیزر بادل نخواستہ بیٹھ گیا تاجر تعظیماً جھکا اور اسکے ملازموں نے جب قالین کھولا تو حیرت سے سیزر کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں ایک نہایت حسین' نوخیز اور مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی بے باک لڑکی اسکے سامنے کھڑی تھی یہ قلوپطرہ تھی دختر خورشید خاور مہتاب..... سیزر نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اسے دیکھا۔ تلواروں کی جھنکار میں سوئے ہوئے جذبے یکدم بیدار ہو گئے۔ خون کسی آبشار کی طرح اسکی رگوں میں سرپٹ دوڑنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے فاتح مفتوح ہو گیا۔ قلوپطرہ اس کا دل بھی تھی اور دماغ

بھی۔ رومن اور یونانی خون یکجا ہو گئے دو عظیم سلطنتوں کی سرحدیں آپس میں خلط ملط ہو گئیں کچھ عرصہ بعد سیزر تو چلا گیا لیکن اپنے پیچھے خوشگوار یادیں اور اپنے پیار کی نشانی سیزرین چھوڑ گیا۔ ایک خوبصورت ہمکتا ہوا بچہ جسے بڑا ہو کر دو ملکوں کا شہنشاہ بننا تھا۔ وہ روم تو پہنچ گیا لیکن اسکا دل ہنوز مصر میں تھا۔ جدائی کی گھڑیاں اس کیلئے ناقابل برداشت ہو گئیں اور اس نے قلوپطرہ کو بلا بھیجا..... وہ جب روم گئی تو اپنی اس بدقسمت باغی بہن کو بھی ساتھ لے گئی۔

دریائے ٹائبر TIBER کے کنارے ایک محل میں اس کی رہائش کا اہتمام کیا گیا..... اس نے وہاں کئی سال قیام کیا اور جب 44 ق م میں سیزر قتل ہو گیا تو وہ ٹوٹے ہوئے دل اور اشک رواں لئے واپس مصر لوٹ گئی۔

''بڑی پر درد کہانی ہے!'' سارا اپنے چہرے پر مصنوعی تاسف طاری کرتے ہوئے بولی ''لیکن تمہارا انداز بیان بھی بڑا غمناک ہے۔ اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ تمہارا قلوپطرہ سے کچھ نہ کچھ روحانی رشتہ ضرور رہا ہے!''

''کہاں اوہ حرافہ عالم اور کہاں بیورلے ہلز کی یہ معصوم سی بھولی بھالی لڑکی!'' کیتھرائن نے مون کی طرفداری کی۔

''اسے الزام مت دو'' مون نے سرزنش کی۔

''انسان اپنی خواہشات کے علاوہ وقت اور حالات کا اسیر بھی ہوتا ہے۔ کمسن اور ناتواں کندھوں پر مصر کی بادشاہت کا بوجھ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اکیس برس کی عمر ہوتی ہی کیا ہے! اس کا بھائی فوج کے کندھے پر سوار تھا اور اس نے اپنے سب جرنیلوں کو قدموں کی دھول بنایا ہوا تھا وہ ہزار سال میں تاریخ کوئی بھی ایسی حکمران عورت پیدا نہیں کر سکی جو اس کی ہم پلہ ہو۔ قسطنطنیہ کی ایرینی (IRINI) برطانیہ کی ملکہ الزبتھ اول' روس کی کیتھرائن دی گریٹ' الزبتھ فرائی' فرانس کی جون آف آرک' رضیہ سلطانہ..... سب اس کے سامنے پانی بھرتی نظر آتی ہیں۔

''لیکن تھی تو بڑی بدمعاش!'' سارا نے کہا۔

''تو کیا مرد بدمعاش نہیں ہوتے؟ کیا سیزر اور انتونی پارسا تھے؟''

دراصل یہ معاشرہ مردوں کی برتری سے قائم ہوا ہے۔ چونکہ تاریخ مردوں نے لکھی ہے اس لئے عورت سے ہر مقام پر تعصب برتا گیا ہے۔ تم اس عورت کی انا تو دیکھو جس نے موت کو ذلت کی زندگی گزارنے پر ترجیح دی..... اس نے اکٹوین کے وعدوں پر اعتبار نہ کیا اور موت کو اس طرح گلے لگایا جیسے نیند کی گولی کھاتے ہیں جس طرح اس نے ایک شاندار زندگی گزاری تھی اسی طرح اسکی موت میں بھی ایک رومانس تھا وہ لمحہ آخریں جو اس نے اپنے لئے خود منتخب کیا..... وہ مر کر بھی امر ہوگئی' ہار کر بھی جیت گئی اس کی دیرینہ خواہش پوری ہوگئی وہ خواہش جس کے لئے اس نے تمام عمر جدوجہد کی تھی روم نے بالآخر الیگزنڈریہ کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کو اپنا لیا.....!''

☆

کافی دیر خاموشی رہی۔ مون ہمیں تاریخ کے جس دور میں لے گئی تھی اس سے باہر آنا مشکل ہوگیا۔ تاریخ' تاسف اور حیرت یکجا ہوگئے تھے ایک عجیب طرح کا کتھارسس۔ لوگوں نے اپنے نظریات کے لئے اپنی انا کی خاطر کتنی طویل جدوجہد کی۔ کتنی بڑی قربانیاں دیں راز حیات ہر کوئی نہیں پالیتا۔ بے شمار لوگ اسے جانوروں کی طرح گزار دیتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اس حیات مستعار کے ہر لمحے کا شکار کرتے ہیں' ہر گھڑی ایک زخم جگر اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لئے موت' زیست کا حرف انجام نہیں ہوتی بلکہ نکتہ آغاز ہوتی ہے.....

''اب چلا جائے'' میں نے خامشی کا طلسم توڑا۔ رات ڈھل گئی ہے تینوں بغیر کچھ کہے کھڑی ہوگئیں اور کیسینو سے باہر نکل آئے۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے کپڑے بدلے اور بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر تو میں نے سونے کی ناکام کوشش کی' کروٹیں بدلیں لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نیند نے ذہن کو شجر ممنوعہ سمجھ لیا تھا۔ میں تنگ آ کر اٹھ بیٹھا اور غربی کھڑکی کھول دی باہر میکارن ایئرپورٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ جہاز یوں تسلسل' تواتر اور تیزی کے ساتھ اتر رہے تھے جیسے اگلے روز ہڑتال ہو اور سب کو اترنے کی جلدی ہو۔ لیکن یہ روزمرہ کا معمول تھا'

کیونکہ اس شہر کی کشش اکثر لوگوں کو یہاں لے آتی ہے۔ ٹائی چی (TYCHE) قسمت کی دیوی نے اپنی خود سر لڑکی کے لئے طلسمی محل بنوایا تھا۔ جہاں بھولے بھٹکے مسافروں کو جوا کھیلنے پر آمادہ کیا جاتا اور ہارنے کی صورت میں وہ خودکشی کر لیتے ویگاس قسمت کی دیوی نے نہیں بلکہ قسمت کے دھنی لوگوں نے بنوایا ہے۔ جن کا تعلق امریکن مافیا سے ہے۔ خودکشیاں یہاں بھی ہوتی ہیں لیکن وہ جسمانی سے زیادہ مالی ہوتی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے رقم ایک جیب سے دوسری میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جس ذوق شوق سے لوگ یہاں آتے ہیں اس کیفیت میں واپس نہیں لوٹتے۔

☆

انسان نے گیمبلنگ کب شروع کی؟

اس کے محرکات کیا تھے؟ یونانی اور ہندو مائیتھالوجی میں اسے کیا حیثیت حاصل تھی۔ کیسے بادشاہوں کے سفینے ڈوبتے' ابھرتے رہے یہ تاریخ دلچسپ بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ یہ بتانا تو شاید ناممکن ہو کہ انسان کب اس عادت بد کا شکار ہوا۔ گیمبلنگ دراصل ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے جس طرح آگ ایک مادی حقیقت ہے آدمی اس سے کہاں اور کیسے متعارف ہوا' یہ بات تاریخ کی روشنی میں نہیں دیکھی جا سکتی۔ آج سے قریباً پانچ لاکھ سال پہلے LOWER PLEISTOCEN دور میں پہلا آدمی منظر عام پر ابھرتا ہے۔ پتھر کے زمانے میں انسان کو خوراک کی ضرورت ہوتی اور وہ سونے سے پہلے جب شکار کے لئے پھندا لگاتا تو شکار کا حصول چانس پر منحصر ہوتا تھا۔ یعنی مل بھی سکتا تھا اور نہیں بھی! یہیں سے غالباً BET کا تصور شروع ہوا۔

بنی نوع انسان چھ نسلی گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔

ARCHAIC WHITE-CAUCASOID- AUSTROLO MONGOLOID- AMERINDIAN AND NEGROID

اس بات کی کافی حد تک شہادت ملتی ہے کہ جب نسلیں الگ ہوئیں تو اس وقت بھی ان RACES میں کسی نہ کسی رنگ میں گیمبلنگ موجود تھی اور اس کی کئی شکلیں اور جہتیں تھیں..... لیکن تاریخ کے ظہور کے

بعد اس کی واضح تصویر ابھرتی ہے مثال کے طور پر قاہرہ کے نزدیک اہرام چی اوپس (PYRAMID OF CHEOPS) میں ایک تحریر ملی ہے جس سے موجودہ کیلنڈر کی ابتدا کا پتہ چلتا ہے اور یہ شروعات بھی جوئے کی مرہون منت ہے۔

''نت (NUT) آسمانوں کی دیوی نے محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے جڑواں بھائی گیب (GEB) سے شادی کر لی۔ اس پر تخلیق کا دیوتا RA بڑا سیخ پا ہوا اور اس نے انہیں علیحدگی کا حکم دیکر مزید یہ سزا تجویز کی کہ نت سال کے کسی دن بھی ماں نہیں بن سکے گی۔ نت کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے رات کے دیوتا ٹوتھ (THOTH) کے دل میں جذبہ ترحم پیدا ہوا اور اس نے اسکی مدد کی ٹھان لی۔ اس نے چاند کو جوئے کی دعوت دی چنداماموں بھی جوئے کے رسیا نکلے اور انہوں نے اس چیلنج کو مسکراتے ہوئے قبول کر لیا..... گھوڑی (DICE) پر کھیلتے ہوئے شرط یہ بدی کہ اگر چنداماموں ہاریں گے تو وہ اپنی روشنی کے بہترویں حصے سے دستبردار ہو جائیں گے۔ جواء کھیلتے ہوئے نت کی حاضر دماغی کام آئی اور ٹوتھ جیت گیا۔ اس نے اپنی جیت جو کہ پانچ یوم پر مشتمل تھی..... نت کو پیش کر دیا اور اس طرح مصری کیلنڈر 360 دنوں سے بڑھ کر 365 دن کا ہو گیا چونکہ یہ لذت انگیز پانچ دن را کی عملداری سے باہر تھے اس لئے نت نے ان کا بھرپور جنسی فائدہ اٹھایا اور جیتے ہوئے دنوں کے حساب سے پانچ بچوں کو جنم دیا جن کے نام ایسس (ISIS) اوریس (ORISIS) ہورس (HORUS) سیت (SET) اور نیپتھس (NEPTHIS) رکھے گئے۔

اس قصے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ گیمبلنگ 3000 ق م بھی موجود تھی یہ وہ زمانہ تھا جب اہرام مصر بنے تھے۔ برلن کے میوزیم میں ہاتھی دانت سے بنی ہوئی IVORY DICE ہے جو THEBES میں دریافت ہوئی اور جو 1573 ق م میں استعمال ہوئی تھی اس طرح برطانیہ اور قاہرہ کے میوزیم میں بھی آلات قمار بازی پڑے ہیں جو اگر شومئی قسمت سے ہماری پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے تو چار ہزار قبل کے انسان کا چالان بھی کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ ہمارے فوجداری قانون کا بنیادی نکتہ ہی یہی ہے TIME NEVER RUNS AGANIST THE PROSECUTION۔

چین میں بھی اِس کی ابتدا حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے قبل ہی ہو چکی تھی۔ چینی تہذیب بھی خاصی پرانی ہے۔ عظیم فلسفی اور ادیب کنفیوشس کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت بھی یہ کھیل موجود تھا اور اس کا نام وائے چائے WEI-CH تھا۔

تاریخی شواہد اس امر کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ شہنشاہ یاہو (YAO) نے 2300 ق م میں یہ کھیل ایجاد کیا اس سے وہ اپنے بیٹے کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگانا چاہتا تھا۔ لیکن ہندو دیومالاؤں میں جوئے کو جو اہمیت حاصل رہی ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ آج بھی جب شاطر کھلاڑیوں کا ذکر ہوتا ہے تو ایک نام جو لامحالہ پردۂ ذہن پر اُبھرتا ہے وہ راجہ نل کا ہے۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں حکمران اس شخص کو جوئے کے ساتھ جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ اُس وقت کی حسین ترین عورت دیمنتی (DAMAYANTI) کی ملکہ تھی۔ اُس کا حسن اِس قدر مسحور کن تھا کہ کئی دیوتا بھی اُس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے۔ لیکن عشق عقل کے سہارے نہیں چلتا بلکہ اپنی راہیں خود متعین کرتا ہے، دیمنتی نے ان خداؤں کی بجائے آب وگل سے بنے انسان کو ترجیح دی..... اپنی تذلیل کا بدلہ لینے کے لئے انہوں نے راجہ نل کی فطری کمزوریوں سے فائدہ اُٹھایا اور انہوں نے اس کی ڈائس DICE کو ''چھومنتر'' کر دیا۔ جوئے کے رسیا راجہ نل کو ہار پر ہار ہونی شروع ہوئی۔ گھر بکا، دربار بکا اور آہستہ آہستہ تمام سلطنت نیلام ہو گئی۔

نیم برہنہ حالت میں اُسے اپنی ملکہ کے ساتھ چھوڑنا پڑا اور انہوں نے پڑوسی ملک کے بادشاہ کے پاس پناہ لی..... جلد ہی راجہ نل کو احساس ہو گیا کہ افسں کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ لہٰذا اُس نے جادو کو زائل کرنے والے ٹونے ٹوٹکے تلاش کئے۔ دانے سے کالے علم کو کافور کیا اور اس طرح اپنی ہاری ہوئی سلطنت پھر سے حاصل کر لی۔ آج بھی جب ہندوستان کا جواری مستی کے عالم میں نعرہ بلند کرتا ہے تو راجہ نل کا نام ورد زباں ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی دلچسپ قصہ کوروؤں اور پانڈوں کا ہے۔ 2500 ق م میں دریائے سندھ کے کنارے نہایت اعلیٰ تہذیب آباد تھی۔ ویدوں کے مطابق لوگ رتھ ریس اور سوم رس کے رسیا تھے۔ 1500 ق م تک جواء معاشرے ہے کی رگ وپے میں سرایت کر چکا تھا۔

جواء اور بے ایمانی' ہر دور میں ساتھ ساتھ چلے ہیں۔ شاہ اس عادت بد کے ہاتھوں گدائے بے نوا بن

گئے۔کوروا اور پانڈو باوجود رشتہ دار ہونے کے ایک دوسرے کے حریف تھے۔سلطنت ایک تھی اور دعویدار دو خاندان' خون بہرو حال خون ہے لیکن جب یہ ہوس وقتدار کی تنگناؤں سے گزرتا ہے تو پھر خون نہیں رہتا گدلا پانی بن جاتا ہے کوروؤں کا چچا سکونی ایک نہایت شاطر اور عیار جواری تھا جو دانے کے الٹ پھیر کا ماہر تھا۔ جبکہ پانڈوں کا سردار یشودھرا سادہ لوح تھا ہر بار ہارنے پر اس کی آتش شوق تیز ہوتی گئی۔زیورات بکے' ایک لاکھ غلام بکے' ایک لاکھ ایسی کنیزیں بھی جوئے کی نذر ہوئیں جو سرتاپا غریق حسن تھیں' سلطنت گئی 'بھائیوں کی جائیدادیں نیلام ہوئیں اور پھر ایک ایسی چیز بھی داؤ پر لگ گئی جو ہزار سلطنتوں پر بھاری تھی۔ دروپدی اس کی ملکہ جس کے حسن کے سامنے کوئی چراغ نہ جلتا تھا۔جس کے سانسوں کی خوشبو لالہ وگل چراتے تھے اور جس کی مسکان سے غنچے چٹختے تھے۔

پانڈوں کو دیس بدر کر دیا گیا.....غم سے دروپدی کا سینہ پھٹ گیا' آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی۔اس نے اپنے سنبل سے بال کھول کر چاند چہرے پر ڈال دیئے اور ہچکیوں کے درمیان یہ عہد کیا کہ کوروؤں کی شکست تک وہ کبھی ہار سنگھار نہیں کرے گی۔

جوئے میں بیوی ہارنے کا یہ پہلا واقعہ تھا' آخری نہیں۔بے شمار مثالیں ایسی ملتی ہیں جہاں لوگوں نے اپنی بیویوں' داشتاؤں' کنیزوں کی داؤ پر لگا دیا۔دوسری صدی قبل مسیح کا ادیب ایتھے نیاس (A T H E N A E U S) لکھتا ہے کہ روڈز کے حکمران ہیگے سلوچس (HEGESILOCHUS) یونانی عورتوں کا بڑا شوق تھا۔وہ کھیلتے ہوئے یہ شرط لگاتا کہ ہارنے والا شخص جیتنے والے کیلئے بہترین یونانی لڑکی تلاش کرے گا۔

یونان بھی اس کھیل میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔یونانی دیومالاؤں کے مطابق ٹائی ٹن کو شکست دینے کے بعد زیوس' اس کے بھائی POSEIDON` HADES کائنات کے مالک بن گئے انہوں نے قرعہ اندازی کے ذریعے یہ فیصلہ کیا کہ زیوس آسمانوں کا مالک ہوگا پوسے ڈن سمندروں پر حکمرانی کرے گا اور زمین ہیڈز کے تسلط میں رہے گی قرعہ اندازی کیلئے انہوں نے جانور کے پاؤں کی ہڈی استعمال کی۔

یونانی مائیتھالوجی کے مطابق جوئے کی ابتداء بھی ایک حادثے کی پیداوار ہے قسمت کی دیوی ٹائی چی

(TYCHE) ایک دن مستی کے عالم میں اولیمپس کے مرغزاروں میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ اس کی ملاقات سورج دیوتا زیوس سے ہوئی جوان دنوں جوان بھی تھا اور مست ملنگ بھی..... تنہائی، حسین موسم اور گرم خون۔ آخر کچھ تو ہونا تھا۔ کچھ نہ کچھ ہو کے رہا۔ جنسی ملاپ سے ایک ایسی لڑکی پیدا ہوئی جو شوخ بھی تھی اور شرارتی بھی..... اس نے کئی کھیل ایجاد کئے لوگوں کو جوئے پر اکساتی اور ہارنے والوں کو خودکشی پر راغب کرتی..... ماں نے بیٹی کا شوق کو دیکھتے ہوئے ایک ایسا محل بنایا جس کے میناروں پر نہ بجھنے والی روشنیاں تھیں اور جو بھولے بھٹکے مسافروں کو اپنی طرف کھینچتی تھیں مسافر اس روشنی کی طرف یوں دوڑتے جس طرح پروانے چراغ کی طرف لپکتے ہیں۔

بایں ہمہ یونانی عموماً جوئے کے سخت خلاف تھے اور اس کیلئے قانون دانوں نے بڑی کڑی سزائیں رکھی ہوئی تھیں وہ اس کے مضمرات سے بخوبی آگاہ تھے کہ کس طرح یہ معاشرے کی جڑیں کھوکھلی کرتا ہے اور لوگوں کو بے عمل بناتا ہے ہر چند کہ بائیبل اور زبور میں اس کے خلاف کوئی واضح احکامات نہیں ہیں لیکن یہودی بھی جوئے کے سخت خلاف تھے۔ اور کسی بھی عدالت میں جواری کی شہادت قبول نہ کی جاتی تھی۔

جب 753 ق م میں رومولس (ROMULUS) نے روم شہر کی بنیاد رکھی تو شہر کے آباد ہونے تک لوگوں میں گیمبلنگ کا شوق بھی بڑھتا گیا بچے اخروٹوں کے ساتھ کھیلتے جبکہ بڑے سکے کو ہوا میں اچھال کر بازیاں لگاتے۔ لیکن یہودیوں کی طرح روم میں بھی ایک جواری کا بیان قابل ادخال شہادت نہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ رومن معاشرے کا اہم جزو بن گیا پہلے اسے دسمبر کے سالانہ میلے سیچرنیلیہ (SATURNALIA) میں قانونی تحفظ ملا پھر جن حکمرانوں نے اسے مزید شہ دی ان میں آگسٹس ڈومیٹین (DOMITIANS) کیلی گولا (CALIGULA) کلاڈیس اور نیرو کے نام قابل ذکر ہیں۔

ایک گیم جس سے رومن اور یونانی قطعاً نا آشنا تھے شطرنج تھی..... اس کی ابتدا کا پتہ نہیں چلتا سنسکرت کے ایک قلمی نسخے میں جو کہ 800 ق م پرانا ہے ایک کھیل کا ذکر ہے جس کا نام چت رنگا ہے یہ شطرنج سے ملتی جلتی ہے لیکن شطرنج نہیں ہے پانچوں صدی قبل مسیح میں ایران میں ایک کھیل 'شہ مات' اس سے کافی حد تک ملتا جلتا تھا۔

ماڈرن شطرنج جو کہ ایک ہزار سال پرانا کھیل ہے اور جس کے کھیلنے کے 169,518,829,100,544,000,000,000,000,0 طریقے ہیں اور دس شروعات ہیں۔اس کھیل میں چانس آٹے میں نمک کے برابر ہے سارا کھیل حساب' منطق اور اور نفسیات پر مبنی ہے یہ بادشاہوں کا کھیل رہا ہے ivan the terrible نے 1584 میں اپنی موت سے قبل بورس گوڈونود کے ساتھ شطرنج کی بازی کھیلی اور اپنا سارا خزانہ داؤ پر لگا دیا۔تاش کا کھیل بہت بعد میں شروع ہوا۔رولے 'لاٹری وغیرہ سب قسمت کی گیمز ہیں اگر مقدر اچھا ہوا تو چمکا..... وارے نیارے ہو گئے۔نہیں تو تین دانے ..... بھٹہ بیٹھ گیا اس کے برعکس تاش مقدر کے ساتھ ساتھ مہارت کا کھیل ہے جہاں عقل' حاضر دماغی اور نفسیات سے مدد لی جا سکتی ہے۔

یہ کہنا تو شاید درست نہ ہو کہ روم کا زوال جوئے کی وجہ سے ہوا۔ہر چند کہ یہ کمزوری نمایاں تھی اور اس کے خلاف سخت قوانین بھی بنائے گئے تھے لیکن جنسی بے راہروی کی وجہ سے بھی پورا معاشرہ روبہ زوال تھا۔ شہنشاہ رنگ رلیاں مناتے رہتے۔گوتھوں (GOTHES) اور ٹیوٹنز (TEUTONES) کے اٹلی پر آئے دن کے حملوں نے بھی کاری ضرب لگائی۔لیکن جنگجو قبیلے یورپ میں کچھ زیادہ پیشرفت نہ کر سکے کیونکہ رومنوں سے انہیں بھی جوئے کی لت پڑ گئی۔250ء میں ان کے لشکر کے جیت محض جوئے کی وجہ سے ہار میں بدل گئی اور مزید پیش قدمی کی بجائے ان کی فوجیں بادل نخواستہ واپس چلی گئی دیگر قدیم معاشرے پیسے کے علاوہ مذہبی رسومات کے لئے بھی اس کا استعمال کرتے تھے دیوی' دیوتاؤں کے حضور کس نے قربانی کا بکرا بننا ہے!اس کیلئے قرعہ اندازی کی جاتی تھی سزا یافتہ مجرموں کو موت سے قبل اس بات کی اجازت دی جاتی تھی کہ وہ اپنے مرنے کا وقت اور طریق کار متعین کر سکیں جنوبی امریکہ کے انڈین قبائل میں قاتل تیر اندازی کے ذریعے اپنی موت کا وقت نکالتا تھا ایک درخت کے دوسری جانب کتبوں پر مختلف تاریخیں لکھی ہوتی تھیں کبھی اسے سالوں تک زندہ رہنے کی مہلت مل جاتی اور کبھی دوسرا لمحہ ہی موت کا سندیسہ لے آتا۔

مرکزی افریقہ' ملایا' جزائر غرب الہند اور پول نیزیا کے قدیم ایب اور جنل قبائل میں اب بھی جرم کا

تعین قرعہ اندازی کے ذریعے کیا جاتا ہے کانگو کے ایک قبیلے میں یہ رواج ہے کہ زانیہ عورت کو ٹب کے اندر دو برتوں میں ہاتھ ڈالنے کیلئے کہا جاتا ہے ایک میں پانی ہوتا ہے اور دوسرے میں تیزاب اگر پانی والے برتن میں ہاتھ پڑ گیا تو بے قصور اور اگر دوسرے میں ڈبولیا تو پھر چمڑا ہاتھ سے جدا ہو جاتا ہے اور شہرت ہمیشہ کیلئے داغدار۔

1190ء میں انگلستان کے بادشاہ چرڈز اور فرانس کے فلپ نے قانون کے ذریعہ جوئے کو صرف خواص تک محدود کر دیا ان دونوں کے علاوہ صرف شہزادوں اور نائیٹس (KNIGHTS) کو کھیلنے کی اجازت تھی شرفا دن میں صرف بیس شلنگ تک کی بازی لگا سکتے تھے قانون کی خلاف ورزی پر داؤ پر لگائی ہوئی رقم ضبط ہو سکتی تھی اور سو شلنگ تک کی بازی لگا سکتے تھے قانون کی خلاف ورزی پر داؤ پر لگائی ہوئی رقم ضبط ہو سکتی تھی اور سو شلنگ تک جرمانہ بھی بھرنا پڑتا تھا۔ جسمانی سزا اس کے علاوہ تھی مجرم کو برہنہ کر کے کوڑے لگائے جاتے تھے۔

کچھ عرصے بعد ہنری (Henry) کو بھی جوئے کی ایسی لت پڑی کہ اس نے اپنی دولت کا بڑا حصہ اس کی نذر کر دیا حتیٰ کہ وہ رقم جو اس نے ویسٹ منسٹر ایبے کی تعمیر کیلئے رکھی ہوئی تھی وہ بھی بیرنز (BARONS) کی جیبوں میں چلی گئی جب شطرنج اور ڈائس کے علاوہ تاش ایجاد ہوئی تو کھیل کو مزید وسعت ملی یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ تاش اہل یورپ کی ایجادہ یا باہر سے درآمد ہوئی۔

1392ء میں فرانس کے خزانے لیجر میں ایک ایسا اندراج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کیلئے سنہری تاش بنوانے کیلئے رقم نکالی گئی تھی ایک کمزور روایت یہ بھی ہے کہ پاگل بادشاہ چارلس ششم کو خوش کرنے کے لئے تاش کے پتے بنائے گئے تھے۔

اس کھیل میں اس قدر جاذبیت تھی کہ لوگ پاگل پن کی حد تک اسکے رسیا ہو گئے۔ 1394ء میں ڈیوک آف سیکسنی (DUKE OF SEXONY) نے ڈیوک آف لیزبرگ (LETZBERG) کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے اپنا ARDENNES کا پورا جنگل داؤ پر لگا دیا۔ 1423ء تک یہ کھیل اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ سینٹ برنارڈ نے اس کو ''شیطانی کھیل'' قرار دے دیا اور

جواریوں کو ایک دہکتے ہوئے دوزخ کی بشارت دی۔

ان پند و نصائح کا عوام پر کیا اثر ہونا تھا۔ ان دیکھی سزا کے لئے لوگ تاش کھیلنا ترک نہ کر سکے قانون سزائیں' خطہ..... کوئی چیز بھی ان کے اس شوق سے مزاحم نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس لاٹری پر اتنی لعن طعن نہ ہوئی ہر چند کہ یہ بھی جوئے کی ایک قسم تھی لیکن چونکہ اس سے چرچ اور حکومتیں بھی مستفیض ہوتی تھیں۔ اس لئے پادریوں اور بادشاہوں نے اس کی مذمت سے حتی الوسع گریز کیا۔

مذہبی حلقوں میں جوئے کو کبھی بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا اور جہاں اس کی ممانعت کی گئی ہے وہاں اس کی خرابیوں کی وجوہ بھی بتائی گئی ہیں اس کو شیطانی کھیل قرار دیا گیا ہے جس کی وجہ سے انسان اس دنیا میں بھی ذلیل خوار ہوتا ہے اور اپنی عاقبت بھی خراب کر بیٹھتا ہے اسلام نے بھی اس کی مذمت کی ہے شراب اور خنزیر کے ساتھ اس کو بھی حرام قرار دیا ہے شیطان اس کے ذریعے تم میں نفاق اور نفرت پیدا کرتا ہے اور اپنے رب اور نماز سے دور کرتا ہے..... لہٰذا اس سے دور رہو مذہب کے علاوہ حکومتوں نے معاشرتی ضرورتوں کے تحت بھی اس کی حوصلہ شکنی کی قرون اولی میں انگلینڈ نے معاشی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے تدارک کیلئے قانون بنائے جب یہ کھیل دیگر کھیلوں سے زیادہ مقبول ہو گیا تو تیر کمان بنانے والوں نیزہ بانوں کا کاروبار تباہ ہو گیا اور انہوں نے حال دہائی مچائی کہ حکومت انکی مدد کرے اس کی ممانعت کرتے ہوئے حکومتوں کے پیش نظر یہ حقیقت بھی تھی کہ قمار بازی کی وجہ سے غربت پھیلتی ہے۔ لوگ کام چور ہو جاتے ہیں اور ہر طرف افلاس کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ان تمام مادقوانین اور سزا و جزا کے کے تصور کے باوجود دنیا میں آج بھی جوئے کی عملداری ہے اکثر لوگ اس کے رسیا ہیں اور چھپ کر یا سر عام گیمبلنگ کرتے ہیں کچھ حکومتوں نے اس کی مکمل ممانعت کر رکھی ہے۔ اور بعض ممالک نے محدود پیمانے پر اس کی اجازت دے رکھی ہے اور اس کو ریگولیٹ کر دیا ہے انہوں نے جگہیں اور اوقات مقرر کر رکھے ہیں تا کہ کم از کم لوگ یہ شوق پورا کر سکیں..... انگلستان کے کیسینوز میں کھیلنے کیلئے ممبر شپ ضروری ہے ممبر بننے کیلئے 72 گھنٹوں کا وقفہ چاہئے وہاں ویگاس کی طرح چوبیس گھنٹے گیمبلنگ نہیں ہوتی بلکہ شام کو کلب کھلتا ہے اور صبح تین چار بجے بند ہو جاتا ہے پھر وہاں لباس کی بھی پابندی ہے جیکٹ اور ٹائی اس کے علاوہ بیٹنگ ہاؤسز ہیں۔ جہاں ہر قسم کی

شرطیں لگتی ہیں ملکہ انگلستان بیٹے کو جنم دی گی یا دختر جو اکثر نیک اختر نہیں ہوتی' کی پیدا ہوگی؟' شہزادہ اپنی بیوی کو کب اور کیسے طلاق دے گا! الیکشن کونسی پارٹی جیتے گی؟ میچ میں کونسی ٹیم فاتح ہوگی! بوتھم سنچری بنائے گا یا پہلے ہی بال میں ''بوتھا'' تڑوائے گا؟

فرانس کے مانٹی کارلو کو یورپ کلاس ویگاس کہا جاتا ہے اور مشرق بعید کا میکاؤ بزعم خود ہی ایگاس آف دی ایسٹ بن گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ویگاس کی جیب میں سما سکتے ہیں مانٹی کارلوں کے مرکزی کیسینو کی صرف ایک بڑی خوبی ہے یہ پہاڑ کی چوٹی پر ہے اور نیچے بہت نیچے گہرا نیلا سمندر ہے۔ بحر قلزم جس کی وسعت اور خوبصورتی الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتی..... اسکے ہر کمرے کی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی ہیں جنہیں کھول کر گیمبلرز لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی چھلانگ بھی لگا جاتے ہیں۔

میکاؤ تک پہنچنے کیلئے سمندر عبور کرنا پڑتا ہے ساؤتھ چائنا سی ہانگ کانگ سے ہائیڈرو فاہلز کے ذریعے ایک گھنٹے کا سفر ہے راستے میں پانی اتنے رنگ بدلتا ہے جتنے جواری ہارنے کے بعد بدلتا ہے لال 'نیلا' سبز اور پیلا۔

آج کل کاروباری دنیا میں بالواسطہ جواء کھیلا جاتا ہے سٹاک ایکسچینج بھی ایک قسم کا جواء خانہ ہے آدمی اس توقع پر حصص خریدتا ہے کہ قیمت بڑھے گی لیکن پل بھر میں کچھ سے کچھ ہوجاتا ہے ہار کر خودکشی کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی باایں ہمہ کیسینو اس سے خائف رہتے ہیں کیونکہ اس قسم کے واقعات بدنامی کا باعث بنتے ہیں اور وقتی طور پر ہی سہی لوگ تائب ہوجاتے ہیں یا کھیلنے سے اجتناب برتتے ہیں گزشتہ 50 سال میں مانٹی کارلو میں خودکشیوں کی تعداد 50 سے زیادہ نہیں بڑھ پائی اس میں ایسے لوگ بھی ہوسکتے ہیں جنہوں نے کسی اور وجہ سے موت کو گلے لگایا ہو کھلاڑی کیسینو میں بنے ہوئے آلات کو دھوکہ نہیں دے سکتے لیکن بسا اوقات کیسینو کو داؤ لگا جاتے ہیں الیگزینڈر والکاٹ (ALEXANDAR WOOLLCOTT) کی کہانی REINNERAPLUS کسی ایسے ہی کردار کے اردگرد گھومتی ہے بظاہر یہ فرضی کردار دراصل حقیقی تھا۔ مصنف اپنے چند دوستوں کے ہمراہ مانٹی کارلو کیسینو کی بالکونی میں میں بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا اور وہ مزے مزے سے سوفلی کھا رہے تھے اور خودکشی کے محرکات پر بحث

کر رہے تھے۔ اتنے میں کوسٹ گارڈ آتا ہے اور کیسینو کی انتظامیہ کو یہ تشویشناک خبر سناتا ہے کہ اس نے ایک نوجوان کو نیچے ساحل پر مردہ حالت میں دیکھا ہے جس کے ہاتھ میں پستول ہے اور وہ خون میں لت پت پڑا ہے مصنف اور اس کے دوست فوراً بھانپ لیتے ہیں کہ یہ وہی نوجوان ہے جو رات کو زریکثیر ہار گیا تھا کیسینو کا منیجر ہانپتا کانپتا نیچے جاتا ہے اور یہ تسلی کر کے کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا چپکے سے دس ہزار فرانک کے نوٹ اس کی جیب میں ٹھونس دیتا ہے تاکہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ متوفی نے ہارنے کی وجہ سے خودکشی نہیں کی بلکہ زندگی کی ناجوازیوں سے تنگ آ کر چل بسا ہے دراصل متوفی کیسینو کو چل دے گیا تھا اپنی ہاری ہوئی رقم لینے کیلئے اس نے یہ سوانگ بھرا تھا سینے پر ٹماٹو ساس' پستول کا ایک عدد ہوائی فائر اور سانس روکنے کی عمدہ ایکٹنگ منیجر نے بڑی حیرت کے ساتھ اس مردے کو دیکھا جو اپنے قدموں پر چل کر واپس کیسینو میں آیا مسکراتے ہوئے اس نے دس ہزار کے فرانک نکالے اور رولے ٹیبل پر دس ہزار مزید جیت گیا۔

یہی وجہ ہے کہ کیسینوز کے پاس ناپسندیدہ لوگوں کی فہرست ہوتی ہے اور ان کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے بدمعاش دھوکہ باز اور پیشہ ور لوگوں کو اندر نہیں گھسنے دیا جاتا۔ خودکشی ہی ایک ایسا حربہ ہے جس سے کیسینوز کا کاروبار اور شہرت داغدار ہو سکتی ہے اور خاصا مالی نقصان پہنچ سکتا ہے..... اس سلسلے میں ایک کہانی کافی مشہور ہوئی۔ 1884ء میں ایک شخص نیویارک میں ''رولے'' پر بیس ہزار ڈالر ہار گیا اس نے کیسینو کو انتباہ کیا کہ اگر اس کی رقم واپس نہ کی گئی تو وہ شہر کو پانی فراہم کرنے والی ٹینکی میں طاعون BUBONIC PLAGUE کے جراثیم والی دوا ملا دے گا کروپیئر نے فوری طور پر پولیس کو اطلاع دی اور وہ پکڑا گیا اور اس سے وہ دوا برآمد کر لی گئی۔

اب رہا سوال یہ کہ ایک پیشہ ور جواری کون ہوتا ہے؟ ایک ایسا شخص جس کا اوڑھنا بچھونا جواء ہو 'جو صرف جوئے کی کمائی پر زندہ ہو اگر کسی شخص کے پاس دیگر ذرائع آمدنی ہیں تو پھر وہ پروفیشنل گیمبلر نہیں ہے بلکہ ایمچور (Amateur)..... پیشہ ور جواریوں کی تین قسمیں ہیں۔

1۔ جو ہر قسم کی مہارت رکھتے ہیں ان کی یادداشت بہت تیز ہوتی ہے اگر تاش کے سو پتے بھی ریک سے نکل جائیں تو ان کے ذہن پر نقش ہوتے ہیں جو انسانی نفسیات سے کماحقہ واقف ہوتے ہیں باڈی لینگویج

اور چہرے کے تاثرات کو کتاب کی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ جذباتی نہیں ہوتے بلکہ کسی حساب دان کی طرح کھیل کھیلتے ہیں اور گیم میں کسی قسم کی بے ایمانی نہیں کرتے۔

(2) شارپرز..... بے ایمانی اور دھوکہ دہی جن کا شعار ہوتی ہے۔ یہ اکثر کرائے کے قاتل ہوتے ہیں اور بڑے بڑے گینگ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے لباس کی تراش خراش، رہن سہن اور طمطراق رئیس زادوں جیسا ہوتا ہے۔ عمدہ سوٹ، فلیٹ سیٹ اور تو اور منہ میں عمدہ سگار یا پھر پائپ۔

(3) بڑے تاجر جو کیسینوز کو چلاتے ہیں اور اکثر خود گیمبلنگ نہیں کرتے۔

A GREAT DEAL OF ROMANCE AND SOME INFAMY LONG BEEN ATTACHED TO THE CHARECTER O PROFESSIONAL GAMBLE

جب لوگ پروفیشنل گیمبلرز کے رومانوی قصے سنتے ہیں تو محبت اور نفرت کے جذبات بیک وقت ابھرتے ہیں۔ عیش و عشرت کی زندگی کا ہر کوئی دلدادہ ہوتا ہے۔Easy Money۔ دیکھتے ہی دیکھتے، دولت کے انبار لگ جاتے ہیں۔ کوئی بھی پیشہ ور جواری شراب اور عورت کا رسیا ہوتا ہے اور یہ رنگین قصے لوگوں کو ایک عجیب قسم کی آسودگی پہنچاتے ہیں۔ فوک گیتوں میںAmerican Blues Roving Gamblers کی ملتون مزاجی، سیمابیت اور خانہ بدوشانہ زندگی کی جھلک ملتی ہے۔ امریکن ٹیلی ویژن سیریMaverick میں اِس کے شب و روز دکھائے گئے ہیں۔ خودسر، خود بین اور ہر اعتبار سے غیر ذمہ دار .....ایک ایسا ہیرو جو اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود مقبول ہے۔ درحقیقت یہ تمام سج دَھج اور طمطراق ظاہری ہوتا ہے۔ آغاز چاہے جیسا بھی ہو ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ جس سفر کا یہ آغاز کرتے ہیں اُس کا ہر راستہ بالآخر تباہی، بربادی اور ذلت کی طرف جاتا ہے۔ راستے میں چند دلفریب مقام ضرور آتے ہیں لیکن وہاں انہیں زیادہ دیر ٹھہرنا نصیب نہیں ہوتا۔ صحیح معنوں میں ان کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ دشمنوں کی فہرست البتہ بہت طویل ہوتی ہے۔ جب تک قسمت ساتھ دیتی ہے ان کے اِردگرد کاسہ لیسوں اور مہوشوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ جب برا وقت آتا ہے تو کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا..... امریکن پروفیشنل پریڈیJeremian

Preedy مسس پی کا پیشہ ور جواری تھا۔ اس نے ساری زندگی کبھی دھوکہ دہی یا چالبازی سے جواء نہیں کھیلا۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات..... پل بھر کے لئے ناچ گئے دھوپ میں سائے.....اسی کی زندگی کے اِردگرد گھومتا ہے جس میں اسے بطور ہیرو کے دکھایا گیا ہے۔

ایک اور پیشہ ور امریکن جواری جیکی سوائر (Jackie Swire) کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ ڈالر تھی۔ وہ رفتہ رفتہ لکھ پتی بن گیا۔ اُس نے ایک عقلمندی کی جو اکثر جواری نہیں کرتے۔ اُس نے اپنی تمام رقم سرکاری کھاتوں میں ڈال دی اور صرف اس کے سود سے پوکر کھیلنا شروع کیا۔ اس کے باوجود سکون اُس کے مقدر میں نہیں تھا۔ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے ''کوئی بھی رات ایسی نہیں گزری جب میں سکون کی نیند سو سکا۔ ایک عجیب قسم کی بے کلی اور بے چینی مجھے پریشان رکھتی ہے۔ میں اپنے آپ کو ملک کا سب سے زیادہ غیر محفوظ شخص تصور کرتا ہوں۔ جوئے کا کیا ہے؟ کل کلاں میں ساری رقم ہار کر بھکاری بن سکتا ہوں اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ پانسہ کسی وقت بھی پلٹ سکتا ہے۔

بے قراری، عدم تحفظ اور معاشی تباہی کا ہمہ گیر ڈر..... یہ پیشہ ور جواری کے مستقل ساتھی ہیں..... اصل کام اتنا رومان انگیز نہیں ہے جتنا کہ نظر آتا ہے۔ اس میں بھی اتنی ہی محنت اَور تگ ودو کرنا پڑتی ہے جتنی دیگر کاموں میں ضروری ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ قسمت کا یہاں عمل دخل کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے لیکن ناخن تدبیر سے تقدیر کو زیر دام لایا جاسکتا ہے۔ جو جواری یہ طور طریقے نہیں سیکھتا وہ زیادہ دیر اس پیشے میں نہیں رہ سکتا اور بڑا بے آبرو ہو کر نکلتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے تاش کے کھیل میں یادداشت اور نفسیات، بہت ضروری ہیں۔ اِن کے بغیر مسلسل جیتنے کا تصور بھی محال ہے۔ ایک وجدانی کیفیت جو اُس کے ضمیر میں ہوتی ہے اور اس کو اکتساب علم سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس جبلت کو تیز تر کرنے کے لئے مسلسل ریاض اور تجربے کی ضرورت ہے۔ پیٹرک حرنے PATRIC HERNE جس نے پوکر سے کثیر رقم جیت کر 1840ء میں براڈوے، نیویارک میں اپنا سیلون کھول لیا تھا اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے:

''میں روزانہ مسلسل چودہ گھنٹوں تک پوکر پلیئرز کو کھیلتے دیکھتا رہتا۔ بغیر کھیلے میں اُن کے چہرے کے تاثرات پڑھتا، اُن کے ہاتھوں کی لرزش سے اُن کے پتوں کی طاقت کا اندازہ لگاتا اور جب کھیل ختم

ہوتا تو مجھے اس بات کا پتہ چل جاتا کہ اگر میں کھیل رہا ہوتا تو بازی کون جیتتا۔"

پروفیشنل گیمبلرز میں معدودے چند لوگ ایسے گزرے ہیں جو با اصول اور ایماندار تھے۔ جن کی ساری زندگی راست گوئی اور راست بازی سے عبارت تھی۔ جن کے صراط مستقیم پر چلنے کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ جو ایک غلط کام، بھی درست طریقے سے کرتے تھے اور اپنی اس شہرت کی وجہ سے بیحد مقبول ہوئے۔ اُن میں ایک نمایاں شخصیت امریکی شہری NICK THE GREEK کی تھی۔ اُس کی زندگی کے حالات اس قدر دلچسپ ہیں کہ اُن کا ذکر نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔ نک جس کا اصل نام NICHOLOS ANDREA DANDOLO تھا 1093ء میں RETHYMNON میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ قالین فروش تھا۔ ایک امیر جہاز ران نے اُسے متبنیٰ بنالیا۔ جب وہ اٹھارہ برس کا ہوا تو اس کے باپ نے اُسے تعلیم کی غرض سے امریکہ بھیج دیا اور چھ سو ڈالر ماہانہ وظیفہ مقرر کیا..... ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، اوائل عمری ہی میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور وہ ایک مقامی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ لیکن یہ بخار زیادہ دیر تک قائم نہ رہا اور وہ اُس سے ناراض ہو کر مانٹریال چلا گیا۔ ادھوری تعلیم اور ناکام عشق نے اُسے شوقِ آوارگی میں مبتلا کر دیا۔ اب کے اُس کا معاشقہ لڑکیوں کے ساتھ نہیں بلکہ "ریس" کے ساتھ ہوا۔ ایک جا کی فل مسگریو PHIL MUSGRAVE کی دوستی اور اُس کی ذہانت سود مند ثابت ہوئی اور اُس نے چھ ماہ کے قلیل عرصے میں 5 لاکھ ڈالر کما لئے..... جیت کے زعم میں وہ شکاگو واپس آیا اور ساری رقم ڈائس اور تاش میں ہار دی۔ ہار، نے اُس کے حوصلہ پست نہ کئے بلکہ اُس نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بالآخر سب جواریوں کے کس بل نکال دیئے۔ اور کسینو زکی آنکھ کا تارا بن گیا۔ اُس کے کھیلنے کا انداز منفرد تھا۔ وہ گھنٹوں یکسوئی کے ساتھ کھیلتا رہتا اور لوگ اُس کے کھیل کی ایک جھلک دیکھنے دور دور سے آتے۔ ہار جیت اُس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئی۔ کیونکہ اُسے اپنے فن پر ناز تھا۔ ایک لاکھ ڈالر کی رقم ایک نشست میں جیتنا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہ تھا۔ یہ کام صرف "نک دی گریٹ" ہی کر سکتا تھا، رولے کی بجائے وہ CRAP-FARO اور STUD پسند کرتا تھا کیونکہ تاش کے اِن کھیلوں میں جیتنے کے زیادہ امکانات تھے۔ اُس دور میں اُس نے چونسٹھ لاکھ ڈالر جیتے۔ جسینائیں اُس کے گرد شہد کی

مکھیوں کی طرح بھنبھناتی تھیں اور جس جگہ وہ داؤ لگاتا سب آنکھیں بند کر کے وہیں شرط لگاتیں..... جیتنے کے بعد رقم اُن کی جیب میں چلی جاتی اور اَن گنت بوسے نک کے لبوں پر ثبت ہو جاتے۔

اُسے ہارنے میں بھی اتنا مزا آتا جتنا حظ وہ جیت کی صورت میں اُٹھاتا..... پیسے کو اُس نے ہمیشہ ہاتھ کی میل سمجھا اور اکثر ترنگ میں آ کر وہ نوٹوں میں تمباکو بھرتا اور سگار کی طرح کش لگاتا۔ وہ اس قدر بے پرواہ ہو گیا کہ ہزاروں ڈالر اُس کی جیبوں میں رہ جاتے اور لانڈری والوں کی موج ہو جتی۔ کیونکہ کپڑے دھونے سے پہلے وہ جیبوں کی تلاشی ضرور لیتے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 50 کروڑ ڈالر اُس کے ناتواں ہاتھوں میں کڑکڑائے..... اُس کی تونگری کا یہ عالم تھا کہ 73 مرتبہ اُس نے غربت اور امارت کی سرحدیں عبور کیں۔ وہ ہمیشہ اُدھار پر کھیلتا، وقت پر قرض کی رقم ادا کرتا اور خیانت کا تصور ہی اُس کے لئے سوہانِ روح تھا۔ اُس فلسفی جواری جو اپنے آپ کو ارسطو اور افلاطون کی معنوی اولاد سمجھتا تھا، کے متعلق کئی فرضی قصے کہانیاں گھڑی گئیں۔ ایک مرتبہ اُس نے لاس اینجلس شہر کا ایک پورا بلاک جیت لیا اور اپنے حریف کو چیلنج کیا کہ تاش کے ایک پتے پر اس کی ہار جیت کا فیصلہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ حریف بدک گیا کیونکہ اتنی ہمت اور صلابت تو پہاڑوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ایک اور روایت کے مطابق وہ ایک مرتبہ مسلسل دس رات دن فیرو کھیلتا رہا اور اس دوران پل بھر بھی نہ سویا..... مبالغہ آرائی اپنی جگہ، لیکن ان کہانیوں سے ''نک دی گریٹ'' کے شوق و ذوق اور جرأت کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے ایماندار پروفیشنل گیمبلرز ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ نہیں تو بے ایمانی، دھوکہ دہی اور فریب، پیشہ ور جواریوں کے خون میں رچ بس جاتی ہیں۔ جوئے میں بے ایمانی کی ابتدا پہلی صدی عیسوی کے برطانوی حکمران CYMBELINE کے زمانے میں شروع ہوئی۔ ایک ہزار سال بعد جواری لندن کی گلیوں میں لوگوں کو دن دہاڑے لوٹتے اور پکڑے جانے پر بڑی سخت سزائیں پاتے۔ 18 ویں صدی میں تو باقاعدہ سکول کھل گئے جہاں لوگوں کو ''شارپنگ'' کی تربیت دی جاتی۔ ساتھ ساتھ یہ شرط بھی لگائی جاتی کہ جب تک وہ فن میں مہارت حاصل نہیں کر لیتے اس کی پریکٹس نہیں کریں گے کیونکہ پکڑے جانے کی صورت میں اُستاد کی بدنامی ہوتی کہ وہ کامل نہیں تھا۔ اس کے لئے باقاعدہ سکول تھے جہاں ایک

ہزار پونڈ فیس لی جاتی۔ ایک اُستاد سال میں صرف چار شاگردوں کو تربیت دیتا۔ یہ لوگ اخباروں میں باقاعدہ اس قسم کے اشتہار دیتے۔APPRENTKES TO HIGHLY FORTUNATE BANKE۔ اُستاد عملی تعلیم کے لئے اپنے شاگردوں کو کیسینوز کا چکر بھی لگواتے۔

امریکہ بھی اس علت سے خالی نہیں تھا۔ تاش کے پتے لگانے والوں نے مسس پی اور OHIO دریاؤں پر چلنے والے جہازوں میں اپنی کمین گاہیں بنا رکھی تھیں۔ جو لوگ ان کے ہاتھوں لٹتے تھے اُن میں اکثریت اُمراء کی تھی اور با آسانی اِن کے جھانسے میں آ جاتے۔ شروع شروع میں پتا بازوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ جہاز کا عملہ اِن پر کڑی نگاہ رکھتا اور انہیں پکڑے جانے کی صورت میں سخت سزائیں ملتیں..... لیکن جیسے جیسے ٹریفک بڑھتی گئی اور زیادہ لوگوں نے سفر شروع کیا تو کپتانوں کو ان کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اور جہاز کا عملہ ان سے باقاعدہ حصہ بٹورنے لگا۔ جس جہاز پر کوئی ایک آدھ شار پر نہیں ہوتا تھا اُس کا کپتان سفر کو برا شگون سمجھتا تھا..... لٹنے والے لوگوں کی شکایات پر کوئی توجہ نہ دی جاتی اور اگر کوئی زیادہ احتجاج کرتا تو پھر اُسے خفیہ طریقوں سے موت کی نیند سلا دیا جاتا۔

1830ء تک پیشہ ور جواریوں کی تعداد پندرہ سو تک پہنچ چکی تھی۔ یہ اکثر اُن جہازوں میں اپنا کاروبار چلاتے جو نیو اور لینز اور لوزے ویل کے درمیان چلتے تھے۔ یہ تاش کو اوکرنے، دانے کو گھمانے کے استاد تھے۔ مسافر سفر کی بوریت دور کرنے کے لئے اِن کے پھندے میں پھنس جاتے۔ یہ لوگ اکثر گروپس کی شکل میں شکار کرتے۔ انہوں نے مختلف بھیس بدل ہوتے اور ایسا ظاہر کرتے جیسے ایک دوسرے کو جانتے نہ ہوں۔ پتہ باز اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے کثیر رقم ہار جاتا جس سے عام لوگوں کو چہ ملتی اور وہ سمجھتے کہ جیتنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جب وہ شرط لگاتے تو وہ اصل ہاتھ دِکھا جاتا۔ گروہ بندی کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ اگر داؤ لگانے والا شخص بھی کوئی ''کاریگر'' ہوتا تو یہ پتے خلط ملط کر دیتے یا پھر صریحاً بدمعاشی پر اُتر آتے۔ اِن میں کچھ کھیلنے والوں کے پیچھے بیٹھ جاتے اور اشاروں اشاروں میں اپنے ساتھی کو اس کے پتوں کی طاقت بتا دیتے۔ بعض جواریوں نے اِس فن میں حیرت انگیز مہارت حاصل کر لی اور ایسے اشارے

وضع کیے جس کا سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ان کو پیشہ ورانہ زبان میں ITEMERS کہا جاتا تھا۔ان میں سب سے مشہور مسس پی کا جیمز ایش بی (JAMES ASHBY) تھا۔اُس نے ایک مجذوب وایلن نواز کا سوانگ بھرا تھا۔ جہاز میں وہ نعرے لگاتا۔وائیلن کی دھنیں بکھیرتا اور بے ارادہ ادھر اُدھر ڈگمگاتا رہتا.....دراصل اُس کے دیوانے پن میں ایک بڑے فرزانگی تھیں۔دُھنیں ایک پیغام تھیں۔ایک سگنل اور سندیسہ.....جوئے کی میز پر بیٹھا ہوا اُس کا ساتھی اُن دھنوں کے معانی سمجھتا۔اُسے صاف پتہ چل جاتا کہ اُس کے حریف کے پاس کیا ہے۔اُس حساب سے وہ رقم لگاتا.....ایش بی کے دام میں سادہ لوح تو پھنستے ہی تھے، بڑے بڑے جغادری کھلاڑی بھی مار کھا جاتے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ یہ قلندر اُن کا چقندر بنا رہا ہے اور آہستہ آہستہ ان کی کھال کھینچ رہی ہے۔

دنیا کے مشہور گیمبلرز کی فہرست خاصی طویل ہے۔ان میں بادشاہ بھی شامل ہیں اور عظیم جرنیل بھی.....مشہور ادیب، ایکٹرز، تاجر اور وہ پیشہ ور کھلاڑی جن کا اوڑھنا بچھونا ہی جواء تھا۔رومن جرنیل جولیس سیزر اور اُس کے دست راست مارک انتونی کو جوئے کی ایسی لت پڑی ت ھی کہ وہ اپنا فارغ وقت ڈائس کی نذر کرتے۔تاریخ دان پلوٹارک نے بڑی تفصیل کے ساتھ اُن کے شب و روز کا ذکر کیا ہے۔

رومن شہنشاہ کلاڈیس جوئے کا اِس قدر رسیا تھا کہ اُس نے چلتی ہوئی کوچ میں بھی کھیلنے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔رومن ڈرامہ نگار SENECA نے اپنے ایک ڈرامے میں اُس کی بڑی دلچسپ کردار نگاری کی ہے۔قیامت کے روز بادشاہ کو سزا کے طور پر جہنم میں نہیں ڈالا جاتا بلکہ اس سے بھی کڑی سزا دی جاتی ہے۔اسے ایک ایسے پیالے میں دانہ پھینکنے کا حکم دیا جاتا ہے جو بغیر پیندے کے ہے۔یقیناً ایک جواری کے لئے اس سے بڑی سزا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔اس کا جانشین نیرو بھی اس علت سے نہ بچ سکا۔روم کی تباہی میں اُس کی بنسری کے علاوہ جوئے کا بھی ہاتھ تھا۔وہ اُن دنوں بھی ایک داؤ پر پچاس ہزار ڈالر کی شرط لگاتا تھا۔ اس طرح پاگل شہنشاہ کالی گیولا (CALI GULA) ہار کر چڑچڑا ہو جاتا تھا اور اپنی ہار کا انتقام امیر لوگوں سے اس صورت میں لیتا تھا کہ یا تو اُن کی جائیداد ضبط کر لیتا یا پھر اُنہیں مروا دیتا۔یورپین بادشاہوں نے رومنوں کی اس روایت کو زندہ رکھا اور ان میں نمایاں نام ہنری ہشتم اور لوئی چہارم کے ہیں۔جس کا ذکر پہلے

کیا جا چکا ہے۔

ادیبوں میں داستووسکی، مان ٹینی (MONTAIGNE) کارڈن اور DECARTS کے نام خاصے مشہور ہیں۔

کیسانووا ایک ایسا گیمبلر تھا جس کا نام سنتے ہی حسرتیں، خواہشیں اور جذبے جوان ہو جاتے تھے۔ اٹلی کا یہ آوارہ ہیرو ایک ایسا شخص تھا جس سے لوگ بیک وقت محبت اور نفرت کرتے تھے۔ جواری اِسے اپنا گرو مانتے تھے۔ عورتیں اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب رہتیں۔ اس نے بھی انہیں کبھی مایوس نہ کیا۔ یوں لگتا تھا کہ 18 ویں صدی کے اِس اوباش کے سینے میں ایک نہیں ہزاروں دل ہیں جنہیں وہ جگہ جگہ پھینکتا اور بانٹتا چلا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ رومانس اگر مجسم شکل میں آتا تو وہ کیسانووا ہوتا۔ اس کا پورا نام GIACOMO JALOPO CASANOVO DESEINC تھا۔ وہ ایک بنجارا تھا جو نگری نگری پھرتا رہا۔ وینس، یونان، پیرس، برلن، لندن، میڈرڈ، ہر جگہ کی اُس نے خاک چھانی۔ کبھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبھی اُفتادِ طبع کیوجہ سے اور اکثر گردشِ حالات زرد پتے کی طرح اُسے اُڑاتی رہی۔ وہ اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے ''لذت، جواء اور بیکاری میرے مستقل ساتھی ہیں۔ وہ بیس سال کی عمر میں ہی پیشہ ور جواری بن گیا..... اُس کے حسن اور خداداد صلاحیتوں نے اُسے سارے یورپ میں مشہور کر دیا۔ غربت اور امارت اُس کی زندگی کا واحد مقصد حصولِ زر تھا۔ اس کے لئے وہ کوئی کام بھی کر گزرتا اور ضمیر کی خلش کو اُس نے ہمیشہ ایک ''شریفانہ فاصلے'' پر رکھا۔ FARO اُس کی پسندیدہ گیم تھی۔ اس میں اُس نے لاکھوں کمائے اور لاکھوں گنوائے..... کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ہارنے پر اُس کی امیر محبوباؤں اور داشتاؤں نے اُس کی مالی معاونت کی اور اُسے ہار کی دلدل سے نکالا..... اُس میں اس قدر جنسی کشش تھی کہ عورتیں اپنے زیور تک بیچ دیتیں۔ ہیرے جواہر نیلام کر دیتیں لیکن اُس کی قربت سے کنارہ کش ہونا گوارا نہ کریں۔ اُس کی زندگی کا اہم ترین موڑ وینس کی جیل سے اُس کا فرار تھا۔ اُس کو جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ 1760ء میں اُس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ فرانس کا ایک مشہور آدمی دو کروڑ فرانک کی مدد سے ایک ملٹری سکول کھولنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اُس نے بادشاہ سے مالی معاونت کی درخواست کی۔ بادشاہ کو سکیم سے تو

اتفاق تھا لیکن اپنا خزانہ خالی ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجبور ہو کر اُس نے کیسانووا سے رجوع کیا۔ نووا کے ذہن رسا نے لاٹری کی اختراع کی۔ ہر چند کہ یہ کوئی نیا طریقہ نہ تھا لیکن یورپ میں اسے جدید خطوط اُستوار کرنے کا سہرا اُس کے سر پر ہی سجنا تھا۔ ابتدائی شکوک وشبہات کے بعد بادشاہ نے اجازت دے دی اور حکومت ضامن بن گئی۔ اس سے لوگوں کا اعتماد بحال ہوا اور ہر شخص نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا..... ملٹری کالج بن گیا۔ بادشاہ کا خزانہ مزید بھر گیا اور ساتھ ہی کیسانووا کے دن بھی پھر گئے۔

لیکن جس چیز نے اُسے ڈان حوان (DON JUAN) کی طرح مشہور کیا وہ گیمبلنگ نہیں بلکہ اُس کے معاشقے تھے۔ ہر وقت اُس کے گرد مہوشوں کا ہجوم رہتا۔ اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ہزاروں دل دھڑکتے۔ جنسی لذت کو اُس نے ایک نیا مفہوم دیا اور انوکھی دنیا سے رُوشناس کرایا۔

اس میدان میں برطانیہ نے بھی پیچھے رہنا گوارا نہ کیا اور کیسانووا اور ڈان حوان کے مقابلے میں مادر وطن نے بیو برومل (BEAUBRUMMELL) متعارف کرایا جو عورتوں کا نہیں بلکہ عمدہ لباس کا شوقین تھا۔ جواء البتہ اُس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ایک امیر باپ کا بیٹا ہونے کے ناطے اُس نے ETON اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ فوج کی ملازمت اور وہاں اُس کی دوستی PRINCE REGENT سے ہوئی۔ جس سے بعد میں اکثر وہ بدتمیزی سے پیش آتا..... اُس کے شب و روز Whites and Brooks Club میں گزرتے جہاں وہ باقاعدگی کے ساتھ گیمبلنگ کرتا..... جواء کھیلتے وقت وہ ہار جیت سے بے نیاز ہو جاتے۔ اُسے مسلسل گفتگو کرنے کی عادت تھی اور وہ اُس وقت تک بولتا رہتا جب تک لوگ تنگ نہ آ جاتے..... کھیلتے ہوئے دیگر جواریوں کے ساتھ اُس کی نوک جھونک بھی چلتی رہتی۔ لیکن کیسانووا کی طرح زیادہ دیر تک قسمت نے اُس کا ساتھ نہ دیا اور ہارتے ہارتے وہ دیوالیہ ہو گیا۔ قرض خواہوں نے جب مطالبات شروع کئے تو زندگی اُس کے لئے عذاب بن گئی..... پرنس ریجنٹ کے ساتھ جھگڑے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اُسے انگلینڈ سے جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ فرانس چلا گیا لیکن وہاں بھی بدقسمتی اس کا پیچھا کرتے ہوئے پہنچ گئی۔ اُسے نادہندہ قرار دے کر گرفتار کر لیا گیا اور بالآخر 1840ء میں 62 سال کی عمر میں وہ ایک پاگل خانے میں فوت ہوا..... دورانِ اسیری ایک دوست اُسے

ملنے جیل گیا اور تاسف بھرے انداز میں پوچھنے لگا کہ ایسا کیونکر ہوا..... اُس نے جو جواب دیا وہ ایک پیشہ ور جواری ہی دے سکتا ہے۔ ''میں نے اپنی بدقسمتی کی تحریر خود ہاتھوں سے لکھی ہے۔ ایٹن میں ایک بوڑھی عورت نے مجھے ایک سکہ دیا تھا جس میں سوراخ تھا۔ اسنے کہا تھا کہ جب تک اس کو سنبھال کر رکھو گے کامیابی تمہارے قدم چومے گی اور اگر یہ کھو گیا تو تمہارا مقدر سو جائے گا..... چنانچہ ایسا ہی ہوا جب تک وہ سکہ میری جیب میں رہا۔ پیسہ میرے ہاتھ کی میل بنا اور جب غلطی سے اُسے میں نے ایک گاڑی بان کو دے دیا تو نحوست کے سائے گہرے ہو گئے۔''

بیسویں صدی کے گیمبلرز کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ بعض لوگ پیسے کی خاطر کھیلتے، کچھ کچھ اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے اس کا سہارا لیتے۔ ان میں فرانس کے کار مینوفیکچرر آندرے سٹریان ANDR'e CITROE کا نام خاصا مشہور ہے۔ وہ صرف کمپنی کی مشہوری کے لئے کھیلتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ عمداً ایک مشین میں ایک کروڑ تیس لاکھ فرانک محض اس لئے ہار گیا کہ اخباروں میں یہ خبر جلی حروف کے ساتھ چھپے کہ سٹریان کمپنی کا مالک اتنا بڑی رقم ہار گیا ہے۔ اُس کے خیال میں یہ کمپنی کی پبلسٹی کے لئے ضروری تھا اور ایک قسم کا اشتہار تھا۔ ''ہار جیت میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اصل بات یہ ہیکہ دنیا جان لے کہ ایک امیر آدمی کیسینو میں بیٹھا کھیل رہے ہے۔'' اُس کا انجام بھی دیگر جواریوں کی طرح برا ہوا۔ وہ دیوالیہ ہو کر مرا اور اخباروں میں خبر اس قدر چھوٹی تھی کہ شاید ہی کسی نے پڑھی ہو۔

جو لوگ لندن کی آکسفورڈ سٹریٹ میں گئے ہیں وہاں اُنہوں نے ایک بہت بڑا سٹور SELFRIDGES دیکھا ہوگا۔ یہ بہت مہنگا سٹور ہے اور ہیرڈز کے بعد اس کی سج دھج دیدنی ہے۔ اس کے مالک GORDON SELFRIDGE کو بھی کھیلنے کا شوق تھا۔ وہ محض اس لئے کھیلتا تھا کہ یہ امارت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن کھیلنے سے زیادہ اُسے کھلانے کا شوق تھا۔ یہ شوق اُس کی داشتائیں ڈولی سسٹرز پورا کرتی تھیں یعنی شوق اُن کا اور سرمایہ اِس کا۔ ان بہنوں کا اصل نام JANZIESKA اور ROSZIESKA تھا۔ یہ ہنگری کی رہنے والی تھیں اور بنیادی طور پر کیبرے ڈانسرز تھیں اُن کے فن سے متاثر ہو کر امریکن تھیٹر کمپنی کے مالک

FLOZIEGFELOIMPRESAS نے انہیں 1911ء میں اپنی فلم FOLLIES میں کاسٹ کیا۔ اس سے ان کی شہرت بڑھی اور جب لندن آئیں تو ان کا شو دیکھ کر حضرت سیلفرج نے اپنے دل کے ساتھ بٹوا بھی کھول دیا۔ یہ معاشقہ ایک طویل عرصے تک چلا اور انہوں نے اس کے اسی لاکھ ڈالر خرچ کرواڈالے۔ جب بھی وہ ہارتیں تو یہ ہیرے جواہرات بھیج کر اُن کی ڈھارس بندھواتا۔ اور اگر وہ جیت جاتیں تو اُس رقم سے اپنے لئے جائیداد خرید لیتیں۔ اس کا انجام بھی برا ہوا۔ اتنی بڑی جائیداد کا مالک 83 سال کی عمر میں کسمپرسی کے عالم میں مرا۔ بعد میں اُس کی داشتہ جینی نے بھی عالم یاس میں خودکشی کر لی۔

امریکن کروڑ پتی جان گیٹس JOHN. W. GATES کا شمار بھی دنیا کے مشہور گیمبلرز میں ہوتا ہے۔ ایک نشست میں اُس کی ہار جیت لاکھوں ڈالر تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک طویل عرصہ تک کھیلنے کے باوجود وہ امیر ہی رہا اور جوئے کا جادو چل نہ سکا۔ آخری عمر میں تائب ہو گیا اور اکثر لوگوں کو نصیحت کرتا تھا کہ اس برائی سے بچو کیونکہ اس میں انجام کار رسوائی، ندامت اور تاسف کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

O

برصغیر میں پیشہ ور جواریوں کی کمی نہیں لیکن انہیں وہ شہرت نصیب نہ ہوئی جو امریکن اور یورپین گیمبلرز کے حصے میں آئی۔ ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی تھی جو سوسائٹی کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم بھی واجبی سی تھی۔ دراصل یہ لوگ ازخود اس قابل نہیں تھے کہ ہائی سوسائٹی میں چل سکیں۔ کچھ اوباش امیر انہیں ایک طرح سے کمیشن پر ملازم رکھ لیتے تھے۔ ان کو بہترین لباس پہنایا جاتا۔ ہاتھ میں ایک عدد ہیرے کی انگوٹھی، منہ میں ہوانا کا سگار یا ڈن ہل کا پائپ..... پہلے ان کا تعارف اس انداز میں کرایا جاتا جیسے یہ کسی شہزادے یا بگڑے نواب ہوں۔ پرنس آف مورت یا نواب ٹانک وغیرہ..... اس طرح نفسیاتی طور پر مخالف کھلاڑیوں پر ایک رعب سا طاری ہو جاتا۔ ان کے سان وگمان میں بھی نہ ہوتا کہ ان کا پالا ایک پیشہ ور جواری سے پڑ رہا ہے۔ پھر تعارف کرانے والا شخص خود نہ کھیلتا ان کے ساتھ ایک ایسے شخص کو بھی بٹھایا جاتا جو یہ ظاہر کرتا کہ وہ پیشہ گیمبلر کو نہیں جانتا۔ تاش شروع کرنے کے بعد پہلے ہاتھ مخالف فرق کو جتوائے جاتے جس سے ان کا حوصلہ اور شوق بڑھتا پھر ہاتھ کی صفائی شروع ہوتی۔ پیشہ ور جواری خود ہارتا جاتا لیکن

دوسرا ساتھی مسلسل جیتنا شروع کر دیتا۔ ان کے فن کا کمال یہ ہوتا کہ تاش کے باون پتوں میں سے جو پتا چاہتے بانٹتے ہوئے نکال لیا اور دوسرے کھلاڑیوں کو قطعاً پتہ نہ چلتا کہ PULLING ہو رہی ہے..... اس قسم کی دھوکہ دہی کیلئے فلاش بہترین کھیل تھا۔ تین پتوں کے کھیل میں ہیرا پھیری نسبتاً آسان ہوتی ہے اور پھر شرط کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کھلاڑی اپنے پتوں کی طاقت پر جب تک چاہے چال چل سکتا ہے۔ اس طرح بعض اوقات ایک ہاتھ ہی میں اس کا پڑا ہو جاتا۔ یہ کھیل اب قریباً متروک ہو گیا ہے اور بڑے کلب اس کے کھیلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس طرح ڈائس میں ہیرا پھیری یوں کی جاتی کہ پیشہ ور دو قسم کے دانے اپنے پاس رکھتا۔ ایک عام قسم کی ڈائس اور دوسری LOADED DICE جو اس کی آستین میں چھپی ہوتی۔ جب اس نے کام دکھانا ہوتا تو ہاتھ کی صفائی سے اصل دانہ آستین میں چھپا لیتا اور دوسرا نکال کر مخالف کھلاڑی کے چھکے چھڑوا دیتا چونکہ یہاں بھی لڑائی جھگڑے کا احتمال ہوتا اس لئے یہ لوگ ایک گینگ کی شکل میں کھیلتے اور خطرناک غنڈے اور بدمعاش ان کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے۔

توہم پرستی اور جوئے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا گیمبلر ہو جو اوہام کا شکار نہ ہو۔ ویسے تو کیسا ہی پڑھا لکھا اور بڑا آدمی کیوں نہ ہو کسی نہ کسی رنگ میں اس عارضے میں مبتلا ہوتا ہے۔ بڑے بڑے حکمران' جرنیل اور سیاستدان اسی کے اسیر رہے ہیں۔ انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو نے گردوں کی تکلیف کے باوجود ڈاکٹروں کا مشورہ نہ مانا اور آپریشن کروانے سے اس لئے انکار کر دیا کہ اسے وہم ہو گیا تھا کہ اس کی مولت لوہے کے آلات سے ہوگی..... ایوب خان مرحوم نے دو خطبوں سے بچنے کے لئے جمعہ کی بجائے جمعرات کو ہی قوم کو چاند دکھلا دیا اور لوگوں کا روزہ تڑوا کر نوید عید دے دی۔ بھٹو مرحوم البتہ مستثنیات میں سے تھے۔ جب ان کی توجہ مولانا کوثر نیازی نے اس طرف دلائی اور یہ کہہ کر جمعہ کی عید رکوانے کی کوشش کی کہ جمعہ کا روز عید والی ریاست پر بھاری ہوتا ہے تو بھٹو نے مسکرا کر مولانا صاحب سے اتفاق کیا؟'' آپ درست فرماتے ہیں۔ والی ریاست چودھری فضل الٰہی کافی بوڑھے ہو چکے ہیں'' دراصل ان کے شاطر ذہن نے فوراً HEAD OF THE GOVT اور HEAD OF THE STAT کا فرق جان لیا تھا۔

لیکن جواریوں کی ہم پرستی اور قسم کی ہوتی ہے۔ یہ محض ان کی ہار جیت تک محدود ہوتی ہے اور ہار کے برے

شگون سے بچنے کیلئے وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں جو بادی النظر میں انہیں مضحکہ خیز بنا دیتی ہیں۔ جواء کھیلنے سے پہلے اگر کالی بلی نے راستہ کاٹ لیا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کیونکہ اسے جادوگرنیوں کی ساتھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قدیم مصر اور چین میں اس کالی بلی کو خوش قسمتی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ جواء خانے میں جانے سے پہلے کونسا راستہ منتخب کرنا ہے' کسی قسم کی کرسی پر بیٹھنا ہے' کرسی کے گرد کتنے چکر لگانے ہیں اور دائیں ٹانگ کو بائیں پر رکھنا یا دونوں ٹانگیں پسار کر بیٹھنا ہے۔ تاش کے پتوں کو کس ہاتھ میں پکڑنا ہے اور انہیں کس انداز میں کھولنا ہے۔ اپنے پتے سب سے پہلے دیکھنے ہیں یا بعد میں..... توہمات کی کوئی حد نہیں ہے۔ بعض کھلاڑی نمبروں کے معاملے میں بڑے محتاط ہوتے ہیں اور انہیں اپنی خوش بختی یا بدقسمتی کی علامت سمجھتے ہیں۔ 3,7,13,70 نمبروں کو خاصی اہمیت دی جاتی ہے۔ 7 کا نمبر عام طور پر لکی سمجھا جاتا ہے جبکہ 13 کا عدد اکثر کے نزدیک نحوست کی علامت ہے۔

اس قسم کے توہمات کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ ان کی بیک گراؤنڈ یا جواز سے یہ لوگ خود بھی آشنا نہیں ہوتے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی دوسرے شخص کی خوش قسمتی میں یہ شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب مشہور گیمبلر رچرڈ منٹ کھیل رہا ہوتا تو دیگر جواری لپک لپک کر اسے چھوتے۔ ان کا خیال تھا کہ بجلی کی رو کی طرح خوش قسمتی بھی ٹرانسفر ہو سکتی ہے۔

اسی طرح ایک دلچسپ قصہ مانٹی کارلو کے BLANCHARD کا ہے۔ وہ کھیلنے جا رہا تھا کہ ایک کبوتر نے اس کے ہیٹ پر بیٹ کر دی۔ اس دن وہ خوب جیتا۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ اب تو وہ گھنٹوں کیسینو کے باہر کھڑا ہو کر کبوتروں کا انتظار کرتا رہتا۔ چند ہفتوں کے جاں گسل انتظار کے بعد اسے گوہر مراد ہاتھ آیا یعنی ایک اور کبوتر نے اس کا ہیٹ خراب کر دیا۔ وہ مارے خوشی کے دہرا ہو گیا اور اس امید پر اندر بھاگا کہ اب کے وہ لمبا ہاتھ مارے گا۔ چند بازیاں کھیل کر ہی وہ تہرا ہو گیا۔ تمام جیت کی رقم بھاپ بن کر فضا میں اڑ گئی اور وہ ایک ٹوٹے ہوئے دل اور خمیدہ کمر کے ساتھ یہ عہد کر کے باہر نکلا کہ اب ساری زندگی وہ نہ کسی گیمبلر کا منہ دیکھے گا اور نہ کیسینو کی زیارت کرے گا۔ لیکن اس دن سے جواریوں میں یہ بات عام ہو گئی کہ پرندوں کی بیٹ جیت کی پیغامبر ہوتی ہے۔

گیمبلنگ کی تشریح اگر کوئی ایک لفظ میں کرنا چاہے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ "امید کو قرض پر خریدنے کا ایک ذریعہ ہے"۔ گیمبلنگ اینگلو سیکس لفظ GAMENIAN سے نکلا ہے جس کے معنی کھیل کے ہیں..... جیسے جیسے کھیل ترقی کرتے گئے اور مقابلہ آرائی زیادہ ہوئی، اس کے ساتھ شرطیں لگنی شروع ہو گئیں اور ایک کھیل محض کھیل نہ رہا بلکہ دولت کی ریل پیل کا ذریعہ بن گیا۔

صبح ہو گئی تھی لیکن میں ہنوز جاگ رہا تھا۔ بستر سے اٹھ کر میں نے الیکٹرک کیتل میں پانی گرم کیا۔ کافی کا کپ بنایا اور ہوانی سگار سلگا کر چند لمبے کش لئے۔ کافی اور سگار کا بڑا عمدہ کمبی نیشن ہے۔ سارے وجود میں ایک عجیب قسم کی طمانیت کا احساس ہوتا ہے اور ذہن میں اٹکے ہوئے خیالات کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں۔ ہوانا کے سگاروں کا اروما مشہور ہے۔ ایک نشیلی سی خوشبو سارے کمرے میں پھیل جاتی ہے۔ یہ سگار بہت مہنگے ہیں لیکن امریکہ میں بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ امریکی کیوبا سے نفرت کرتے ہیں لیکن ان کی مصنوعات کے شائق ہیں۔ کیوبا جو امریکہ کا پڑوسی چھوٹا سا ملک ہے۔ جو امریکہ کے گلے کی پھانس ہے بلکہ ایک طرح سے اس کی چڑ بن گیا ہے، اتنی بڑی سپر طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ جس طرح شیر چوہے کو پکڑ کر سزا نہیں دے سکتا۔

کیوبا ایک کمیونسٹ ملک ہے جس کا سربراہ فیڈرل کاسترو امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک طویل عرصہ سے اقتدار کی گدی سے بڑی مضبوطی کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ کئی امریکی صدر آئے اور اسے سزا دینے کی حسرت دل میں لئے چلے گئے لیکن یہ نیک بخت ڈٹا ہوا ہے۔ گردش مہ و سال اقتدار پر اس کی گرفت کمزور نہیں کر سکے۔ بس ہر سال داڑھی کی طوالت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

روسی ایمپائر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے۔ روس عملاً امریکہ کی گود میں جا گرا ہے۔ Prestroika & Glasnos نے کمیونسٹ فلسفے پر کاری ضرب لگائی ہے۔ ڈوبتی ہوئی معیشت نے رہی سہی کسر نکال دی ہے۔ چین بھی بین الاقوامی مصلحتوں کے تحت امریکہ کے قریب آ گیا ہے۔ اور اسے یہاں MOST FAVOURED NATIO کا مرتبہ مل گیا ہے لیکن کاسترو نے سر تسلیم خم نہیں کیا اور اپنے نظریات

اور اصولوں سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کو اقتدار سے ہٹانے کی ہر امریکی کوشش ناکام ہو چکی ہے..... سمندری آکٹوپس کی طرح C.I.A کے پنجے ہر براعظم تک پھیلے ہوئے ہیں۔ حکمران اور سلاطین اپنے محفوظ محلوں میں بیٹھ کر بھی لرزتے رہتے ہیں اور امریکہ بہادر کی خوشنودی کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ لیکن اس بوڑھے جرنیل کی داڑھی کا ایک بال تک نہیں ہلتا۔ 1964ء میں تو اس نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھا دیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے لوگوں نے سوچا کہ وہ قیامت بالآخر آنے والی ہے جس کا اشارہ ہر الہامی کتاب میں موجود ہے۔

ایٹمی جنگ..... وجود سے عدم وجود..... روسی بحری جہاز ایٹمی میزائلوں کی ایک بڑی کھیپ لے کر کیوبا کی طرف بڑھ رہے تھے کہ کینیڈی نے روس کو متنبہ کیا کہ جہازوں کا رخ موڑ دیا جائے نہیں تو لفظ کیوبا تاریخ کی راکھ میں بھی نہیں ملے گا۔ پہلے تو خروشیف ڈٹ گیا لیکن امریکی ارادے اور طاقت کو دیکھتے ہوئے بالآخر نگاہ نیچی کر لی کیونکہ مونچھ وہ رکھتا نہیں تھا، اسی زعم میں کینیڈی نے BAY OF PIGS مہم کے ذریعے اس کا تختہ الٹنے کی نیم دلانہ کوشش کی لیکن سوائے رسوائی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔

کافی اور سگار نے اپنا کام آہستہ آہستہ دکھانا شروع کیا۔ دھیرے دھیرے کوئی ذہن کو تھپکیاں دینے لگا اور میں گہری نیند سو گیا۔

جب میں اٹھا تو شام کے تین بج رہے تھے۔ ناشتے اور لنچ کا وقت نکل چکا تھا۔ اس قدر گہری نیند کبھی کبھی نصیب ہوتی ہے، نہیں تو پریشانیاں اور تفکرات نیند میں بھی ہچکولے دیتے ہیں اور آدمی بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ سونے کے متعلق مختلف نظریات ہیں۔ زاہد اور پارسا لوگ زیادہ سونا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ ہر اس لمحے کے طالب ہوتے ہیں جو یاد الٰہی میں گزرتا ہے۔

تیار ہو کر مون کو فون کیا' وہ کمرے میں نہیں تھیں۔ ریسپشن سے رابطہ کیا تو اس کا پیغام ملا کہ وہ سارا اور کیتھرائن کے ہمراہ کسی عزیز کو ملنے جا رہی ہے اور رات کو دیر سے واپس آئیں گی..... میں نیچے ہال میں آ گیا۔ ہال میں زیادہ رش نہ تھا۔ لوگ لنچ کے بعد قیلولہ کی غرض سے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔

میں سانتا فے بار میں چلا گیا۔ بوڑھا فرانسیسی بارٹینڈر مجھے دیکھ کر مسکرایا اور میرے آرڈر دینے سے پہلے ہی بول پڑا ''بلڈی میری؟''

''اورنج جوس ٹھیک رہے گا'' میں نے کہا ''میں بہت دیر سے سویا ہوں اور کافی دیر سو کر اٹھا ہوں اس لئے جسم کوئی ریفرشنگ ڈرنک مانگتا ہے''۔

جوس کا گلاس کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا ''کیا بات ہے آج اکیلے پھر رہے ہو۔ تمہاری دوست نظر نہیں آ رہی؟''

''وہ کسی عزیز کو ملنے گئی ہے لیکن تم مضطرب کیوں ہو؟''

کہنے لگا ''کوئی ایسی بات نہیں! تم کچھ کھوئے کھوئے سے لگ رہے تھے اس لئے پوچھ لیا''۔

''بعض اوقات اپنی اندرونی کیفیات کا پرتو دوسروں کے چہرے پر منعکس نظر آتا ہے؟'' میں مسکرایا۔

''ہو سکتا ہے!'' وہ اتفاق کرتے ہوئے بولا ''دراصل وہ بڑی پیاری اور بھولی لڑکی ہے۔ اس نفسا نفسی کے ماحول میں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں!''

''تم اسے کب سے جانتے ہو؟''

گزشتہ ایک برس سے۔ وہ مہینے میں دو بار ضرور آتی ہے!''

''تم فرانسیسی ہو کر یہاں سروس کر رہے ہو اور بادل نخواستہ انگریزی زبان بھی بولتے ہو۔ کیا فرانس میں نوکریاں ختم ہو گئی ہیں؟'' میں نے موضع بدلتے ہوئے پوچھا۔

''ایک طویل عرصہ ہوا میں نے فرانس چھوڑ دیا ہے۔ کینز سے کیوبک گیا اور امریکہ آ گیا۔ بالآخر قسمت مجھے اس شہر خرابات میں لے آئی ہے''۔

''کیا تم یہاں خوش ہو؟''

''اس عمر میں خوشی، ناخوشی بے معنی ہو جاتی ہے! صرف زندگی گزارنے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے.....!''

لوگ CANNES جانے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور تم وہ شہر حسن چھوڑ آئے؟''

''کیا تم نے وہ شہر دیکھا ہے؟ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آئی'' فرنچ رویرا۔ ''فرانس کی

انگوٹھی کا نگینہ..... جس کے عطر بیز پانیوں کی اپنی ایک خوشبو ہے' ایک رنگ ہے۔ کسی زمانے میں میں بھی جوان تھا اور خوبصورت۔ شہر کی طرح مجھے بھی اپنے آپ پر بڑا ناز تھا۔ میرا باپ ایک معقول جائیداد چھوڑ کر مرا تھا۔ دولت اور خودسر جوانی جب یکجا ہو جائیں تو پھر بڑی خرابی پیدا کرتی ہیں۔ میرے شب و روز کیفے کیسینو میں گزرنے لگے۔ دن کو ساحل سمندر پر حسیناؤں کے ساتھ اٹھکیلیاں اور رات کو شراب خانوں اور گیمبلنگ ٹیبلز پر..... ان حالات میں گنج قارون بھی ہوتا تو ختم ہو جاتا۔ دولت کا جانا تھا کہ ہر چیز روٹھ گئی۔ زمانے نے آنکھیں پھیر لیں۔ کچھ دن تو ادھار لے کام چلایا لیکن تا کے! جس جگہ آپ نے اچھے دن گزارے ہوں وہاں غربت نہیں کاٹی جا سکتی۔ اس قسم کے ناپسندیدہ جاب بھی نہیں کیے جا سکتے..... لہٰذا میں نے شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا"۔

"کیا تم کیفے واپس گئے ہو؟"

"نہیں! ایک دفعہ بھی نہیں! اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ "جب ایک دفعہ چھوڑ دیا تو چھوڑ دیا! میں ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنی حسرتوں کے مزار پر دعا مانگنے جاتے ہیں!"

"ایسے لگتا ہے جیسے آج بھی اس کی یاد تمہارے سینے میں جوان ہے.....!"

"مادر وطن کو کون بھول سکتا ہے۔ جس مٹی سے میرا خمیر اٹھا جہاں میرے ماں باپ دفن ہیں' جو زمین میری شناخت ہے اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں..... نہ جانا میرے بس میں ہے لیکن یادوں کے چراغ کبھی نہیں بجھتے.....!"

"مجھے تم سے ہمدردی ہے!" میں نے اسے اس دردانگیز کیفیت سے نالنے کی شعوری کوشش کی۔

"شکریہ! لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کی لاکھ ہمدردیاں تسلیاں اور دلاسے کسی ایک درد کا مداوا بھی نہیں بن سکتے!"

"لیکن غم بانٹا تو جا سکتا ہے! اس کا بوجھ کچھ نہ کچھ تو ہلکا کیا جا سکتا ہے"۔

بولا، "یہ محض خام خیالی ہے۔ غم ناقابل تقسیم ہے۔ ہر شخص نے اپنی صلیب خود اٹھانی ہے"۔ بار میں اٹالین سیاحوں کی ایک پوری ٹولی آ گئی اور وہ فرداً فرداً آرڈر دینے لگے۔ میں نے بل ادا کیا اور اٹھ کر کیسینو سے

باہر آ گیا.....

جتنے لوگ کیسینو سے باہر نکل رہے تھے اس سے کہیں زیادہ اندر جا رہے تھے۔ ایم جی ایم گرینڈ بلیوارڈ کے بائیں طرف کا آخری کیسینو ہے۔ اس کے بعد میکارن ایئرپورٹ کے رن وے کی حدود شروع ہو جاتیں ہے۔ ایک دیوار ہے جو ایئرپورٹ کو شہر سے الگ کرتی ہے۔

میں بے مقصد باہر آ گیا تھا۔ گائیڈ کے بغیر شہر کی سیر کا خیال ہی بڑا بے لذت سا لگا۔ باہر نکل کر میں بائیں ہاتھ چل پڑا۔ میں نے پہلا چوک کراس کیا ہی تھا کہ پھر وہی ہوا جو ویگاس میں اکثر ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑی گاڑی میرے قریب آ کر رکی۔ ایک نہایت سمارٹ سی لڑکی نے سر باہر نکالا بولی ''ہائے کیا حال ہے؟''

''NOT TO BAD'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کدھر جا رہے ہو۔ کیا تمہیں لفٹ چاہئے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''آوارہ گردی کر رہا ہوں'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''کیا آوارگی کی انتہا تک جانا پسند کرو گے؟''

''آوارگی کی انتہا کیا ہوتی ہے؟''

''آدمی یا تو چاند تک پہنچ جاتا ہے یا پھر پاتال میں دھنس جاتا ہے.....!''

''میں انتہا پسند نہیں ہوں۔ میں سڑک کے درمیان چلنے کا عادی ہوں''۔

''تو پھر ویگاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''کیا لوگ ویگاس میں صرف اسی کام کے لئے آتے ہیں؟''

''تمہیں چرچ میں اپنے گناہ کو بخشوانے آتے ہیں''۔

اسے میرا استدلال اچھا نہ لگا اور غصے میں گاڑی کا شیشہ چڑھا کر کسی دوسرے شکار کی تلاش میں نکل گئی.....

میکارن ایئرپورٹ کی حدود ختم ہوئیں تو ڈیزرٹ شروع ہو گیا۔ میں چلتا چلتا شہر سے خاصا باہر نکل آیا۔

صحرائے نیواڈا، صحرائے عرب کی طرح نہیں ہے جہاں سرکتی ہوئی ریت کے ٹیلے ہیں جو ہوا کے ساتھ بنتے

بگڑتے رہتے ہیں بلکہ یہاں COMPACT ریت ہے جس میں مٹی کی آمیزش ہے اور خودرو جھاڑیاں ہیں۔ دور دور تک کوئی شخص یا بھیڑ بکری یا ڈھور ڈنگر نظر نہ آئے..... سورج غروب ہوا چاہتا تھا اس کی کرنوں نے سفید ریت کو سنہری بنا دیا تھا اور جھاڑیوں کے نیم سبز پتوں پر زمرد کا گمان ہوتا تھا۔ میں نے مڑ کر شہر کی طرف دیکھا..... شہر سے چند میل دور صحرا کی وسعت' ہیبت اور خوبصورتی کا اندازہ شام کے ڈھلتے ہوئے سورج کے ساتھ ہوتا ہے۔ ڈیزرٹ میں ڈرائیو کرتا ہوا آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس صحرا میں اس قدر آباد اور شاداب شہر بھی بس سکتا ہے۔ یہ تضاد آدمی کو سکتے میں ڈال دیتا ہے۔ کسی بھی بڑے شہر میں داخل ہونے سے پہلے اس کی نشانیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ پہلے سبزہ جات آتے ہیں' پھر مضافات آتے ہیں پھر ایک یک منزلہ مکانات جو بڑھتے بڑھتے سکائی سکیپر میں تبدیل ہو جاتے ہیں گویا بتدریج ''بلڈاپ'' ہوتی ہے۔ ویگاس کا کمال یہ ہے کہ ایک دم شہر شروع ہو جاتا ہے۔ اگر فلوریڈا سے آئیں تو ایسے پتہ چلتا ہے کہ صحرا میں چلتے چلتے اچانک نخلستان آ گیا ہے اور اگر ہوور ڈیم کی طرف سے داخل ہوں تو پہاڑ کے عین نیچے شہر کسی انگشتری میں نگینے کی طرح سجا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی سرسبزی اور ہریالی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کھجور' پام کے خوبصورت درخت جو دراصل اگائے نہیں گئے بلکہ منگوائے گئے ہیں۔ سالم درخت جڑوں سمیت بڑے بڑے ٹرالوں پر کیلیفورنیا سے منگوا کر یہاں زمین میں گاڑ دیئے گئے ہیں اور پھر بی کوشش اور کاوش سے انہیں ماحول کے مطابق ڈھالا گیا ہے تاکہ پتے مرجھا نہ جائیں۔ یہ بڑا محنت طلب اور مہنگا کام ہے لیکن جہاں پیسہ اور ہمت اور ٹیکنالوجی ہو وہاں کوئی چیز بھی ناممکن نہیں ہوتی.....

صحرا میں مکمل خاموشی تھی۔ شہر کا شور وغل اور ہاؤ ہو یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ جھاڑیوں سے سرکتی ہوئی نیم مترنم ہوا اور سورج کی ہلکی سنہری کرنوں کے سوا دیگر کوئی ساتھی نہ تھا۔ مختلف پرندے بھی غالباً صحرا کی سختیوں کو جھیل نہ سکتے تھے۔ اور سبزہ زاروں کی طرف کوچ کر گئے۔ میں ریت پر نیم غنودگی کے عالم میں لیٹ گیا۔ یہ دشت غربت تھا یا دشت فرصت؟ میں نے ایک ملحے کے لئے سوچا۔ ایک نہایت وسیع و عریض صحرا! اگر ہزار قیس بھی ہوتے تو بروئے کار آ سکتے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ امریکن معاشرے میں صحرا تو بہت ہیں' قیس نہیں ملتے۔ قیس صورت پیوں نے بھی بغل میں کوئی نہ کوئی لیلیٰ دبوچی ہوتی ہے۔ جو محبوب سے ''منت ترلا''

نہیں کرواتی بلکہ خود اس کے ناز نخرے اٹھاتی ہے اور ہر وقت اس کے گلے کا ہار بنی رہتی ہے۔

کس قدر تضاد ہے ہماری زندگیوں میں! دنیا میں مختلف ممالک ہیں۔ قومیں، معاشرے، تہذیبیں جو اپنے اپنے حصار میں بند ہیں..... اور اپنے حال میں مست۔ ایک یہ شہر ہے جہاں ہفت رنگ روشنیاں کبھی نہیں بجھتیں۔ جس کے کیسینو دنیا کے ہر نائٹ کلب اور ہوٹل کو شرماتے ہیں۔ مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا..... گاؤں میں چاچے نورے کی واحد دوکان پر ایک مدھم چراغ ٹمٹاتا رہتا تھا۔ دن کے تھکے ہارے لوگ سورج کے غروب ہوتے ہی کھانا کھا کر سو جاتے تھے۔ ہم جب بھی چاچے کی دوکان پر ریوڑیاں اور گڑ کے شیرے میں پکائے ہوئے اخروٹ خریدنے جاتے تو وہ ہمیں بڑی حیران کن کہانیاں سنایا کرتا۔ اجنبی دیسوں کی کہانیاں، اجنبی لوگوں کے قصے! ایسی سلطنتیں جہاں چھ ماہ دن اور چھ ماہ رات ہوتی تھی۔ ایسے نگر جن کے باسی دن کو سوتے اور رات کو جاگتے تھے۔ ایسے دیو جن کی آدم بو سے اشتہا بڑھ جاتی تھی۔ ہم چشم تصور میں ان شہروں اور لوگوں کو دیکھتے اور ہمارے ساتھ یہ خواہش بھی پل کر جوانی ہوئی کہ کیا ہمارا بھی کبھی اس اقلیم سے گزر ہوگا؟ حالات مجھے نہ صرف اس شہر میں لے آئے تھے بلکہ ایسے لوگوں کی قربت اور رفاقت بھی میسر آئی تھی جو زندگی میں قسمت سے ہی ملتی ہے۔ اگر سانتا فے بار میں میری مون سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید شہر میں چند دن بھٹک کر واپس چلا گیا ہوتا۔ چند جملوں کے الٹ پھیر نے ایک ایسی دوستی کی بنیاد رکھ دی ہے جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا مون کی شخصیت کے پرت اس طرح کھلتے جاتے جیسے گلاب کی پنکھڑی کے نیچے ایک اور خوبصورت، کومل اور نرم و ملائم پنکھڑی ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو دنیا کے کسی خطے میں بھی چلی جاتی اپنے حسن اور من موہنی باتوں کا خراج ضرور وصول کرتی۔ میری زبان سے نکلے ہوئے چند تعریفی جملے اسے متاثر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس قسم کے نذرانے روز وصول کرتی تھی۔ کبھی اپنوں سے، اکثر غیروں سے..... باایں ہمہ وہ مجھے ویگاس کی سیر کرانا چاہتی تھی۔ کہتی، ''شاہ! مجھے تمہارا انداز گفتگو بہت پسند آیا ہے۔ اس قدر جرأت، بیباکی اور حلاوت تصنع اور بناوٹ پیدا نہیں کر سکتے..... کاش تم امریکہ میں پیدا ہوئے ہوتے.....

''تو پھر تم سے ملاقات کیسے ہوتی؟'' میں اسے بتایا۔ ''سانتا فے بار میں اجنبیوں کی طرح ہم اپنے اپنے جام

اٹھائے غرق مئے ناب ہوتے۔ نہ تو بلڈی میری کا نام سن کر مجھے اچنبھا ہوتا اور نہ بلڈلیس میری' کی اختراع تمہیں حیران کرتی''۔

ان خیالوں میں مگن میں کافی دیر لیٹا رہا۔ سورج اب غروب ہونے کو تھا۔ اس کی کرنیں صحرا کا الوداعی بوسہ لے رہی تھیں۔ میں اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں..... ایک جوڑا میرے قریب کھڑا مجھے بڑی حیرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

''تم تو ڈر ہی گئے تھے!'' لڑکے نے کہا ''تم جس قدر سکون کے ساتھ سوئے ہوئے تھے اس سے تو یوں گمان ہوتا تھا اب سوتے ہی رہو گے!''

''ایک نہ ایک دن تو سونا ہی ہے۔ مٹی کے اوپر سو لئے یا تہہ خاک!'' میں نے کہا۔

''تمہیں اکیلے دیکھ کر کچھ اچنبھا ہوا ہے!'' لڑکی بولی۔

''لیکن تم لوگوں نے میرا تجسس کچھ زیادہ ہی بڑھا دیا ہے۔ اس سے یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

''رات گزارنے! ایڈونچر..... کیا تم نے ہمارے رک سیک نہیں دیکھے! لڑکے نے شرارتی نظروں سے اپنی گرل فرینڈ کو دیکھا۔

''حشرات الارض کے ساتھ؟ کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا؟

''ڈر کس بات کا؟ انسان سے زیادہ خطرناک اور کوئی جانور نہیں'' لڑکے نے جواب دیا۔

''اور اگر دو جانور اکٹھے ہو جائیں تو؟

''تو پھر تیسرے جانور کی آمد کا سگنل ہو سکتا ہے!'' لڑکے نے اپنی دوست کو بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

ویگاس کے بارونق شہر کو چھوڑ کر ان کا صحرا میں رات بسر کرنا حیران کن نہ تھا۔ امریکی معاشرہ ترقی کرتا ہوا مادیت کے اس موڑ پر پہنچ گیا ہے جہاں نوجوان نسل ذہنی طور پر پریشان ہے اور روحانی سکون کی تلاش میں بھٹک رہی ہے۔ کوئی ہیروئن' چرس' حشیش اور گانجے کے دھوئیں میں سکون تلاش کر رہا ہے تو کوئی سادھوؤں کا چیلا بن کر گیروے کپڑے پہنے جنگل جنگل بھٹک رہا ہے۔ ہادو جوگیوں کو اتنے پیروکار ہندوستان میں نہیں ملتے جتنے امریکہ میں مل جاتے ہیں..... جب یہ نشے میں دھت ہو کر اپنی ٹوٹی پھوٹی

ہندی میں ہرے راما ہرے کرشنا کا جاپ کرتے ہیں تو دیکھنے اور سننے والے بڑے محظوظ ہوتے ہیں۔ میں نے زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اس امریکی جوڑے سے ہاتھ ملا کر واپس ہوٹل آ گیا۔

صبح دروازے پر بڑی زور کی دستک ہوئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں جا رہا بلکہ طبل جنگ بج رہا ہے۔ میں نے دروزہ کھولا تو تینوں باہر کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

''اس قدر گہری نیند! کل کیا کرتے رہے ہو'' سارا نے حسب عادت شک کا اظہار کیا۔

''سویٹ کمپنی؟'' کیتھی نے اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

''رات تم نے ضرور کسی نائٹ کلب میں گزاری ہوگی!'' سارا شک کو یقین کا لبادہ پہناتے ہوئے بولی!

''جبھی تو آنکھیں سرخ ہیں اور بال الجھے ہوئے!'' کیتھی بھی آج کچھ زیادہ چہک رہی تھی۔

''میں بستر سے سو کر اُٹھا ہوں تمہاری طرح کسی بیوٹی سیلون سے ہو کر نہیں آ رہا'' ہر چند کہ اُس اچانک حملے کے لئے تیار نہیں تھا لیکن سارا کی شرارتوں کا مجھے خاصا اندازہ ہو گیا تھا۔ اب کے اُس نے کیتھی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

''حسن کی کسی آرائش کا محتاج نہیں ہوتا'' وہ آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر مسکرائی۔

''اتنا خود بین حسن میں نے آج تک نہیں دیکھا۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ کیسا حسن ہے جو اپنی تعریف خود کر رہا ہے؟''

''تم تو کرنے سے رہے۔ تمہارے بُخل کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔''

''کیا فضول بحث شروع کر دی ہے''۔ مون نے اُسے ہلکی سی سرزنش کی۔ ''شاہ ہم نے کل تمہیں بڑا مس کیا ہے! کل کا دن کیسا گزرا؟''

''کسی طور گزر ہی گیا ہے..... میں صحرا کی طرف نکل گیا تھا۔''

''اگر ایک دن ہم اور مصروف رہیں تو یہ ہوور ڈیم کی جھیل کی طرف نکل جائے گا۔'' سارا نے بدلہ

لینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ چند دن تمہارا ساتھ رہا تو میں ڈیم کے پہاڑ سے چھلانگ ہی لگا دوں!''

''کیا میں اتنی بری ہوں؟'' اُس نے ہونٹ سکیڑے اور بانہیں مون کے گلے میں ڈال دیں۔

''نہیں کچھ کم بری ہو'' مون نے اُس کے گال پر ہلکا سا چپت لگایا۔

مون کہنے لگی آج ہم دو ایسے کیسینو دیکھنے جائیں گے جنہوں نے لاس ویگاس کو ایک نیا تشخص دیا ہے Affluence coupled with technology کی اصطلاح ان کی تکمیل کے بعد وضع کی گئی۔ یہ ہر اعتبار سے منفرد ہیں۔ نہ صرف ان کا مالک ایک ہے بلکہ مزاج بھی ایک جیسا ہے۔ جلالی اور جمالی کیفیات کا بڑا دلچسپ امتزاج ہے۔ باہر سے دیکھیں تو سراسر جلال اور اندر جائیں تو مجسم جمال۔ دنیا کا کوئی ہوٹل یا نائٹ کلب ایسا متضاد اور متنوع منظر پیش نہیں کرتا۔ شہر کے عین مرکز میں پہاڑ، جھیلیں، سمندر، آبشار اور قدیم بستیاں بسائی گئی ہیں۔ آگت پانی کو یکجا کیا گیا ہے۔ متلاطم سمندر میں بحری جہاز فیل بے زنجیر کی طرح دھاڑتے ہیں اور آپس میں گتھم گتھا ہوتے ہیں۔ اندر جائیں تو طلسم ہوشربا..... ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی اکیسویں صدی میں قبل از وقت داخل ہو گیا ہو۔ وہی آبشاریں جو باہر ایک گھن گرج کے ساتھ پہاڑ سے نیچے گرتی ہیں یہاں مترنم اور عطر بیز ہو جاتی ہیں۔ سبزے کے سمندر میں پانی دودھ کی نہر کی طرح بہتا ہے۔

''بس کرو! اگر ساری تفصیل ادھر ہی بتا دی تو پھر وہاں جانے کا کیا خاک مزا آئے گا؟'' سارا نے اسے ٹوکا۔

''بولنے دو۔ اس کا انداز بیان بھی اس کی طرح حسین اور بیباک ہے'' میں نے سارا کو جھڑکا۔

''شاید سارا ٹھیک ہی کہہ رہی ہے'' مون بولی SEEING IS BELIVEING۔ ویسے بھی حسن کو جس آنکھ سے ایک ادیب یا شاعر دیکھتا ہے عام آدمی نہیں دیکھ پاتا۔

''جانتی ہو شاہ اب کیا کہے گا؟'' سارا نے کیتھی کی طرف دیکھا۔

''کیا کہے گا؟''

''مون تم ایک عام انسان نہیں ہو۔ شاعروں نے تمہیں دیکھ کر غزل میں رنگ بھرا۔ کلی نے تمہاری جوانی سے چٹکنے کے انداز سیکھے۔ پھولوں نے تمہاری مسکراہٹ چرالی ہے۔ نکہت گل تمہیں دیکھ کر ہمیشہ شرماتی ہے۔ تم انسان نہیں ہو سراپا گلستان ہو۔''

''میں تو اسے ڈفر سمجھتا تھا لیکن یہ تو!''

''اتنی ڈفر نہیں ہے۔'' مون ادھورے فقرے کو مکمل کرتے ہوئے بولی ''رومانی فلمیں دیکھ دیکھ کر اس نے کافی ڈائیلاگ رٹ رکھے ہیں اور انہیں جابے جا دہراتی رہتی ہے۔''

''لیکن یہ معنی نہیں ہیں۔ شاہ اگر قسم اٹھائے کہ اس قسم کے خیالات اس کے دل میں نہیں ہیں تو میں ابھی اسی وقت چودھویں منزل سے نیچے کودنے کو تیار ہوں۔'' سارا نے اس طرح پوز بنایا جیسے قسم اٹھاتے ہی وہ سینکڑوں فٹ نیچے چھلانگ لگا دے گی۔

''اس طرح تو یہ قتل عمد کا مرتکب ہوگا'' مون کہنے لگی۔ کیا ضروری ہے کہ ایک گنہگار کی جان لی جائے۔

'' کچھ بھی نہیں ہوگا'' میں نے کہا ''بالفرض یہ کودی بھی تو ضرور کسی راہ گیر کے کندھوں پر گرے گی۔ اس غریب کی گردن ٹوٹ جائے گی جبکہ اس کو خراش تک نہیں آئے گی اور یہ مٹکتی لچکتی پھر لفٹ کے ذریعے اوپر آ جائے گی۔''

''کیا یہ کٹی ہوئی پتنگ ہے جسکی ڈور پکڑنے کیلئے ہر کوئی دوڑے گا!'' کیتھی بھی جملہ بازی میں شامل ہو گئی۔

''کوئی اسے کیا پکڑ پائے گا! اس کی ڈور کا سرا ہی نہیں ملتا'' میں نے کہا۔

کہنے لگی ''میری ڈور کا کنٹرول میرے پاس ہے اور میں بڑی دیکھ بھال کے بعد ڈولتی ہوں..... یہ مون ہے جس کی ڈور کا سرا نہیں ملتا۔ کئی سر پھرے اس کی تلاش میں دوڑے اور بے نیل و مرام واپس لوٹ گئے پتہ نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی ہے یہ!'' سارا نے مون کو گدگدایا۔

''شاہ اس کی دلچسپ باتیں آسودگی اور تفریح کا باعث بنتی ہیں۔ تفکرات بھول کر بھی اس کے نزدیک نہیں پھٹکتے۔ مجھے اس کی دوستی پر ناز ہے'' مون نے اسے گلے لگا لیا۔

ہم نیچے آئے تو میں نے مون سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لئے سانتا فے بار چلتے ہیں۔

''کیا نہ پینے کی قسم توڑ دی ہے'' اسنے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

''میں نے قسم اٹھائی ہی کب تھی! لیکن وہاں جانے کی یہ وجہ نہیں ہے۔''

''کیا وہاں کوئی چیز بھول آئے ہو؟''

''نہیں۔ بوڑھا فرانسیسی بارٹینڈر تمہیں نہیں بھولا۔ کل بھی یاد کر رہا تھا۔''

''ہاں۔ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ میں جب بھی آتی ہوں کچھ دیر کیلئے اس سے گپ شپ ضرور ہوتی ہے۔''

سارا کہنے لگی ''اپنی جوانی کے فرضی اور اصل قصے بڑے مزے لے کر اور چٹخارے دار زبان میں سناتا ہے۔''

''اب سوائے کہانیوں کے اس کے پاس رہ ہی کیا گیا ہے!'' کیتھی کہنے لگی۔

میں نے کہا ''یہی ہماری زندگی کا المیہ ہے۔ جوانی واقعی چار دن کی چاندنی ہوتی ہے۔ وقت پیری اگر شباب کے قصے نہ دہرائے جائیں تو زندگی ایک مسلسل عذاب بن جائے!''

جب ہم سانتا فے بار پہنچے تو بارٹینڈر کا چہرہ کھل اٹھا۔ مون کو اس نے بڑی پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ''ویلکم سویٹ گرل۔ کہاں تھیں تم! مادام موزیل۔ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں ہیں۔ یقین کرو تمہارے آنے سے بار کی رونق بڑھ جاتی ہے اور میرا کاروبار خوب چمکتا ہے۔''

''YOU ARE ALSO VERY NICE'' مون نے اس سے ہاتھ ملایا۔

''بلڈی میری؟'' اس نے استفسار کیا۔

''اب یہ ڈرنک پینے کو جی نہیں چاہتا۔ شاہ نے اس کے معانی اور مفاہیم بدل ڈالے ہیں!'' مون نے معذرت کی۔

''شمپین! اس مرتبہ میری طرف سے۔ بارٹینڈر نے التجا کی۔''

''کسی کا دل نہیں توڑنا چاہئے!'' مون کے لونے سے پہلے ہی سارا بول پڑی۔ ''دوستو! ہو جائے ایک

جام۔ مگر جلدی جلدی اس لئے کہ ہمیں مراج اور ٹرینٹر آئی لینڈ جانا ہے۔"

"کیا ایم جی ایم گرینڈ کی رونقیں ختم ہو گئیں کہ تم لوگوں کو وہاں جانے کی ضرورت پیش آئی ہے؟" اس کے لہجے میں پیشہ ورانہ رقابت عود کر آئی۔

"تمہیں شاید علم نہیں کہ آج کل شاہ کی گائیڈ ہوں اور ویگاس سے متعارف کرانا میری ذمہ داری ہے۔" مون نے وضاحت کی۔

"تو یہ بات ہے!" وہ مسکرایا "مسٹر شاہ تمہیں اس سے بہتر گائیڈ شاید زندگی میں نہ مل سکے۔"

"یہ درست ہے" میں نے کہا "تمہارا بار میرے لئے ایک یادگار بن گیا ہے۔"

ہم تھوڑی دیر خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ بار اب قریباً بھر چکا تھا اس لئے ہم نے اس سے اجازت لی اور باہر نکل آئے۔ میرے خیال میں ٹیکسی پکڑی جائے۔ سارا نے مشورہ دیا۔ "مراج یہاں سے دو میل دور ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا" موہ بولی "ویگاس کا اصل مزا تو پیدل چلنے میں ہے کیا تم ان ہزاروں ٹورسٹس کو نہیں دیکھ رہی جو سڑکوں پر پیدل چل رہے ہیں!"

"دیکھ تو میں ان ہزاروں کاروں کو بھی رہی ہوں جو سڑک پر چیونٹیوں کی طرح رینگ رہی ہیں۔"

"اس کی حالت پر رحم کھاؤ۔ اس کی ٹانگیں کمزور ہیں!" کیتھی کہنے لگی۔

"اتمہارے قد کے برابر تو میری ٹانگیں ہیں۔ پتہ نہیں تم نے کمزور کہاں سے دیکھ لی ہے!"

"چھوڑو اس فضول بحث کو۔ پیدل ہی چلتے ہیں" مون نے فیصلہ دے دیا۔

"مجھے تو شاہ کا خیال آیا تھا۔ یہ تھک جائے گا" سارا نے مصنوعی ہمدردی ظاہر کی۔

"اپنی فکر کرو۔ ہمارا اسکول گاؤں سے تین میل کے فاصلے پر تھا ہم شرط لگا کر دوڑتے ہوئے سکول تک پہنچتے تھے اور پھر شدید گرمی میں بھی قریباً دوڑتے ہوئے واپس گھر آتے تھے۔"

"پھر تو تمہیں ویگاس کی میراتھن ریس میں حصہ لینا چاہئے" سارا کو غالباً یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اگر میری ٹانگیں تمہاری طرح سڈول ہوتیں تو میں بھی نیکر پہن کر ضرور دوڑتا۔"

''بس میں یہی چاہتی تھی۔ وہ مسکرائی'' تمہاری زبان سے چند تعریفی جملے۔

ہم چلتے چلتے مراج کے نزدیک پہنچ گئے۔ سورج غروب ہو گیا تھا لیکن جگمگاتے قمقموں کی روشنی اس قدر تھی کہ رات کو بھی دن کا سماں تھا۔ کیسینو کے سامنے ہزاروں آدمی کھڑے تھے۔ میلے کا سماں تھا۔ تمام نگاہیں ایک خاص نقطے پر مرکوز تھیں۔ لوگ دم سادھے کھڑے تھے۔ چار سو گھبرا دینے والی خامشی چھائی ہوئی تھی جیسے کوئی بہت بڑا حادثہ ہو گیا ہو یا ہونے والا ہو۔

ایک بڑی جھیل۔ جھیل کے آخری کونے پر پہاڑیاں جو جزوی طور پر سرسبز درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ چالیس فٹ کی بلندی سے ایک بہت بڑی آبشار گر رہی تھی۔ پانی زوردار آواز کے ساتھ نیچے گر رہا تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے نیاگرا آبشار کا ایک حصہ یہاں منتقل کر دیا گیا ہو۔

تھوڑی دیر تک پانی گرتا رہا پھر پہاڑیوں کے اوپر اگے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں سے پرندوں کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ بے چین اور مضطرب' جیسے ان کے گھونسلوں پر حملہ ہو گیا ہو اور وہ کرب کے عالم میں چیخ رہے ہوں..... کچھ دیر بعد آوازیں آنا بند ہو گئیں اور پہاڑیوں کے درمیان چٹانوں سے دھواں نکلنا شروع ہو گیا۔ پہلے دودھیا رنگ پھر نیلا' پھر ہلکا سرخ اور اس کے ساتھ ہی آگ کا ایک بہت بڑا گولا فضا میں بلند ہوا۔ لوگ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ بچے ماؤں کے سینے سے چمٹ گئے اور نوجوان لڑکیاں بانہوں کے حصار میں آ گئیں۔ کچھ دیر تک آگ کے شعلے فضا میں لپکتے رہے۔ الاؤ تیز ہوتا گیا۔ گھن گرج بھی خاصی بڑھ گئی اور پھر اچانک پانی کی آبشاری گرنا بند ہو گئی اور اس کی جگہ آگ کی آبشار نے لے لی جو رفتہ رفتہ ساری جھیل پر پھیل گئی۔ آگ کی تپش ہر کسی نے محسوس کی۔ لوگ پسینے میں تر ہو گئے۔ پندرہ منٹ کے عرصے میں سارا کھیل ختم ہو گیا۔ آگ خود بخود بجھ گئی۔ پرندے گھونسلوں میں آرام اور چین سے سو گئے اور از سر نو پانی کی آبشار گرنے لگی۔

''مائی گاڈ! کیا حیران کن نظارہ ہے'' میں نے مون کی طرف دیکھا۔

''volcanic eruption..... پہاڑوں سے لاوا نکلنے کا منظر دیکھایا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح پہاڑوں کا سینہ شق ہوتا ہے اور پھر آگ اور سیال مٹی بستیوں کو تاراج کر دیتی ہے۔''

''کیا اچھوتا خیال ہے!'' میں ہنوز ورطہ حیرت میں تھا۔

بولی ''یہی چیز ویگاس کو دیگر شہروں سے منفرد اور ممتاز کرتی ہے۔ مفت کا شو۔ اگر انتظامیہ چاہتی تو پچاس سو ڈالر کا ٹکٹ بھی لگا سکتی تھی۔ پھر بھی لوگ بڑے شوق سے دیکھتے۔''

رقم کے علاوہ اس صحرا میں قدر پانی کا ضیاع؟

بہت زیادہ ہے۔ یہاں امریکہ کے ہر بڑے شہر سے زیادہ فی کس پانی خرچ کیا جاتا ہے۔ 345 گیلن جبکہ لاس اینجلس میں اس کی شرح دو سو گیلن فیکس ہے۔

سارا کہنے لگی ''دراصل ان لوگوں نے بزنس کا بنیادی اصول سمجھ لیا ہے۔ جس طرح مقناطیس مقناطیس کو کھینچتا ہے اسی طرح پیسہ پیسے کی طرف دوڑتا ہے۔ یہ جس قدر خرچ کرتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ کما لیتے ہیں۔''

ہم کیسینو کے اندر گئے تو دنیا ہی الگ تھی۔ اس کے قالین، پینٹنگز، شینڈ لیئرز اور فرنیچر ہر چیز کا منفرد ڈیزائن تھا۔ انتظامیہ نے کوشش کی تھی کہ کوئی بھی چیز عمومی نہ ہو بلکہ اس کی اپنی شناخت ہو۔ چونکہ ٹریژر آئی لینڈ کا بھی ایک ہی مالک ہے اس لئے لگژری کی طرح یہاں بھی دونوں کیسینو کو مونوریل کے ذریعے ملایا گیا ہے۔ گیمبلنگ بھی یہاں اونچے درجے کی ہوتی ہے۔ یہ غالباً دنیا کا واحد کیسینو ہے جہاں سلاٹ مشین میں 500 ڈالر تک کا نوٹ ڈالا جا سکتا ہے۔ گویا ایک گھنٹے میں دس لاکھ ڈالر کی ہار جیت ہو سکتی ہے۔ لوگ اپنے حال میں اس قدر مست ہیں کہ اگر نامور فلمی ہیرو اور ہیروئن قریب سے بھی گزر جائیں تو کوئی شخص نوٹس نہیں لے گا۔ یہاں آنے والوں کی اکثریت نوجوانوں کی ہے۔ جس طرح محبت کرنے والے جوڑے تاج محل دیکھنے جاتے تھے آج کل وہ ویگاس کا رخ کرتے ہیں۔ فراغت، محبت، اعلیٰ خوراک، سستے ہوٹل، حیران کن ماحول، تھیٹر، شوز اس ماحول میں کون کمبخت ہے جو پانچ سو، ہزار ڈالر شغلاً ہارنا نہیں چاہے گا۔ پیشہ ور کھلاڑیوں کے علاوہ عام لوگ بھی چھوٹی موٹی رقم ہار کر بھی حظ اٹھاتے ہیں۔ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو ویگاس ہنی مون کا دوسرا نام ہے۔

مین ہال سے گزر کر ہم کاریڈور میں آ گئے..... ایک بہت بڑے شیشے کے پیچھے پانی کا تالاب اور کچھار یں

بنائی گئی تھیں۔ ان میں سفید رنگ کے چیتوں کی جوڑی بیٹھی ہوئی تھی..... جو ایک دوسرے کو پیار سے اور لوگوں کو غصے بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے..... یہ چیتوں کی بڑی اعلیٰ اور نایاب نسل ہے۔ جو دنیا میں قریباً ختم ہوتی جارہی ہے۔ پیسے کا یہی کمال ہے کہ ہر چیز کو اپنے جال میں پھانس لیتا ہے..... شاید ہی کوئی ایسا ٹورسٹ ہو جو ویگاس میں آئے اور ان چیتوں کی جوڑی اور آتش فشاں کو دیکھے بغیر واپس چلا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب آدمی آئے گا تو پھر وہ کچھ نہ کچھ کھائے گا، کچھ نہ کچھ پیئے گا اور تھوڑا بہت کھیلے گا بھی ضرور۔ بعض لوگ صرف یہ سوچ کر بھی ٹیبلز پر بیٹھ جاتے ہیں کہ واپس جا کر دوستوں کو بتا سکیں کہ انہوں نے مراج میں گیمبلنگ کی تھی۔

جب فوری تسکین ایک خوبی تصور ہو تو پھر پاپ کلچر کو فروغ ملتا ہے۔ SIEGFRIED ANE ROY کے شو بہت شوق سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کیلئے ٹکٹ ہفتوں پہلے بک جاتے ہیں۔ اس طرح آرنلڈ شوارزنگر، ڈیوڈ کاپر فیلڈ اور مارلن پارکن سال میں 480 شو منعقد کرتے ہیں جو کو بڑے شوق اور چاہت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ سارا کا خیال تھا کہ تھوڑا بہت کھیلا جائے لیکن مون نے مشورہ دیا کہ سیگ فرائیڈ اور رائے کا میجک شو دیکھا جائے۔ وہ خاص طور پر مجھے یہ شو دکھانا چاہتی تھی اور اس نے ہمیں بتائے بغیر ایڈوانس بکنگ کرالی تھی۔

''تم ہمیشہ سرپرائز دیتی ہو؟'' میں نے مون کی طرف دیکھا۔

کہنے لگی، ''میں آدھے اقدامات میں یقین نہیں رکھتی۔ میں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ ویگاس کی روح سے تمہیں روشناس کراؤں گی۔ کونسا تم نے روز روز یہاں آنا ہے''۔

''یا کونسا تم نے اب واپس جانا ہے؟'' سارا یکدم بول پڑی۔

ایک لمحے کیلئے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے دور کہیں زور کی بجلی کڑکی ہو، کوئی کونداں لپکا ہو، اس کی روشنی چار سو پھیل گئی ہو اور پھر برسات شروع ہوگئی ہے! کیا یہ سارا بول رہی تھی یا وجود کے اندر سے کوئی آواز آئی تھی۔

''مون ٹھیک کہہ رہی ہے'' میں نے آپ کو سنبھالا۔ ''سات سمندروں کے فاصلے یکدم معدوم نہیں

ہوتے"۔

مون مسکرائی "شاہ اس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہ لیا کرو۔ اسے انٹ شنٹ باتیں کرنے کی عادت ہے"۔

سیگ فرائیڈ، رائے میجک شو واقعی کمال کا تھا۔ لمبے کوٹ پہنے سر پر فلیٹ ہیٹ اور گلے میں کراس مفلر ڈالے دونوں جادوگر سٹیج پر آئے اور تالیوں کی گونج میں کورنش بجالائے۔ جب شو شروع ہوا تو کمال فن کی داد دینی پڑی۔ کہتے ہیں جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ ہر شعبدہ بازی پر سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھتا۔ لوگ کبھی ہنسی سے لوٹ پوٹ جاتے تو کبھی کبھی HORRER TRICK پر انہیں اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ ہر ٹرک شو کے اختتام کا جواز بن سکتا تھا اور ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے اب اس سے بڑی شعبدہ بازی ممکن نہیں لیکن اگلے لمحے ہی اس سے بھی زیادہ حیران کن اور دلچسپ آئٹم پیش کیا جاتا..... بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس سے بہتر میجک شو دنیا میں نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو وہ جادوگر مراج میں ہوتے اور رائے صاحبان صحرا کی خاک چھانتے پھرتے۔

جادو نے انسان کے تخیل کو ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ انہونی اور محیر العقول چیزیں دیکھنا یا سننا پسند کرتا ہے۔ بعض اوقات تو پیغمبروں کو بھی اپنا پیغام مؤثر بنانے کیلئے جادو کا سہارا لینا پڑا۔ عصا کے بغیر کلیمی بھی بے کار و بے بنیاد ثابت ہوتی ہے۔ انسان کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نوسر بازوں اور پیروں فقیروں نے ڈھونگ رچائے۔ تعویز دھاگے اور ٹونے ٹوٹکوں کی آڑ میں غریب لوگوں کو لوٹا۔ کوئی نہیں سوچتا کہ جہاں گوشت پوست سے بنا ہوا انسان بے بس ہے وہاں کاغذ کا ایک ٹکڑا کیا اثر رکھتا ہے۔ اس قسم کے افسوسناک واقعات سے بعض اوقات دلچسپ لطیفے جنم لیتے ہیں..... کہتے ہیں کہ ایک پکھی واں، پیر کے پاس گیا اور اپنے سارے ہفتے کی کمائی اس کی نذر کرتے ہوئے استدعا کی کہ اس کا دشمن ہفتے کے اندر تباہ ہو جائے۔ پیر صاحب نے چرس اور گانجے میں پھنکی ہوئی سرخ آنکھیں اوپر اٹھائیں، نذر نے کو جلدی سے جیب میں ڈالا اور جھٹ سے تعویز لکھ کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کہنے لگے اس تعویز کو لے جاؤ اور ایک بکرا ذبح کر کے اُس کے خون میں اس کو دو دن ڈبوئے رکھو اور پھر ایک بولی کتے کے گلے میں ڈال دو۔ دو دن کے بعد ایک گائے ذبح کرواور اُس کی اوجڑی میں لپیٹ کر اپنے گھر کے صحن میں دفن کر دو اور اس

کی نگرانی ایک پستہ کتے سے کرواؤ۔ سات دن کے بعد اسے نکال کر کسی طور دشمن کے تکیے کے نیچے رکھوا دو۔ وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ پکھی وال نے کچھ دیر کے لئے بکرے اور گائے کی قیمت کا تخمینہ لگایا اور اس میں سگانِ بزرگ و خرد کے خرچے کو جمع کیا تو اسے پسینہ آ گیا اور اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بولا ''او پیرا شاڈا تے بولی وی تو ایں تے پستہ وی توں ایں خودای کوئی بندوبست کر (ہمارا بل ڈاگ اور پستہ سب کچھ تم ہی ہو خود ہی کوئی انتظام کرو)۔

اِس جادو اور اُس میں فرق یہ ہے کہ یہاں لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ یہ ہاتھ کی صفائی ہے، کمال فن ہے، اگر پکڑ سکتے ہو تو پکڑو، اگر بھانپنا چاہتے ہو تو بھانپ کر بتاؤ، اگر جھانکنا چاہتے ہو تو تمہیں ناکامی ہوگی۔

یہاں کے جادوگر محض اپنے فن کی جوت جگاتے ہیں انہوں نے خرقہ سالوس نہیں پہنا ہوتا اور نہ اپنی اصلیت چھپاتے ہیں۔

ہم مراج سے نکل کر ٹریژر آئی لینڈ کی طرف چل پڑے چونکہ دونوں کیسینوز کا مالک ایک ہے اس لئے یہ جڑواں بھائی لگتے ہیں اور شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہوئے ہیں۔ اندرونی ماحول کافی حد تک ایک جیسا ہے لیکن بیرونی طور پر دونوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہوئی ہے۔ بالکل ایسے جیسے دو جڑواں بھائی شناخت کے مسئلے سے بچتے ہوئے اپنا ظاہری حلیہ الگ الگ کر لیں۔ یعنی ایک داڑھی رکھ لے اور دوسرا لمبی بل کھاتی ہوئی مونچھیں۔ ایک کے ہاتھ میں تلوار ہو تو دوسرا چرمی گاترے والا پستول کندھے پر لٹکائے پھرے۔

O

ٹریژر آئی لینڈ کا مرکزی خیال چارلس ڈکنز کے ناول سے لیا گیا ہے۔ خزانے کی تلاش، سمندری لٹیروں اور برطانوی نیوی کا ٹکراؤ۔ جہازوں کا ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہونا اور بالآخر برٹش نیول شپ کی تباہی۔ یہاں بھی کیسینو کے عین سامنے ایک پہاڑی گاؤں ہے جو قدیم بحر قلزم اور کتر بیتی تہذیبوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اُس کے بالکل نیچے 65 فٹ گہری جھیل ہے جس میں پورے سائز کے دو جنگی جہاز کھڑے تھے۔ یہ شو ہر ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوتا ہے۔ برٹش نیوی اور قزاقوں کے جہازوں کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔

نہایت دلچسپ جملیبازی کے دوران برطانوی کپتان اُنہیں ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیتا ہے۔ ڈاکوؤں کا سردار جواباً اُس کا تمسخر اُڑاتا ہے۔

''تم ہو کس باغ کی مولی۔ تم لندن کے کسی ڈرائنگ روم میں نرم صوفوں پر نہیں بیٹھے، متلاطم سمندر میں گھر گئے ہو۔ اپنی جان کی خیر مناؤ اور بھاگ جاؤ۔'' پروفیشنل پرائیڈ اور برسہابرس کا تجربہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ توپوں کے دھانے کھل جاتے ہیں۔ تڑتڑ گولیاں چلتی ہیں، ہر طرف آگ برستی ہے۔ جہازوں کے مستول روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے ہیں آگ کی برسات سمندر کا منہ چڑاتی ہے اور انجام کار برطانوی جہاز ڈوب جاتا ہے۔

ایک ایسا نظارہ جو دنیا میں کہیں بھی نہیں دکھایا جاتا۔ اصلی شعلے، پس پردہ ہیبت ناک موسیقی، ڈوبتے ہوئے جہاز کا منظر۔ پندرہ منٹ میں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی تالیاں ان کے جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ لوگ اتنا حظ 65 ڈالر کے براڈوے میوزیکل شو میں نہیں اٹھاتے جتنا مزہ وہ یہاں مفت لوٹتے ہیں۔

شو دیکھ کر ہم کیسینو کے اندر چلے گئے۔ مون کہنے لگی ''شاہ آج بانکو پانٹو کھیلتے ہیں۔ سارا کے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے جب تک یہ دو چار ہزار ڈالر ہار نہ لے گی نہیں اس کی تسلی نہیں ہوگی۔''

میں نے سارا کو کہا، ''یہی رقم کسی غریب کو دے دیا کرو اُس کی زندگی بن جائے گی اور تمہاری عاقبت سنور جائے گی۔''

بولی، ''ویگاس میں کوئی غریب نہیں آتا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہاں آ کر اکثر لوگ قلاش ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ بھی وقتی طور پر۔ اگلی دفعہ وہ پہلے سے بھی زیادہ رقم لاتے ہیں تاکہ اپنے نقصانات پورے کر سکیں۔ پھر ضروری نہیں کہ میں نے ہارنا بھی ہے میں آج ایک معقول رقم جیتنا چاہتی ہوں!''

''بہت مشکل ہے!'' میں نے کہا۔

''آخر تمہارے استدلال کی بنیاد کیا ہے؟''

''گیمبلنگ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب بھی انسان کو رقم جیتنے کی شدید خواہش ہوتی ہے وہ ہارتا

ہے اور جب وہ اس سے بے نیاز ہو کر کھیلتا ہے تو مال وزر کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ مون کو ہی دیکھو گزشتہ چند دنوں میں یہ چالیس ہزار ڈالر جیت چکی ہے۔ افس کی بے نیازی ہی اس کی جیت ہے۔ یہ وقت گزارنے کے لئے کھیلتی ہے۔ گزارا کرنے کے لئے نہیں کھیلتی۔"

"میں آج تمہاری اس تھیوری کو غلط ثابت کر رکھاؤں گی" افس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"بالفرض تم جیت بھی گئیں تو یہ ایک استثنا ہوگا۔"

"مستثنیات رولز کو باطل نہیں بلکہ کنفرم کرتی ہیں۔"

ہم بانکو پانٹو کے ٹیبل پر چلے گئے۔ لندن کے برعکس ویگاس میں بانکو پانٹو کے ٹیبل کم لگتے ہیں۔ کروپیئر ریک سے پتے نکالتا ہے لیکن بعض کیسینو یہ کام کھلاڑیوں سے کرواتے ہیں۔ پانچ تاشوں کے بنڈل سے کھلاڑی باری باری پتے بانٹتے ہیں۔ جب تک پلیئر جیتتا رہے ریک افس کے پاس رہتا ہے اور جب وہ ہار جائے تو پھر شوکو دائیں ہاتھ بیٹھے ہوئے کھلاڑی کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم Confidence Building Measu ہے۔ مقصد کھلاڑیوں کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ ہار جیت کا انحصار اُن کے مقدر پر ہے۔ کیسینو کی اس میں کوئی کارستانی نہیں۔ کارڈ ریک یوں گھومتا ہے جس طرح لکھنو کے مشاعروں میں شمع دان گھومتا تھا۔

مون کہنے لگی کہ افس کی جگہ پتا میں نکالوں گا۔ میں نے معذرت کی تو بولی، "ہار جیت میری ہے۔ میں تمہارا مقدر آزمانا چاہتی ہوں۔"

دراصل میری ہچکچاہٹ کی وجہ صرف یہ تھی کہ اگر میری وجہ سے وہ ہار جاتی تو مجھے افسوس ہوتا۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس پر سارا نے مجھے شہ دی کہ میرے ہاتھوں کام کا پتا نکل ہی نہیں سکتا..... چنانچہ جب کارڈ ریک گھومتا ہوا ہم تک آیا تو بولی کہ نکالو پتا!..... مون نے پانٹو پر ہزار ڈالر رکھے۔ مجھے زچ کرنے کے لئے سارا نے مخالف سمت پانٹو پر 5 سو ڈالر رکھ دیئے۔ میں نے جب پتے نکالے تو مون کا پلہ بھاری تھا۔ سارا ہار گئی تھی۔ مون نے رقم ڈبل کر دی اور بولی کہ جب تک جیتتے جاؤ گے میں رقم ڈبل کرتی جاؤں گی۔ مون نے سارا کو بڑا سمجھایا کہ وہ افس کی پیروی کرے لیکن افس کے سر پر تو مجھے مات دینے کا بھوت سوار

تھا۔ جب چھٹی دفعہ میں نے اپنا پتا نکالا تو اُس نے ہاتھ کھڑے کر دیئے وہ چھ ہزار ڈالر ہار چکی تھی اور مون سولہ ہزار ڈالر جیت گئی تھی۔ سارا مایوسی کے عالم میں اُٹھ کھڑی ہوئی اس کے ساتھ ہم بھی کھڑے ہو گئے۔

''تمہیں کہا نہیں تھا کہ درویشوں کے ساتھ چھیڑ خانی مت کیا کرو'' میں افسں کی پریشانی سے حظ اٹھاتے ہوئے بولا۔

''اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں، آج قسمت ہی بری تھی۔''

''اور طبیعت بھی!'' کیتھی نے اُسے چھیڑا۔

''یہ تو صرف گڈلک پر زندہ ہے'' وہ افس کی طف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''جب بھی مون جیتتی ہے یہ ہزار دو ہزار ڈالر اینٹھ لیتی ہے۔''

''اور تم اپنی ہار واپس لے لیتی ہو'' کیتھی نے جواب دیا۔

''یوں برا منہ نہ بنا Will make Good Your Loses مون نے اُسے تسلی دی اور اس کے ساتھ ہی چھ ہزار ڈالر اُس کی جیب میں ڈال دیئے۔ سارا خوشی سے گنگنانے لگی اور اُس نے بڑھ کر مون کا منہ چوم لیا۔

ہم کیسینو سے باہر آئے تو مون نے مجھ سے پوچھا کہ کھانا کہاں کھایا جائے۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی سارا بول پڑی ''ساتھ ہی تو SEA FOOD ریسٹورنٹ ہے وہاں کھا لیتے ہیں۔''

''میرے خیال میں پہلے جنم میں تمہارا مچھلیوں سے ضرور تعلق رہا ہوگا۔'' میں نے اُسے شک کی نگاہ سے دیکھا ''جبھی تو سی فوڈ کے علوہ تمہیں کچھ پسند ہی نہیں آتا!''

''شارک مچھلیوں سے!'' کیتھرائن نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔

''تم نے غور نہیں کیا کس قدر خونخوار نظروں سے دیکھتی ہے!''

''تعلق چاہے کسی نسل سے بھی رہا ہو پھسلتی بہت ہوگی'' میں نے کہا۔

''مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا!'' سارا مسکرائی ''تم گھنٹوں کنڈی لگائے کھڑے رہتے تھے لیکن میں تمہارے دام سے صاف بچ نکلتی تھی..... ابھی تک تمہاری شکار کرنے کی عادت نہیں گئی!''

''اسے تم میری کم عقلی یا بدقسمتی کہہ سکتی ہو کہ بھرے سمندر میں شکار کرنے کے لئے تم ہی رہ گئی تھیں!''

''کم عقلی نہیں، عیاری۔ بھرے سمندر میں بڑا تاک کر تیر مارتے تھے۔''

''تیر کہیں نہ کہیں لگا ضرور ہے جبھی تو آج بھی کسک باقی ہے''

''بالفرض مون اُس جنم میں جل پری ہوتی تو پھر تم کیا کرتے؟'' کیتھرائن نے مجھ سے پوچھا۔

''تو پھر بجائے ڈوری ڈالنے کے یہ خود ہی سمندر میں کود جاتا'' سارا فٹ سے بولی۔

ریسٹورنٹ باہر سے بالکل سمندری جہاز لگتا تھا۔ وہی بادبان، مستول اور سمندر کے پانیوں کا شور۔ اندرونی حصہ البتہ بہت خوبصورت تھا اور اُسے سلیقے سے سجایا گیا تھا بیک وقت سو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ریسٹورنٹ میں بڑا رش تھا۔ ہمیں نصف گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔

کھانا بہت مزیدار تھا غالباً ویگاس میں سب سے مزیدار سی فوڈ اس ریسٹورنٹ میں ملتا ہے۔ ہم جب کھانا کھا کر باہر نکلے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہوٹل میں پہنچتے پہنچتے ساڑھے گیارہ کا وقت ہو گیا۔ مون کہنے لگی، ''شاہ آرام کیا جائے کیونکہ کل ویگاس میں ہمارا آخری دن ہے اور ہمیں بہت سی چیزیں دیکھنی ہیں۔ مختصراً پروگرام یہ ہے کہ کل ہم ناشتہ ڈیزرٹ ان، کے گالف کلب میں کریں گے۔ میں گالف کھیلوں گی۔ سارا مساج کرائے گی اور تم چاہو تو اُس سبزہ زار میں واک کر سکتے ہو یا کیتھرائن کے ساتھ سوئمنگ پول میں نہا سکتے ہو۔ اس کے بعد ہم ویگاس STRETOSPHERE TOWER دیکھنے جائیں گے۔ لنچ سارا کی سہیلی جوزی کے ساتھ اُس کے گھر جا کر کریں گے۔ پھر شہر کی ڈرائیو اور شام کو واپس ہوٹل آ جائیں گے۔

''بہت ہیوی شیڈول ہے!'' میں نے کہا۔

بولی، ''ویگاس کے سا تویں دن کم از کم سات آئٹم تو ہونے چاہئیں۔'' میں نے تینوں کو خدا حافظ کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

مون کی ہدایت کے مطابق صبح میں جلد ہی تیار ہو گیا۔ فون کیا تو مون بولی کہ وہ کیسینو کے مرکزی

گیٹ پر میرا انتظار کریں گی۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ تینوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھیں۔ مون نے گہرے سبز رنگ کی کاڈرائے کی جین اور گلابی قمیض پہن رکھی تھی۔ سارا واقعی مساج کے موڈ میں تھی اُس نے کریم کلر کی نیکر اور ہاف سلیونیو بلیو رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی۔ کیتھی فیروزی رنگ کی سکرٹ اور سلیولیس سفید قمیض میں ملبوس تھی.....

''آج تو ویگاس کے تمام رنگ یکجا ہو گئے ہیں بالکل ایک اعتبار سے رنگوں کی برسات ہو رہی ہے'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''تمہاری سج دھج بھی تو دیدنی ہے'' سارا بولی ''کالے رنگ کا سفاری سوٹ جو امریکہ میں اب کوئی نہیں پہنتا۔''

''اگر امریکی لباس کی قید سے یکسر آزاد ہو جائیں تو کیا باقی دنیا کو بھی اُن کی تقلید کرنی چاہئے؟''

بولی، ''آزاد معاشرے کی یہی تو خوبی ہے کہ لباس میں، چال ڈھال اور خورد و نوش میں غیر ضروری بناوٹ نہیں ہونی چاہئے!''

''آزاد معاشرے اور مادر پدر آزاد معاشرے میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے!''

بولی، ''پابندیوں کی بھی کچھ حد ہونی چاہئے۔ قدامت پسند برطانوی تو سلیپنگ گاؤن پہنے بغیر اخبار تک نہیں پڑھتے۔''

امریکی معاشرے میں لباس کا خیال یا تو ٹاپ بزنس ایگزیکٹو کرتے ہیں یا پھر بڑے سیاستدان۔ ان کی دیکھا دیکھی کئی ملکوں نے بھی یہی روش اختیار کر لی ہے۔ جب میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز سڈنی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو ایک دن میں سفاری سوٹ پہنکر کلاس میں چلا گیا۔ اس پر ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ جان بلیک بڑا حیران ہوا اور کہنے لگا "Shah Are you on a date" (کسی حسین دوست سے ملاقات کا پروگرام ہے کیا؟) پروفیسر پھٹی ہوئی جینز اور نیکریں پہن کر آتے۔ لڑکے لڑکیاں جوتے گاڑی میں اتار کر ہفتے میں کم از کم ایک دفعہ ننگے پاؤں کلاس اٹینڈ کرتے۔

''اب چلا جائے باقی باتیں راستے میں ہوتی رہیں گی'' مون نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا پھر پیدل جانا ہے؟'' سارا ہاتھوں سے اپنی ٹانگیں دباتی ہوئی بولی۔

''فکر نہ کرو! تمہاری سڈول ٹانگیں کچھ اور سڈول ہو جائیں گی۔ پھر تم چاہو تو لاس ویگاس کے بیوٹی کانٹسٹ میں حصہ لے سکتی ہو'' مون مسکرائی۔

''اسے سوائے ندامت کے کچھ حاصل نہ ہوگا'' کیتھی نے چوٹ کی۔

''یہ درست کہتی ہے'' سارا کسمسائی ''میں صرف اُسی صورت میں جیت سکتی ہوں اگر میرے بالمقابل کیتھی ہو۔ شرطیہ میرا نہ صرف اول نمبر ہوگا بلکہ دوم اور سوم بھی میں ہی آؤں گی۔''

جب ہم نے ٹریژر آئی لینڈ کیسینو کراس کیا تو فٹ پاتھ پر اشتہار ہی اشتہار نظر آئے۔ یوں لگتا تھا جیسے کاغذوں کی بارش ہوئی ہو۔ میں نے تجسس میں چند اشتہار اٹھائے۔

''انہیں غور سے پڑھو۔ بڑے کام کی انفارمیشن ہے'' سارا نے کہا۔

اشتہار کیا تھے۔ بے حیائی کی سرعام تشہیر کی گئی تھی۔ لاس ویگاس کی کال گرلز اور سوشل اسکارٹ کے نیم برہنہ اور برہنہ فوٹو گراف، اُن کے سائز، قومیت، خصوصیات اور عادات کے متعلق مزیدار اور چٹپٹی زبان میں تفصیل دی گئی تھی۔ ہر ایک نے اپنا فون نمبر اور ایڈریس دے رکھا تھا۔ عمر کا ذکر خاص طور پر کیا گیا تھا۔ اٹھارہ سال، بیس سال، بالی عمریا، نوخیز کلی، کالج گرل، ڈریم گرل۔ جیسے کسی ہوٹل میں کھانے کا مینو پیش کیا جا رہا ہو۔ SMILES ALL OVER' TOO HOT TO HANDLE اور اس قسم کے کئی CLICHES لکھے گئے تھے۔ مجھے بڑی عجیب قسم کی اُبکائی آئی۔ یوں لگا جیسے میں ویگاس کے مرکز بلیو ارڈ پر نہیں چل رہا کسی بیف مارکیٹ میں آ گیا ہوں۔ میں نے اشتہار پھینک دیئے۔ ''پبلسٹی کا کیا بھونڈا طریقہ ہے۔ کیا پولیس انہیں کچھ نہیں کہتی؟'' میں نے پوچھا۔

''پولیس نے کیا کہنا ہے اس قسم کی پبلسٹی جرم نہیں ہے'' کیتھی نے وضاحت کی۔

''تکریم انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے۔ عورت کی اس سے زیادہ تذلیل نہیں ہو سکتی!''

''Oldest Profession'' سارا بولی۔ ''انسان نے ہوش سنبھالتے ہی سب سے پہلی نگاہ عورت کے خدوخال پر ڈالی تھی۔ اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ اُس وقت کا وحشی انسان قیمت ادا نہیں کرتا تھا۔

صف جسمانی قوت پر انحصار کرتا تھا۔ آج کل کا انسان پیسے کی قوت سے اسے ہتھیاتا ہے۔"

"یہ تم ناصح کب سے بن گئیں؟" مون نے قدرے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"حقیقت، حقیقت ہوتی ہے۔ عورت اُس وقت بھی مجبور تھی اور آج بھی ہے۔ صرف چالاک مردوں نے اسے آزادی کے زعم میں مبتلا کر رکھا ہے۔"

"لیکن اس قدر لٹریچر!" میں نے پوچھا۔ "اس پر ہزاروں لاکھوں ڈالر اُٹھتے ہوں گے؟"

"یقیناً!" مون کہنے لگی۔ "آزدن بھی اُسی حساب سے ہوتی ہے۔ یہ صرف کمپنی دینے کے بھی سینکڑوں ڈالر وصول کرتی ہیں۔ دنوں کے حساب سے نہیں بلکہ گھنٹوں کے حساب سے۔"

ہم باتیں کرتے کرتے ذرا اور آگے بڑھے تو فرنٹیر ہوٹل کے قریب بے شمار ہڑتالی ملازمین نظر آئے جنہوں نے کتبے اٹھا رکھے تھے اور لاؤڈ سپیکر کے ذریعے لوگوں کو ہوٹل کی مالک 'الارڈی فیملی' کے مظالم کے اصلی اور فرضی قصے سناتے ہوئے اپیل کر رہے تھے کہ وہ ہوٹل میں نہ جائیں اور یوں ایسے ظالم انسان کی حوصلہ شکنی کریں..... کیسینو کی انتظامیہ نے اُنہیں کسی وجہ سے نکال دیا تھا اور یہ برخواست شدہ لوگ مسلسل چار سال سے ہوٹل کے باہر احتجاج کر رہے تھے لیکن نہ تو انہوں نے گھیراؤ جلاؤ کا مظاہرہ کیا اور نہ اس طویل عرصے میں انتظامیہ نے انہیں پولیس سے ذلیل کروایا اور اپنے غنڈوں سے پٹوایا۔

"چار سال سے یہ بغیر تنخواہ کے احتجاج کر رہے ہیں۔ ان کا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دیگر یونین ان کی مالی معاونت کرتی ہیں کیونکہ کل کلاں ان کے ساتھ بھی اس قسم کا حادثہ ہو سکتا ہے" مون نے وضاحت کی۔ ہم کچھ دیر اُن کے پاس کھڑے رہے اور یونین لیڈر کی تقریر سنتے رہے۔ یوں لگتا تھا کہ چار سال مسلسل ایک ہی موضوع پر بولتے بولتے تقریر اُسے حفظ ہو گئی تھی، کیونکہ اس میں کوئی جھول نہ تھا۔ الفاظ کا زیر و بم اور ہاتھوں کی حرکات و سکنات بھی پیشہ ورانہ تھیں۔

"کب تک یہ سلسلہ جاری رکھو گے؟" میں نے پوچھا۔

بولا، "جب تک مالک راہِ راست پر نہیں آ جاتا ہمارا احتجاج جاری رہے گا۔"

''یہ کام ہی بے راہروی کا ہے، صراط مستقیم پر کیونکر چلے گا؟''

کہنے لگا، ''ہر برے کام کے بھی اصول ہوتے ہیں۔ فاحشہ عورتوں نے بھی اپنے لئے ایک ضابطہ اخلاق مرتب کر رکھا ہے۔ انہیں بھی غلط کاری سے باز آنا چاہئے''.....

''بہت طویل راستہ چنا ہے۔ چلتے چلتے آبلہ پا ہو جاؤ گے!''

''جب ارادہ پختہ ہو اور انسان کو اپنی سچائی کا یقین ہو تو راستے خود بخود مختصر اور سہل ہو جاتے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب ہم انہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے!''

''تو کیا ہوا!'' وہ پرعزم لہجے میں بولا، ''ہماری جگہ کوئی دوسرا لے گا۔ تم تاریخ پر نظر ڈالو ظلم کبھی پنپ نہیں سکتا۔ بالآخر مٹ جاتا ہے..... شکاگو کے شہید آج زندہ نہیں ہیں لیکن اُن کا مشن زندہ ہے۔ یکم مئی کو اقوامِ عالم اُنہیں خراج عقیدت پیش کرتیہیں.....''

''لیکن لوگوں نے تمہاری اپیل کا کوئی خاص اثر نہیں لیا، دیکھا نہیں تمنے لوگ کس طرح جوق در جوق اندر جا رہے ہیں۔''

''ایک دن یہ آہیں ضرور اثر کریں گی۔ مایوسی گناہ ہے۔''

O

مزدور تنظیمیں ساری دنیا میں قائم ہیں چونکہ یہ دنیا اب ایک گلوبل ولیج بنتی جا رہی ہے اس لئے ان کے آپس میں گہرے رابطے ہیں اگر کوئی مزدور لیڈر پاکستان میں گرفتار ہوتا ہے تو اُس کا احتجاج جنیوا میں ہوتا ہے۔ اقوامِ متحدہ نے تو بقاعدہ اپنا ذیلی ادارہ I.L.O بنایا ہوا ہے جو دنیا بھر کے مزدوروں کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ حکومتوں کو سرزنش کرتا ہے اور وقتاً فوقتاً انہیں یادداشتیں اور تنبیہیں کرتا رہتا ہے۔ چونکہ اس کا کنٹرول سپر پاور امریکہ کے پاس ہے اس لئے اس کے ذریعے ناپسندیدہ ممالک کی گوشمالی بھی کی جاتی ہے۔ جب امریکہ بہادر کسی ملک سے ناراض ہوتا ہے تو اُسے کہا جاتا ہے کہ وہ چائلڈ لیبر ختم کرے ورنہ اُس کا ''حقہ پانی'' بند کر دیا جائے گا یا ماحولیاتی تحفظ کا اہتمام کرے نہیں تو اس سے تجارتی تعلقات منقطع کر دیئے جائیں گے۔ ناراضگی سیاسی ہوتی ہے سزا معاشی دی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا NEO

COLONIALISM ہے۔ غریب ممالک ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' کے مصداق ان طاقتوں کے اشاروں پر چلتے ہیں اور ان کی گردن بھی اُسی سمت مڑتی ہے جدھر امریکہ کی اُنگلی اٹھتی ہے۔ NGO's کے ذریعے ان کا ناک میں دم کیا جاتا ہے۔ ان اداروں میں اکثریت سامراجی ایجنٹوں کی ہوتی ہے۔ یہ لوگ چند ٹکوں کی خاطر نہ صرف اپنا ضمیر بیچتے ہیں بلکہ بسا اوقات ملکی مفادات کے خلاف کام کرتے ہیں۔

پاکستان بھی ان ہتھکنڈوں کا شکار رہا۔ کورین کمپنی ڈائیو کو موٹروے کا ٹھیکہ کیا ملنا تھا کہ ایک قیامت کھڑی ہوگئی۔ پاکستان پر الزام لگایا گیا کہ یہاں چائلڈ لیبر ہے اور جبری مشقت کروائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی دنیا کے ممالک کو کہا گیا کہ اس کی مصنوعات، خصوصاً قالین، کھیلوں کا سامان اور سرجیکل آلات نہ خریدے جائیں۔

ہر ملک کی کچھ معاشی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ کوئی والد بھی نہیں چاہے گا کہ اُس کا نونہال سکول کی بجائے فیکٹری میں کام کرے۔ جس شخص کا چھ آدمیوں کا کنبہ ہو اور تین ہزار تنخواہ ہو، تو وہ کیا کرے گا؟ بچوں کو روٹی کہاں سے کھلائے گا..... یہ نام نہاد انسانی حقوق کے محافظ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر بیان داغتے رہتے ہیں اور اپنے آقاؤں سے انعام پاتے ہیں۔ اُنہیں اس بات کا نہ تو احساس ہوتا ہے اور نہ ادراک کہ مزدور کون سی چکی میں پس رہا ہے۔ انہی لوگوں کے متعلق ایک عظیم ادیب نے کہا تھا کہ ''اُس نے بھنے ہوئے مرغ کی ٹانگ کو وسکی کے پیگ میں بھگوتے ہوئے سوچا کہ ہمارا ملک بہت غریب ہو چکا ہے۔ اگر مقصد غریبوں کو معیارِ زندگی بلند کرنا ہے تو پھر اُن کی مالی امداد کی جائے۔ اگر تعلیم دینی ہے تو سکول چلانے میں مالی معاونت کی جائے۔ اگر امداد بھی نہ دی جائے اور روزی کے ذرائع، اور مواقع بھی ختم کرائے جائیں تو پھر تعلیم و تربیت تو کجا زندہ رہنا بھی مشکل ہو جائے گا۔

میں ایک دفعہ انڈونیشیا سے ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے بعد سنگاپور واپس آیا تو لیبر فیڈریشن کی دعوت پر وہاں کچھ دن رُکا..... رابطہ آفیسر راج نے میٹنگ کا بندوبست کرایا۔ جاپان کے برادر ازومی کے علاوہ آسٹریلیا کے چند ماہرین بھی موجود تھے۔ انہوں نے بھرپور انداز میں شکایت کی کہ پاکستان میں بندۂ مزدور کے اوقات بہت تلخ ہیں۔ آسٹریلوی کہنے لگا پاکستان میں جبری مشقت بہت زیادہ ہے۔

مثلاً؟ میں نے پوچھا۔ بتانے لگا کہ وہ سنگاپور سے کراچی پہنچا۔ کراچی سے حیدرآباد گیا پھر لاہور آیا۔ اسلام آباد کے راستے ہری پور گیا اور وہاں اُس نے ایک گاؤں میں ایک بھٹہ مزدور کو دیکھا جس کو بیڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

میں نے پوچھا کہ اس نے اُس پکنک پر کم از کم چار لاکھ روپے خرچ کیے ہوں گے۔ اُس نے سنگاپور ایئر لائنز کی فرسٹ کلاس میں سفر کیا ہوگا۔ پاکستان کے فائیو سٹار ہوٹلوں میں دادِ عیش دی ہوگی۔ وسکی کی کئی بوتلیں حلق میں انڈیلی ہوں گی۔ کئی مزدور تنظیموں نے اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے ہوں گے اور کسی چالاک آدمی نے ایک غریب مزدور کو چالیس پچاس روپے دے کر بیڑیاں پہننے کا ڈرامہ رچایا ہوگا..... پھر جب واپس جا کر اس نے جنیوا میں رپورٹ دی ہوگی تو کسی ایسی ہی رپورٹ کے منتظر لوگوں میں ''غم و غصے'' کا ایک طوفان آیا ہوگا اور انہوں نے جھٹ سے اپنی پہلے سے تیار کردہ رپورٹ میں سفارش کی ہوگی کہ اس ملک کا معاشی بائیکاٹ کر دیا جائے۔

''کس سوچ میں گم ہو گئے ہو؟'' مون نے مجھے جھنجھوڑا۔

سوچ رہا تھا کہ طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے میں پرویزی..... جب میں نے اس کا ترجمہ کیا تو ہنس کر بولی، ''تمہاری سوچ کب بدلے گی؟''

''جب یہ نظام بدلے گا؟'' میں نے جواب دیا۔

فرنٹیر ہوٹل کیسینو سے اگلا چوک عبور رک کے ہم 'ڈیزرٹ اِن' پہنچ گئے۔ ڈیزرٹ اِن کیسینو دیگر کیسینوز سے اس اعتبار سے مختلف ہیکہ اس میں گالف کورس ہے۔ دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں کسی اچھے ہوٹل کی شناخت گالف کورس ہے۔ گالف نہ صرف دنیا کے مقبول ترین کھیلوں میں سے ایک ہے بلکہ بہت مہنگا بھی ہے۔ سنگاپور، کوالالمپور، لندن، پیرس، روم، امریکہ میں بیس سے لے کر چالیس ڈالر فی گھنٹہ کھیلنیکی فیس ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ گالف کورسز شہر کے اُس حصے میں بنائے جاتے ہیں جہاں زمین بہت بہنگی ہوتی ہے۔ پھر دیگر کھیلوں کے برعکس اسکے لئے خاصی زمین درکار ہوتی ہے..... اُس کی دیکھ بھال پر بھی زرِ کثیر خرچ ہوتا ہے۔ دبیز گھاس اِس قدر نفاست کے ساتھ کاٹی جاتی ہے کہ بالکل مخملی قالین

نظر آتی ہے۔ کوئی شہر بھی بغیر گالف کورسز کے اس طرح ہے جیسے انگوٹھی بغیر نگینے کے ہو۔ یہ اُس کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔

ہم مرکزی ہال میں سے ہوتے ہوئے سیدھے گالف کورس پہنچ گئے۔ مون کہنے لگی ''شاہ! میں ایک گھنٹہ گالف کھیلوں گی، کیتھی سوئمنگ کرے گی اور سارا حسب پروگرام مساج کرائے گی۔ تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''یہ تمہیں گالف کھیلتے ہوئے دیکھے گا۔ جب تم شاٹ مارنے کے لئے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرو گی اور تمہاری پتلی کمر لچک کر دہری ہو جائے گی اور تمہارے ریشمی لمبے بال کھل کر شانوں پر بکھریں گے تو یہ بہت داد دے گا'' سارا مسکرائی۔

''کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو!'' مون نے نصیحت کی۔

''اس دفعہ اس کا اندازہ غلط نکلا ہے!'' میں نے کہا۔ ''جب یہ ڈیپ ٹشو مساج کروا رہی ہو گی تو اسے دیکھ کر زیادہ لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے!''

''وہ کیسے؟ کیا تمہارے ملک میں لڑکیاں DEEP TISSUE مساج نہیں کرواتیں.....؟''

''نہیں! اگر ایسا ہو تو یہ BIG ISSUE بن جائے۔''

''میرے خیال میں ہم دونوں سے زیادہ کیتھی کو تمہاری ضرورت ہے!'' سارا اپنے طنز کا رخ کیتھرائن کی طرف کرتے ہوئے بولی۔

''وجہ؟''

''بچوں کو سوئمنگ کے لئے گارڈین کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''مجھے شاید گارڈین کی اِس قدر ضرورت نہیں جتنی تمہیں گارڈ کی ہے۔'' کیتھی کے اس برجستہ جواب پر سب مسکرا پڑے۔

ہم 'ڈیزرٹ اِن' میں دو گھنٹے رہے۔ چونکہ وہ تینوں مصروف تھیں اس لئے میں نے سوچا کہ سیر ہی کر لی جائے۔ صبح کے وقت تیز ہوا چل رہی تھی۔ موسم بھی مہربان تھا۔ گالف کورس کے چارف طرف کھلے

ہوئے پھولوں کی خوشبو نے فضا کو مزید خوشگوار بنا دیا تھا۔ جب میں سیر کے بعد واپس آیا تو وہ میرا انتظار کر رہی تھیں۔

مون بولی ''اب ناشتہ کیا جائے۔'' ہم ریس کورس کے ساتھ بنے ہوئے ٹیرس میں بیٹھ گئے..... ناشتے کا صحیح لطف صبح کے وقت کھلی فضا میں بیٹھ کر آتا ہے۔ اورنج جوس، یخ دودھ میں ڈوبے ہوئے سیریل، فرائی انڈہ، توس، جام، شہد، مکھن اور ناشتے کے بعد سگار کے کیف آور کش۔ زندگی کس قدر حسین، دلکش اور رومانوی لگتی ہے.....

ناشتہ کرنے کے بعد مون نے گھڑی دیکھی تو جھٹ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی STRETOSPHERE TOWE کھل گیا ہوگا۔ جلدی کریں نہیں تو قطار میں کھڑے ہو کر طویل انتظار کرنا پڑے گا۔

بل دے کر ہم باہر نکلے تو دس بج رہے تھے۔ سورج بڑی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور گرمی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

''پیدل ہی چلنا ہوگا!'' سارا نے اپنے سوال کا جواب بھی خود ہی دے دیا۔

'ٹاور ہے ہی کتنا دور؟ وہ دیکھو! سامنے نظر آ رہا ہے۔'' مون نے اُس کی ڈھارس بندھائی۔

بولی، ''نظر تو یہ پچاس میل سے بھی آ سکتا ہے۔ ویسے یہ اتنا نزدیک نہیں جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ کم از کم ڈیڑھ میل ہوگا۔ ڈر ہے کہ واپسی پر مجھے پھر مساج کروانا پڑے گا۔''

''تھکن کی وجہ سے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں! لطف کی خاطر۔ لگتا ہے اسے کوئی اچھا مساجر مل گیا ہے۔'' کیتھی نے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں تمہیں اس کی کیا پرواہ ہے۔ تم جب بھی تھک گئیں تو کوئی راہ گیر بچہ سمجھ کر تمہیں کندھوں پر اُٹھا لے گا۔''

''لیکن تھکوں گی ہی کیوں؟ مون کی طرح میں نے بھی جوانی اور اپنی توانائیاں سنبھال کر رکھی ہوئی

ہیں!'' کیتھی کہنے لگی۔

''تو کیا میں نے انہیں نیلام کر دیا ہے؟'' سارا نے خشمگیں نگاہوں سے کیتھی کو گھورا۔

''پھر فضول بحث شروع کر دی ہے'' مون نے کہا ''یہ دائیں طرف دیکھو صحہارا کیسینو۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم صحرائے عرب کے کسی نخلستان میں نکل آئے ہوں..... کھجوروں کے جھنڈ، فوارے، اپنے اصل قد جتنے بڑے STUFFED اونٹ، شتربان، عرب آرکیٹیکچر۔''

''شاہ! کیا ایسا نہیں لگتا جیسے ہم واقعی مشرقِ وسطیٰ میں پہنچ گئے ہوں؟''.....

''ہاں ایسے ہی لگتا ہے جیسے سرزمین مشرق کا ایک ٹکڑا یہاں آن گرا ہو۔ اور ہاں تم نے اُس عرب اونٹ کا قصہ تو ضرور سنا ہوگا جس نے پاؤں پسارنے کے لئے خیمہ میں جگہ لی تھی اور بالآخر بدو کو ہی خیمے سے نکال باہر کیا تھا۔''

''کیا اب بھی عرب یہاں آتے ہیں؟'' سارا نے پوچھا۔

''عرب کہاں نہیں جاتے'' مون کہنے لگی ''دنیا کا کوئی ایسا قحبہ خانہ، جواء خانہ یا عشرت کدہ نہیں، جہاں ان کے مبارک قدم نہ پہنچتے ہوں۔ قومی دولت کو جس قدر بیدردی اور بے رحمی کے ساتھ یہ لٹاتے ہیں اُس سے تو یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ ایک بار پھر وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے!''

''اِن کے پاس تیل کے کنویں ہیں۔ بے پناہ دولت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی'' سارا کہنے لگی۔

''اگر گنج قارون بھی ہو تو ختم ہو جاتا ہے۔ جب خرچ آمدن سے زیادہ ہو تو دیوالیہ پن میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ پھر تیل کے چشموں نے بھی تو آخر ایک دن خشک ہونا ہے۔''

''تم آخر اس قدر ہمارے خلاف کیوں ہو؟'' سارا نے سوال کیا۔

''تمہارے خلاف کون کافر ہو سکتا ہے!'' میں مسکرایا۔ ''لیکن حقیقت چاہے کتنی تلخ ہی کیوں نہ ہو اُس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ طاقت کے متعلق کہا گیا ہے کہ IT corrupts and absolute power corrupts absolyte۔ یہی حال طاقتور ممالک کا ہے۔ جس ملک کا پلڑا بھاری ہوگا وہ ضرور اپنی طاقت کا مظاہرہ بھی کرے گا اور خواہش بھی رکھے گا۔ موریطی کو ڈپلومیسی میں کچھ زیادہ عمل دخل نہیں

ہوتا۔لیکن انصاف اور اخلاقیات کے کچھ بنیادی تقاضے ہیں جن کو کسی نہ کسی طور تو ملحوظِ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔ عربوں کا معاملہ شاید اس اعتبار سے مختلف ہے کہ ''اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔''

ہم باتیں کرتے کرتے ٹاور کے نزدیک پہنچ گئے۔ ٹاور کو بنے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ویگاس والوں نے سوچا کہ اگر دیگر شہروں میں ٹاور ہیں تو وہ کیوں پیچھے رہیں۔ ایک فرق البتہ ضرور ہے فرانس کا ایفل ٹاور، ٹوکیو ٹاور، کوالالمپور وغیرہ میں محض ٹاور بنائے گئے ہیں جو شہر کا تشخص اُبھارتے ہیں اور ایک طرف سے سٹیٹس سمبل ہیں۔ یہ واحد ٹاور ہے جو دراصل کیسینو کا ایک حصہ ہے۔ ہر چند کہ اس کی الگ شناخت بھی ہے لیکن لوگ کیسینو کے اندر سے ہو کر اُوپر جاتے ہیں اور جب آدمی کیسینو کے اندر جاتا ہے تو لامحالہ کھیلنے کو بھی جی کرتا ہے۔ ٹاور 109 منازل پر مشتمل ہے۔ 7 ڈالر کا ٹکٹ ہے۔JOYRIDE کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ تیسرے لیول پر گھومتی ہوئی بار ہے اور اس کے عین نیچے ریستوران ہے۔ پتہ نہیں گھومتی ہوئی بار میں کیا حکمت ہے۔ کیونکہ ویگاس میں تو سرو ویسے ہی گھومتے رہتے ہیں۔ ٹاور کی بلندی کی وجہ سے، میخانہ حسن اور مئے ناب کی کثرت سے، زیادہ ہارنے کی صورت میں، تمام دنیا گھومتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ٹاور لاس ویگاس بلیوارڈ اور ڈاؤن ٹاؤن میں حدِ فاصل ہے۔ ویگاس کا ڈاؤن ٹاؤن دیگر شہروں کے ڈاؤن ٹاؤنز سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ یہ کمرشل سے زیادہ رہائشی علاقہ ہے۔ یہاں بلند و بانگ عمارات بھی نہیں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کیسینو یہاں پر ختم ہو جاتے ہیں۔ گولڈن نگٹ اور دیگر کئی کیسینو ڈاؤن ٹاؤن کے اندر بنائے گئے ہیں۔

ہم نے ٹکٹ خریدے اور لائن میں کھڑے ہو گئے۔ مون کے خدشات درست تھے۔ ہر چند کہ ہم جلدی پہنچ گئے تھے لیکن پھر بھی سیاحوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ جو ٹورسٹ بھی ویگاس آتا ہے وہ ٹاور ضرور دیکھتا ہے اور جب لاکھ سے زائد لوگ روزانہ آئیں تو پھر رش تو ہو گا ہی۔ بہر حال ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا اور جب لفٹ میں سوار ہوئے تو یوں لگا جیسے ہم راکٹ میں بیٹھ گئے ہوں جو چاند کی طرف مائل پرواز ہے۔ لفٹ اآخری منزل پر جا کر رُکی۔ ہم باہر نکلے تو بڑا دلکش منظر تھا۔ بالکل سامنے لاس ویگاس بلیوارڈ تھا جہاں سے سب کیسینوز کو بیک وقت دیکھا جا سکتا تھا۔ سڑک پر کاریں چیونٹیوں کی طرح رینگ رہی

تھیں۔ بڑے کسینو بھی اتنے بڑے نہیں دکھتے تھے۔ بلند پر پہنچ کر انسان کو عجیب احساس ہوتا ہے۔ کئی سوئے ہوئے جذبے بیدار ہو جاتے ہیں۔ بائیں ہاتھ مڑیں تو ہوور ڈیم اور اُسکی پہاڑیاں صاف نظر آتی ہیں۔ مخالف سمت میں صحرا ہے یہاں میلوں تک کوئی عمارت یا درخت نظر نہیں آتا..... شہر خاصا پھیل گیا ہے۔ آج سے پچاس سال پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صحرا کی قسمت جاگ اُٹھے گی اور دنیا کے نقشے پر ایک ایسا شہر ابھرے گا جس پر لوگ فخر بھی کریں گے اور ندامت بھی محسوس ہوگی۔ یہ دو کیفیات بیک وقت مشکل سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ کیسینوز کے نیون سائن دن کو بھی جلتے رہتے ہیں۔ بجلی سے حرکت پیدا ہوتی ہے اور حرکت زندگی کی علامت ہے۔ یہ ایک زندہ شہر ہے جس کی مصروفیت کبھی کم نہیں ہوتی۔ عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔

ہم کافی دیر گھومتے رہے۔ چونکہ آخری دن تھا اس لئے ہر چیز کو بار بار دیکھنے کی خواہش بھی کچھ زیادہ تھی۔ ٹاور کے چاروں کونوں پر دوربینیں نصب تھیں۔ عورتیں ان کی مدد سے چاروں طرف نظارے کر رہی تھیں۔ مردوں کو غالباً ضرورت نہ تھی۔ جب چاروں اُور عورتیں ہوں تو پھر کوئی دیگر نظارہ کرنے کی بھلا کیا حاجت رہتی ہے۔ ''مستی سے ہر نگہ تیرے رخ پر بکھر گئی۔''

جب تھک گئے تو سارا مچل گئی کہ وہ گھومتی ہوئی بار میں آئس کریم کھائے گی۔ جس منزل پر ہم کھڑے تھے افس پر اشیائے خورد و نوش کی ممانعت تھی۔ مون نے افسے کافی سمجھایا کہ جہاں ہر شخص پی رہا ہو وہاں بچوں کی طرح لالی پاپ یا آئس کریم کھانا عجیب لگتا ہے۔ لیکن سارا کی ضد کے سامنیب نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ریوالونگ بار میں پہنچ کر جب افس نے آئس کریم کا آرڈر دیا تو پہلے تو ویٹر نے حیران کن نظروں سے افسے دیکھا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اُس کی نگاہ مون پر پڑی۔ لفظ آتے آتے اُس کے حلق میں اٹک گئے۔ آنکھوں کی پتلیاں حیرت اور مسرت سے کچھ زیادہ ہی پھیل گئیں۔

نو پرابلم..... اُس نے خوشی سے نعرہ نما الفاظ کہے اور نچلے ریسٹورنٹ سے آئس کریم لینے چلا گیا۔

''تم آڑے وقت میں بہت کام آتی ہو۔'' سارا نے شرارت سے مون کی طرف دیکھا۔ ''اگر میں افورڈ کر سکتی تو تمہیں اپنی پرائیویٹ سیکرٹری رکھ لیتی۔''

''تم اس کے ہاں ملازمت کیوں نہیں کر لیتیں۔ رفاقت کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہے!'' کیتھی نے اُسے مشورہ دیا۔

''بشرطِ شاہ کو کوئی اعتراض نہ ہو!'' اُس نے میری طرف دیکھا۔

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی تو تم اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہو!''

''گلے کا ہار! بلکہ بارِ گراں!'' کیتھی مسکرائی۔

''تم یقیناً کسی پر بوجھ نہیں بن سکتیں۔ اتنی ہلکی پھلکی اور مختصر چیز تو ویسے ہی آسانی سے جیب میں ڈالی جا سکتی ہے'' سارا نے اُس کی چٹکی لی۔

اِس نوک جھونک کے دوران مون مسکراتی رہی۔ اتنے میں ویٹر آئس کریم لے آیا۔ ہم نے آئس کریم کھا کر بل ادا کیا اور نیچے اُترے تو سورج نصف النہار پر آ چکا تھا۔ گرمی بھی زور پکڑ رہی تھی۔

''اب تو میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتی'' سارا نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ''اگر تم لوگوں کو پیدل چلنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اسے ضرور پورا کرو۔ میں کیب لے کر پہلے پہنچ جاتی ہوں اور جوزی کے گھر آپ کا استقبال کروں گی۔''

''کوئی بات تو اس کی بھی مان لی جائے۔ بیچاری کئی دنوں سے OUTVOTE ہو رہی ہے۔'' کیتھی نے کافی دیر کے بعد اس کی طرفداری کی۔

''ہمدردی کا کیا بھونڈا انداز اپنایا ہے!'' سارا اُس کی نقل اُتارتے ہوئے بولی..... ''اِس غضب کی گرمی میں چار میل چلو گی تو ہلکان ہو جاؤ گی۔''

اتنے میں ایک کیب ہمارے پاس سے گزری۔ مون نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا اور ہم شہر کی مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے جوزفین کے گھر پہنچ گئے۔

جوزی ہماری منتظر تھی۔ مون نے تعارف کرایا تو ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے اُس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ انتہائی متناسب جسم، سنہری بال، شوخ آنکھیں جو اگرچہ بڑی تو نہ تھیں لیکن بے پناہ جاذبیت رکھتی تھیں۔ ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی ہلکی سی دائمی مسکراہٹ۔

''تمہاری طرح نہ سہی لیکن تمہاری سہیلیاں بھی خاصی خوبصورت ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ تم دوستوں کے انتخاب میں خاصی CHOOSY رہی ہو۔'' میں نے مون کو داد دی۔

''یہ محض اتفاق ہے ویسے میں حسن باطنی کو حسن ظاہری کی نسبت زیادہ اہم سمجھتی ہوں۔''

''تم سے ملنے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا! جوزی کہنے لگی'' کسی رائٹر سے ملنا صحیح معنوں میں عزت افزائی ہے۔ مون تمہارا غائبانہ تعارف پہلے ہی کرا چکی ہے۔

مون نے یقیناً مبالغہ آرائی سے کام لیا ہوگا۔ میں تو ایک عام سا سفر نامہ نگار ہوں۔

یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ تمہاری کتاب میں ہم سب کا ذکر ہوگا۔ مون کہنے لگی۔

ہوسکتا ہے تمہارے ذکر سے ہی کتاب شروع ہوا اور تم پر ہی ختم ہو جائے'' سارا کی شوخی عروج پر تھی۔

یہ ممکن نہیں ہے یہ تمہیں کہاں لے جائے گا۔ جو ایک سوالیہ نشان بنے بنچ میں کھڑی ہو۔

کیتھی نے اسے پھر چھیڑا۔ ہوسکتا ہے ویگاس کے ٹاور سے مجھے دھکا دے دے۔

اس کے لئے تمہیں فاتر العقل ظاہر کرنا پڑے گا۔ اتنی چالاک لڑکی پاگل نہیں ہوسکتی۔ میں نے کہا۔

اس کی باتوں پر نہ جاؤ' اتنی پیاری اور سادہ دل دوست قسمت والوں کو ملتی ہے۔ مون نے سارا کو گلے لگا لیا۔

مون نے تمہیں کچھ زیادہ لفٹ دے رکھی ہے میں نے کہا۔

ہا ہا..... وہ مسکرائی Bewave My Lord of Jealousy. Itis the green eyed monste

کیا تم نے شیکسپیئر پڑھا ہے۔

بالکل نہیں! اس نے QUOTATIONS والی کتاب پڑھ رکھی ہے۔ اس میں سے موقع بے موقع QUOTE کرتی رہتی ہے۔ کیتھی نے اس کی ٹانگ کھینچی۔

لیکن یہ بے موقع نہیں ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو شاہ سے ہی پوچھ لو۔

سب نے میری طرف دیکھا..... شاید یہ درست ہی کہہ رہی ہے۔ میں مسکرا دیا۔

جوزف ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کافی بنانے چلی گئی۔ چھوٹا سا گھر' دو بیڈ رومز پر مشتمل۔ چھوٹا لیکن

صاف ستھرا ڈرائنگ روم' ایک صوفہ سیٹ' سینتھٹک کارپٹ' دیواروں پر دو عام سی پینٹنگز' ڈیکوریشن کے لئے چند کرسٹل ایک درمیانے سائز کا کلر ٹی وی اور اس کے ساتھ ریک پڑا ہوا وی سی آر۔ ٹی وی پر فریم شدہ جوزی کی تصویر' اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا کھڑا تھا۔ کیا یہ اس کا خاوند ہے؟ میں نے استفسار کیا۔

بوائے فرینڈ' سارا بولی' بس خاوند ہی سمجھ لو۔

کیا مطلب؟

یہ شادی شدہ جوڑے کی طرح ہی رہ رہے ہیں۔ یہ ایسی حیران کن بات نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ شاید ایک دوسرے کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے اگر ایک دوسرے کو جانچ پرکھ لیا تو شادی کر لی نہیں تو..... خدا حافظ' تو نہیں اور سہی سارا نے وضاحت کی۔

اتنے میں جوزی کافی بنا کر لے آئی۔ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ اس نے پوچھا۔

تمہارے دوست کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ کیتھی بولی۔

وہ بہت سویٹ ہے۔ ہینڈسم' ونگ اور ریسپو' جوزی کسی انجانے جذبے کے تحت ہاتھ سینے تک لے آئی۔ جیسے تصور میں اس سے گلے مل رہی ہو۔

میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے نارمن جیسا ساتھی ملا ہے۔ ہم نے طے کیا ہے کہ ہم اپنے بچے کی پیدائش سے قبل ہی شادی کر لیں گے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی کیا تمہارے ہاں ایسا نہیں ہوتا؟

نہیں اسے غیر اخلاقی فعل سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کہا۔ سارا نے مقولوں والی کتاب پھر سے کھول دی۔

Morality is the way to behave as you have been taught

She is quotion۔ اب تو تمہیں میری بات کا یقین ہو گیا ہو گا۔ کیتھی کہنے لگی behave

phobiac

لیکن یہ ریمارکس ہیں برجستہ' کہیں بھی یہ تاثر نہیں ابھرتا کہ انہیں مسلط کیا جا رہا ہے۔

اب کچھ شرم کرو۔ سارا نے کیتھی کو جھڑکا۔

یہ الفاظ ایک کے رائٹر نکلے ہیں۔ ایرے غیرے نے نہیں کہے۔

تم نے ایرے غیرے پر کچھ زیادہ ہی وزن ڈال دیا ہے۔ میں نے اس کے طنز کو بھانپتے ہوئے کہا۔
مون کہنے لگی شاہ جوزی نے ہماری دعوت کی ہے۔ لیکن یہ دعوت اس اعتبار سے تمہیں شاید عجیب لگے کہ ہم سب کو مل کر کھانا تیار کرنا ہوگا۔ BAR-B-Q لنچ۔ جوزی آگ جلا کر کوئلوں کو سرخ کرے گی۔ سارا برتن دھوئے گی۔ کیتھی چکن ساجز اور اسٹیکس دھو کر سیخوں پر لگائے گی۔ میں اور تمہیں کام کرتے ہوئے بڑے شوق سے دیکھے گا۔ سارا بولی۔
اور تم میری مدد کرو گے۔ مون کہنے لگی۔
مجھے حیرانی نہیں ہو رہی تھی۔ میں آسٹریلیا میں بڑی عجیب دعوتوں میں شرکت کی تھی۔ جب میں یونیورسٹی آف ساؤتھ ویلز میں پڑھ رہا تھا تو ہمارے ایک دوست باب نے کلاس کے بلیک بورڈ پر جلی حروف میں لکھا۔ میری طرف سے ساری کلاس کو کل شام کھانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ سب لوگ شام سات بجے تک میرے گھر اپنا اپنا کھانا لے کر پہنچ جائیں۔
جوزی کہنے لگی۔ شاہ! میں نے تمہارے لئے خاص طور پر ٹی بون اسٹیکس منگوائے ہیں۔ اتفاق سے یہ بیف بی آسٹریلیا سے امپورٹ کیا گیا ہے۔ کیونکہ آسٹریلیا سے بہتر گوشت دنیا میں کہیں نہیں ملتا۔ پہلے تھوڑا بہت برطانیہ سے بھی آجاتا تھا۔ لیکن جب سے میڈ کاؤ بیماری پھیلی ہے۔ امریکیوں نے برطانوی بیف کھانا چھوڑ دیا ہے۔ برطانوی اسے اپنے خلاف معاندانہ پروپیگنڈہ سمجھتے ہیں لیکن جب شک کے سائے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے لیں تو پھر مشکل سے ہی نکلتے ہیں۔
یہ درست ہے۔ مون بولی آجکل مقابلہ اتنا سخت ہو گیا ہے۔ کہ حریف کمپنیاں مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ کسی زمانے میں آسٹریلیا کے گوشت کے متعلق بھی مشہور ہو گیا تھا کہ وہ بیف نہیں بلکہ کانگرومیٹ ہے۔ لیکن یہ حربہ زیادہ دیر کارگر ثابت نہ ہو سکا کیونکہ آسٹریلیا میں اتنے کانگرو نہیں جتنی بھیڑیں اور گائیں ہیں۔ پھر ان کی گائیوں کا گوشت اتنا نرم اور جوسی Juicy ہوتا ہے کہ اپنا ذائقہ خود محسوس کراتا ہے۔ کسی کو تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔
امریکہ اتنا بڑا ملک ہے برصغیر پاک و ہند سے دوگنا بڑا۔ روس کو چھوڑ کر یورپ کے سائز کا بلکہ ایک اعتبار

سے آسٹریلیا سے بھی بڑا ہے۔ پھر آپ لوگوں کو گوشت درآمد کرنے کی کیا ضرورت ہے
شاید کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ جوزی نے وضاحت کی۔ یہاں بھی مویشیوں کی افزائش نسل کا بہت کاروبار ہے لیکن اس ملک کی آبادی تو دیکھو۔ تیس کروڑ۔ پھر سب کے سب گوشت خور جبکہ آسٹریلیا میں دو کروڑ انسان بستے ہیں۔ ٹریڈ بیریئر ختم کر دیئے گئے ہیں۔ لوگوں کو خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہے۔ دنیا کی ہر اچھی پراڈکٹ یہاں آتی ہے۔ پھل' سبزیاں' گوشت' پنیر' شراب جس کو جس قسم کی طلب یا خواہش ہوتی ہے۔ خرید لیتا ہے۔
اور کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ مون بولی۔ یہاں زیادہ آمدن الیکٹرانک گڈز' ایوی ایشن' اسلحہ' کمپیوٹر' اجناس وغیرہ کی فروخت میں ہوتی ہے اگر تمہارے ملک کے سارے سال کی آلوؤں کی فصل بیچ دی جائے تو ایک F-16 خریدا جا سکتا ہے۔ اور ایف سولہ ہوتا ہی کیا ہے۔ چند ٹن لوہا' ٹیکنالوجی
جب کوئلے دہک گئے اور کیتھی گوشت دھو کر لے آئی تو مون نے اسٹیکس کوئلوں پر رکھتے ہوئے پوچھا
کیسا اسٹیک پسند کروں گے ہاف DONE HAF یا ویل ڈن؟
ویری ویل ڈن۔
اس طرح تو اس کا سارا جوش ختم ہو جائے گا اور گوشت جل جائے گا۔
عادت کی بات ہے۔ میں کچا گوشت کھا نہیں سکتا۔ میں نے یہاں لوگوں کو اتنے کچے اسٹیک کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ کہ ان میں سے خون رس رہا ہوتا ہے۔
لیکن تھوڑا بہت تو جوس ہونا چاہیے۔
کیا ضروری ہے کہ معدے اور دانتوں کی آزمائش کی جائے؟
تمہاری مرضی! مون نے مزید بحث ضروری نہ سمجھی۔
اچھا کھانا یقیناً پر لطف ہوتا ہے۔ لیکن اچھا کھانا پکانے کا بھی اپنا مزہ ہے۔ خصوصاً جبکہ اتنی پسندیدہ کمپنی ہو۔ سارا برتن دھوتے دھوتے چائے کے چمچ سے ان کو بجاتے ہوئے آرکسٹرا استعمال کر رہی تھی۔ اور اپنی نیم سریلی آواز میں کوئی فوک سانگ گا رہی تھی۔ کیتھی گوشت دھوتے دھوتے گانے کی دھن پر ڈانس کر رہی

تھی۔ ہر چند جوزی نے کوئلے دہکا دیئے تھے لیکن تھوڑا سا دھواں پھر بھی اٹھ رہا تھا۔ جس سے مون کی آنکھوں سے پانی بہنا شروع ہو گیا۔ پانی کے قطرے اس کے گالوں تک آ کر اٹک جاتے چونکہ اس کے دونوں ہاتھ مصروف تھے۔ اس لئے کہنے لگی۔ اگر محسوس نہ کرو تو رومال سے میری آنکھوں اور گالوں پر کھڑا ہوا پانی صاف کر دو۔ اسٹیک بنانے میں دشواری محسوس ہو رہی ہے۔ آگ کی حرارت سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ غالب نے فروغ نہ سے چہروں کو گلستان ہوتے دیکھا تھا۔ اس چہرے کو دیکھ سردار جذب و مستی کو جو کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ وہ تاثیر شراب پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور اس کی آنکھیں اور چہرے پر جمے ہوئے قطروں کو سمیت لیا۔

بولی ''شاہ معذرت خواں ہوں تمہارا رومال خراب کر دیا ہے۔

اس قدر معصومت! یقین نہیں آتا تھا کہ بیورلے ہلز پر رہنے والی امریکن لڑکی جو ویگاس میں کئی بار آتی ہے۔ اس طرح کی سوچ رکھتی ہے۔ میں اس کیا جواب دیتا۔ میں زبان سے تو کچھ نہ بولا میری نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ اس نے میری طرف دیکھا کہنے لگی ''لفظوں کی بیساکھیوں کا سہارا لئے بغیر بھی بعض جواب اس قدر جامع ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔

کھانا تیار ہو گیا۔ سارا نے برتن لگا دیئے۔ چھوٹے گھروں میں الگ سے کوئی ڈائنگ روم نہیں ہوتا۔ کچن میں ایک چھوٹا سا گول میز جس کے اردگرد چار کرسیاں رکھ دی جاتی ہیں۔ خود ہی کھانا پکایا اور میز پر رکھ کر خاندان نے اکٹھے کھایا۔ میاں بیوی اور دو بچے.....اور تھوڑے تھوڑے سلاد کا اضافہ کر دیا۔ فریج سے شمپین کی بوتل اور اورنج جوس نکال لائی۔ سارا نے بڑی للچائی ہوئی آنکھوں سے شمپین کو دیکھا۔

حوصلہ کرو، میں نے صبر کی تلقین کی۔ بوتل میں بند شراب اتنی مضطرب نہیں ہے جتنی ہلچل تمہارے اندر مچی ہے۔

کہنے لگی۔ تھک گئی ہوں اور شمپین کا گلاس میری تھکن دور کر دے گا۔

سارا نے بوتل کھولی۔ کارک ایک جھٹکے کے ساتھ دور جا گرا اور سفید جھاگ کی ایک پھوار فوارے کی شکل میں اوپر ابھری۔ اس نے ہونٹ بوتل سے لگا دیئے۔

کیا ذائقہ ہے۔ اس نے مجھے ورغلانے کی کوشش کی۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے انسان کھٹے میٹھے انگوروں کا ٹھنڈا رس پی رہا ہو۔ اسے چکھ کر تو دیکھو یوں محسوس کرو گے جیسے دھیرے دھیرے تم فضا میں بلند ہو رہے ہو۔ پرندوں کے ساتھ پرواز کر رہے ہو اور اگر ایک آدھ بوتل چڑا لو تو ان کے ساتھ چہچہا بھی سکتے ہو۔

مجھے تو بن پیئے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے تم نہیں بول رہی کوئی کوئل کوک رہی ہے۔ ہر طرف قمریاں' خمریاں اندلیبیں اور فاختائیں ہیں۔

بولی' میں مذاق نہیں کر رہی۔ ایک دفعہ آزما کر تو دیکھو

اگر میں نے پینی ہی ہوتی تو کیا یہ زنانہ ڈرنک پیتا۔ اس سردار جی کی طرح ٹھیک طرح سے مت مارتا۔

کون سردار؟ اس نے کیا کیا تھا؟ سب نے بیک زبان ہو کر پوچھا

سردار جی ایک شخص کے پاس بطور مہمان ٹھہرے۔ اسیان کے شغل شب کا علم تھا چنانچہ وہ وسکی کی بوتل لے آیا۔ گلاس اور بوتل میز پر رکھ کر سوڈا لینے گیا۔ جب وہ آیا تو سردار جی بوتل کی تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ میزبان کو حیرت تو بہت ہوئی لیکن سوڈا میز پر رکھتے ہوئے بولا ذرا انتظار کر لیں تو دوسری بوتل لے کر آتا ہوں۔ وہ مڑا ہی تھا کہ سردار جی بولے۔ اس کی ضرورت نہیں آباں اکو پینگ پیندے آں (ہم ایک ہی پیگ پیتے ہیں)۔

''یہی تو لوگوں میں خرابی ہے'' جوزی کہنے لگی ''تم لوگ شراب کو راحت جاں نہیں بناتے۔ اس کے ساتھ کشتی لڑتے ہو۔ باکسنگ کرتے ہو۔ وسکی کا PUNCH بڑا ظالم ہوتا ہے۔ آدمی چاروں شانے چت گرتا ہے''۔

''ہر چیز کی زیادتی بری چیز ہے''۔ مون بحث میں شریک ہوتے ہوئے بولی ''نظام کائنات کی طرح ہر چیز میں توازن ضروری ہے۔ یہ ستارے' چاند' سورج سب توازن پر قائم ہیں۔ اسی طرح انسانی نظام بھی توازن کا مرہونِ منت ہے۔ بلڈ پریشر کم ہو تو انسان ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ زیادہ ہو تو رگیں چٹخ جاتی ہیں۔ یہی حال شوگر کا ہے۔ کولیسٹرول زیادہ ہو تو دل کی نازک رگیں ٹوٹتی ہیں اور کم ہو تو ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔ پیگ کو تھپتھپانا چاہئے ڈیک نہیں لگانی چاہئے؟''۔

سارا بولی' ''میرے خیال میں اب کھانا شروع کرنا چاہئے بھوک چمک اٹھی ہے'' کھانا واقعی بڑا مزیدار تھا۔ سٹریلیا کاٹی بون اسٹیک لذت کے اعتبار سے حرف آخر ہے۔

''شاہ کھانا پسند آیا ہے؟'' مون نے پوچھا۔

''بہت زیادہ'' میرے بولنے سے پہلے سارا پھر بول پڑی۔ ''تم نے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے جو بنایا ہے۔ ابھی یہ کہے گا میں نے زندگی میں اتنا مزیدار کھانا نہیں کھایا''۔

''کیا یہ سچ کہہ رہی ہے؟'' مون مسکرائی۔

''زندگی میں کبھی کبھی تو یہ سچ بولتی ہے ویسے اسے تمہاری سہیلی کے بجائے تمہاری گارڈین ہونا چاہئے تھا''۔

کیتھی کہنے لگی ''کوئی مرغی چوزوں کا اتنا خیال نہیں رکھتی جتنی اسے تمہاری چنتا رہتی ہے!''

''اس لحاظ سے تو مجھے تمہارا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ چوزوں کی بھی چوزی''۔

''تمہاری ان فضول باتوں کا مؤثر جواب کیتھی ہی دے سکتی ہے' جس طرح ہر فرعون کے ساتھ ایک موسیٰ ہوتا ہے اس طرح ہر سارا کو چیک کرنے کیلئے ایک کیتھی پیدا ہوتی ہے''۔

کہنے لگی ''یہ مجھے کیا کنٹرول کرے گی یہ تو میری شخصیت کا سایہ بھی نہیں بنتی''۔

''سایہ قد سے اکثر بڑھ جاتا ہے'' میں نے کہا۔

''رہتا تو بے جان ہی ہے' بے حس اور بے ضرر!''

جوزی کہنے لگی ''شاہ! سنجیدہ سے سنجیدہ انسان نے بھی تفنن طبع کیلئے کوئی نہ کوئی کامیڈین رکھتا ہوتا ہے۔ یہ مون کی مزاح گو ہیں' چونکہ یہ خود بہت سنجیدہ ہے اس لئے ان دونوں کے ملنے سے بھی ایک قسم کا توازن پیدا ہوتا ہے!''

شاید جوزی نے درست ہی کہا تھا۔ نواب کالا باغ جیسا سنجیدہ اور اکھڑ مزاج انسان بھی بعض اوقات مزاح کیلئے ترستا تھا اور اسی لئے بقول شورش مرحوم اپنی کابینہ میں ایک ادھ غرغوں قسم کا منسٹر رکھتا تھا۔ غالباً یٰسین وٹو کی زبانی اس نے سن لیا کہ مشکور حسین یاد بھی بڑے زبردست جملہ باز ہیں' چنانچہ ایک دن اس نے انہیں بغیر پیشگی نوٹس دیئے بلوالیا۔ مشکور صاحب پہلے تو یہ سمجھے کہ ان سے کوئی خطا ہوگئی ہے اور ان کی آزادی سلب کرنے کا پروانہ گیا ہے۔ جب ملٹری یونیفارم میں ملبوس ADC نے انہیں کار میں بٹھایا تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے یہ کسی لیموزین میں نہیں بلکہ ہنڈولے پر بیٹھے ہوں۔

آدھے اوسان تو وہیں خطا ہو گئے اور جب کالا باغ کا سامنا ہوا تو یکسر حواسکھو بیٹھے۔ انہوں نے اس کو ہنسانا تو کیا تھا الٹا پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ ان کو فوراً واپس گھر بھیج دیا جائے اس کے علاوہ بھی غالباً چند باتیں ہوئیں۔ جو نہ تو مشکور صاحب مانتے ہیں اور نہ ہمارے پاس موثر شہادت موجود ہے انشاء اللہ خان کا واقعہ مزاح گوئی سے زیادہ درس عبرت ہے نواب سعادت اللہ کو وہ اس قدر محظوظ کرتے کہ ہنستے ہنستے نواب صاحب لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے پانی بہنا شروع ہو جاتا لیکن بالآخر ایک نقطے نے انہیں محرم سے مجرم کر دیا۔ نجیب الطرفین کا ذکر چھڑا نواب صاحب بھی داعی ہوئے کہنے لگے ''ہم بھی تو نجیب الطرفین ہیں..... بلکہ انجب''۔ انشاء اللہ خان کے منہ نکل گیا ''لفظ تیروں کی طرح ہوتے ہیں'' طنز کا وہی تیر آسٹریلین بوم رینگ کی طرح ان کے مقدر کے سینے میں پیوست ہو گیا بقیہ عمر انہوں نے مزاح تو کیا کرنا تھا اس کے مفہوم سے ہی نا آشنا ہو گئے۔

،مون اور سارا کا قصہ دوسرا تھا۔ وہ خود بہت متمول تھی۔ یہ مون کی محبت تھی جو دراصل اسے کشاں کشاں اس کے پاس لے آتی تھی نہیں تو امریکن معاشرے میں لوگوں کے پاس ملنے ملانے کا اتنا وقت نہیں ہوتا۔

ہم کھانا کھا رہے تھے کہ جوزی کا دوست نارمن آ گیا۔ جوزی نے تعارف کرایا چھ فٹ سے زیادہ قد' چوڑے کندے' مضبوط جسم' جاذب نظر' کہنے لگا ''آنے میں کچھ دیر ہو گئی ہے ایک مکان کا نقشہ آج ہی مکمل کرنا تھا''۔

''کیا تم آرکیٹیکٹ ہو'' میں نے پوچھا۔

بولا ''ہم دونوں آرکیٹیکٹ ہیں۔ یہاں ہم نے اپنی چھوٹی سی فرم قائم کر رکھی ہے جوزی اور میں آرٹ کالج میں کلاس فیلو تھے وہیں سے دوستی کی ابتدا ہوئی۔ اب ہم نہ صرف اچھے دوست ہیں بلکہ بزنس پارٹنر بھی ہیں۔

''دوستی کی انتہا کب ہو گی؟ سارا کو پھر شرارت سوجھی۔

''اسے انتہا ہی سمجھو'' وہ مسکرایا۔ ''سنا ہے آج کل تمہاری اپنے دوست سے ان بن ہے؟''

''موسموں کے ساتھ یہ دوست بھی بدل لیتی ہے'' کیتھی کہنے لگی 'عجیب متلون مزاج ہے کہیں ٹک کر نہیں بیٹھتی''۔

''تمہاری طرح دوست تلاش کرنے میں مجھے دشواری پیش نہیں آتی۔ لڑکے میرے آگے پیچھے پتنگوں کی طرح منڈلاتے ہیں!''

'لیکن جلتا کوئی نہیں ہے کیونکہ یہ آتش بے سوز ہے'' کیتھی بھی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ ''یہ سوز نہیں ساز کا زمانہ ہے تم نے میرا گانا نہیں سنا جب میں گاتی ہوں تو ایک ہلچل سی۔

مچ جاتی ہے۔ لڑکے دل تھام کر رہ جاتے ہیں!''

جوزفین موضوع بدلتے ہوئے بولی ''نارمن کب تک کھڑے رہو گے' بیٹھو اور میرے ساتھ کھانا کھاؤ''۔

''کہاں بیٹھوں!'' نارمن نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی کوئی کرسی خالی نہ تھی۔

''میری گود میں بیٹھ جاؤ'' جوزی نے اسے پیار سے دیکھا۔

''اگر میں دس منٹ تمہاری گود میں بیٹھا رہا تو تمہاری خوبصورت ٹانگیں دہری ہو جائیں گی۔ اور بقیہ عمر لنگڑا کر چلو گی۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ میری سویٹی کی لنگڑی کہیں''۔

''تو اس صورت میں میں تمہاری گود میں بیٹھ جاتی ہوں!''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں'' وہ مسکرایا۔

''سارا کی کرسی پر بیٹھ جاؤ'' مون نے اسے مشورہ دیا۔ ''سارا کھانا ختم کر چکی ہے اور ویسے بھی سے اب برتن دھونے ہیں!''

سارا نے کرسی خالی کر دی اور نارمن کھانے میں شریک ہو گیا۔ پوچھنے لگا ''پاکستان سے ویگاس تک ایک طویل سفر ہے کیا صرف کتاب لکھنے کی خواہش تمہیں یہاں لے آئی ہے''۔

''ہاں..... ویگاس پر مشتمل عجیب مفروضے قائم کر رکھے ہیں''۔

بولا ''عام طور پر اسے شہر گناہ سمجھا جاتا ہے یعنی ہر قسم کی برائی نکتہ عروج پر پہلے لوگ خاندان کے

ساتھ یہاں آنے سے بدکتے تھے لیکن اب خاندان کثرت سے آتے ہیں۔ لوگوں کو چھٹیاں گزارنے کیلئے اس سے بہتر کوئی جگہ نظر نہیں آتی دنیا کی ہر سہولت یہاں میسر ہے جو لوگ موسم کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں وہ کچھ دن یہاں ٹھہر کر رینو اور لیک طاہو چلے جاتے ہیں"۔

"لوگوں کی آمد کی وجہ کیا ہے؟ کیا اس شہر نے اپنا مزاج بدل ڈالا ہے؟"۔

"نہیں..... امریکیوں نے اپنے لئے اخلاقیات کی نئی ڈکشنری مقرر کی ہے پہلے جو لفظ ٹی وی اور ریڈیو پر معیوب سمجھے جاتے تھے وہ اب کثرت سے استعمال ہوتے ہیں!"

"بڑی عجیب بات ہے" میں نے کہا "جو شان و شوکت اور طمطراق ویگاس بلیوارڈ میں نظر آتا ہے اس کی ہلکی سی جھلک بھی باقی شہر میں دکھائی نہیں دیتی"۔

"بظاہر یہ بڑی حیران کن بات ہے کہ لوگ اس شہر میں رہتے ہوئے بھی اس کی رنگینیوں سے محروم ہیں یا شریک نہیں ہوتے"۔

"وجہ.....؟"۔

"صاف ظاہر ہے یہ پیسے کا کھیل ہے اور عام آدمی کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ اسے کیسینو میں جا کر بے دریغ لٹائے پھر شہر کے لوگ حیران کن حد تک مذہبی ہیں انہیں گیمبلنگ سے نہ تو رغبت ہے اور نہ چاہت! ویسے بھی خوبصورت سے خوبصورت چیز کی کشش بھی ایک حد تک ہوتی ہے بار بار دیکھنے سے چارم کم ہو جاتا ہے"۔

"تو یہاں کے باسی اپنی شامیں کیسے گزارتے ہیں؟"

جیسے لاس اینجلس میں گزارتے ہیں نیویارک میں بسر کرتے ہیں اکثریت کام کرنے والے لوگوں کی ہوتی ہے دن بھر کے تھکے ہارے لوگ شام کو واپس آ کر آرام کرتے ہیں کھانا کھایا اور سو گئے یا ٹی وی دیکھ لیا اگلے دن پھر کام پر جانا ہوتا ہے اور وقت پر دفتر پہنچنا ضروری ہے۔ پورے آٹھ گھنٹے کام اور اوقات کار کی پابندی آدمی ہلکان ہو جاتا ہے شام کو عام طور پر کہیں جانے کی نہ تو ضرورت ہوتی ہے اور نہ فرصت!"

کیا کیسینو کی تعمیر میں لوکل ٹیلنٹ کی خدمات بھی لی جاتی ہیں؟

بالکل نہیں وہ مسکرایا۔ نیویارک' شکاگو اور دنیا کے کونے کونے سے ٹاپ آرکیٹیکٹ آتے ہیں کٹ تھروٹ کمپیٹیشن کی وجہ سے مالکان کو خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہے جدت' اختراع' کوئی اچھوتا خیال جیسا کہ تم نے ایم جی ایم گرینڈ مراج اور ٹریژر آئی لینڈ میں دیکھا ہوگا۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے کروڑوں خرچ ہوں گے تو تب ہی اربوں جمع ہوں گے''۔

جوزی کہنے لگی'' شاہ امید ہے مون نے تمہیں خوب گھمایا اور تمہاری معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہوگا؟''

یہ میری خوش قسمتی ہے اگر میں ویگاس نہ آتا تو مون سے ملاقات نہ ہوتی اور اگر مون سے ملاقات نہ ہوتی تو ویگاس صرف دکھائی دیتا بھائی نہ دیتا..... یقین نہیں آتا کہ کوئی خوبصورت لڑکی کسی اجنبی کیلئے اتنا وقت نکال سکتی ہے''..... میں نے مون کی طرف تشکرانہ نگاہوں سے دیکھا۔

مون کہنے لگی'' IT IS A BOTH WAY TRAFFIC اگر میں تم سے نہ ملتی تو ساری زندگی یہ نہ جان پاتی کہ لفظوں کا جادو کیا ہوتا ہے اور وہ کیسے سر پر چڑھ کر بولتا ہے''

جوزی کہنے لگی ایک رائٹر کی زبان سے اپنی تعریف سن کر من میں لڈو سے پھوٹتے ہیں اور کیف وسرور کی عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے'

بولی' تعریف تو ایک جہان کرتا ہے اور اس کے مختلف زاویے اور مطالب ہوتے ہیں شاہ جیسا بے ساختہ پن اور خلوص مجھے کہیں نظر نہیں آیا اب ہم ہمسفر ہی نہیں بلکہ اچھے دوست بھی ہیں'' اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا' SWELL MR SHAH'' سارا بولی۔

یوں لگتا ہے کہ یہ الفاظ اس نے کسی لاکر میں محفوظ رکھے ہوئے تھے اور آج ہی اس نے انہیں لاکر سے نکالا ہے۔

تم نے لفظوں سے ہمیشہ غلط معانی اخذ کئے ہیں'' میں نے کہا۔

جوزی مجھ سے پوچھنے لگی'' آج ویگاس میں آپ لوگوں کا آخری دن ہے آگے کیا پروگرام ہے؟''

شاہ ہمارے ساتھ لاس اینجلس جارہا ہے میرے بولنے سے پہلے ہی مون بول پڑی۔ یہ عجیب لگتا ہے کہ اسے ویگاس تو دکھایا جائے اور اپنی ریاست کیلیفورنیا نہ دکھائی جائے جو بڑی خوبصورت بھی ہے اور عظیم بھی

سارافٹ سے بولی پڑی مون کیسا حسن اتفاق ہے! میں بھی L.A جانے کا سوچ رہی تھی تمہاری کمپنی میں سفر مزید سہانا ہو جائے گا

تم شرارتوں سے باز نہیں آؤ گی۔ مون نے اس کا کان پکڑا کر ہلکے سے کھینچا۔ اب جاؤ اور پلیٹیں صاف کرو یہی تمہاری سزا ہے۔

ساری میری طرف دیکھ کر بولی' سزا اور جزا کا بڑی عجیب تصور قائم کر رکھا ہے بہر حال مجھے یہ سزا قبول ہے کیونکہ میں ٹاور سے چھلانگ تو لگا سکتی ہوں مون کا کہا ٹال نہیں سکتی۔

ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے سیاست' سیاحت' ثقافت' امریکہ کی دو صد سالہ تاریخ کو کھنگال ڈالا ایک تقابلی جائزہ دنیا کی واحد سپر پاور جس POLICE MAN OF THE WORLD روپ دھار لیا ہے شام کے آٹھ بج گئے مون نے اجازت چاہی تو جوزی کہنے لگی چلو میں اپنی گاڑی میں تمہیں ہوٹل چھوڑ آؤں!

کیسینو پہنچ کر مون کہنے لگی صبح نو بجے کے جہاز سے ہمیں لاس اینجلس جانا ہے رات کو کیسینو میں پوکر کھیلیں گے اگر تم لوگ چاہو تو کچھ دیر آرام کر سکتے ہو میں تھکا ہوا تھا نیز پوکر کے کھیل سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے میں نے معذرت کی اور صبح ملنے کا پروگرام بنا کر کمرے میں چلا آیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے کپڑے بدلے ڈنر کا وقت ہو رہا تھا لیکن بھوک نہیں تھیں ایک تو لنچ لیٹ کیا تھا پھر رغبت میں کچھ زیادہ ہی کھا لیا تھا ٹی بون اسٹیکس کے علاوہ چکن پیس اور اور ساجز سویٹ ڈش کے لئے جوزی نے اپیل پائی منگوائی تھی اور نج جوس بھی کچھ زیادہ پی لیا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ ڈنر گول کیا جائے میں نے سگار سلگایا اور حسب معمول بلیوارڈ والی کھڑکی کھول دی۔

☆☆☆

باب دونم

سات دن پلک جھپکتے ہی گزر گئے تھے۔ سات دن، جن کا ہر لمحہ شمار کیا جا سکتا تھا۔ ویگاس کا نہ صرف چپہ چپہ چھان مارا تھا بلکہ اس شہر کی سائیکی بھی کافی حد تک سمجھ میں آ گئی تھی۔ کیا زندگی واقعی اس قدر حسین، جوان اور سہل ہے؟ میں نے سوچا۔ بارہ ہزار میل کے سفر کا یہ اختتام تھا یا یہاں سے ایک نئے سفر کا آغاز ہو رہا تھا؟ ایک ایسا سفر جس میں نشیب کوئی نہ تھا سب فراز تھے..... کس قدر تضاد ہے ہماری زندگیوں میں! کہنے کو تو یہ دنیا اب ایک گوبل ویلج کی شکل اختیار کر گئی ہے لیکن اس گاؤں کے بھی کئی حصے ہیں۔ ایک طرف اگر ہن برس رہا ہے تو دوسری جانب مفلسی اور غربت ہاتھ جوڑتی نظر آتی ہے۔ ایک طرف پانی کی جگہ شراب چلتی ہے تو دوسری جانب لوگ جرعہ آب کو ترستے ہیں۔ کچھ حصوں میں لوگ نان جویں کے محتاج ہیں تو کہیں کتے کیک کھاتے ہیں۔ ایشیاء زرد ہے، افریقہ قریب المرگ ہے، مشرقی وسطی کی دولت کماتا کوئی اور ہے اور اسے لوٹتا کوئی اور ہے! اس غیر منصفانہ نظام کے خلاف کئی آوازیں اٹھیں۔ ہر طرف صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ کمیونزم کی شکل میں فلسفانہ رنگ بھی دیا گیا لیکن وہ لوگ جو ظلم اور ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے ایوان اقتدار میں داخل ہوئے وہ پہلوں سے بھی زیادہ ظالم نکلے۔ وہ صرف مارتے تھے یہ تابوت میں کیل بھی گاڑتے تھے۔ دنیا میں ہر شخص امیر نہیں ہو سکتا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے لہٰذا اہل مغرب نے فیصلہ کیا ہے IN ORDER TO KEEP THE WEST RICH AND

PROSPEROUS THE PEOPLE OF ASIA AND AFRICA M
REMAIN POO۔کتنا سیدھا سادا فیصلہ ہے۔منافقت سے کام نہیں لیا گیا۔کون کہتا ہے قانون جنگل کی عملداری ختم ہوگئی ہے۔فیصلہ وہ لوگ کرتے ہیں اور اس پر عملدرآمد میں ہم خود مدد اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔نہ ختم ہونے والی طویل جنگیں' اذیب ناک کشمکش' بے مقصد مخاصمت' سارا بجٹ دفاع پر اٹھ جاتا ہے۔پڑوسی ملک ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔دفاع کا سامان مغرب سے آتا ہے مہنگا اور منہ منگی قیمت دے کر۔سگار بجھ گیا تھا کھلی کھڑکی سے گرم ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے' ذہن پر دھواں سا اٹھتا محسوس ہوا۔انہیں سوچوں میں غلطاں میں سو گیا۔

صبح ہوٹل کے آپریٹر نے WAKE UP CALL دی تو میں اٹھ بیٹھا۔اتنے میں مون کا بھی فون آ گیا۔کہنے لگی جلدی کرو ایئرپورٹ پر خاصا رش ہوتا ہے اور بورڈنگ کارڈ کے لئے کافی دیر انتظار کرنا پڑتا ہے۔میں نے جلدی جلدی شیو کی۔سامان رات کو ہی پیک کر لیا تھا۔غسل کر کے جب میں کاؤنٹر پر پہنچا تو وہ سامان کے ساتھ میرا انتظار کر رہی تھی۔

''کہو کیسی شب گزری''مون نے پوچھا۔

''ضرور حسین خواب دیکھے ہوں گے۔پھول' سبزہ' آب رواں' بلبلیں' قمریاں' عندلیبیں'' سارا فٹ سے بول پڑی۔

''میں نے خواب دیکھنے چھوڑ دیئے ہیں۔''

''کیوں؟''

خواب دیکھنے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔

اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ مون نے پوچھا۔

آسماں حد نظر' راہ گزر راہ گزر' شیشہ مے' شیشہ مے!

اب چلیں؟ سب نے اپنا اپنا سامان اٹھا لیا۔

تو کیا یہ حسین بھڑیں بھی ہمارے ساتھ چلیں گی؟ میں نے پوچھا۔

ان کے چنگل سے بچنا مشکل ہے' مون مسکرائی۔ کہتی ہیں ہم نے بھی شاہ کو کیلفیور نیا دکھانا ہے۔
بلکہ ہم تو ہوائی تک جانے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ اس کا انحصار تمہارے Response اور مون کی روشن ضمیری پر ہے۔
میرا رسپانس تو شاید اتنا مثبت نہ ہو لیکن مون کی روشن ضمیری سے تمہاری کیا مراد ہے؟
ٹکٹ!..... ٹکٹ! بھولے! دونوں خوشدلی سے مسکرائیں۔
اور اگر میں تمہارا پاکستان تک کا ٹکٹ کٹوا دوں تو؟
پیسے کہاں سے آئیں گے؟ میں نے آج تک کوئی ادیب متمول نہیں دیکھا!
اور یہ HAROLD ROBBINS ہے جانتی ہو اس کی کتنی کتابیں بکتی ہیں؟
بولی' وہ ادب نہیں جنس بیچتا ہے۔ تم بھی اگر ہمارے متعلق انٹ شنٹ باتیں لکھ دو تو شاید وارے نیارے ہو جائیں۔
''آج تو یہ بڑی زیرک نظر آ رہی ہے!'' میں نے مون سے کہا۔
''کبھی کبھی اسے دانائی کے دورے پڑتے ہیں LUCID INTERVELS'' کیتھی بولی۔
ویسے سارا نے درست ہی کہا تھا ایشیاء میں شاید ہی کوئی ادیب ہو جو کتابوں کے سہارے زندگی گزار سکے۔ برصغیر میں تو حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہیں۔ وہ لوگ جو کتاب پڑھنا چاہتے ہیں ان کے پاس خریدنے کی استطاعت نہیں ہے اور جو صاحب ثروت ہیں ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ لوگ نام و نمود' ناچ گانوں اور اللوں تللوں پر تو ہزاروں لاکھوں خرچ کر دیں گے لیکن کسی ادبی محفل کا نام سن کر یوں بدکتے ہیں جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ مشاعرہ ایک ڈوبتی ہوئی روایت ہے۔ ادبی مذاکرہ ایک گزری ہوئی حکایت ہے۔ انہیں رونمائی کا شوق البتہ ضرور ہے لیکن یہ کتابوں کی نہیں ہوتی..... اس بازار میں ہوتی ہے۔
کیب پندرہ منٹ میں میکارن ایئر پورٹ پہنچ گئی۔ جب اندر پہنچے تو عجیب منظر دیکھا۔ ہزاروں کی تعداد میں جاپانی' چینی نژاد اور دیگر ایشیائی لوگ طویل قطاروں میں کھڑے ہوئے تھے۔ قطاریں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کس قدر لوگ ہر روز ویگاس آتے جاتے ہیں۔ دیگر ایئر پورٹس کے برعکس بورڈنگ کے

یہاں دگنا وقت درکار ہوتا ہے..... ہمارے پاس چونک فرسٹ کلاس کے ٹکٹ تھے اس لئے ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا اور جلد ہی ہم چیک ان ہو گئے۔ لاؤنج میں جا کر میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ ویگاس شہر کی طرح ایئرپورٹ بھی بڑا چھیل چھبیلا تھا۔ نہایت خوبصورت وال ٹو وال دبیز پھولدار قالین۔ ہر طرف خوبصورت اشتہاری بورڈ' قابل یقین حد تک بڑے برقی فانوس اور کئی کئی منازل! گیمبلنگ نے ایئرپورٹ کو بھی نہ بخشا تھا۔ جگہ جگہ سلاٹ مشین..... یعنی بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے لوگ اپنی باقی ماندہ لٹیا یہاں ڈبوتے ہیں۔

ناشتہ کر کے آئے ہو؟ مون نے پوچھا۔

''وقت ہی کہاں تھا۔ تو چا جہاز میں کر لیں گے۔ جہاز کا ناشتہ تو ویسے بھی مزیدار ہوتا ہے۔''

بولی'' پتہ نہیں کون سے ہوائی سفر کی بات کر رہے ہو۔ یہاں اندرون ملک پروازوں میں اس قسم کی تفریحات کا انتظام نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ ایک کوکا کولا کا گلاس یا کافی کا کپ۔''

اس کی وجہ کیا ہے؟

''اکانومی ڈرائیور ہوائی کمپنیاں مقابلہ بازی کی وجہ سے ٹکٹ سستا بیچتی ہیں اس لئے زائد خرچ کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔''

''لیکن فرسٹ کلاس اور اکانومی میں تو کچھ فرق ہونا چاہئے۔''

''پہلے تو اندرون ملک کی فرسٹ کلاس اور بین الاقوامی سفر کی فرسٹ کلاس میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ چھوٹے جہازوں میں سیٹیں اتنی آرام دہ نہیں ہوتیں پھر اتنی مختصر فلائٹ کیلئے خصوصی انتظامات نہیں ہو سکتے۔ سفر ہی کتنا ہے کل ایک گھنٹہ اور بیس منٹ۔''

ایک گھنٹہ میں اور بیس منٹ میں جہاز لاہور سے کراچی پہنچ جاتا ہے لیکن امریکی فاصلوں کو دیکھتے ہوئے واقعی یہ سفر اتنا زیادہ نہیں ہے۔ جس ملک میں چار ٹائم زون ہوں' نیویارک سے لاس اینجلس تک سات گھنٹوں کی پرواز ہو' سان فرانسسکو سے ہوئی تک مزید پانچ گھنٹے لگتے ہیں وہاں گھنٹے کی پرواز یقیناً کوئی اتنی طویل شمار نہیں کی جا سکتی۔

ہمیں ایک دو جگہ رکنا پڑا ہر چند کہ یہ ڈومیسٹک فلائٹ تھی لیکن ہر جگہ غیر ملکیوں سے پاسپورٹ مانگا جاتا ہے۔ خصوصاً پاکستانی پاسپورٹ دیکھتے ہی امیگریشن آفیسر کے ہاتھ کو جھٹکا لگتا ہے۔ بظاہر وہ آپ سے باتیں کر رہا ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ کتاب کھول کر آپ کا نام منشیات فروشوں کی فہرست میں تلاش کر رہا ہوتا ہے۔ کس قدر رسوائی کی بات ہے۔ کتنی ذلت ہے جب دیگر لوگوں کو کسٹم کلیئرنس مل جاتی ہے لیکن پاکستانیوں کے سامان کی خصوصی چیکنگ ہوتی ہے..... ایک مرتبہ قاہرہ میں جب امیگریشن حکام نے تمام پاکستانی مسافروں کو روک لیا اور دو گھنٹے کا جاں گسل انتظار کرایا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ہر دفعہ جب میں اہلکار سے وجہ پوچھتا تو وہ کہتا بلا درویٹ' بلا درویٹ! آخر میں بچوں نے بلکنا شروع کر دیا اور عورتیں تھک کر وہیں فرش پر لیٹ گئیں تو میں اسے دھمکی دی کہ یا تو وہ وجہ بتائے نہیں تو میں اس کی باقاعدہ شکایت IATA سے کروں گا۔ تو اس نے نہایت رازداری سے میرے کان میں سرگوشی کی.....

''آج کل پاکستان سے مذہبی دہشت گرد مصر آ رہے ہیں۔ ان کی فہرست جس شخص کے پاس ہے وہ کھانا کھانے گیا ہے۔''

سبحان اللہ! میں نے سوچا بدنامیوں کے اتنے مدارج اس قدر تیزی کے ساتھ طے کرنا ہر قوم کا کمال نہیں ہوتا۔ غالباً یہی ایک شعبہ ہے جس میں ہم نے بہت ترقی کی ہے..... میں جب بھی سفر کرتا ہوں تو ہینڈ بیگ میں اپنی کتابیں رکھ لیتا ہوں جن پر میری تصویر ہوتی ہے۔ ان معاشروں میں ابھی تک ادیبوں کا احترام ہے۔ ہر چند کہ وہ اردو زبان نہیں جانتے لیکن کتاب کی تصویر دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں۔ اوہ رائٹر کہہ کر حتی الوسع سامان کی چیکنگ نہیں کرتے۔ اس طرح کسی حد تک عزت نفس بحال رہتی ہے۔

جہاز جب اڑا تو ایئر ہوسٹس نے آ کر پوچھا کافی یا کوکا کولا؟ میں نے ایک نظر اسے دیکھا وہ بھی بلیک کافی سے ملتی جلتی چیز تھی۔ پکی عمر کی نیگرو عورت.....

''تمہیں مایوسی ہوئی ہوگی'' سارا مسکرائی۔

''یہاں چلبلی حسینائیں سرو نہیں کرتیں۔ تجربہ کار عورتوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں!''

تمہارے ہوتے ہوئے میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا! مقصد تو باتیں کر کے جی بہلانا ہے۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ ایئر ہوسٹس کافی لے آئی۔ بغیر دودھ اور چینی کے ٹھنڈی بدمزہ کافی! یہ کیا لے آئی ہو؟

''میرے خیال میں تم نے کافی کا کپ مانگا تھا۔''

اسے تم کافی کہتی ہو نہ دودھ نہ چینی!

''اوہ آئی سی''۔ وہ غالباً میری کم علمی پر مسکرائی۔ تمہیں آرڈر دینے سے پہلے وضاحت کرنی چاہئے تھی۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اکثریت بلیک کافی پسند کرتی ہے۔ اس لئے جب تک وائٹ کافی نہ مانگی جائے تو تاثر یہی لیا جاتا ہے کہ مسافر بلیک کافی پینا چاہتا ہے۔

''شاہ! کیا پہلے بھی لاس اینجلس گئے ہو؟'' مون نے استفسار کیا۔

''ہاں ایک مرتبہ پہلے بھی جا چکا ہوں۔''

کب؟

''لاس اینجلس اولمپکس دیکھنے! وہ بھی کیا دن تھے۔ لاس اینجلس کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔''

''پھر تم نے خوب انجوائے کیا ہوگا؟'' سارا بولی۔

یقیناً! آدمی اپنے آپ کو تاریخ کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔

یہاں کے اولمپک اور دیگر اولمپکس میں کوئی فرق محسوس کیا۔

بہت زیادہ! ڈیگر ممالک اپنے ملک میں اس کا انعقاد بہت بڑی عزت سمجھتے ہیں۔ جب سپین میں اولمپکس کرانے کا سوال اٹھا تو وہاں کے بادشاہ کارلوس نے ذاتی طور پر کمیٹی کے ممبران سے درخواست کی کہ وہ اس کے ملک کے حق میں ووٹ دیں۔ لیکن امریکن یہ تاثر دیتے ہیں جیسے انہوں نے اولمپکس پر بڑا احسان کیا ہو! جس طرح خوائے سلطانی نہیں جاتی اسی طرح سپر پاور ہونے کا زعم بھی ختم نہیں ہوتا..... پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پہلی دفعہ اسے کمرشل خطوط پر استوار کیا گیا۔ امریکہ نے کچھ کمایا' لٹایا نہیں۔

دراصل ہم لوگ بنیادی طور پر بزنس مین ہیں۔ پیسے پیسے کا حساب رکھتے ہیں۔ سارا چہکی۔

ایک گھنٹہ ہوتا ہی کتنا ہے باتوں باتوں میں پتہ ہی نہ چلا اور جب میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا تو ہم ایل اے پر پرواز کر رہے تھے اور رن وے بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے تھوڑی سی حیرانی تو ہوئی کہ سیٹ بیلٹس کا رسمی اعلان نہیں ہوا لیکن پھر بھی احتیاطاً میں نے سیٹ بیلٹ باندھ لی۔

ابھی سے؟ سارا نے حیرانی ظاہر کی۔

دیکھتی نہیں ہو شہر آ گیا ہے اور رن وے بھی نظر آ رہا ہے۔

''نہ تو شہر آیا ہے اور نہ یہ وہ رن وے ہے جہاں جہاز نے اترنا ہے'' اس نے وضاحت کی۔

مون میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے بولی' یہ لاس اینجلس کے مضافات ہیں۔ یہ شہر شیطان کی آنت کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ابھی بیسمنٹ کا سفر باقی ہے۔ نیچے جو دن وے دیکھ رہے ہو اس قسم کے بیسیوں رن وے شہر میں موجود ہیں جو لوکل آبادی کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ اگر سارے جہاز مرکزی ایئرپورٹ پر اترنے لگیں تو رن وے چوک ہو جائیں اور جہازوں کی اڑان ناممکن ہو جائے گی۔

آخر جب جہاز ایئرپورٹ پر اترا تو ایسے محسوس ہوا جیسے جہازوں کی نمائش لگی ہوئی ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی کمپنیوں کے جہاز کھلونوں کی طرح ہر طرف کھڑے نظر آئے۔ نیویارک اور لاس اینجلس چونکہ مشرق اور مغرب میں ہیں اس لئے شکاگو کی طرح یہاں بھی بہت رش ہوتا ہے۔ مشرق بعید اور یورپ کی بے شمار کمپنیاں یہاں OPERATE کرتی ہیں پھر امریکہ میں خود اس قدر ہوائی کمپنیاں ہیں جن کی گنتی مشکل ہو جاتی ہے۔

L-Shaped ایئرپورٹ بہت بڑا ہے۔ ایئرپورٹ کے دونوں جانب رن وے ہیں۔ ایک ٹرمینل سے دوسرے کا فاصلہ تین میل تک پھیلا ہوا ہے۔

ادھر ہم ٹرمینل سے باہر نکلے تو سامان پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ جہاز سے نکل کر بیگیج سیکشن تک پہنچنے کے وقت کا تعین کیا گیا ہے۔ اسی سرعت کے ساتھ کنویئر بیلٹس سے سامان پہنچتا ہے۔ مسافروں کو ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ نہیں دیکھنا پڑا۔

ایئرپورٹ کے باہر مون کا ڈرائیور انتظار کر رہا تھا۔ امریکہ میں پرائیویٹ ڈرائیور رکھنے کا رواج نہیں

ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس قسم کی عیاشی کے متحمل ہو سکتے یا ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ڈرائیور بھی پارٹ ٹائم ہوتے ہیں۔ اپنی کار پر آتے ہیں اور اپنی ہی کار میں آٹھ گھنٹے کام کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ مالکان سے یوں برتاؤ کرتے ہیں جیسے ملازم نہ ہوں دوست یا مشیر ہوں۔ شوفر نے سامان اٹھا کر ڈگی میں رکھا۔

''اچھا خدا حافظ!'' میں نے سارا سے ہاتھ ملانا چاہا۔

کہنے لگی ''فی الحال تو ہم تمہارے ساتھ ہی بیورلے ہلز جا رہے ہیں۔ وہاں سے رخصتی پر چاہے گلے مل لینا۔''

گلے تو وہ ملتے ہیں جو جگری دوست ہوں یا ایک طویل عرصے کیلئے جدا ہو رہے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا ہے کہ تمہارا بچھڑنے کا کوئی ارادہ ہے! میں نے کہا۔

بولی مجھے تمہاری پریشانی کا بخوبی احساس ہے۔ دوستی اور رقابت میں بال برابر فاصلہ ہوتا ہے۔ لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ مون کے بغیر رہ نہیں سکتی۔

دروغگوئی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے کسی زمانے میں مجھے بھی یہی باتیں کہتی تھیں کیتھی مسکرائی۔

تم بھول رہی ہو ضرور تم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔!

مون کہنے لگی۔ بیورلے ہلز تک اکٹھا چلتے ہیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد ڈرائیور تم دونوں کے گھر چھوڑ آئے گا۔

ایئرپورٹ سے بیورلے لز تک دو گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ شہر کی وسعت کا اندازہ صحیح معنوں میں تو ڈائیو کرنے سے ہی ہوتا ہے۔ لاس اینجلس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تیرہ کاؤنٹیز پر مشتمل یہ ایک ایسا شہر ہے جو اپنے مرکز کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ڈاؤن ٹاؤن سے گزرتے ہوئے بھی ایسا احساس نہیں ہوتا کہ ہم کسی بہت بڑے امریکی شہر کے ڈاؤن ٹاؤن سے گزرتے ہوئے بھی ایسا احساس نہیں ہوتا کہ ہم کسی بہت بڑے امریکی شہر کے ڈاؤن ٹاؤن سے گزر رہے ہیں۔ ہر طرف سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اوپر نیچے دائیں بائیں گاڑیاں ایک دوسرے کو بغیر گھورے یا غرائے کراس کر جاتی ہیں۔ یہ غالباً امریکہ کے معدودے چند

شہروں میں سے ایک ہے۔ جہاں پبلک ٹرانسپورٹ کا موثر انتظام نہیں ہے بسیں خال خال ہیں۔ ٹیوب بھی گویا بادل نخواستہ بنائی گئی ہوں۔ ٹیکسیاں ہیں تو سہی لیکن بہت مہنگی۔ فاصلے اتنے طویل ہیں کہ بل کا تصور کر کے ہی دل دہل جاتا ہے۔ شہر کی آبادی اس کمی کو اس لئے محسوس نہیں کرتی کیونکہ ہر شخص کے پاس اپنی ٹرانسپورٹ ہے۔ یہاں کار کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی محال ہے۔ اگر بدقسمتی سے کسی آدمی کا ڈرائیونگ لائسنس منسوخ یا معطل ہو جائے تو وہ یوں محسوس کرتا ہے گویا اسے جیل ہو گئی ہو۔ ظاہر ہے جب کسی شخص کی نقل و حرکت محدود کر دی جائے تو اس سے بڑی کوفت اور کیا ہو سکتی ہے؟

بیورلے ہلز پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ گئے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انور کی وجہ سے دکانیں شاپنگ سنٹرز اور کمرشل ادارے بند تھے۔ بیورلے ہلز کے متعلق یہ تاثر کہ مکانات اونچی اونچی پہاڑیوں پر ہونگے زائل ہو گیا۔ یہ بھی ایک طرح کی کیپیٹل ہلز واشنگٹن نکلی۔ اونچائی ضرور تھی لیکن سڑکیں اس قدر کشادہ ہموار اور شفاف تھیں کہ کسی پہاڑی پر چڑھنے کا گمان نہ ہوتا تھا۔ میں نے مون سے کہا یہ کیسی پہاڑی ہے جو نہ تو دکھائی دیتی ہے اور نہ اپنی اونچائی کا احساس دلاتی ہے؟

ہنس کر بولی۔ یہ بیورلے ہلز ہے پائیکس پیک نہیں جس پر چڑھنے کے لئے دل دہل جاتے ہیں اور گاڑیوں کی سانس پھول جاتی ہے۔

تو پھر ایسا نام کیوں رکھا گیا ہے؟

اس کا نام دراصل رینکورو ڈیوڈی لاس آ گاس تھا جو انیسویں صدی میں رکھا گیا تھا۔ 1906ء میں جو مکانیت شروع ہوئی تو یہ بیورلے کے نام سے مشہور ہوا۔ 1912ء میں یہاں پہلا ہوٹل بیورلے ہلز ہوٹل بنا۔ اس وقت اس کی آبادی پانچ سو کے قریب تھی۔

یہ فلمی ستاروں کا مسکن کب بنا؟

شروع ہی سے 1919ء میں فلمسٹار میری پیکرڈ ڈنگلس فیربینکس نے یہاں خوبصورت گھر بنایا۔ پھر تو یہ رواج ہو گیا اور ہالی وڈ کے خوبصورت لوگ یہاں خیمہ زن ہونا شروع ہو گئے۔ پہلے فلمی ستارے، پھر پروڈیوسرز اور اس کے بعد بزنس مین اب یہ علاقہ Status Symbol بن گیا ہے۔ جس امیر آدمی کا

یہاں گھر نہ ہو وہ اپنی رہائش کا پتہ اس طرح بتاتا ہے جیسے معذرت کر رہا ہو۔

کس قدر تصنع اور بناوٹ آ گئی ہے ہماری زندگیوں میں؟ میں تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ اسکا اظہار میں پہلے ہی کر چکی ہوں یہاں زمین ہیکٹرز میں نہیں بلکہ فٹوں اور انچوں کے حساب سے بکتی ہے۔ ایک ایکڑ زمین کی قیمت میں اگر کوئی چاہے تو دوسرے علاقوں میں محل کھڑا کر سکتا ہے۔ ویسے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس علاقے سے TWENTH CENTURY FOX STUDIO بھی تھا۔ اداکاروں کیلئے اس وقت نسبتاً آسان تھا کہ گھر سے نکلے اور چند منٹوں کی ڈرائیو کے بعد شوٹنگ کیلئے سٹوڈیو پہنچ گئے۔

کیا اب بھی سکون کی یہی وجہ ہے؟ میں نے پوچھا۔

بولی، نہیں سٹوڈیو کی زمین بہت زیادہ قیمتی ہونے کی وجہ سے کمرشل ہو گئی ہے یہاں اب دکانیں پلازے دفاتر اور فلیٹ بن گئے ہیں۔ یہ علاقہ کتنا بڑا ہے؟

بہت وسیع ہے۔ قریباً چھ مربع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سات خوبصورت پارک ہیں جہاں ہر طرف پھولوں کی مہک ہے۔ سبزے کا وسیع سمندر اور ہرے بھرے درختوں نے چھتریاں سی تان رکھی ہیں۔ شہر شرقاً غرباً تین بلیوارڈز میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سن سیٹ بلیوارڈ کے شمال میں چھوٹی پہاڑیاں ہیں جہاں بیورلے ہلز ہوٹل ہے جس کا پولولاؤنج اور گلابی بنگلے بہت مشہور ہیں۔ آج شام ہم نے وہیں ڈنر کرنا ہے۔ اس کے ساتھ بہت خوبصورت اور قیمتی مکانات ہیں ہمارا گھر بھی اتفاق سے وہیں ہے۔ مغرب میں نسبتاً ہموار زمین ہے وہاں بھی مکانات ہیں۔ سانتا مانیکا بلیوارڈ اور ولشائر بلیوارڈ کے درمیان بوتیک اور ڈیپارٹمنٹل سٹورز ہیں جن میں بہت قیمتی اور مشہور مارکیٹ MOCKMEDITERRANIAN STYLE ہے اس کے علاوہ WIL SHIRE کے جنوب میں LIGHT MANUFACTURIN ہوتی ہے۔

یوں لگتا ہے کہ ساری بوتیک مون کیلئے کھولی گئی ہیں۔ سارا اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔ یہ کیا غضب ہے کہ تم بھی سنگھار کرتی ہو! میں نے مون کی طرف دیکھا۔

کہنے لگی یہ درست ہے کہ مجھے ہر ماہ بیوٹی پارلرز کا لمبا چوڑا بل ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ بناؤ سنگھار میں نہیں کرتی یہ روبی بلی کرتی ہے۔ مون نے سارا کی طرف اشارہ کیا۔ یہ حقیقت ہے! کیتھی کہنے لگی بیوٹی پارلر میں یہ یوں پھسکڑا مار کر بیٹھتی ہے جیسے اسے ہار سنگھار کے بعد سیدھا لوسٹوری کی شوٹنگ کیلئے سٹوڈیو جانا ہے۔ ایکسٹرا عورتیں اسے ٹکر ٹکر دیکھتی ہیں۔

ہیروئنیں! سارا نے اسے گھورا۔ یہاں بھی ڈنڈی مارنے سے نہیں چوکیں۔

کار نے آخری موڑ کاٹا اور بیورلے ہلز ہوٹل کے سامنے سے گزرتی ہوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر رک گئی۔ ڈرائیور نے ریموٹ کنٹرول دبایا تو مکان کا بڑا منقش سٹیل گیٹ ایک دلآویز موسیقی کے ساتھ کھل گیا سامنے مون کا گھر تھا۔

یہ موسیقی بڑی روح پرور ہے میں نے پہلے بھی کہیں سنی ہے۔

یہ ایک بہت پرانی فلم COME SEPTEMBER کی ہے۔ مون کہنے لگی۔ یہی ہالی وڈ کی خوبی ہے ہر گھر میں کوئی نہ کوئی جدت کسی نہ کسی رنگ میں تنوع اور اختراع پیدا کیا گیا ہے۔

گھر کا لان بہت بڑا تھا۔ مکان خاصا پیچھے تھا۔ لان کے چاروں طرف اور درمیان میں خوبصورت پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ رنگ برنگے گلاب' ٹیولپ اور نرگس سبزے کی بیک گراؤنڈ میں یوں لگ رہے تھے جیسے ہر طرف تتلیاں اڑ رہی ہوں۔ سبز لان بذات خود بہت دلفریب تھا۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے کسی ماہ انجینئر نے پرکار سے اسے تراشا ہے۔ لان کے غربی جانب سفید اور سیاہ پتھروں سے ایک چھوٹی سی پہاڑی بنائی گئی تھی جس کے اندر فوارہ لگا تھا۔ پانی کی اٹھان اس قدر تھی کہ اکثر یوکلپٹس اور پائین کے درختوں سے بھی اوپر چلا جاتا۔ لان کے کناروں پر درخت لگائے گئے تھے۔ جو زیادہ تو نہیں تھے لیکن ان میں سمڑی تھی۔ ان کی اونچائی ایک جیسی تھی۔ درمیانی فاصلے یکساں تھے۔ مکان کے بائیں جانب سیبوں اور سٹرس کے درخت تھے۔ سیب کے پیڑ میں شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ نرم' سفید' ہلکا گلابی رنگ لئے ہوئے ان کی خوشبو نے تمام فضا کو مشکبار کر رکھا تھا۔

مکان دو منزلہ تھا۔ دیواریں نفیس باریک اینٹوں سے چنی گئی تھیں۔ سیمنٹ کا پلستر کہیں بھی نہ

تھوپا گیا تھا۔ مرکزی دروازہ برماٹیک کا بنا ہوا تھا۔ جس پر پرانی طرز کی مینا کاری کی گئی تھی گمان ہوتا تھا کہ یہ دروازہ خاصا پرانا ہے۔ جو مکان کے ساتھ نہیں بنا تھا بلکہ کسی انٹیک شاپ سے خریدا گیا۔ امریکن پرانی چیزوں کے شیدائی ہیں۔ ہر چند کہ ان کی اپنی تاریخ کچھ اتنی پرانی نہیں لیکن تاریخ کا ادراک رکھتے ہیں۔

ڈرائیور نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور ڈگی کھول کر ہمارا سامان باہر نکالا۔ مون نے باہر نکل کر کالی بیل بجائی تو چند منٹ کے بعد منقش چوبی دروازہ کھلا سامنے ایک نہایت خوبصورت اور باوقار عورت کھڑی تھی۔ مون دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اچانک الگ ہو کر بولی۔ سوی شاہ! میں تو تعارف کرانا ہی بھول گئی یہ میری.....!

یہ تمہاری بڑی بہن ہیں۔ مون کی بات کو میں نے بیچ میں کاٹ دیا اس پر ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا۔

مام! شاہ کی باتوں پر نہ جانا' اسے لوگوں کو شیشے میں اتارنے کا فن خوب آتا ہے۔ مون کے لہجے میں بلا کی شوخی تھی۔

تو اس میں مبالغہ آرائی کی کون سی بات ہے۔ اس کی ممی بھی اسی زندہ دلی سے بولیں میں تمہاری بڑی بہن ہی تو لگتی ہوں۔

مون ایک بار پھر شدت جذبات سے ان کے ساتھ لپٹ گئی یو آر ویری سویٹ مام I AM PROUD OF YO۔

میرا اصل فخر تو میری بانہوں میں ہے۔ وہ مون کے خوبصورت ریشمی بالوں کو چومتے ہوئے بولیں۔

آج اگر کوئی چیز مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے تو وہ تمہاری چاہت ہے۔

ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ مون بھی آبدیدہ ہو گئی۔ بڑا عجیب منظر تھا۔ اگر سچائی کو لمحات میں قید کیا جا سکتا ہے تو شاید وہاں رک جاتی۔ مکر و فریب' ریاکاری اور نفسا نفسی کی دنیا میں ایسے لمحات کب میسر ہوتے ہیں؟ کافی دیر وہ ایک دوسرے سے بغلگیر رہیں۔ کافی دیر ماحول میں سکوت رہا حتیٰ کہ سارا بھی جو جملہ بازی سے کبھی نہ چوکتی تھی سحر زدہ لگتی تھی۔ مون کی ممی کہنے لگیں تمہارا غائبانہ تعارف اس قدر ہو چکا ہے کہ اب مزید تعارف کی ضرورت نہیں رہی۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب مون نے فون پر تمہارا ذکر نہ

کیا ہو۔ ویگاس میں کبھی کسی شخص سے یہ اس قدر ایمپریس نہیں ہوئی۔ کہو کیسا لگا وہ شہر خرابات؟''

''شہر خوبصورت ہے اُس پر کہانی بھی اچھی لکھی جا سکتی ہے لیکن اس میں رنگ مون نے ہی بھرا ہے۔''

''اور ہمارے متعلق کیا خیال ہے؟'' سارا کی شوخی عود کر آئی۔''

''اور تم نے رنگ میں بھنگ ڈالی ہے!'' کیتھی بولی۔

''تم لوگوں کی نوک جھونک اب بھی جاری ہے؟'' مون کی مام مسکرائیں۔

مون کہنے لگی ''مام بھوک چمک اٹھی ہے آپ لنچ لگوائیں میں شاہ کو مکان دکھاتی ہوں۔''

مکان کیا تھا، اندر سے چھوٹا موٹا محل لگتا تھا۔ سارے گھر میں ٹیک پینلنگ کی گئی تھی۔ فرش بھی چوبی تھے۔ لاؤنج، ڈرائنگ روم کی نسبت بہت برا تھا۔ یہ غالباً بیور لے ہلز کی ضرورت تھی۔ جہاں آئے روز پارٹیاں ہوں، حسن اور فیشن کی پریڈ ہو وہاں وسیع و عریض ہال میں ہی اہتمام ہو سکتا ہے۔ لاؤنج میں سو کے قریب لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ دیواروں کی خوبصورت پینٹنگز سے سجایا گیا تھا۔ پکاسو، وان گوگ، لینارڈو، ڈی ونچی۔ مون ہر تصویر کی خوبیوں اور آرٹسٹک ویلیو کے متعلق بھی بتاتی جاتی۔ یہ سب تصویریں اس کے مرحوم ڈیڈی نے مختلف اوقات میں نیلامی میں خریدی تھیں۔ میرے استفسار پر جب افس نے قیمتیں بتائیں تو مجھے ایک چکر سا آیا۔ وہ ناقابل یقین حد تک مہنگی تھیں۔ ایک ایک تصویر سے ایک ایک مکان بن سکتا تھا۔ چوبی فرش کی وجہ سے وال ٹو وال کارپٹ نہیں بچھائے گئے تھے بلکہ مناسب فاصلوں پر ایرانی قالینڈالے گئے تھے۔ کوئی بھی قالین سو سال سے کم پرانا نہیں تھا۔ ایرانی قالین کی یہی خوبی ہے کہ وقت کے ساتھ پرانا نہیں ہوتا بلکہ اس کا حسن کچھ زیادہ ہی بکھرتا ہے۔ شینڈ لیرز اور کرسٹل خاص طور پر پولینڈ اور اٹلی سے منگوائے گئے تھے۔ مکان چھ بیڈ رومز پر مشتمل تھا۔ ہر بیڈ روم کے ساتھ ملحقہ ڈریسنگ روم اور باتھ تھا۔ باتھ روم میں واش بیسن کی ٹونٹیاں گولڈ پلیٹڈ تھیں۔ سنہری فریم والے پلنگ بہت کشادہ تھے۔ تکیوں میں روئی کی جگہ پرندوں کے پر ڈالے گئے تھے۔ ٹیبل لیمپ اٹلی کے سفید سنگِ مرمر کے بنے ہوئے تھے۔ ٹی وی سکرین کیتھی کے قد کے برابر تھی۔ ہر کمرے میں وی سی آر اور اکائی کے میوزک ڈیک تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر

فرانس کے بہترین کلون اور پرفیومز رکھی گ ءیں تھیں۔ مردانہ اور زنانہ! پتہ نہیں ی اہل مغرب کو خوشبوؤں کی تخصیص کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیونکہ جب چاہت اور سرعت کے ساتھ یہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں اس میں کوئی خوشبو مردانہ یا زنانہ نہیں رہتی بلکہ گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ الزبتھ ٹیلر کی خوشبو چرڈ برٹن کے جسم میں سما جاتی ہے اور رچرڈ کی Fragrance Masculane لڑکے لوچ دار بدن میں سرایت کر جیتی ہے۔ کمروں میں بڑے بڑے فلاورواز تھے جن میں تیزہ پھول بڑے سلیقے سے سجائے گئے تھے۔ بالائی منزل کا ٹیرس بھی قریباً آدھے مکان کے برابر تھا۔ ٹیرس میں خوبصورت بید سے بنی ہوئی رنگ برنگی کرسیاں پڑی تھیں۔ ٹیرس پر کھڑے ہو کر سارے بیورلے ہلز کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ سبزے کے سمندر میں گھرے ہوئے گلابی گھر بڑے دلکش لگ رہے تھے۔ امیر لوگ کیوں مقناطیس کی طرح کھنچے چلے آتے ہیں؟ اس کا اندازہ یہاں کچھ دن ٹھہر کر ہی ہو سکتا ہے۔ ایک ایسا علاقہ جہاں غربت و افلاس کا داخلہ ممنوع ہو، جہاں صرف رنگ، روشنی اور رونقیں ہوں۔

ہم مکان کا معائنہ کر کے نیچے آئے تو ڈائنگ ٹیبل پر کھانا لگ چکا تھا۔ بڑا سادا سا کھانا تھا۔ کلیئر سوپ، چکن پیس سینڈوچ فش، پوٹے ٹو، ابلی ہوئی سبزیاں اور ہر قسم کے پھل..... یہ لوگ صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہماری طرح محض نمائش کی خاطر گوشت چربی اور گھی میں تلی ہوئی ڈشوں کے ڈھیر نہیں لگاتے۔ کھانا کھاتے کھاتے دن کے تین بج گئے۔ مون کی ممی نے کسی پارٹی میں جانا تھا اس لئے پروگرام بنا کہ چند گھنٹے پارک میں گزارے جائیں اور رات کو بیورلے ہلز ہوٹل میں کھانا کھایا جائے۔ وہ پارٹی کے بعد ہمیں وہیں ہوٹل میں جوائن کر لیں گی..... پارک مون کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بیورلے ہلز کے چھ پارک اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ہر آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ زیادہ لوگ وہاں نہیں جاتے..... اُس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جہاں ہر گھر میں پارک نما بڑے بڑے لان ہوں اور جہاں زندگی ایک مشین کی طرح گزرتی ہو وہاں سیر سپاٹے جیسی فضول چیز کا کب کسی کو خیال آتا ہے۔ اکثر لوگ سوچتے ہوں گے کہ اگر ان امیر لوگوں کو پارکس میں سیر نہیں کرنی تھی تو پھر وہ بنائے ہی کیوں جاتے ہیں۔ امیر لوگوں کے گھر میں ایک ریڈنگ روم ہوتا ہے جس کے خوبصورت ریکس میں رکھی ہوئی دنیا کے ہر قابل

ذکر مصنف کی کتابیں ہوتی ہیں جنہیں پڑھا نہیں جاتا بلکہ محض ساگوان سے بنے ہوئے شیلفس میں سجایا جاتا ہے۔ کیونکہ نام نمود کے بھوکے لوگ یہ تاثر نہیں دینا چاہتے کہ انہیں ادب اور ارٹ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

پارک میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ کچھ بوڑھے جوڑے جو غالباً عمر رفتہ کو آواز دینے چلے آئے تھے۔ کچھ آیائیں جو بچوں کو پریم میں ڈالے آپس میں خش گپیاں کر رہی تھیں..... ہم نے پارک کے تین چکر لگائے اور پھر پائن کے سائے میں رکھے ہوئے بینچ پر بیٹھ گئے۔ مون کہنے لگی ''شاہ اگر تھک گئے ہو تو کوک منگواؤں؟''

''مجھ سے زیادہ اِسے ضرورت ہے!'' میں نے سارا کی طرف اشارہ کیا۔ ''دیکھتی نہیں ہو اس کی سانس پھول گئی ہے۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہے اور خوبصورت رگیں تن گئی ہیں۔''

''اس آخری جملے کو پھر سے دہراؤ'' سارا نے گھاس پر لیٹتے ہوئے کہا۔

''تم واقعی اپنا چیک اپ کیوں نہیں کراتیں'' کیتھی چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولی۔ ''چند قدم چل کر ہی تم شرابیوں کی طرح لڑکھڑانے لگتی ہو۔''

''افسے تم چند قدم کہتی ہو!'' سارا نے اُسے گھورا۔ ''ہم تین میل چل چکے ہیں۔ باتوں باتوں میں پتہ نہیں چل سکا۔''

''تو تین میل کون سے زیادہ ہوتے ہیں!'' کیتھی اُسے زچ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

''لگتا ہے تمہارے خاندان میں ضرور کوئی میراتھن رنر رہا ہے۔''

مون کوکا کولا اور چپس لے آئی۔ کوک پی کر ہم تازہ دم ہو گئے۔ چپس بھی بڑے مزیدار تھے۔ وہی ایک جیسے آلو ہیں۔ چینی اور پانی بھی ایک طرح کا ہے اپنے ملک میں ان کی کوئی قدر نہیں ہے لیکن یہی چیز جب ایک خاص ترکیب سے بن کر غریب ملکوں میں پہنچتی ہیں تو لوگ انہیں بڑی رغبت سے کھاتے ہیں اور کئی گنا مہنگے داموں پر بکتی ہیں..... امریکہ سپر پاور تو ہے ہی اب کلچرل سپر پاور بھی بنتا جا رہا ہے۔ اور یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ جب قومیں اپنا تشخص کھو کر اوروں کے رنگ میں رنگ جاتی ہیں تو پھر اپنی شناخت بھی کھو بیٹھتی ہیں۔ مشروبات، ماکولات، موسیقی، لباس بلکہ اب تو سوچ بھی امریکی ہو گئی ہے۔

O

رات کو ڈنر کے لئے ہم بیورلے ہلز ہوٹل پہنچے ہی تھے کہ مون کی مام مسز رابسن آ گئیں۔ ہوٹل ہر چند کہ کافی پرانا ہے لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ OLD IS GOLD، اس کی نوک پلک کو جس خوبصورتی سے سنوارا گیا ہے اور اولڈ ماڈرن کا جو حسین امتزاج پیدا کیا گیا ہے وہ دیدنی ہے۔ ویٹرز کی بے داغ اور بغیر سلوٹ کے وردیاں اور ان کے لب و لہجے سے گمان ہوتا ہے جیسے یہ کسی اُجڑی ریاست کے نواب ہوں جنہیں غدر کے بعد کے مغل شہزادوں کی طرح گردش روزگار یہاں کھینچ لائی ہے۔ سلور کٹلری، روزن تھال کی کراکری اور CARVED فرنیچر ہوٹل کے معیار اور نفاست کے آئینہ دار تھے۔ ظاہر ہے جہاں گلیمر ورلڈ کے مشہور لوگ آتے ہوں وہاں خصوصی اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

کھانا مزیدار تھا لیکن افس سے بھی زیادہ اہم چیز سروس تھی۔ ویٹر نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے آتے اور ڈش سے پلیٹوں میں یوں کھانا ڈالتے جیسے صرف ہمارے لئے بنایا گیا تھا۔ وہ بیورلے ہلز کے مکینوں کو نہ صرف نام سے جانتے تھے بلکہ اُن کے ٹیسٹ، مزاج اور عادات و اطوار سے بھی آشنا لگتے تھے۔ سنجیدہ لوگوں کو وہ بڑی متانت سے سرو کر رہے تھے۔ نوجوانوں کے ساتھ ہلکا پھلکا مزاح بھی کر لیتے۔ ڈائننگ ہال کے جنوبی کونے میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ ایک نیگرو لڑکی اپنی سریلی آواز میں گا رہی تھی۔ ہر گانے کے بعد وہ داد طلب نگاہوں سے سامعین کو دیکھتی جو سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ اظہار پسندیدگی کرتے..... اس کے ساتھ ساتھ فرمائشوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ خصوصاً نوجوان لڑکے اور لڑکیاں چٹ پر اپنے پسندیدہ گانوں کی فرمائش لکھ کر اُسے بھیجتے۔ وہ پڑھ کر متبسم نظروں سے اُنہیں دیکھتی اور پھر گانا شروع کر دیتی..... جس آسانی کے ساتھ وہ گا رہی تھی اُس سے حیرانی ہوتی۔ وطن عزیز کے گویوں کی طرح نہ تو افس کی رگیں تنتی تھیں نہ چہرے پر رنج و الم کی لہریں اُبھرتیں اور نہ پیشانی پر اَن گنت بل پڑتے۔ جنہیں گاتے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تشنج کی کیفیت میں ہوں یا پل صراط پر سے گزر رہے ہوں۔

کھانا کھا کر ہم ڈانسنگ ہال میں آ گئے۔ یہاں صرف موسیقی تھی، سنگر کوئی نہ تھا۔ شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جب اعضاء کی شاعری ہو رہی ہو تو پھر گانے کے میٹھے بول بھی ہیچ لگتے ہیں۔ ساز کی

لے تیز تھی۔ چوبی فلور پر نوجوان جوڑے تھرک رہے تھے۔ جہایت متناسب جسم، بن پیئے ہی مخمور، آنکھوں ہی آنکھوں میں سندیسے، کہانیاں اور یاددہانیاں، چاہت اور خودسپردگی کا عالم..... جوانی ایسی چیز ہے! کسی نیک روحانی ہستی نے کہا تھا "اگر خریدی جاسکتی تو شاید میں بھی اس جنس نایاب کو خرید لیتا!"

"آؤ، شاہ ڈانس کریں!" سارا کہنے لگی "مون اور تم پارٹنر بن جاؤ!"

"اور تم یا کروگی؟"

کہنے لگی، "ایک ابروچشم کے ہلنے پر یہ ہالی وڈ کے دِل پھینک لوگ میرے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگیں گے!"

"بڑا اعتماد ہے تمہیں اپنے آپ پر؟"

بولی، "مردوں کی اوقات ہی کیا ہے! ذرا سا پھول یا کلی دیکھ لیں تو دیوانہ وار لپکتے ہیں!"

"لیکن اُس کے لئے پھول کا ہونا ضروری ہے" میں نے اُسے چھیڑا۔

"تو میں تمہیں کیا نظر آتی ہوں؟" اُس نے خشمگیں نظروں سے مجھے گھورا۔

"پھول کی بھول!" کیتھی کچھ کہے بن رہ نہ سکی۔

"میں ڈانس نہیں کرتا!" میں نے وضاحت کی۔

"لیکن کیوں؟" وہ تینوں بیک وقت بول پڑیں۔

"عادت نہیں ہے!"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ آتا نہیں ہے!" سارا نے بدلہ لینے کی کوشش کی۔

"بس یوں ہی سمجھ لو!" میں نے بات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔

سارا نے سچ ہی کہا تھا۔ وہ اور کیتھی ڈانسنگ فلور پر آئیں تو کئی لوگ اُن کی طرف آئے اور ڈانس کی آفر کی۔ دونوں نے اپنی اپنی پسند کے پارٹنر چنے اور ڈانس کرنے لگیں۔

"تم انہیں جائن کیوں نہیں کرتیں؟" میں نے سے پوچھا۔

بولی، "جی نہیں چاہ رہا!"

''تو کیا کیا جائے؟''

''باتیں! آج بہت سی باتیں کرنے کو دل کرتا ہے!''

''اس ماحول میں آدمی کیا بات کر سکتا ہے؟ جب ہر طرف ہاؤ ہو، ہو۔ موسیقی کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔''

جب ہم گھر پہنچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کیتھی اور سارا نے اجازت چاہی تو مون کہنے لگی اب اس وقت جانا مناسب نہیں ہوگا بہتر ہے کہ رات کو یہیں رک جاؤ کل ڈزنی لینڈ جائیں گے اور واپسی پر میں تمہیں اپنے اپنے گھر اتار دوں گی!''

مون درست کہہ رہی ہے تم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرو میں کافی بنا لیتی ہوں۔

مسز رابسن اُٹھ کر ڈائننگ روم میں چلی گئیں۔ ہم ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہم خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ کافی آ گئی۔

''کیا شہر پسند آیا ہے؟'' مون کی مام نے مجھے پوچھا۔ ''بہت مشہور شہر ہے۔ موسم بہت اچھا ہے لیکن ہر طرف چھائی ہوئی سموگ (SMOG) نے اس کے حسن کو گہنا دیا ہے۔

بولیں ''نیویارک کے بعد یہ امریکہ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ لیکن پھیلاؤ کے لحاظ سے غالباً دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ جب آدمی سوچتا ہے کہ اس کی حدود اربعہ 464 مربع میل تک پھیلا ہوا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کے مغرب میں سین جبریل کے پہاڑ ہیں اور مشرق میں بحرالکاہل کی کوسٹ لائن ہے۔ سارے شہر میں ڈرامائی انداز میں بنائے گئے فری ویز کا جال بچھا ہوا ہے۔''

میں نے کہا ''اس شہر کو غالباً اتنا دیکھا نہیں جتنا اس کے متعلق پڑھا ہے۔ دنیا میں عام آدمی تو اس کا تصور کر کے ہی خواب آور کیفیت میں ڈوب جاتا ہے۔ ہالی وڈ جہاں دنیا کا حسن اور گلیمر جمع ہو گیا ہے۔ یونیورسل سٹوڈیو جہاں جزو میں کل دکھاتے ہیں اور قطروں میں قلزموں کا سماں پیدا کیا جاتا ہے۔ ڈزنی لینڈ جہاں جا کر اسی سالہ لوگ بھی بچے بن جاتے ہیں۔ سانتا مانیکا اور لانگ بیچ۔ ہزاروں ایکڑ پر پھیلے ہوئے پارک، تیل کے چشمے، ساحل سمندر، سیب، سنگترے، انناس، واٹر ملین، سنہری دھوپ اور سنہری

خوابوں کی سرزمین! لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے مخالفین نے بھی طنز کی آخری حدوں کو چھولیا ہے!''

''وہ کیا کہتے ہیں؟'' اُن کا تجسس بڑھنے لگا۔

''کوئی ایسی دشنام نہیں ہے جو انہوں نے نذرِ شہر نہ کی ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ انیس مضافات اپنے مرکز کی تلاش میں سرگرداں ہیں، تو کوئی اسے ایسا سرکس قرار دیتا ہے جس کا خیمہ نہ ہو۔ ایک ایسی جگہ جو شہر کم اور ایک نہ ختم ہونے والی کنونشن زیادہ ہو۔ فرینک لائیڈ نے کہا تھا کہ اگر امریکہ کو کناروں سے پکڑ کر اُٹھایا جائے تو ہر ڈھیلی چیز لاس اینجلس میں آگرے گی۔''

''میرے خوبصورت شہر کی اس قدر بے عزتی! اگر یہ شخص میرا واقف ہوتا تو ہمیشہ کے لئے ترکِ تعلق کر لیتی!'' سارا نے شہر کا دفاع کیا۔

''ترکِ تعلق تو تمہاری پرانی عادت ہے۔ کتنے ہی دوستوں سے منہ موڑ چکی ہو!'' کیتھی نے پھر اُس کو چھیڑا۔

میں نے کہا ''ابھی تم نے سنا ہی کیا ہے۔ اگر تم ویسٹ بروک پیگلر (WEST BROOK PEGLER) کے خیالات اُس کی زبانی سن لیتیں تو شاید اُسے گولی مار دیتیں!''

''اُس نے بھی ضرور کوئی خرافات بکی ہوگی!''

''بے شک!..... وہ ایل اے کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے۔ ''امریکہ کی بہتری اِسی میں ہے کہ وہ اس بے ربط، بے جوڑ، بے ہنگم پھیلے ہوئے اور رالیں ٹپکاتے ہوئے شہری فاتر العقل کو کسی کی تحویل میں دے دے۔ فاتر العقل لوگوں کو گارڈین کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''قطع نظر اس کے کہ پیگلر اِس شہر کے لوگوں سے ذاتی پرخاش رکھتا تھا ہم میں تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہئے۔'' مون کی مام سارا کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔

''جہاں اس شہر میں بے شمار خوبیاں ہیں وہاں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ کارخانوں کی وجہ سے اس کی فضا گرد آلود ہوگئی ہے۔ بندرگاہیں آلودہ ہو چکی ہیں۔ شاہراہیں ٹریفک کی وجہ سے اکثر جام رہتی ہیں۔ سکولوں میں بچے زیادہ ہیں اور کمرے کم! یہاں صرف بیورلے ہلز اور ہالی وڈ ہی نہیں ہیں بلکہ

Ghettos اور غلیظ علاقے بھی ہیں جہاں سیاہ فام لوگ جانوروں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ بجٹ کم ہے اور ضروریات بہت زیادہ ہیں!''

''لیکن تم نے یہ ساری باتیں کہاں پڑھی ہیں؟'' سارا حیرت زدہ لگتی تھی۔

''شاہ صرف کتابیں ہی نہیں چہرے پڑھنے کا بھی ماہر ہے!'' مون کہنے لگی۔

''اچھا! تو بتاؤ میرے چہرے پر کیا لکھا ہے؟'' سارا اپنا چہرہ ہتھیلیوں پر رکھتے ہوئے میرے قریب آ گئی''۔

''اس پر کوئی تحریر نہیں لکھی۔ تمہارے دماغ کی طرح تمہارا چہرہ بھی کورا کاغذ لگتا ہے''؟ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تو پھر مون کا چہرہ پڑھ دو۔ اسے پڑھنے میں تو تم نے کافی ریاضت کی ہوگی!'' اس نے بزعم خود میری دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''تمہیں کیوں بتاؤں! وہ تو میں مون کو ہی بتاؤں گا!''

''بھلا کب؟''

''جب مناسب سمجھوں گا''۔

''دراصل بڑے لوگوں کی طرح بڑے شہروں کے بھی دشمن بے شمار ہوتے ہیں'' مسز رابسن نے وضاحت کی۔ ''ایک وقت تھا کہ اسے دنیا میں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اس کا موجودہ نام بھی کافی دیر بعد تجویز کیا گیا''۔

''اس کا اصل نام کیا تھا!'' میں نے پوچھا۔

بولیں ''1781ء میں ہسپانوی آبادکاروں نے اس کا نام EL PUEBLO DE LA REYNA DE LOS ANGELE رکھا جس کے لغوی معنی فرشتوں کی ملکہ کا شہر ہے''۔

1846ء کی جنگ میکسیکو میں امریکہ نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اس پر قبضہ کر لیا تھا''۔

''اپنے خون کا قطرہ بہائے بغیر؟'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ قدرے حیران ہو کر بولیں۔

''امریکی صرف اسے خون سمجھتے ہیں جو ان کا اپنا ہو اور ان کے جسم سے بہے' نہیں تو خونریزی پر اس قدر پریشان نہیں ہوتے!''۔

''بولیں ''خون خون ہوتا ہے اور نسل آدم کے حوالے سے اس کی قدر و قیمت بھی ایک جیسی ہونی چاہیے''۔

''ہاں تو آپ لاس اینجلس کے متعلق بتا رہی تھیں۔ درمیان میں پتہ نہیں یہ جملہ معترضہ کیسے آ گیا!''

''تنقید بھی جمہوری روایات کا حصہ ہے۔ جو قومیں اپنے اندر برداشت کا مادہ نہیں رکھتیں وہ ترقی نہیں کر سکتیں!'' وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولیں ''ہاں تو میں تمہیں ایل اے کے متعلق بتا رہی تھی۔ جس تیزی اور سرعت کے ساتھ اس نے ترقی کی ہے دیگر کسی شہر کو نصیب نہیں ہوئی۔ 1849ء میں سونے کی دریافت نے ریاست کا سویا مقدر جگا دیا۔ ریلوے کمپنیوں کی جنگ نے کرائے حیران کن حد تک گھٹا دیئے اور بندرگاہ کی تعمیر و ترقی سے بھی شہر کی شہرت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ 1880ء سے 1890ء تک کے درمیانی عرصے میں اس کی آبادی چار گنا زیادہ ہو گئی اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اس کا رقبہ تین سو فیصد بڑھ گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے شہر کو پہیے لگ گئے ہیں اور امریکہ کی ہر شاہراہ لاس اینجلس کو جا رہی ہو۔ آبادی اس قدر بڑھی کہ لوگوں کو گھر اور ٹرانسپورٹ مہیا کرنے کے لئے زرعی زمین کا ایک تہائی حصہ وقف کرنا پڑا''.....

''کیا ریاست کا دارومدار صرف زراعت پر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب بزنس زراعت کو بیک گراؤنڈ میں لے گئی ہے۔ سیاحت' بینکاری' انشورنس' جہاز سازی' دوائیں' گلاس' ربڑ' سیمنٹ' الیکٹرانکس' فوڈ اور ان سب سے بڑھ کر پٹرولیم انڈسٹری اس شہر کی شناخت ہیں!''۔

''مون نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے تیل کے کنویں ہیں۔ کیا ان پر ریاست کا تسلط نہیں

ہے؟''

''بالکل نہیں۔ ریاست صرف پالیسی مرتب کرتی ہے اور انکم ٹیکس وصول کرتی ہے۔ عرب ممالک کی طرح ساری آمدن شیوخ کی تجوریوں میں منتقل نہیں ہوتی۔ یہاں تیل کے ہزاروں کنویں ہیں جو مختلف افراد کی ملکیت ہیں۔ کسی کے اگر چار سو ہیں تو بعض ایسے ایسے بھی ہیں جن کے پاس صرف چار ہوں گے۔ ہر آدمی اپنا تیل خود نکالتا ہے اور پھر اسے مختلف آئل کمپنیوں کو فروخت کر دیتا ہے''۔

''کیا ریاست کے اصل باشندے نقل مکانی کر کے یہاں آنے والوں کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتے؟''

''یہاں لوگوں کی آمدورفت اس قدر زیادہ ہے کہ ریاستی تعصب نہیں پھیل سکتا۔ ہسپانوی اور چینی باشندے تھوڑی بہت ناک بھوں ضرور چڑھاتے ہیں لیکن کوئی پروا نہیں کرتا''۔

''بڑی حیران کن بات ہے'' میں نے کہا ''دنیا میں اسے الف لیلوی شہر تصور کیا جاتا ہے۔ ہارون رشید کے بغداد کی طرح' جہاں فلمی پریاں اور پری زاد بستے ہیں' جن کے کنج لب سے صحبتیں آغاز کرتی ہیں اور جن کی حسین زلفوں سے شوخ شامیں مشکبار ہوتی ہیں!''۔

''یہ تاثر بھی کافی حد تک درست ہے۔ اٹلی کی خوبصورت جینا لولو بریجڈا ہو یا فرانس کی نرم و نازک صوفیہ لارین' شہرت صرف یہاں آ کر ہی نصیب ہوتی ہے۔ یہاں کے صنم خانے جب مہربان ہوتے ہیں تو گمنام لوگوں کو بام عروج تک پہنچا دیتے ہیں۔ دولت اور عزت کی ایسی دنیا جہاں ان کے لئے اپنی شناخت بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ شین کونری ایک معمولی ٹرک ڈرائیور تھا۔ کسی فلمی ڈائریکٹر کی نظر پڑی تو کلھ سے لکھ پتی ہو گیا۔ سڑکوں پر رینگتی ہوئی اور ڈیزل کے دھویں میں لتھڑی ہوئی قسمت کو پر لگ گئے اور لوگ اس کی ایک ایک جھلک کو ترسنے لگے.....''

''مون کہتی ہے آپ کو بھی فلم میں کام کرنے کی کئی آفرز ہوئیں لیکن سازگار ماحول کے باوجود آپ نے انہیں قبول نہ کیا؟''۔

''اس کی محبت نے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں!'' انہوں نے ممتا بھری نظروں

سے مون کو دیکھا۔ ''میں اسے آیاؤں کے سپرد نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں کے فلمی لوگوں کی زندگیاں اس قدر مصروف ہیں کہ انہیں آس پاس کا ہوش نہیں ہوتا۔ ساری رات شوٹنگ کی اور تمام دن سو کر گزارا۔ جب یہ سکول سے واپس آ کر بستہ صوفے پر پھینک کر دوڑتی ہوئی مجھ سے لپٹتی تھی تو مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے میں شہرت کے ساتویں آسمان پر پہنچ گئی ہوں۔ زندگی میں بعض ایسے فیصلے ہوتے ہیں جو انسان کو بہر طور اپنے لئے خود کرنا پڑتے ہیں۔ مجھے آج تک اس فیصلے پر فخر ہے کبھی تاسف نہیں ہوا''۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں تھیں مون بھی ایک عجیب سے سحر میں گرفتار تھی۔

''لیکن شہر کا نقشہ عجیب ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کسی کاغذ کو چرمر کر دیا گیا ہو!'' میں نے انہیں اس ماحول سے باہر نکالنے کی شعوری کوشش کی۔

بولیں ''جب شہر بہت بڑا ہو تو پھر تنقید بھی اسی تناسب سے ہوتی ہے۔ کل مون تمہیں وینتورا بلیوارد VENTURA BOLEVARD دکھائے گی۔ سترہ میل لمبا بازار۔ خوبصورت دکانیں ان گنت ریسٹورنٹ جہاں دنیا جہان کے کھانے ملتے ہیں۔ بے شمار بینک' شاپنگ ہال' میڈیکل سٹورز' کاروں کی ایجنسیاں' پراپرٹی ڈیلرز' فرانسیسی مصنف ڈپلومیٹ رومین گیری (ROMAIN GARY) نے کہا تھا ''دنیا میں ایسی گلی کہاں دیکھنے کو ملے گی!''

میں نے کہا ''مون پہلے ہی مجھے بہت کچھ دکھا چکی ہے سمجھ نہیں آتی کیسے اظہار کروں!''

''کچھ بھی نہ کہو!'' وہ مسکرائی ''جو کہنا ہے بس لکھ دینا''۔

''لیکن تم پڑھو گی کیسے؟ زبان مختلف ہو گی'' سارا نے پوچھا۔

''جو کچھ اس نے لکھنا ہے وہ میں پڑھ چکی ہوں جذبوں کی اپنی زبان ہوتی ہے!''

''اس اعتبار سے تو سارا بالکل ان پڑھ ہے جذبات سے یکسر عاری'' کیتھی نے لمبی خاموشی کا سکوت توڑا۔

''تم نے ہر معاملے میں ٹانگ ضرور اڑانی ہوتی ہے!'' سارا نے اسے ڈانٹا۔

''جب تم اوٹ پٹانگ باتیں کرو گی تو جواب بھی ایسے ہی ملے گا''۔

باتیں کرتے کرتے کافی دیر ہوگئی۔ مسز رابسن گھڑی دیکھتے ہوئے بولیں رات کے بارہ بج گئے ہیں۔ شاہ تھکا ہوگا' اسے ریسٹ کرنے دو!''

''جو شخص بارہ ہزار میل کا سفر کر کے آیا ہو وہ بارہ بجے کہاں تھکتا ہے!'' سارا کا اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

''بارہ ہزار میل کا سفر کونسا پیدل کیا ہے'' مون مسکرائی۔

''ایئر ہوسٹسوں سے گپ شپ کرتے وقت گزر گیا ہوگا''۔

''میں سیدھا یہاں نہیں پہنچا۔ اس طویل سفر میں چودہ مرتبہ میں نے جہاز بدلا ہے اور آٹھ ممالک میں قیام کیا ہے!''

''انٹرسٹنگ It is almost an odeyssey'' مون کی مام نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا ''یہاں آنے سے پہلے کہاں کہاں گئے تھے؟''

''دبئی' ہالینڈ' سوئٹزرلینڈ' انگلینڈ' جرمنی' ناروے' سویڈن اور مانٹی کارلو' کینز' نیس وغیرہ''۔

''میں نے ناروے کی بڑی تعریف سنی ہے۔ اتفاق سے میں وہاں نہیں جا سکی'' مون پوچھنے لگی۔

''اوسلو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ چھوٹا سا صاف ستھرا خوبصورت شہر جس کے اندر سمندر ہے۔ پہاڑ ہیں' سبزہ ہے' دولت کی ریل پیل ہے۔ فی کس آمدنی کے اعتبار سے یہ دنیا کے امیر ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے''۔

''لیکن سورج بہت کم نکلتا ہے۔ گولڈن سن شائن نہیں ہوتی''۔

''جب لوگوں کے مقدر کا آفتاب نصف النہار پر ہو تو پھر موسم کی کون پروا کرتا ہے۔ پیسہ موسموں کی یخ بستگی ختم کر دیتا ہے کیونکہ اس کی اپنی حرارت ہوتی ہے جو آدمی کو ہر وقت تکور کرتی رہتی ہے اور خوش و خرم رکھتی ہے''۔

''میں نے CANNES کی بڑی تعریف سنی ہے'' سارا بولی۔

''ہاں! فرنچ رویرا' میڈی ٹرینین کے پانیوں میں فرانس کے کلونوں کی خوشبو رچ بس گئی ہے۔ سات میل کا ساحل سمندر جس کی نرم سفید ریت پر ہزاروں حسینائیں غسل آفتابی سے لطف اندوز ہوتی ہیں.....''

ہنس کر بولی ''جہاں ستارے ہوتے ہیں وہاں کوئی نہ کوئی چاند بھی تو جھلملاتا ہوگا''۔

''مون ایک بھی نہیں ہے۔ میں نے سارا ساحل PILLER TO POST دیکھا ہے۔ کوئی چہرہ بھی اس چہرے کے برابر نظر نہیں آیا''۔

''پھر وہی مبالغہ آرائی''۔ مون نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''آخر سچ بولنے میں حرج ہی کیا ہے!'' مون کی مام نے میری بات کی تائید کی۔ ''اگر یہ میری بیٹی نہ بھی ہوتی تو ساری زندگی مجھے ایک ہی حسرت رہتی کہ کاش اس جیسی میری بھی کوئی بیٹی ہوتی!''.....

مون نے مجھے بیڈ روم دکھایا کمرہ کیا تھا ایک چھوٹی سی دنیا آباد تھی۔ "50 سکرین کا کلرٹی وی' وی سی آر' اکائی کا جدید میوزک ڈیک' فریج جس میں ہر قسم کی شرابیں' مشروبات اور انواع واقسام کے پھل رکھے ہوئے تھے۔ دبیز ایرانی قالین' دیواروں پر پینٹنگز اور ان کے درمیان سنہری فریم میں سجی ہوئی مون کی تصویر' جو اٹلی کے کسی مصور نے بنائی تھی۔ کارپر فریم کا بیڈ جس پر نہایت ہی آرام دہ فوم کشن بچھا ہوا تھا۔ نہ زیادہ نرم اور نہ زیادہ سخت۔ پلنگ پر بچھی ہوئی سفید چادر جس پر راج ہنس کے پروں کا گمان ہوتا تھا سارے کمرے میں ایک نہایت مدھم سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں اسپرے کیا گیا تھا یا خوشبو آور ساز و سامان رکھا گیا تھا۔ خوشبو اس قدر مسحور کن تھی کہ ذہن کے در خود بخود کھلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

''خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی ہے یا تمہارے وجود سے اٹھ رہی ہے؟'' میں نے مون کی طرف دیکھا۔

بولی ''تم کافی دیر باغ میں گھومتے رہے ہو شاید پھولوں کی مہک تمہارے دماغ میں رچ بس گئی ہے''۔

''اس اعتبار سے تو تمہیں بھی متاثر ہونا تھا کیونکہ تم نے صرف پھول ہی نہیں توڑے بلکہ تتلیاں بھی پکڑیں ہیں''۔

''لیکن خوشبو کا تتلیوں سے کیا واسطہ؟''

''رنگ اور خوشبو کا بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اگر رنگ جاندار نہ ہو تو خوشبو بھی اڑی اڑی سی لگتی ہے۔

''تو کیا رنگ اور خوشبو کا چولی دامن کا ساتھ ہے؟''

''بالکل! پانی کا رنگ نہیں ہوتا اس لئے اس کی کوئی خوشبو بھی نہیں ہوتی۔ یہی پانی جب گلاب کے پھولوں سے کشید ہوتا ہے تو اس کے اندر ایک مہک آ جاتی ہے اور رنگ بھی!''۔

مون چلی گئی تو میں نے کپڑے بدلے اور سگار سلگا کر باہر ٹیرس میں آ گیا۔ نصف رات کا عمل' چاند اپنے جوبن پر اور لاس اینجلس کی تسکین آور خنک راتیں اسے سنہری دھوپ کی سرزمین کہا جاتا ہے' حالانکہ اس کی شامیں بھی بڑی روشن اور دلکش ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے گرمی اور جاڑے نے الحاق کر لیا ہو۔ دونوں اس طرح ملتے ہیں کہ اپنا اثر نہیں چھوڑتے بلکہ بہار کا گمان ہوتا ہے میں بید کی بنی ہوئی آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ سگار کے چند کش لگائے تو یادوں کے کئی دریچے کھل گئے جیسا کہ میں نے مون کو بتایا تھا میں ایل اے ایک مرتبہ پہلے بھی آ چکا تھا اور اس شہر میں میرا قیام بھی بہت طویل تھا کیونکہ میں اولمپکس دیکھنے آیا تھا۔

☆☆

اولمپک کھیل بھی اس کی تاریخ کی طرح بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ جس طرح انسانی فکر کے ارتقاء میں یونان کا خاص کردار رہا ہے اسی طرح کھیلوں کی ابتدا بھی اس خطہ ارض سے ہوئی۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے آٹھ سو سال قبل بھی کوہ اولمپیا پر سالانہ کھیلوں کا انعقاد ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ کئی سو سال چلا۔ بالآخر رومیوں اور یونانیوں کی باہمی چپقلش رنگ لائی اور 303 میں رومن بادشاہ THEODOSIUS نے ان پر پابندی لگا دی۔ ایک طویل عرصہ تک کھیلوں کا انعقاد نہ ہو سکا۔ وہ تو بھلا

ہوفرانس کے شریف انسان BARON-DE-COUBERTAIN کا جس نے عین جوانی میں ایک مردہ رسم کو پھر سے زندہ کیا اور سات سال تک فرانس' انگلینڈ اور امریکہ کی رائے عامہ کو ہموار کرتا رہا۔ بالآخر اس کی مساعی رنگ لائی اور 1894ء میں انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی نے اس کی تجاویز منظور کر لیں اس طرح پہلی ماڈرن اولمپک کھیلیں اپریل 1896ء میں ایتھنز میں ہوئیں جن میں تیرہ ممالک کے تین سو کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ کھیلیں ہر چار سال بعد ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ جنگ عظیم میں کچھ عرصہ کے لئے تعطل ضرور آیا جو ناگزیر تھا۔ جرمن اور جاپانی آبدوزوں اور جنگلی جہازوں کی ہمہ وقت موجودگی میں کھلاڑیوں کو دور دراز علاقے میں بھیجنا ملک الموت سے بالمشافہ گفتگو کرانے کے مترادف تھا۔

آج کل کھیلیں اس قدر اہمیت اختیار کر گئی ہیں کہ ہر ملک کے لئے یہ ایک بہت بڑے فخر و مباہات کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ ملک زر کثیر خرچ کر کے ان کے انعقاد کے متمنی رہتے ہیں۔ پاکستان کے سید واجد علی شاہ جو شومئی قسمت سے انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کے ممبر بھی ہیں' مجھے رحیم یار خان میں ایک واقعہ سنانے لگے کہ کس طرح سپین کے بادشاہ کارلوس نے اپنے شاہی محل میں ان کی دعوت کی اور دعوت کے اختتام پر منت آمیز لہجے میں کہنے لگا "آپ آل رسولؐ ہیں" ہمیں مایوس نہ کریں اور ہمارے حق میں ووٹ دیں!"۔ شاہ صاحب فرمانے لگے "وہ سپین کا بادشاہ اور میں اپنے مزاج کا بادشاہ ہوں۔ اس لئے میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس کی درخواست رد کی جائے۔ چنانچہ میں نے نہ صرف اپنا ووٹ سپین کو دیا بلکہ دیگر مندوبین کو بھی قائل کیا اور اس طرح سپین اور شاہ کے وقار میں اضافہ ہوا۔ سپین کے شاہ کارلوس کو غالباً علم نہیں تھا کہ شاہ صاحب بڑے رفیق القلب اور حلیم الطبع انسان ہیں۔ اس قسم کی ضیافتوں میں ایسی باتیں سن کر اکثر پسیج جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چار سال بعد کوئی نہ کوئی شاہ اپنے محل میں ان کی دعوت ضرور کرتا ہے اور یہ بھی اسے کبھی مایوس نہیں کرتے۔

وہ بڑے عجیب دن تھے سال بھر کی محنت کے بعد چھٹی کا تصور ہی بڑا جانفزا ہوتا ہے' پھر اگر جگہ لاس اینجلس ہو اور کھیل اولمپکس تو محض سونے پر سہاگہ نہیں ہوتا بلکہ سونے پر سونا ہی ہوتا ہے۔ اولمپکس

سے قبل جہاں میڈیا کے ماہرین نے لوگوں کی آتش شوق کو بھڑکایا تھا وہاں تھوڑی سی اوس بھی غالباً اس خیال سے ڈال دی تھی مبادا وجود اتنی حدت برداشت نہ کر سکیں بڑا رش ہوگا' ٹریفک سے سڑکیں بلاک ہو جائیں گی۔ بلیک فرائیڈیز لوگ گاڑیوں کو سڑک پر چھوڑ کر پیدل گھروں کو جائیں گے۔ ہوٹلوں میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوگی اور بالفرض مل بھی گئی تو کرائے آسمان کو چھوتے نظر آئیں گے۔ لوگوں کو لبھانے اور ورغلانے سے زیادہ ڈرانے کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن بھلا متوالے ان باتوں سے کہاں ڈرتے ہیں چنانچہ یوں لگتا تھا جیسے امریکہ کی ہر شاہراہ ایل اے کی طرف جا رہی ہے' ہر ہوائی جہاز اس سمت پرواز کا خواہاں ہے.....

لاس اینجلس کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا شہر کی نوک پلک بھی خوب سنواری گئی تھی۔ کشادہ سڑکیں مزید کشادہ کی گئی تھیں۔ راتوں رات ان کے دونوں کناروں پر پودے اور تناور درخت لگا دیئے گئے تھے۔ شجر' جو سایہ دار بھی تھے اور چھتری کی صورت میں خوبصورت بھی لگتے تھے۔ سبز ملائم اور ریشمی گھاس کے قالین بھی دیکھتے ہی دیکھتے ان کے دونوں جانب بچھ گئے تھے۔ اشتہار' ہورڈنگز' نیون سائن' لگتا تھا جیسے شہر اپنے آپ کو از سر نو دریافت کر رہا ہے۔ ہالی وڈ کے ایکٹرز پراگریسو فارمرز' بزنس ٹائیکون سب نے اپنی دیگر مصروفیات پس پشت ڈال دی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پچاس ریاستیں سکڑ سمٹ کر' فخر و مباہات کی فضا میں یکجا اور یکجان ہو گئی تھیں۔ کوئی نیویارکر نہیں تھا' کوئی ٹیکسن نہیں کہلاتا تھا' میامی کی ''میں'' غائب ہو گئی تھی' شکاگو کی انا میں شگاف پڑ گئے تھے ہر طرف ایک ہی نعرہ زبان خلق تھا IF U.S WINS I WIN کھیلیں قومی جذبات کو کس قدر ابھارتی ہیں' اس کا اندازہ ٹھیک طرح سے یہاں آ کر ہوا۔

روس نے کھیلوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا اس کی شہ پر کچھ دیگر کمیونسٹ ممالک نے بھی شرکت سے معذرت کر لی۔ آنجہانی خروشیف نے امریکہ سے مخاصمت کی جو بنیاد رکھی اس کے اثرات زائل نہیں ہوئے تھے۔ کیوبن میزائل کرائسس نے نہ صرف اس کی مونچھ نیچے کر دی تھی بلکہ کمر بھی دہری ہو گئی تھی۔ امریکہ میں اس کے متعلق کافی لطائف مشہور ہو گئے تھے۔ بایں ہمہ کھیلوں کی رونق میں زیادہ فرق نہ پڑا تھا۔ اقوام عالم کے جم غفیر میں چند ممالک کی عدم شرکت کچھ خاص فرق نہ ڈال سکتی تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رسم افتتاح کے سو ڈالر کے ٹکٹ بلیک میں ہزار ہزار ڈالر میں بکے۔ پورا کیلیفورنیا

رسم افتتاح دیکھنے کے لئے پاگل ہورہا تھا۔ ان کے اس جنون کی وجہ سے خاص طور پر ہمارے پاکستانی کھیل کے پردھانوں نے خوب ہاتھ رنگے۔ ان کو جو ٹکٹ کوٹے میں ملے تھے وہ سب بجائے اہل وطن کو بیچنے کے بلیک میں بیچ دیئے گئے۔ ایسوسی ایشن کے کچھ ایسے عہدیدار بھی تھے جنہوں نے دعوتی کارڈ بھی تیس چالیس ہزار روپے میں بیچ ڈالے۔ ان میں ہوٹل کا مفت قیام' ٹرانسپورٹ اور کھیلوں کے ٹکٹ شامل تھے۔

ان کھیلوں کی اہمیت اس اعتبار سے بھی دو چند ہوگئی کہ پہلی مرتبہ انہیں کمرشل بنیادوں پر منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ قبل ازیں حکومتیں اربوں روپے خرچ کر کے انہیں کامیاب بنائیں' اولمپک ولیج بنتے' نئے نئے سٹیڈیم کھڑے کئے جاتے' ٹرانسپورٹ' رہائش اور دیگر لوازمات پر کروڑوں ڈالروں کی لاگت آتی۔ امریکیوں نے اس میں بھی منفعت کا پہلو ڈھنڈ لیا۔ سارانج جو امریکہ کا ECONOMIC WIZARD مانا جاتا تھا اس نے حکومت کو باور کرایا کہ وہ کچھ کمائے گا' گنوائے گا کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے بین الاقوامی کمپنیوں نے کروڑوں کے اشتہار دیئے۔ اس نے اولمپک ولیج کی بجائے کالجوں اور سکولوں کے ہوسٹلز میں کھلاڑیوں کو ٹھہرایا' ان کے پلے گراؤنڈ استعمال کئے گئے حتیٰ کہ 1934ء میں بنا ہوا سٹیڈیم بھی معمولی تزئین و آرائش کے بعد استعمال کیا گیا۔

ہوٹل کے ہوشربا کرایوں کے متعلق ہمیں نہ بھی ڈرایا جاتا تو یہ خوف ہمارے ذہن میں پہلے سے موجود تھا۔ ڈالر کو جب بھی پاکستانی کرنسی سے ضرب دی جاتی ہے تو ایک ہیجانی کیفیت ضرور پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ بجائے ہوٹل میں ٹھہرنے کے میں ایک دوست کے پاس ٹھہر گیا۔ اشفاق دتو وہاں گارمنٹس کا کاروبار کرتے تھے۔ انہوں نے اور ان کی امریکن بیگم نے ایل اے ایئرپورٹ پر میرا ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا۔ اس قدر مصروف زندگی گزارنے والوں کا اتنی دور چل کر آنا ان کے خلوص اور محبت کا مظہر تھا۔ پہلی ملاقات کے باوجود گلے ملے اور اپنی بیگم سے تعارف کرایا۔ مسز دتو کہنے لگیں ''مسٹر شاہ دو دنوں سے تمہارا تذکرہ ہورہا ہے اور اشفاق نے اپنے اگلے سات یوم کی مصروفیات مختصر کر ڈالی ہیں۔ کہتے ہیں کہ شاہ پہلی مرتبہ ایل اے آرہا ہے اس کو اولمپکس دکھانا ہے''۔ ایئرپورٹ پر بیگیج لینے کے لئے ہم کافی دیر انتظار کرتے رہے لیکن سامان نے کنویئر بیلٹ پر نہ آنا تھا نہ آیا۔ کافی دیر کے بعد جب بیگیج سیکشن پر اطلاع

دی تو پتہ چلا کہ عملے کی غفلت سے سامان اتر نہیں سکا اور میرا اکلوتا سوٹ کیس عازم سڈنی ہو گیا ہے۔ ہماری پریشانی بھانپتے ہوئے ہوائی کمپنی کے اہلکار نے ہمیں تسلی دی ''گھبراؤ نہیں سامان ہونالولو میں اتار لیا جائے گا اور کل شام تمہیں بہر طور پہنچا دیا جائے گا تم اگر چاہو تو شیونگ کٹ کے لئے سوڈالر لے سکتے ہو کیونکہ قواعد کے مطابق اتنی ہی رقم دی جا سکتی ہے''۔ اس قدر فراخدلانہ پیشکش سے بھلا ہمیں کیا انکار ہو سکتا تھا۔ بادل نخواستہ شکریہ ادا کرنے والے تھے کہ میرے بولنے سے پہلے ہی اشفاق صاحب بول پڑے اس کی ضرورت نہیں۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے آپ صرف سامان پہنچا دیں گاڑی میں بیٹھ کر میں نے پہلی مرتبہ لاس اینجلس کو دیکھا رات کا وقت تھا لیکن ٹریفک دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے پیک آورز ہوں ہر طرف روشنیاں 'چار موسڑکوں کا ایک نہ ختم ہونے والا جال شہر کی وسعت اور اشفاق صاحب کی وسیع القلبی کا اندازہ تو مجھے اسی وقت ہو گیا تھا گاڑی کوئی تین گھنٹے تک سڑکوں پر رینگتی رہی کئی کاؤنٹیوں سے گزر ہوا بے شمار بلیوارڈ آئے اشفاق صاحب باقاعدہ میری معلومات میں اضافہ کرتے گئے معلومات سے زیادہ میری حیرت میں اضافہ ہوتا گیا ہر چند کہ میں نے سن رکھا تھا کہ SANFRANSISCO WAS BUILT HIGH LOS ANGELLOS WAS BUILT WI لیکن اس کے معنی اس شام معلوم ہوئے۔

''کیا آپ ایل اے سے باہر رہتے ہیں؟'' میں بے تابی سے پوچھ بیٹھا۔

میں ایل اے ہی میں رہتا ہوں وہ مسکرائے یہ دنیا کا طویل ترین شہر ہے جب ہم ان کے گھر پہنچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

دتو صاحب کا گھران کی نفاست اور امارات کا آئینہ دار تھا مشرق و مغرب کا حسین امتزاج جہاں وہ ویسٹرن کلچر سے متاثر ہوئے تھے وہاں انہوں نے اپنی بیگم کو بھی کچھ مشرقی آداب سکھائے تھے خصوصاً آداب مہمان نوازی چار کنال کے رقبے میں بنا ہوا مکان جس میں سوئمنگ پول' اٹیچڈ باتھ اور دو گیراج تھے بیرونی دیوار کے ساتھ پام کے درخت سنتریوں کی طرح ایستادہ تھے کافی دیر تک پاکستان کی باتیں ہوتی رہیں کوئٹہ میں ان کے والد صاحب کا دتو اینڈ سنز کے نام سے خاصا وسیع کاروبار تھا اشفاق صاحب شوقیہ

طور پر امریکہ آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے پتہ نہیں یہ مسز دتو کی زلف گرہ گیر تھی یا ایل اے کی کشش کہ انہوں نے کوئٹہ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا جب میں نے انہیں بتایا کہ میں کسی وقت قلات میں اے سی رہا ہوں اور بلوچستان پر کتاب بھی لکھی ہے تو بڑے خوش ہوئے میرے دوست بشیر صاحب نے انہیں میرے شوق اور ترجیحات سے آگاہ کر دیا تھا اس لئے میری آمد سے قبل انہوں نے ہاکی میچ اور ٹریک ایونٹس کے ٹکٹ خرید رکھے تھے ان دنوں ہائی کی خاصی پاپولر تھی آج کل کی طرح قوم نے اسے طاق نسیاں میں نہیں ڈال رکھا تھا چونکہ سکول کے دنوں میں ضلعی سطح پر ہاکی کھیلتا رہا تھا اس لئے کچھ زیادہ ہی شوق تھا کھیلتا تو میں کرکٹ بھی تھا لیکن تلہ گنگ کا ماحول اور حالات میں اس مہنگے کھیل کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ جاندار پچ بنانا بذات خود بہت بڑا مسئلہ تھا۔ وکٹیں' گیند' پیڈ' ایب ڈامینل گارڈ' دستانے' پتہ نہیں کیا کیا ضروری تھا ہر چند کہ آج کل کی طرح زرہ بکتر پہننے اور کھوپے چڑھانے کا رواج نہ تھا اور بلے باز بڑی ہمت اور جرات کے ساتھ اٹھتی ہوئی گیند کا سامنا کرتا تھا مسلز بھی ان دنوں کم کھنچتے تھے' فلو اور اس نوع کی دیگر ملائم بیماریاں بھی کھلاڑی کے قریب آنے سے حتی الوسع اجتناب برتتی تھیں۔ دولت کی ریل پیل بھی نہیں تھی۔ کھلاڑی خوابوں میں کار اور کوٹھیاں نہیں دیکھتے تھے۔ انہیں صرف وکٹیں اور ''ڈی'' نظر آتی تھی چونکہ بکی نہیں تھے اس لئے بکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ایک بک میکر ہمیں بنانے لگے کہ ایک دفعہ چند بکیوں سے مل کر ایک ماہ ناز کھلاڑی کو دس لاکھ روپے کی پیشکش کی گئی کہ وہ ون ڈے میچ میں جلد آؤٹ ہو جائے جواب میں اس نے جیب کو بٹن کھول دیئے اور پھر ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جس میں ندامت کا شائبہ تک نہیں تھا کہنے لگا ''انگریزی محاورہ شاید انہی مواقع کے لئے وضع کیا گیا ہے GOOD OFFER IS NEVER REFUDED ایک اچھی پیشکش کو کبھی نہیں ٹھکرانا چاہئے بکی کہنے لگے ہم نے بطور حفظ ماتقدم اس کے توسط سے ایک دوسرے کھلاڑی کو بھی دس لاکھ کی آفر کی اس پر اس نے ایک قہقہہ لگایا جس میں ہنسی کم اور بے حیائی زیادہ تھی..... اس کی کیا ضرورت ہے یہ رقم بھی مجھے دے دو میں اس کو رن آؤٹ کرا دوں گا''۔

تب میچ جیتنے کی صورت میں شمپین کی بوتل نہیں بلکہ پشاور کے پونے گنے کے رس کا پورا گلاس ملتا تھا وقفے میں کوکا کولا اور پیپسی وار نہیں ہوتی تھی بلکہ لسی اور سکنجبین کی یلغار ہوتی تھی۔ اخلاقیات کے متعلق کہا

morolity is the way to behave as you have taught کہ گیا ہے behave جس معاشرے میں انسانوں کے سائے ان کے قد سے بڑھ جائیں جہاں زبان مدح ستم گراں کرتے تھکتی نہ ہو جہاں ضمیر بک جائیں اسباب مفلساں کی طرح جہاں قبائے دین ابوجہل نے سجالی ہو جہاں چار سو یمس وقت کی پیغمبری کے قصے ہوں' جہاں انصاف ایک انعام کی شکل اختیار کر جائے وہاں ان لوگوں سے کیا توقع کی جاسکتی ہے جو ہوائی چپل سے ہوائی جہاز تک پہنچے ہوں جنہیں فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا گیا ہو اور جن کی ہڈیوں کے گودے میں رچی ہوئی بھوک کو دولت کا کوئی بھی نشتر باہر نہ نکال سکتا ہو۔

اشفاق صاحب کے ساتھ ایسٹ ایل اے کالج ہاکی میچ دیکھنے گئے تو پہلی خوشگوار حیرت تو ہمیں میدان کے باہر ہی ہوگئی..... اور وہ تھی ایک ہمدم دیرینہ سے بارہ سال کے بعد ملاقات امیر احسان راولپنڈی کے پلازہ سینما کے مالک اتنے طویل عرصے تک گھر کیوں نہیں آئے؟ ہم نے بغلگیر ہوتے ہی سوال کر ڈالا" کل بتاؤں گا!" وہ مسکرائے اور میری رہائش گاہ کا پتہ نوٹ کر لیا ہاکی گراؤنڈ میں کوئی کرسی نہ تھی پھٹوں کو سفید رنگ کر کے جوڑ دیا گیا تھا اور پھر ان پر جلی حروف میں سیٹ نمبر اور گیٹ نمبر لکھ دیا گیا تھا قریباً پانچ سات ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی ان میں اکثریت پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی تھی ۔ پاکستان جس خوبصورت انداز میں میچ کھیلا اور ہالینڈ کی صفوں میں حال دہائی مچادی وہ دیدنی تھی کھلاڑیوں میں جذبہ تھا۔ لگن تھی ۔ کمٹمنٹ تھی اور قومی پرچم کو سربلند کرنے کا لافانی عزم تھا۔ دن میں تین میچ ہوتے تھے لوگ تیز دھوپ کی پروا کئے بغیر دیکھتے گراؤنڈ پر کوئی سائبان نہیں تھا انکوڑز بھی ایک ہی تھا امریکہ میں چونکہ ہاکی مقبول نہیں ہے اس لئے اولمپک انتظامیہ نے کوئی خاص تردد نہ کیا تھا۔

واپسی میں میں نے امیر احسان کے متعلق اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے دتو صاحب سے پوچھا کیا کوئی شخص دس سال تک گھر سے باہر رہ سکتا ہے کہنے لگے اس کے پاس واپس جانے کا کرایہ نہیں ہوگا!" میں نے سمجھا وہ مذاق کر رہے ہیں لیکن دوسرے دن جب امیر احسان مجھے ملنے آیا اور اپنی کار پر ڈنر کیلئے لے گیا تو راستے میں میں اپنا تجسس چھپا نہ سکا تم اس قدر طویل عرصے تک پاکستان نہیں آئے کوئی خاص بات

تھی؟

کرایہ نہیں تھا!'' اس نے سٹیرنگ سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ وہ اپنی گاڑی پر مجھے لینے آیا تھا اور فیڈرل نیوی میں سول انجینئر تھا۔

وہ میری حیرت کو بھانپتے ہوئے بولا' تمہاری حیرانگی اپنی جگہ درست ہے لیکن میرے حالات بھی کچھ کم پریشان کن نہیں تھے جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہاب ہے تب نہیں تھا۔

پاکستان میں ایم اے کرنے کے بعد مجھے کوئی ڈھب کی نوکری نہ ملی سینما کا بزنس ایک تو ویسے ہی ڈوب رہا ہے پھر بڑے بھائی کی سرمستیوں نے لٹیا ہی ڈبودی اندنوں کینیڈا میں مقیم برسرروزگار ایک بریگیڈئر کی لڑکی کا رشتہ آیا تو گھر والے خوشی سے اچھل پڑے۔ انہوں نے کینیڈا کی رومانی سرزمین اور لڑکی تصوراتی حسن کا کچھ اس انداز میں نقشہ کھینچا کہ میں نے برادران یوسف کی ناجوازیوں کو بھول کر ہاں کردی .....شادی ہوگئی۔ لڑکی واقعی خوبصورت تھی کینیڈا بھی پرکشش تھا پہلے چند ماہ تو اس طرح گزر گئے جیسے قصوں کہانیوں میں ہوتے ہیں اس نے ہنی مون کیلئے چھٹی لے رکھی تھی اور مجھے بھی فکر فردتھا نہ غم روزگار کیلگری کھیل کے کنارے پورے چاند کی روشنی میں ہم بانہوں میں بانہیں ڈالے لیٹے رہتے گھنٹوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ نگاہیں تھکتی ہی نہ تھیں' خواہشیں ختم ہی نہ ہوتی تھیں' جذبے پل پل جوان ہوتے تھے' پیار محبت کی باتیں' عہد و پیمان ایسے محسوس ہوتا جیسے ہم نے اتنی دیگر الگ رہ کر کوئی بہت بڑی غلطی کی ہو۔

وقت کس قدر تیزی سے گزرتا ہے لمحے کیسے دیکھتے ہی دیکھتے اداس ہوجاتے ہیں اپنائیت کس طرح غیریت پھر کدورت اور مخاصمت میں بدل جاتی ہے مجھے کینیڈا میں نوکری نہ ملنی تھی نہ ملی ایم اے کی ڈگری کو وہ یوں دیکھتے جیسے میں نے پرت حقیر اٹھا رکھا ہو۔ کسی چھوٹی موٹی نوکری کو میں کسر شان سمجھتا تھا۔ چنانچہ تھک ہار کر PRISIONER OF INACTICVITY ہوگیا سارا دن فلیٹ میں بیماروں کی طرح پڑا رہتا باہر گھومنے کیلئے نہ جیب میں پیسہ تھا اور نہ دل میں خواہش جب آدمی بے کار ہو تو پھر مزاج میں چڑچڑاپن بھی آجاتا ہے گھر کے درودیوار گھورتے نظر آتے ہیں کتابیں طنز کرتی دکھائی دیتی ہیں..... رفتہ رفتہ بیوی کی بے رخی بڑھنے لگی اس کی خاموش نظریں مجھے سرزنش دکھائی دیتیں میرے جیب خرچ سے بھی

اس نے ہاتھ کھینچ لیا کچھ عرصے بعد نگاہوں کے ساتھ لب بھی ملنے لگے دبے دبے طعنے' تضحیک آمیز رویہ اور پھر وہ کھل کر سرزنش کرنے لگی میں نے مشرقی ماحول میں آنکھ کھلی تھی اپنے والد مرحوم کا رعب و دبدبہ دیکھا تھا جب وہ گھر میں آتے تو سارے بچے سہم جاتے والدہ ان کا کوٹ اور ٹائی ہینگر میں لگاتیں اور پھر کھانا پروستیں تاہم حالات نے مجھے بزدل بنادیا تھا پہلی مرتبہ میں ملک سے باہر آیا تھا۔ پہلی بار اس تلخ تجربے سے گزر رہا تھا چنانچہ برداشت اور مصلحت پسندی سے ہر وار سہہ جاتا اور جھڑپوں کو کبھی جنگ کی صورت اختیار نہ کرنے دیتا لیکن ایک دن میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا!'' امیر کی آنکھوں میں نمی آگئی اور جلدی سے اس نے مارلبرو کا سگریٹ ہونٹوں سے لگالیا۔

''کیا ہوا؟'' میں اپنا تجسس چھپا نہ سکا۔

THE INEVITABLE HAPPENED وہ دھوئیں کو فضا میں بکھیرتے ہوئے بولا وہ بڑی اداس شام تھی میری بیوی دفتر سے واپس نہ آئی تھی۔ کئی وسوسے اور خدشے ذہن کے زندان میں ابھر رہے تھے کافی دیر کے بعد وہ آئی اور سیدھی بیڈروم میں چلی گئی نہ سلام دعا نہ دیر سے آنے کی توجیح کچھ دیر بعد وہ بیڈروم سے باہر نکلی تو اس نے نائٹی پہن رکھی تھی۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ یوں لگا جیسے سفید بادلوں کی اوڑ سے چاندنی چھن چھن کر باہر آرہی ہے ہو مجھے کالگری لیک یاد آگئی شاید وقت پیچھے کی طرف لوٹ رہا ہے ایک موہوم سی امید نے میرے اندر سر اٹھایا انسان بنیادی طور پر خوش فہم ہے صبح کا بھولا اگر شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں سمجھنا چاہئے۔ لیکن یہ میرا بھولپن تھا' بھول تھی' خوش فہمی اس وقت بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہوگئی۔ جب وہ کوئی بات کئے بغیر اسی نیم عریاں لباس میں سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی موٹر کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی میں نے کھڑکی سے جھانکا' وہ جا چکی تھی۔ حیرت' تاسف اور پشیمانی یکجا ہوگئے غصے کی لہر تھی جو مدوجزر کی طرح مجھے اپنے وجود میں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دیار غیر میں اس قدر ذلت اور رسوائی اور وہ بھی بیوی کے ہاتھوں..... وہ چند گھنٹے میں نے کس طرح گزارے آج بھی جب میں سوچتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور پسینے میں تربتر ہوجاتا ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں فوم کشن پر نہیں کسی جلتے ہوئے تنور پر بیٹھا ہوں اور میرا دل گھڑی کے پنڈولم کی طرح میری پسلیوں سے

ٹکرا رہا ہے۔ غصے کی کالی آندھی جس نے دماغ کی ہر رگ کو ہلا کر رکھ دیا تھا..... اس نے غصے سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹا جس سے لہو جاری ہو گیا میں نے ٹشو پیپر نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

رہنے دو! اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کیا۔ یہ پہلے بھی کئی مرتبہ کٹ چکا ہے میں تمہارا تجسس دیکھ رہا ہوں تم غالباً اس کہانی کا انجام جاننا چاہتے ہو!..... نصف رات کو وہ واپس لوٹی اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے غالباً کسی پارٹی میں اس نے پی ہو گی۔ وہ مجھے نظر انداز کرتے ہوئے بیڈ روم کی طرف بڑھی تو میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے روک لیا۔

''کہاں گئی تھیں؟'' میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

IT IS NONE OF YOUR BUSINESS اس نے غصے سے مجھے گھورا..... مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ راجہ بیل نے اپنا سینگ بدل ڈالا ہو یا کروڑوں ٹن پانی مضبوط بند توڑ کر باہر بہہ نکلا ہو اپنے وجود کی ساری قوتوں کو مجتمع کرتے ہوئے میں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا وہ فضا میں یوں اچھلی جیسے کوئی ہوائی طشتری ہو اور چار گز دور پڑے ہوئے صوفے پر جا گری۔ خون اس کے منہ سے فوارے کی طرح پھوٹ پڑا اور ہاتھ کا نشان اس کے چہرے پر یوں جم گیا جیسے کسی نے گیلی ریت پر نقش بنا دیا ہو کچھ دیر تو وہ بے حس صوفے پر پڑی رہی۔ پھر اس نے اٹھ کر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

HOW DARE YOU HIT ME ,BASTARD ,I AM GOING REPORT THE MATTER TO THE POLI میں تمہیں جیل کرا دوں گی وہ ٹیلیفون کی طرف لپکی..... میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر پھر صوبے کی طرف دھکیل دیا..... اس اثنا میں نہ صرف میرا غصہ ہرن ہو گیا تھا بلکہ خطرے کی کوئی گھنٹیاں بیک وقت میرے وجود میں بجنے لگیں خوف کی ایک سرد لہر مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تم جانتے ہی ہو یہاں کی پولیس بیوی چھوڑ بچے کی رپورٹ پر بھی والد کو گرفتار کر لیتی ہے..... لیکن وہ وقت ڈرنے کا نہیں تھا..... میں اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے بولا' پولیس رپورٹ تو تب کرو گی جب اپنے قدموں سے چل کر تھانے پہنچو گی۔ اور اپنے ہاتھوں سے رپٹ لکھواؤ گی!''

اس نے خائف نظروں سے مجھے دیکھا۔اس کا نجام جانتے ہو؟''

'ہاں! لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں.....'' کافی دیر تلخ جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا کافی دیر دبے دبے لفظوں میں میں نے معذرت بھی کی لیکن وہ کسی صورت بھی اس واقعے کو فراموش کرنے کو تیار نہ تھی۔

آخر تم چاہتی کیا ہو؟' تنگ آ کر میں نے پوچھا۔

وہ میرا اکلوتا سوٹ کیس فلیٹ کی دوسری منزل سے نیچے پھینکتے ہوئے بولی GET OUT OF MY HOUSE & LIFE AS WEL

میں کینیڈا سے ایک ٹوٹے ہوئے دل اور زخمی انا کے ساتھ امریکہ آ گیا۔ایم اے ہونے کے باوجود یہاں آ کر ایک ہوٹل میں ڈش واشر ہو گیا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری از سر نو تعلیم کا آغاز کیا انجینئرنگ کی ڈگری لی اور اب فیڈرل نیوی میں سول انجینئر ہوں''۔

میں نے افسوس کا اظہار کیا تو کہنے لگا ''زندگی کی ناجوازیوں اور زیادتیوں کا آدمی کب تک گلہ کر سکتا ہے میں بھی اگر ہار مان لیتا تو یہاں تک نہ پہنچ پاتا بجائے ہتھیار ڈالنے کے میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں وقار سے زندہ رہنے کا غالباً یہی واحد طریقہ ہے.....!''

مجھے دتو صاحب کے گھر ٹھہرے ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ افضل حسین تارڑ کا فون آ گیا کہنے لگے میں اورنج کاؤنٹی کے پلازہ ان ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں تم جلدی سے یہاں آ جاؤ۔تمہارا بے تابی سے انتظار ہو رہا ہے'' افضل حسین میرے دوست ہیں ہم دونوں کے پاس پین ایم کا AROUND THE WORLD ٹکٹ تھا پاکستان سے لندن تک ہم اکٹھے آئے تھے میں لندن سے جلد آ گیا تھا اور وہ چند روز کے بعد آئے تھے چونکہ میرے پاس ساری دنیا کا ٹکٹ تھا اس لئے میں اس سہولت سے پر فائدہ اٹھانا چاہتا تھا نیویارک واشنگٹن' میامی' ڈلس' سان فرانسسکو اور لاس اینجلس' ٹکٹ تو ان کے پاس بھی ساری دنیا کا تھا لیکن ان کی دنیا روُلے (ROULET) کے گرد گھومتی تھی اور وہ کیسینو کی چار دیواری کو ہی ساری کائنات سمجھتے تھے جب یہ کیسینو جاتے تو وہاں کی انتظامیہ ان کو دیکھ کر یوں خش ہوتی جیسے بچہ چاکلیٹ دیکھ کر ہمکتا ہے ہر چند کہ دتو صاحب کے ہاں ہر سہولت میسر تھی لیکن ایک تو مجھے حق دوستی بہر طور ادا کرنا تھا پھر مہمان

نوازی کے بھی کچھ طور طریقے ہوتے ہیں کچھ حدود و قیود ہوتی ہیں اور ان کے اندر رہ کر ہی لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے ایک مصروف بزنس مین کو پندرہ یوم کیلئے پابند کرنا یقیناً نامناسب تھا جب میں نے اجازت چاہی تو کہنے لگے خواہ مخواہ ہوٹل میں خرچہ کرو گے یہاں کیا تکلیف ہے؟'' میں نے وجہ بتائی تو کافی ردو کد کے بعد مان گئے کہنے لگے کل میں تمہیں چھوڑ آؤں گا میں نے کہا آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں ٹیکسی منگوا دیں میں چلا جاؤں گا اس پر وہ مسکرائے جانتے ہو یہاں سے اورنج کاؤنٹی کتنی دور ہے پورے پچاس میل ٹیکسی کا کرایہ نیویارک کے کرائے کے برابر ہوگا کل دفتر جاتے ہوئے میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔

دوسرے دن ہم ان کے دفتر گئے بہت بڑا گارمنٹس سٹور تھا۔ تائیوان' ہانگ کانگ اور بنکاک سے سلے ہوئے کپڑے درآمد کئے گئے تھے سال میں تین چار مرتبہ وہ خود وہاں جاتے اور امریکیوں کے شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈیزائن کرواتے تھے دفتر میں بیس پچیس آدمی کام کرتے تھے ہم کافی پی رہے تھے۔ کہ ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی اندر آئی۔ اور تقریباً رونے کے انداز میں بولی ''سر! آپ مجھے نوکری سے فارغ کر رہے ہیں میں ایم اے ہوں آخر میرا قصور کیا ہے؟''

تم کمپیوٹر نہیں جانتی امریکہ میں کوئی بزنس کمپیوٹر کے بغیر نہیں ہو سکتا!''۔

جب وہ ناامید ہو کر چلی گئی تو میں نے مسکرا کہا' آپ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہیں اتنی خوبصورت لڑکی کو جاب نہ دینا کفران نعمت ہے!''

کہنے لگے'' یہ شاعر لوگوں کا کام ہے جو ایک تل کے بدلے سمرقند و بخارا دے ڈالتے ہیں۔ اگر میں اس قسم کی فیاضی کرتا تو آج اتنے بڑے ویئر ہاؤس کا مالک نہ ہوتا کوئٹہ میں والد صاحب کے ساتھ سرکہ اور اچار بیچ رہا ہوتا'' اشفاق صاحب مجھے پلازہ ان چھوڑ آئے ہر چند کہ رش آور نہیں تھے پھر بھی دو گھنٹے لگ گئے۔

افضل حسین کے ساتھ رانا افتخار اور ملک خدا بخش صاحب بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ رانا افتخار مانانوالہ کے رہنے والے تھے جمخانہ کلب کے صدر بھی رہے اور پھر اپنی لاابالی طبیعت کے ہاتھوں اسے خیر باد بھی کہا چھ فٹ سے زیادہ اٹھتا ہوا قد ساٹھ کے پیٹے میں آبنوسی رنگت بھاری بھرکم' کھانا کھانے کے اتنے شوقین نہیں تھے جتنا پکانے کا جنون تھا خود ہاتھ سے کھانا بناتے وہاں بھی سب مرچ مصالحے ساتھ لائے تھے

جمخانہ کلب میں انہوں نے مچھلی پکانے کا ایک نیا طریقہ دریافت کیا چنانچہ اس ڈش کا نام ''رانافش'' مشہور ہوگیا کھانے کی طرح معاشقوں کا بھی بڑا شوق تھا غالباً عشق لڑا کر اتنا خوش نہ ہوتے جتنا بتا کر خط اٹھاتے کسی داستان گو کے انداز میں اپنے ان کارناموں کا ذکر کرتے شام کو جب کھیلیں دیکھ کر لوٹتے تو ساتھ کوئی چٹ پٹا قصہ کہانی بھی لاتے یوں محسوس ہوتا جیسے لاس اینجلس کی حسینائیں سڑکوں پر رانا صاحب کے انتظار میں بت بنی کھڑی رہتی ہیں مبادا پنجاب کے اس آبنوسی رنگت والے گھبرو کا ادھر سے گزر ہو اور ان کی قسمت سنور جائے کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کیلئے یہ اسے کوئی نہ کوئی حسین موڑ ضرور دیتے ایک دن شام کو لوٹے تو پہلے پیگ کے ساتھ ہی طلوع ہوگئے کہنے لگے بھائی افضل حسین آج تو کمال ہی ہوگیا میں ٹریک ایونٹس دیکھنے سٹیڈیم جارہا تھا کہ سٹیڈیم کے مرکزی دروازہ کے قریب 16 سال کی ایک لڑکی دیکھی جو اندر جانے والوں کو بڑی حسرت سے تک رہی تھی پہلے تو میں سمجھا کہ شاید اپنے کسی بوائے فرینڈ کو تلاش کر رہی ہے لیکن جب کافی دیر تک اسے کوئی نہ ملا تو میں نے دیکھا آنسو اس کی غزالی آنکھوں سے نکل کر گلابی گالوں پر ٹپ ٹپ گر رہے ہیں تم تو جانتے ہی ہو میں ٹھہرا رفیق القلب انسان' کسی کی تکلیف برداشت نہیں کرسکتا چنانچہ میں اس کے پاس چلا گیا اور اس سے کہا اے کیلیفورنیا کی کلی وہ کونسا غم ہے جو تم نے اس خوبصورت شہر میں بھی پال رکھا ہے۔ مجھے بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟

کیلیفورنیا کی کلی کی تشبیہ سن کر اس کے آنسو یک دم رگ گئے پھر میرا ڈیل ڈول دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرا پڑی کہنے لگی اتنی اچھوتی تشبیہ میں نے زندگی میں پہلی بار سنی ہے اس کیلئے شکریہ لیکن تم میری مدد نہیں کر سکتے چونکہ میرا درد لادوا ہے۔

دنیا کا کوئی دکھ ایسا نہیں جو لادوا ہو تم بیان تو کرو۔ بعض اوقات خرقہ پوشوں کی آستینوں میں بدبیضا ہوتا ہے'' غالباً اسے بدبیضا کے معنی سمجھ نہیں آئے تھے یا ہوسکتا ہے میرے انگریزی ترجمہ میں کوئی سقم رہ گیا ہو۔

کہنے لگی' لوگ تو آستینوں میں خنجر رکھتے ہیں تم نے یہ چمکتی ہوئی چیز کیسے رکھ لی؟

تم اپنا کام بتاؤ؟ میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا! میں سمجھ گیا کہ اسے شعروشاعری سے رام نہیں کیا جا سکتا۔

اجنبی' میری بڑی خواہش تھی کہ سٹیڈیم میں جا کر اولمپک کھیلیں دیکھوں لیکن یہاں تو ٹکٹ ہزار ڈالر میں بلیک پر بک رہا ہے اور میرے پاس میکڈونلڈ کا برگر کھانے کے لئے بھی رقم نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی یہ سننے کے بعد میرے حلق سے ایسا قہقہہ بلند ہوا جیسا کہ لیمپ رگڑنے سے الہ دین کا چراغی جن مارتا ہے بلیک ٹکٹ کا حل بلیک مین کے پاس ہے مجھے پہلی مرتبہ اپنی رنگت پر فخر محسوس ہوا جب میں نے ٹکٹ نکال کر ہوا میں لہرایا تو مارے حسرت اور خوشی کے اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں بے اختیار اس کے ہاتھ ٹکٹ کی طرف بڑھے۔ لیکن پر کچھ سوچ کر اس نے پیچھے ہٹا لئے۔ کہیں تم چوری تو نہیں کی ہے''؟

''کیا میں تمہیں چور لگتا ہوں؟''

'تھوڑا تھوڑا شک تو ضرور ہوتا ہے'' وہ پیار سے مسکرائی۔

'تو پہلے شک دور کر لو'' میں نے ٹکٹ واپس جیب میں ڈال دیئے۔

'لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ اس کے لہجے میں ایک دفعہ پھر مایوسی عود کر آئی۔

تمہارے پاس دنیا جہان کی دولت ہے صرف تمہیں احساس نہیں''۔

کہا ہے؟ اس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا!

یہ حسین مسکراہٹ' یہ نرم و نازک ہونٹ' اس ٹکٹ کی قیمت صرف ایک بوسہ ہے جو تمہارے بس میں بھی ہے اور اختیار میں بھی!''

''اچھا!'' وہ حیرت سے اچھلی اور مجھ سے لپٹ کر بوسوں کی برسات کر ڈالی۔

کمال ہے بھائی افضل حسین کمال ہے رانا صاحب کا لہجہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی حسین خواب دیکھ کر بیدار ہوئے ہوں میں نے قبرص کا شہد چکھا ہے فرانس کے کلونوں کی خوشبو سونگھی ہے' ارجنٹائنا کے انناسوں کا جوس پیا ہے لیکن جتنی لذت' مٹھاس' خوشبو اور رس رس بوسے میں تھا کبھی نہیں چکھا۔

یہ کونسی بڑی بات ہے افضل حسین بظاہر یقین کرتے ہوئے بولے آپ نے پنجاب کی بیوروکریسی میں جو دراڑیں ڈالی ہیں اس کے چرچے زبان زد خاص و عام ہیں' اور اس پر پڑے پڑے جغادری عاشق بھی

عش عش کر اٹھے ہیں یہ کون سے باغ کی مولی ہے۔

کلی کہو کلی!!'' رانا صاحب نے سرزنش کی!

اپنے مزاج کی طرح تمہاری تشبیہات اور استعارے بھی بڑے کھڑدرے ہوتے ہیں

ملک خدا بخش میلہ رانا صاحب کے گہرے دوست تھے ان کی طرح فربہ اور لمبا قد کاٹھ تو نہیں تھا البتہ رنگت میں انیس بیس کا فرق تھا یہ سرگودھا کے زمیندار تھے اور بقول خود پنجاب کے سب سے بڑے سٹرس فارمر تھے غالباً تقسیم کے بعد شاید ہی کوئی ایسی اولمپک ہو جوان دونوں نے اکٹھی نہ دیکھی ہو ہر سال دنیا کی سیر کو نکلتے گھومتے پھرتے اور پرباش ہو کر واپس لوٹتے البتہ کھیلوں کے معاملہ میں دونوں کے شوق مختلف تھے رانا صاحب ٹریک ایونٹس کے شائق تھے اور ملک صاحب کو جنون کی حد تک فٹ بال سے انس تھا دونوں علی الصبح مختلف سمتوں کو روانہ ہوتے لیکن شام کو جب اکٹھے ہوتے تو گلشن کا کاروبار چل پڑتا میلہ صاحب کم گو انسان تھے رانا صاحب کی لن ترانیاں سن کر ہی محظوظ ہوتے رہتے اور از خود اپنے کسی کارنامے کا تذکرہ کرتے صبح کھیلوں پر روانہ ہونے سے پہلے دونوں باقاعدگی کے ساتھ سوئمنگ پول پر اشنان ضرور کرتے چونکہ پرانے مزاج کے آدمی تھے اس لئے کاسٹیوم کے بجائے کچھا پہنتے کچھے کے ساتھ سوئمنگ کرتے ہوئے آدمی ایسے لگتا ہے جیسے بٹھل میں کوکا کولا پی رہا ہو ایک تو کچھے کثرت استعمال سے کہیں کہیں سے کانے تھے پھر ڈیل ڈول پہلوانوں جیسا میمیں گھبرا کر سوئمنگ پول خال کر دیتے اور یہ بلاشرکت غیرے پول کے کم گہرے پانی میں اتھل پتھل ہوتے رہتے بقول بھائی افضل حسین یوں لگتا جیسے وہیل مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ افضل حسین کو والی بال کا شوق تھا وہ لاگن بیچ کی طرف نکل جاتے ہم علی الصبح اٹھتے تیار ہو کر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے ہوٹل سے بس سٹاپ ایک میل کے فاصلے پر تھا مجھے یہ فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا ڈزنی لینڈ سے جو بس آتی وہ ڈاؤن ٹاؤن تک پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگا دیتی وہاں سے ٹاؤن ہال کے سامنے ایسٹ ایل اے گراؤنڈ کیلئے شٹل سروس جاتی بس میں اس قدر رش ہوتا کہ بعض اوقات سانس لینا دشوار ہو جاتا لیکن شوق کی کوئی قیمت نہیں میں تینوں میچ باقاعدگی کے ساتھ دیکھتا تینوں میچوں کیلئے ایک ہی ٹکٹ ہوتا۔

پاکستان بالآخر فائنل میں پہنچ گیا اس روز پاکستان کا مقابلہ جرمنی سے ہونا تھا۔ یہ آخری میچ تھا اس سے پہلے تیسری اور چوتھی پوزیشن کیلئے برطانیہ اور ہالینڈ کے درمیان مقابلہ تھا فیصلہ یہ ہوا کہ فائنل سب دیکھیں گے اور علی الصبح جا کر میں اور امیر احسان ٹکٹ کا بندوبست کریں گے کیونکہ ہمارے پاس فائنل کے ٹکٹ نہیں تھے امیر احسان صبح سویرے آ گیا چونکہ وہ اپنی کار پر آیا تھا اس لئے سفر جلد کٹ گیا ہم جب گراؤنڈ کے باہر پہنچے تو صبح کے دس بج رہے تھے اندر برطانیہ اور ہالینڈ کا ہاکی میچ ہو رہا تھا ہم گاڑی پارک کر کے آئے تو کچھ پاکستانیوں نے ہمیں دیکھتے ہی نعرے لگانے شروع کر دیئے

''ٹکٹ چاہئے؟ کتنے ٹکٹ چاہئیں؟؟ یہ میچ مس نہ کریں' ملکی وقار کا سوال ہے۔'

پہلے تو ہم بڑے متاثر ہوئے کہ جذبہ حب الوطنی جو اکثر ملک میں سویا رہتا ہے یہاں پر یک دم بیدار ہو گیا ہے ہم نے پانچ ٹکٹوں کی قیمت پوچھی تو وہ بے حیائی سے مسکرائے! 'پانچ سو ڈالر' میں نے سرزنش کی آپ ٹکٹ بیچ رہے ہیں یا ملک فروخت کر رہے ہیں اور اگر ملک فروخت کر رہے ہیں تو بہت ارزاں فروختند' شرمندہ تو انہوں نے کیا ہونا تھا وہ دیگر گاہکوں کی تلاش میں نکل گئے۔

امیر احسان نے کہا 'لے لیں! یہ تاریخی میچ ہے اگر نہ دیکھ پائے تو ساری زندگی قلق رہے گا'

فکر نہ کریں اللہ کارساز ہے پاکستانیوں سے بلیک کا ٹکٹ نہیں خریدیں گے اگر انہوں نے کاروبار ہی کرنا ہے تو کسی اور ملک کا ٹکٹ بیچیں''۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ پہلا میچ ختم ہو گیا ایک بوڑھا برطانوی اپنے سے کہیں زیادہ بوڑھی بیوی کے ساتھ باہر نکلا میں اس کے قریب گیا اور کہا کہ تم نے اپنے ملک کا میچ دیکھ لیا ہے اگر چاہو تو قیمت خرید پر ٹکٹ ہمیں دے دو اس نے کچھ دیر سوچا اور بولا مجھے اپنی بیوی سے مشورہ کر لینے دو دونوں میاں بیوی ایک برونا نما درخت کی ہلکی چھاؤں میں چند منٹ گٹ مٹ کرتے رہے اور بالآخر بوڑھے جوڑے نے کہا کہ وہ اصل قیمت پر ٹکٹ فروخت کرنے کیلئے تیار ہیں ہم نے تھوڑی سی کوشش کے بعد پانچ ٹکٹ پچاس ڈالر میں خرید لئے۔ اتنے میں افضل حسین' رانا صاحب اور میلہ بھی آ گئے۔ جب ہم میچ دیکھنے گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ وہی لوگ مایوسی کے عالم میں ٹکٹ اصل قیمت سے بھی کم قیمت پر بیچنے کی کوشش کر رہے

تھے۔لیکن انہیں کوئی گاہک نہیں مل رہا تھا۔

ہاکی کا فائنل میچ بڑا جاندار تھا۔ کاغذوں میں جرمنی کی ٹیم زیادہ مضبوط تھی لیکن جوش اور جذبہ پاکستانیوں میں زیادہ تھا۔ امریکہ نے کونے کونے سے اہل وطن قومی ٹیم کو داد دینے پہنچے تھے۔ تمام فضا پاکستان زندہ باد اور اللہ اکبر کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ اس وقت کوئی سندھی کوئی پنجابی کوئی بلوچ اور کوئی پٹھان نہیں تھا بلکہ سب بھائی بھائی تھے۔ شائقین بینڈ باجے ساتھ لائے تھے۔ کچھ زندہ دل تو ڈھول بھی اٹھا لائے تھے۔ نفیریاں بج رہی تھیں۔ امریکن اور دیگر یورپین بڑی حیرت سے یہ سب منظر دیکھ رہے تھے۔ دونوں ٹیمیں جی لڑا کر کھیلیں۔ مقررہ وقت میں میچ برابر رہا۔ مزید وقت دیا گیا۔ نتیجہ وہی رہا۔ پھر آخری موقع دیا گیا۔ دونوں ٹیمیں تھک کر نڈھال ہو چکی تھیں لیکن گرمی نے جرمنی کی ٹیم کے کس بل نکال دیئے۔ قسام ازل نے فتح پاکستان کے مقدر میں لکھی تھی۔ جب آخری وسل بجی تو میدان ایک بار پھر نعرہ تکبیر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ عجیب منظر تھا۔ لوگ ناچ رہے تھے' لوگ گا رہے تھے' لوگ ہنس رہے تھے' لوگ رو رہے تھے' خوشی کے آنسو' دیار غیر میں اتنی شاندار فتح!..... ساری ٹیم سجدے میں گر گئی۔ سارے پاکستانی تماشائی سجدہ ریز ہو گئے۔ ایسٹ ایل اے کالج کا گراؤنڈ عیدگاہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بغیر واقفیت کے بھی لوگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ 'اگر یہ جذبہ ایک ماہ کیلئے بھی ساری قوم میں بیدار ہو جائے'..... میں نے سوچا! تو پھر اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ کوئی مات نہیں ہو سکتی۔ تمام سازشیں اور ریشہ دوانیاں روئی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑ جائیں گی.....

جب ہم واپس لوٹے تو وقتی طور پر ہی سہی کتھارسس ہو چکا تھا۔ روح کی ساری کثافت دھل چکی تھی۔ ایک عجیب طرح کی بالیدگی کا احساس۔ افضل حسین' رانا صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے "جہاں ہم لوگوں کو مسرت ہو رہی ہے وہاں سٹیڈیم کے قریب کھڑی ہوئی کئی حسیناؤں کو آپ کی عدم موجودگی کی وجہ سے بڑی مایوسی ہوئی ہوگی"۔

وہ مسکرا کر بولے "ہر پاکستان کو اپنے اپنے رنگ میں ملک و قوم کا نام روشن کرنا چاہیے۔ امیج بلڈنگ صرف کھیل کے میدان میں ہی نہیں ہوتی اور بھی میدان ہیں"۔

بارہ دن ایل اے میں رہ کر بھی شہر کے مشہور مقامات نہ دیکھ سکا تھا۔ گیمز کا جنون اس قدر تھا کہ کسی تفریحی مقام کو دیکھنے کی فرصت تھی اور نہ حسرت۔ زیادہ دیر اس لئے نہیں ٹھہر سکتا تھا کہ بنکاک کے ایشین انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں میرا کمپیوٹر کورس شروع ہونے والا تھا۔ اس لئے مون نے جب ایل اے دیکھنے کی دعوت دی تو میں نے اسے بغیر کسی تامل کے قبول کرلیا۔ اگر وہ نہ بھی کہتی تو شاید میں خود ہی اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیتا۔

پتہ نہیں، کس وقت سگار بجھا تھا۔ نہ جانے کس سمے نیند نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب نرگس کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو نے میرے نتھنوں میں سرایت کرنا شروع کیا۔ مون اور سارا کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ سارا بار بار پھولوں کو میرے چہرے کے قریب لے آتی۔ جگانے کا یہ نرالا انداز تھا۔

''کیا ساری رات تم نے اس بید کی کرسی پر گزار دی ہے؟'' مون کو حیرت ہو رہی تھی۔

''اختر شماری کرتا رہا ہوگا'' سارا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''شاعروں اور ادیبوں کو تارے گننے اور چاند دیکھنے کا ہمیشہ شوق رہا ہے''۔

''رات یادوں کی بارات آئی تھی۔ میں انہی خیالوں میں مگن سو گیا'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تمہیں خنکی کا احساس نہیں ہوا۔ رات تو اچھی خاصی ٹھنڈ ہو گئی تھی'' مون میرا ماتھا چھوتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا جسم خاصا سرد ہے۔ میں کافی بنا کر لاتی ہوں''۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے سارا کی طرف دیکھا۔ ''یہ چند اور جلی کٹی باتیں کرے گی تو جسم میں خود بخود حرارت آ جائے گی''۔

''یہ کافی نعم البدل نہیں ہو سکتی'' مون مسکرائی اور باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ سارا میرے پاس رکھی ہوئی دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی ''شاہ! واقعی حیران کن بات ہے تم کمرے کا اتنا اچھا COSY ATMOSPHER چھوڑ کر باہر کیسے سو گئے۔

''روز Atmosphere کی وجہ سے..... پورے چاند کی چاندنی، چار سو اٹھتی ہوئی پھولوں کی خوشبو، ایک ایسی نرم اور ملائم خنکی جو جسم کو عجیب قسم کا سکون مہیا کرتی ہے۔ روح میں طراوت پیدا کرتی ہے۔ اس ماحول میں اندر سونا کفران نعمت ہے!''

بولی، ''یقین نہیں آتا۔ سچ سچ بتاؤ! کہیں سامنے والے مکان کی کھڑکی سے کوئی حسین نظارہ تو نہیں دیکھ لیا''۔

''تو پھر میں جاگ رہا ہوتا!! رات آنکھوں میں کٹتی! یوں بے خبر نہ سوتا''۔

''ہاں! یہ بات تو ہے'' وہ لاجواب سی ہوگئی۔

مون کافی کے تین کپ بنا کر لے آئی۔ بڑی مزیدار کافی تھی۔ گرم، خوش ذائقہ اور تازہ! میرے حلق کا کسیلا پن دور ہوگیا اور کرسی پر نیم دراز رات گزارنے سے جو تھکن سی پیدا ہوئی تھی وہ کافی حد تک ختم ہوگئی۔

مون بولی ''شاہ! اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج ہم نے بہت مصروف دن گزارنا ہے۔ ڈزنی لینڈ صحیح طرح سے ایک دن میں دیکھنا خاصا مشکل ہے اور ہمارے پاس صرف آج کا دن ہی ہے''۔

''میرا کیا ہے۔ میں دس منٹ میں تیار ہو جاؤں گا۔ یہ بات اپنی عزیز سہیلی کو بتاؤ جو اخبار بھی بغیر میک اپ کے نہیں پڑھتی!''

''کیا تم اس پر ریسرچ تو نہیں کر رہے۔ چند دنوں میں ہی اس قدر گہرا مشاہدہ! خالی از خطرہ نہیں!''

مون نے ہم دونوں کو بیک وقت دیکھا۔

''اس پر کسی تحقیق کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ اپنا چلتا پھرتا اشتہار ہے''۔

''تو شرط لگ جائے پہلے کون تیار ہوتا ہے'' سارا میرے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

''پہلے ہی بہت ہار چکی ہو میں تمہیں مزید شرمندہ نہیں کرنا چاہتا''۔

ہم ناشتہ کر کے صبح نو بجے گھر سے نکلے۔ مون نے ڈرائیور کو چھٹی دے دی اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مجھے اس نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کیلئے کہا۔ سارا اور کیتھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ جب گاڑی چلی تو مون کہنے لگی ''آج ہم والٹ ڈزنی کی طلسماتی دنیا دیکھیں گے۔ سچ پوچھو تو اگر ایل اے میں ڈزنی لینڈ اور

ہالی وڈ نہ ہوتے تو شہر شہرت کے اس مقام پر نہ پہنچتا"۔

"میں نے اس کے ساحلوں کی بھی تعریف سنی ہے۔ لونگ بیچ' سانتا' مونیکا!"

کہنے لگی "ساحل تو دیگر ریاستوں میں بھی ہیں اور شاید ان سے بڑھ کر خوبصورت بھی ہوں گے لیکن جس چیز نے اسے شہرت دوام بخشی ہے وہ والف ڈزنی کا شہکار "ڈزنی لینڈ" ہے۔ ڈزنی کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ ایک غریب آدمی سے کروڑ پتی بن گیا' یا اس نے ماڈرن تفریح گاہیں بنائیں بلکہ اس کی عظمت اس بات میں پنہاں ہے کہ اس نے افسردہ لبوں پر مسکراہٹیں بکھیریں' اداس دلوں کو شادمانی عطا کی۔ اور خیال کو ایک انوکھی جدت بخشی۔ آج ڈزنی نہیں ہے لیکن اس کی LEGACY قائم ہے۔ بیشتر ملک اپنے اپنے ہاں ڈزنی لینڈ قائم کرنے کے متمنی ہیں"۔

"واقعی وہ بڑا عظیم انسان تھا!" میں نے کہا۔

بولی، "اس کی زندگی کے حالات بڑے دلچسپ ہیں۔ انسان عزم و ہمت اور جہد مسلسل سے ابدیت کے مقام پر پہنچ سکتا ہے۔ اسے خصوصاً بچوں سے بڑی محبت تھی کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ قوموں کی ترقی کا راز بچوں کی صحت مند تربیت میں ہے۔ مکی ماؤس اور ڈونلڈ ڈک پر اس کی کارٹون فلمیں پہلے پہل 1930ء میں بنائی گئیں تھیں آج بھی مقبول ہیں"۔

"کیا وہ لاس اینجلس کا رہنے والا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اکثر مشہور آدمی یہاں کے پیدائشی نہیں ہیں۔ اس شہر کی کشش انہیں یہاں لے آتی ہے۔ ڈزنی شکاگو کا رہنے والا تھا۔ دسمبر 1901ء میں پیدا ہوا۔ وہ ایک بڑھئی کا بیٹا تھا۔ آبائی پیشے کی مناسبت سے اسے شروع ہی سے پینٹنگ اور ڈرائنگ کا بڑا شوق تھا۔ کینساس کے سکول میں اس نے کارٹون بنانے کی تربیت حاصل کی۔ اس کی خواہش تھی کہ بڑا ہو کر اخبار میں بطور ایک "کارٹونسٹ" کے نوکری کرے۔ لیکن پہلی جنگ عظیم نے اس کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی اور وہ ریڈ کراس میں ٹرک ڈرائیور کے طور پر بھرتی ہو گیا۔ اس سلسلہ میں اسے جرمنی اور فرانس جانا پڑا..... جنگ ختم ہوئی تو اس کے ساتھ ہی والٹ کا پرانا شوق بھی عود کر آیا۔ خوش قسمتی سے اس کی ملاقات ایک نوجوان آرٹسٹ UB IWERKS سے ہوئی۔ ایک

سیکنڈ ہینڈ کیمرے اور ایک چھوٹے سے بوسیدہ کمرے میں جسے وہ بطور سٹوڈیو استعمال کرتے' انہوں نے مل کر ٹی وی کمرشل اور ان کے ساتھ ساتھ کارٹون بنانے کا کام شروع کیا۔ تاہم نیویارک کے ایک فلمی ڈسٹری بیوٹر نے ان کے ساتھ دھوکا کیا اور ان کا چھوٹا سا کاروبار تباہ ہو گیا۔ ڈزنی نے شکاگو چھوڑ دیا اور لاس اینجلس اپنے بھائی رائے کے پاس چلا آیا۔ دوبارہ سابقہ کاروبار شروع کیا۔ اس کی قسمت نے پلٹا کھایا اور جب 1922ء میں موشن فلموں میں آواز لائی گئی تو اس کے ذہن رسا نے ایک خوش باش' چست اور شرارتی چوہے کا کردار تخلیق کیا۔ جسے سب لوگ ''مکی ماؤس'' کے نام سے جانتے ہیں۔

1930ء کی کساد بازاری میں اس کی فنکارانہ صلاحیتیں مزید ابھریں۔ اس نے اپنی فلموں کے ذریعے لوگوں میں یہ احساس اجاگر کیا کہ مایوسی گناہ ہے۔ غم و آلام ہمیشہ نہیں رہتے اور انسان کو مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ اس کی فلم LITTLE THREE PIGS نے امریکہ میں ہلچل مچا دی۔ ایک چھوٹا سا Pig جو نامساعد حالات کے باوجود اپنا چھوٹا سا گھروندہ بناتا ہے اور دشمن بھیڑیے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گنگناتا ہے WHO AFRAID OF THE BIG BAD WOLF''۔ اس فلم نے نہ صرف اس کی شہرت میں بے پناہ اضافہ کیا بلکہ معاشی طور پر بھی اسے مضبوط کیا.....!''

''واقعی وہ بڑے مضبوط ارادے کا انسان تھا!'' میں نے مون کی باتیں سن کر اسے خراج عقیدت پیش کیا۔

بولی ''یہاں پر اس کی زندگی کی کہانی ختم نہیں ہوتی۔ وہ ان لوگوں کی طرح نہیں تھا جو چند کلیوں پر قناعت کر جاتے ہیں۔ اسے خوب سے خوب تر کی تلاش تھی۔ وہ کارٹون فلموں سے نکل کر مکمل فلمیں بنانے کا آرزومند تھا۔ چنانچہ 1935ء میں اس نے کلاسیک فلم SNOW WHITE AND SEVEN DWARFS تخلیق کی جسے بے حد پسند کیا گیا۔ یہ کامیابی اس کو زندگی کے ایک نئے موڑ پر لے آئی۔ پھر فلموں پر فلمیں بننے لگیں ALICE IN WONDER LAND ABSENTMINDED PROFSS (1951), CINDERELLA(1951), PETERPAN(1953),

اور جب فلم MARY POPPINS مارکیٹ میں آئی تو اس وقت تک ڈزنی شہرت کی بلندیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اور تمام دنیا اس کے نام اور کام سے روشناس ہو چکی تھی۔

''یہ پارک اس نے کب بنایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''1957ء میں اس پر کام شروع ہوا۔ ڈزنی چاہتا تھا کہ ایسا تفریحی پارک بنایا جائے جہاں جا کر لوگ اپنے تفکرات سے آواز ہو جائیں اور صحیح معنوں میں لطف اندوز ہو سکیں۔ وہ انسان کی ناآسودہ خواہشوں کو وقتی طور پر ہی سہی' ایک آسودگی بخشنا چاہتا تھا۔ زندگی کا روشن پہلو دکھانا چاہتا تھا۔ پانچ سال کی مسلسل تعمیر اور زیبائش کے بعد 1955ء میں اسے پبلک کیلئے کھول دیا گیا۔ یہ پارک ہر عمر کے بچے کیلئے ہے''۔ مون گاڑی کو اینا ہیم روڈ کی طرف موڑتے ہوئے بولی ''وہاں جا کر پانچ سالہ بچے پسند کرتے ہیں!''

سارا نے چپ کا روزہ توڑا۔

''میں حیران تھی کہ تم اتنی دیر سے چپ کیسے بیٹھی رہیں۔ مجھے تو تشویش شروع ہو گئی کہ یا تو تمہارا گلا خراب ہے یا پھر سر میں درد ہے'' مون مسکرائی۔

''گلا نہیں اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جبھی تو خوابوں کے جزیرے کو پیاز اور پنیر کی دنیا میں لے آئی ہے''۔ کیتھی نے ڈانٹ پلائی۔

''جسم کے ساتھ روح کی غذا بھی ضروری ہے'' مون کیتھی سے اتفاق کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ڈزنی کا تخیل اور استقلال' اس کی حس مزاح' اس کی عوامی مزاج شناسی نے نہ صرف اسے امریکہ کے بڑے فلم سازوں اور تاجروں کی صف میں لا کھڑا کیا بلکہ اسے ایسی شہرت بھی بخشی جو دنیا کی کوئی دولت نہیں خرید سکتی.....!''

ڈاؤن ٹاؤن کے بعد بڑی عمارتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور سڑک کے دورویہ چھوٹے چھوٹے مکانات نظر آئے۔ میرے لئے کم از کم یہ راستے اجنبی نہ تھے۔ اورنج کاؤنٹی سے مین کالیسیم اور ایسٹ ایل اے کالج گراؤنڈ پہنچنے کا یہی راستہ تھا۔ ڈبل ڈیکر بس میں بیٹھ کر میں نے ان سڑکوں کو کئی بار دیکھا تھا۔ کسی شہر کو اچھی طرح دیکھنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ یا تو آدمی پیدل چلے یا پھر بس پر سفر کرے۔ چونکہ بس ہر سٹاف پر

ٹھہرتی ہے اس لئے وہ علاقہ اچھی طرح دیکھا جاسکتا ہے۔ ایل اے جیسے شہر میں تو پیدل چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتے پہنچتے یا تو جوتے چٹخ جائیں گے یا پھر پاؤں میں موچ آجائے گی۔

مرسیڈیز 500 میں بیٹھ کر مون اور اس کی سہیلیوں سے باتیں کرتے کرتے وقت کا احساس نہ ہوا۔ اور ہم ڈزنی لینڈ پہنچ گئے۔ پارکنگ لاٹ دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چار دیواری کے اندر کوئی میلہ لگا ہوا ہو۔ یا پھر گاڑیوں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا ہو۔ امریکیوں کو چھوٹی گاڑیوں سے غالباً چڑ ہے اسی لئے اس لنکا میں جو گاڑی بھی دیکھی 'باون گز' کی نکلی۔ جو لوگ بس پر سفر کرتے ہیں ان کی سہولت کیلئے بس سٹاپ سے لے کر ڈزنی لینڈ تک مونو ریل چلتی ہے۔ لوہے کے مضبوط ستونوں پر بنی ہوئی پٹڑی پر جب گاڑی چلتی ہے تو ایک انوکھے تجربے کا احساس ہوتا ہے۔ گاڑی پارک کر کے ہجب مرکزی دروازے تک پہنچے تو ٹکٹ کی کھڑکی کے سامنے لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ دنیا بھر کے ٹورسٹ ٹکٹ خریدنے کیلئے اپنی بار کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ ہماری باری آنے تک آدھ گھنٹہ لگ جائے گا۔ لوگ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی ٹرن کا انتظار کر رہے تھے۔ نہ تو دھکم پیل تھی نہ کوئی قطار کو توڑنے کی جرأت کر سکتا تھا۔ ہمارا قومی مزاج ایسا ہے کہ نہ تو ہمیں قطار میں کھڑا ہونے کی عادت ہے نہ حوصلہ۔ سینما ہال کے باہر کا منظر دیدنی ہوتا ہے۔ دھکم پیل میں لوگ دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ سیٹیاں اور نعرے لگاتے ہوئے سروں' کندھوں پر پھسلتے ہوئے منچلے یوں کھڑکی کی طرف لپکتے ہیں جیسے آب حیات بٹ رہا ہو۔ بعد ازاں بڑے فخر سے سناتے ہیں کہ کتنے لوگوں سے لڑ جھگڑ کر انہوں نے پہلے ٹکٹ خریدا۔ ہر چند کہ قطار میں کھڑا ہونے کا مجھے بھی کوئی زیادہ تجربہ نہ تھا اور کالج کے دنوں میں بھی میں فلم دیکھنے اس شرط پر جاتا تھا کہ ٹکٹ میرا 'روم میٹ' خریدے گا۔ لیکن یہ دیار غیر تھا اور پھر مردانہ وقار کا سوال۔

میں نے مشورہ دیا کہ وہ سائے میں کھڑی ہو جائیں۔ میں چاروں ٹکٹ خرید کر لے آتا ہوں۔ لیکن سب نے صاف انکار کر دیا۔

بولیں، ''کیا فرق پڑتا ہے۔ کیوں نہ سب ہی قطار میں لگ جائیں۔ بات چیت میں وقت بھی کٹ

جائے گا اور اپنی باری پر ٹکٹ بھی خرید لیں گے"۔

بڑا عجیب منظر تھا۔ واقعی اہل نظر نے ایک تازہ بستی آباد کی تھی۔ والٹ ڈزنی کے خوابوں کی تعبیر۔ ایک کارپینٹر کا بیٹا شہرت اور امارت کی آخری حدوں کو چھوتا نظر آتا تھا۔ لوگ یوں جوق در جوق آ رہے تھے جیسے کوئی زیارت یا پوجا کرنے آئے ہوں۔ چینی' جاپانی' ایشین' یورپین' سیاہ فارم کوئی ملک ایسا نہیں تھا جس کی نمائندگی نہ کی جا رہی ہو۔ ڈزنی لینڈ دیکھنے کے دو طریقے ہیں۔ وہ جن کے پاس وقت زیادہ ہوتا ہے یا جو بچوں کے ساتھ آتے ہیں وہ تو الف سے لے کر یے تک سبھی آئٹم دیکھ ڈالتے ہیں۔ اور جن کے پاس وقت کم ہو وہ اپنی مرضی کے منتخب پروگرام دیکھ سکتے ہیں۔ تمام نقشے اور گائیڈ بکس گیٹ پر ہی مل جاتی ہیں۔ چاند ستاروں کی دنیا' خلاؤں میں پرواز کرنے کی آرزو' تہہ سمندر کی میرین لائف' لرزہ براندام کرنے والی خطرناک رائیڈز' اور ان سب سے بڑھ کر فینٹسی لینڈ۔ نا آسودہ خواہشوں کی تکمیل۔ والٹ ڈزنی نے واقعی نہ صرف ہر عمر کے بچوں کا خیال رکھا تھا بلکہ بڑوں کو بھی باور کرایا تھا کہ عزم و ہمت سے ستاروں پر بھی کمندیں ڈالی جا سکتی ہیں۔ جو چیز اسے اپنے ہمعصر فلم سازوں میں منفرد اور ممتاز کرتی تھی وہ اس کی ORIGINALITY تھی۔ وہ دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں تھا۔ اس نے اپنی آگ خود جلائی تھی۔ ایک ایسی آگ جس میں سے گزر کر آدمی کندن بن جاتا ہے۔ لاس اینجلس میں ڈزنی لینڈ دیکھے بغیر جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بنارس میں بغیر مندر دیکھے لوٹ جائے۔ دنیا میں جب بھی اس کا ذکر ہوتا ہے کوئی نہیں کہتا کہ "ڈزنی لینڈ" جو ایل اے میں ہے' لوگ کہتے ہیں وہ لائس اینجلس کے ماتھے کا جھومر ہے تو "ڈزنی لینڈ" اس کے سر کا تاج ہے۔ جس میں سکون' مسرت اور شادمانی کے 'کوہ نور' ہیرے ٹکے ہوئے ہیں۔

اندر داخل ہوتے ہی 'SPACE WALK' تھا۔ خلاؤں میں پرواز!

سارہ کہنے لگی، "شروعات یہاں سے کی جائیں۔ کتنا دلچسپ نظارہ ہوگا جب چاند چاند پر اترے گا۔ اس کا شارہ مون کی طرف تھا"۔

"کیا خیال ہے" اس نے شرارتاً میری طرف دیکھا۔

''یہ تم شاعری کب سے کرنے لگیں''۔

''ماحول کا اثر ہے'' مون کہنے لگی۔ ''ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پتہ پتہ بوٹا بوٹا گنگنا رہا ہو''۔ خلاؤں کا سفر واقعی خوشگوار تھا۔ آہستہ آہستہ روشنی کم ہوتی گئی۔ دھیرے دھیرے نیلے آسمان پر ستارے نمودار ہنے لگے اور پھر ایک دم چودھویں کا چاند ستاروں کے جھرمٹ میں نمودار ہوا۔ مشتری' مریخ' عطارد' زحل' دب اکبر' کہکشاں' انسان کچھ دیر کیلئے بالکل بھول جاتا ہے کہ وہ اپنے مدار کے گرد ہی گھوم رہا ہے۔ تخیلات کی قدر تیزی سے حقیقتوں میں بدل رہے ہیں۔ ایک شاعر' ایک ادیب' ایک مفکر' خواب دیکھتا ہے اور پھر جلد ہی سائنسدان اسے زندہ حقیقت بنا دیتے ہیں۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' میں نے اپنی پاس والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی مون سے پوچھا۔

کہنے لگی، ''کس قدر پاکیزہ ماحول ہے۔ کوئی آلودگی نہیں ہے۔ کوئی کثافت موجود نہیں۔ انسان نے پہنچ کر اس کو بھی آلودہ کر دینا ہے۔ مکروب فریب' حرص و ہوس' جبر و استبداد' خلاؤں میں بھی جنگیں ہوا کریں گی۔ یہاں معصوم اور کمزور انسانوں کا خون بہے گا''۔

''بڑی حیران کن بات ہے'' میں نے کہا۔ ''فضائے بسیط میں کروڑوں ستارے ہیں۔ ہر ستارہ زمین سے ہزاروں گنا بڑا ہے۔ درمیانی فاصلے بھی کروڑوں میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہوا' برف' پانی بھی کہیں کہیں ہے لیکن حضرت انسان نے اس چھوٹے سے ستارے قدم جمائے ہوئے ہیں۔ اس کائنات میں یا تو آبادی کہیں ہے ہی نہیں یا پھر وہ لوگ ابھی تک اتنے ترقی یافتہ نہیں ہو سکے۔ آدمی وہاں جا کر کشت و خون کرے گا''۔

پندرہ منٹ کی رائیڈ تھی۔ پندرہ منٹ میں ہم نے ایک نیا جہان دیکھ لیا۔ ستاروں کی سرگوشیاں سنیں' چندا ماموں سے باتیں کیں' قطب آسمان کی بے بسی پہ رونا آیا۔ خضر نجستہ گام تو کہیں نظر آئے لیکن راز حیات کسی حد تک جان لیا۔ تھوڑا سا آگے بڑھے تو 'سب میرین رائیڈ تھے۔ زیر آب سفر۔ سب میرین میں بیٹھے تو اس کے خودکار دروازے بند ہو گئے۔ آہستہ آہستہ کشتی پانی کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ ہر طرف میرین لائف نظر آئی۔ وہیل مچھلیاں سب میرین کو اپنی ہی برادری کی کوئی مخلوق سمجھ رہی تھیں۔ کیونکہ سب

میرین کی ساخت بھی مچھلی جیسی ہوتی ہے۔ شارک مچھلیوں کا رویہ البتہ مخاصمانہ تھا۔ یہ کدوت کشتی کے ساتھ نہیں بلکہ اس کی سواریوں کے ساتھ تھی۔ یہ غالباً واحد بدبخت مچھلی ہے جو انسان کی ازلی دشمن ہے۔ جب تک انسانی خون نہ چکھلے اس کی داڑھ گرم نہیں ہوتی۔ خشکی پر یہ چند گز بھی نہیں پھسل سکتی۔ اپنے ہی بوجھ کے نیچے دم توڑ دیتی ہے لیکن سمندر میں اس کی پھرتیاں دیکھنے والی ہوتی ہیں۔ شکار پر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جھپٹتی ہے اور اپنے تیز نوکیلے دانت اس کے جسم میں گاڑ دیتی ہے۔ چونکہ سب میرین میں ہر طرف شیشے لگے ہوئے تھے اس لئے سواریاں ان مچھلیوں کو صاف نظر آتی تھیں۔ وہ جست لگا کر شیشوں سے ٹکراتیں اور اپنی ناکامی پر پھر حملہ کر دیتیں۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار رنگ برنگی مچھلیاں تھیں۔ OYESTERS LOBSTERS آکٹوپس۔ دس منٹ میں یہ رائیڈ بھی ختم ہوگئی۔ چونکہ بیسیوں رائیڈز تھیں اس لئے پانچ دس منٹ سے زیادہ ٹائم دیا جائے تو پھر وہ سنسنی اور چارم نہیں رہتا۔ جب بھی شارک سواریوں پر حملہ آور ہوتی سارا ڈر کر مون سے لپٹ جاتی۔ ''اتنی ڈرپوک لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی'' میں نے سرزنش کی۔ ''کیتھی کو دیکھو! کس قدر آرام سے بیٹھی ہے''۔

بولی، ''جس طرح وہیل مچھلیاں سب میرین کو ہم جنس سمجھ رہی ہیں اسی طرح 'شارک' بھی غلط فہمی میں مبتلا ہیں!''

''کیتھی کو شارک سے تشبیہ دینا بڑی زیادتی ہے۔ اتنی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی''۔

''تم بھی تو کچھ کہو؟'' مون نے کیتھی کو جھنجھوڑا۔

بولی، ''کیا کہوں۔ ہم دونوں کو پانی میں ڈال دو پتہ چل جائے گا 'شارک' کون ہے؟''

ہم چلتے چلتے رولر کوسٹر کے پاس پہنچ گئے۔ اتنی خطرناک ایڈونچرس اور تھرلنگ رائیڈز اور کہیں نہیں ہیں۔ الٹی چلتی ٹرین میں بلندی سے آدمی یوں نیچے آتا ہے جیسے بغیر پیراشوٹ کے جمپ لگا رہا ہو۔ ان میں اکثر بچے اور نوجوان لڑکیاں بیٹھتی ہیں۔ جو خوشی اور خوف کے مارے چیختے چلاتے بھی ہیں اور لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔

''تو ہو جائے ایک رائیڈ یہاں بھی!'' سارا نے چیلنج کے انداز میں بولتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ انجوائے کرو! مجھے اس کا شوق نہیں۔ میں اتنے عرصہ میں کافی کا ایک کپ پی لیتا ہوں''۔

وہ رولر کوسٹر رائیڈ کیلئے چلی گئیں تو میں نے قریبی ریسٹورنٹ میں جا کر کافی کا آرڈر دیا'' BOTTEM LESS CUP OF COFFI'' کسی ملک کی خوشحالی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ایک کپ کافی خریدیں۔ اس کے بعد حسب خواہش جتنی اور جس قدر چاہیں کافی پی سکتے ہیں۔ مزیدار اور خالص دودھ میں بنی ہوئی کافی۔ اشیائے خوردنوش کی جس قدر فراوانی اور ارزانی اس ملک میں ہے اور کہیں نہیں۔ دنیا جہان کا پھل' انڈے' دودھ' ڈبل روٹی' چند ڈالر کا سامان سٹور سے خرید کر لائیں تو ہفتہ بھر ختم نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس سابقہ سپر پاور روس کو دیکھ لیں' کھانے کو روٹی نہیں' پینے کو مشروبات نہیں ہیں' پہننے کو ڈھنگ کا کپڑا نہیں ملتا۔ چھبیس ہزار ہائیڈروجن بم' بین البراعظمی میزائلوں سے لیس!..... کیا فائدہ ایسے بم کا جو لوگوں کا تن نہ ڈھانپ سکے۔ دنیا میں آج تک کوئی ایسا میزائل نہیں بنا جسے بطور خوراک کے استعمال کیا جا سکے۔ یہ مضبوط معیشت کا دور ہے۔ دفاع بھی ساؤنڈ اکانومی کا مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ پچاس ریاستوں کے ساتھ بھی مضبوط اور مستحکم ہے اور سوویت یونین ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ آج بھی روس میں فوجوں کو مہینوں تنخواہ نہیں ملتی۔ عوام نان جویں کو محتاج ہیں۔ آج جب لینن کی روح اپنی اقلیم شکستہ کا طواف کرتی ہوگی تو ضرور مضطرب اور مضمحل ہوتی ہوگی۔ صدیوں کا مسیحا بیمار ہو گیا ہے۔ روایات خضر گم گشتہ منزل نظر آتی ہیں۔ یہ اپنے زخموں پر پھاہا بھی اپنے ازلی دشمن سے رکھوانے پر مجبور ہے۔ جو لوگ تاریخ کے طالب علم ہیں اور قوموں کے عروج و زوال کا ادارک رکھتے ہیں انہیں ایک نشان عبرت نظر آتا ہے۔

کافی پی کر میں اخبار پڑھنے لگا۔ اخبار تو غالباً تکلفاً کہا جاتا ہے' پوری کتاب ہے۔ سو صفحے کا اخبار۔ دراصل لوگ پورا اخبار خریدتے ضرور ہیں۔ ہماری طرح تنکھیوں سے بیڑی نہیں مارتے، یا بغیر کسی تردد کے یہ نہیں کہتے ''بھاجی! اگر اخبار پڑھ لیا جے تے ذرا سانوں وی دیو! چوندی، چوندی خبر پڑھ لیے'' (بھائی صاحب' اگر آپ نے اخبار پڑھ لیا ہے تو تھوڑی دیر کیلئے ادھر کریں ہم بھی گرما گرم خبریں پڑھ لیں)۔

امریکہ میں بھی اخبارات گرما گرم خبروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تپش سے اکثر کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ چوری' ڈاکے' جنسی جرائم' قتل و غارت گری' یا پھر ان کمپنیوں کے تذکرے جن کے بھٹے بیٹھ گئے ہوں HIGHLY COMPETITIVE SOCIETY جس میں صرف مضبوط ہی مارکیٹ میں زندہ رہ سکتا ہے۔ کمزور کمپنیاں اور ادارے حرف غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔

اخبارات کئی حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی خبریں جن کو امریکہ کی اکثریت نہیں پڑھتی۔ ایک عام امریکی کی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ ملکی خبریں' فیشن' آرٹ' کلچر' میڈیسن' ایجادات' بزنس اور کھیل اور ان میں سے بھی کھیلوں کی خبریں زیادہ شوق سے پڑھتی جاتی ہیں۔ لیکن یہ وہ کھیل ہوتے ہیں جو اکثر دنیا میں نہ تو کھیلے جاتے ہیں اور نہ اکثریت کو ان کے قواعد ضوابط کا علم ہوتا ہے۔

ہر چند کہ امریکہ میں ابتداً زیادہ لوگ برطانیہ سے آئے۔ امریکہ کی زبان بھی انگریزی ہے۔ ایک عرصہ تک برطانیہ کے محکوم بھی رہے لیکن انگلستان کے قومی کھیل کرکٹ سے قطعاً آشنا نہیں۔ جو لوگ تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں وہ بھی اسے تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ پانچ دن تک ٹک ٹک!! اور پھر پتہ چلتا ہے کہ ''میچ ڈرا ہو گیا ہے''۔ ہٹلر بھی غالباً اس غلط فہمی میں مارکھا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جو قوم پانچ دن کے کھیل کے بعد فیصلہ نہیں کر پاتی وہ جنگ کا مشکل مرحلہ کیسے طے کرے گی۔ یہ امریکہ ہی ہے جہاں رگبی' بیس بال' باسکٹ بال' اور باکسنگ کے کھلاڑی کو ایک میچ کا دس کروڑ روپے تک معاوضہ مل سکتا ہے۔ چنانچہ میچ فکسنگ کی نوبت ہی نہیں آتی۔ کھیلوں کے میدان اور انڈور سٹیڈیم دیکھیں تو طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ ان کے بند سٹیڈیم ہمارے کھلے میدانوں سے بڑے ہیں۔ کئی منزلہ اور ہر قسم کی سہولتوں سے آراستہ۔

میں اخبار اس قدر انہماک سے پڑھ رہا تھا کہ مجھے خبر ہی نہ ہوئی کہ مون اور سارا میرے دائیں بائیں کھڑی ہیں اور میری بے خبری پر مسکرا رہی ہیں۔ آخر سارا نے مجھے جھنجھوڑا' تو اخبار سے نظریں ہٹا کر میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ''تم لوگ کب آئے۔ پتہ ہی نہیں چلا؟''

مون بولی، ''تم اخبار اس طرح پڑھ رہے تھے جیسے کوئی بائبل پڑھتا ہے''

''خبریں نہیں پڑھ رہا تھا۔ تصویریں دیکھ رہا تھا! مہ رخوں کی نیم برہنہ تصویریں۔ ذرا غور

سے تو دیکھو" سارا نے انگلی کیا شارے سے مون کی توجہ مبذول کرائی۔

"تمہارے ذہن میں کوئی شرارتی شیطان گھسا ہوا ہے جو ہر چیز کا منفی پہلو دیکھتا ہے۔"

مون نے اسے ڈانٹا۔

"اگر سچ بولنا شیطانی کام ہے تو میں اس شیطانی کا خیر مقدم کروں گی۔"

"اسے بولنے دو! کبھی کبھی تو سچ بولتی ہے۔" کیتھی بحث میں شامل ہوتے ہوئے بولی!

ہمیں آئے ہوئے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ مون کہنے لگی "سارا ڈزنی لینڈ ایک دن میں دیکھنا ناممکن ہے، چیدہ چیدہ آئٹم دیکھ لئے ہیں۔ ان میں ٹرین رائیڈ، میجک کنگڈم، کریبین کے بحری قزاق اور برفانی انسان سے ٹاکرا زیادہ اہم ہیں۔ ٹرین رائیڈ اس اعتبار سے زیادہ دلچسپ تھی کہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کوہسار، جنگل، غاریں، وائلڈ لائف، جھیلیں اور سبزہ زار سبھی ایک گھنٹے میں دیکھ ڈالے۔

ڈزنی نے ٹیکنالوجی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر چیز کی شبیہ کھڑی کر دی۔ ماحول کو اس قدر نیچرل بنایا گیا تھا کہ محسوس ہوتا تھا جیسے ہم لاس اینجلس میں نہیں بلکہ افریقہ کے کسی جنگل میں سے گزر رہے ہیں۔ غاروں سے گزرتے ہوئے جنگلی جانور ڈراتے تھے۔ مرغزاروں میں معصوم ہرن کلیلیں بھر رہے تھے۔

مون کہنے لگی "کچھ اور دیکھنے سے پہلے لنچ کر لیا جائے۔ یہاں کا پیزا ہٹ بہت مشہور ہے۔ اٹالین پیزا نے بھی امریکن برگر کی طرح کافی پر پرزے نکالے ہیں۔ ہر چند کے یہ میکڈونلڈ اور کینٹکی فرائیڈ چکن کے برابر تو نہیں آسکا لیکن اس کی مقبولیت میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک خاص طریقے سے بنایا ہوا میدے کا بڑا سا نان اور اس پر پنیر، مکھن، چکن، فش حسب فرمائش اور حسب ضرور..... پوری پرات پر پھیلا ہوا پیزا تو جوان لڑکے اور لڑکیاں یوں رغبت سے کھا جاتے ہیں جیسے کوئی پوٹیٹو چپس کھا رہا ہو..... مون نے ٹونافش والے پیزا کا آرڈر دیا..... ہاتھ کی انگلی سے بھی چھوٹی مچھلیاں، ہری اور سرخ مرچوں کی طرح، سارے نان پر ٹکی ہوئیں..... میں نے پہلا لقمہ لیا تو مجھے متلی سی ہوئی۔ اتنی چھوٹی مچھلی اور وہ بھی باسی۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"پسند نہیں آیا؟" مون نے میری طرف دیکھا۔

''حلق سے اتر نہیں رہا۔''

''اوہ آئی سی! اس کے لئے ٹیسٹ ڈویلپ کرنا پڑتا ہے۔ چلو کہیں اور چلتے ہیں۔ کیونکہ یہاں صرف پیزا ہی ملتا ہے۔ اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا!

''اس میں قصور پیزے کا نہیں مچھلی کا ہے۔ بالکل مکڑی لگتی ہے۔ میرے خیال میں کہیں اور جانا بیکار ہوگا۔ کیونکہ میں کافی کے ساتھ چپس لے چکا ہوں۔''

کہنے لگی، ''پھر ویجی ٹیبل پیزا ٹرائی کرلو۔ شاید یہ تمہیں پسند آجائے!''

ویجی ٹیبل پیزا واقعی مزیدار تھا۔ میں نے بڑی رغبت سے کھایا۔ کھانا کھا کر ہم RIRATES OF THE CARRIBEA دیکھنے چل پڑے..... جن لوگوں نے 1970ء اور 1980ء کی دہائیوں میں ویسٹ انڈیز کی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں کو دیکھا ہے انہیں کچھ کچھ اندازہ ہو جائے گا کہ کریبین کے بحری قزاق کس قسم کے ہوں گے۔ جول گارنر، میلکم مارشل، کولن کرافٹ اور مائیکل ہولڈنگ جس قسم کی ہڈی پسلی توڑ باؤلنگ کرتے تھے، اتنی ہی سفاکی اور بے رحمی سے بحری ڈاکو تجارتی قافلوں کو لوٹتے تھے۔ ان تمام مناظر کو ایک SEQUENCE میں دکھایا جاتا ہے۔ آپ کشتی پر سوار ہوتے ہیں، مشینی آدمی، توپوں کی گھن گرج، مضبوط قلعے زمین بوس ہوتے ہوئے..... قتل و غارت..... لوٹ مار..... نوجوان عورتوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے وحشی مرد..... ہر طرف دست درازیاں..... بوس و کنار..... نفسا نفسی کا عالم۔ ان دنوں سفر کس قدر خطرناک ہوتا تھا۔ مسافر گناہ بخشوا کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر گھر سے نکلتے تھے۔ بحیرۂ کریبین کے قزاق..... ناروے کے وائی کنگز کی طرح نہایت لڑاکے جانباز اور فنونِ حرب میں مہارت رکھتے تھے۔ تجارتی جہازوں پر یوں جھپٹتے جیسے باز چڑیوں کو دبوچتا ہے۔

''کس قدر ظالم لوگ تھے۔ دیکھو عورتوں کے پیچھے کس طرح دیوانہ وار بھاگ رہے ہیں جیسے کھا ہی جائیں گے۔'' سارا کے لہجے میں خوف تھا۔

''ظلم آج بھی ہو رہا ہے۔ بحری قزاق اور لٹیرے اب بھی دندنا رہے ہیں۔ صرف ٹیکنیک بدل گئی ہے۔ لوٹنے کے طور طریقے بدل گئے ہیں۔ اب ان لٹیروں کو کمزور انسانوں کے پیچھے بھاگنا نہیں

پڑتا بلکہ مشعلیں خود بخود آتی ہیں ہوا کی جانب۔ انصاف ان کے لئے ہاتھ کی چھڑی ہے۔ غریب ملکوں کو مزید غریب بنانے کا فن، انہیں آپس میں لڑانے اور ٹکرا ٹکرا کے گر جانتے ہیں۔ شکاری نیا جال لائے ہیں جس کے پھندے مضبوط ہیں"..... میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

"البتہ ایک فرق ضرور پڑا ہے۔ اب یہاں مرد عورتوں کو پیچھا نہیں کرتے۔ عورتیں مردوں کو تاکتی ہیں۔"

"بالکل غل" سارا نے مجھے ٹوکا۔

"اب ہماری مون کو ہی دیکھو! ایک جہان اس پر مرمٹا ہے۔ لیکن یہ کسی کو گھاس ہی نہیں ڈالتی۔"

"مون کی مثال مت دو!" ایسی لڑکیاں تو صرف قصے کہانیوں میں ملتی ہیں۔ اپنی مثال کیوں نہیں دیتیں!" کیتھی کہنے لگی۔ "تم بوائے فرینڈ اس طرح بدلتی ہو جس طرح لڑکیاں اسکارف بدلتی ہیں!"

"اب اگر کوئی گلے کا ہار ہو جائے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" سارا مسکرائی۔

Encounter with the abomonable snow man بڑا دلچسپ تھا۔ چھوٹی ٹرین مختلف غاروں اور پہاڑوں پر سے گزرتی ہے اور چلتے چلتے بارہ فٹ کا برفانی آدمی، ایک دم کسی کچھار سے نکلتا ہے اور ایک دھاڑ کے ساتھ اپنے بازو دبوچنے کے انداز میں پھیلا دیتا ہے۔ اس کی آمد اچانک ہوتی ہے اور شکل وصورت اور آوازیں اس قدر ڈراؤنی کہ لڑکیاں چیخنا چلانا شروع کر دیتی ہیں۔ برفانی انسان زندہ حقیقت ہے یا محض تخیل کی پیداوار، لیکن والٹ ڈزنی نے اسے ایک زندہ حقیقت بنا دیا ہے۔ میجک کنگڈم دیکھ کر جب ہم واپس لوٹے تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ اندازہ ہی نہ ہوا کہ 340 ایکڑ کے اس حیرت کدہ میں ہم نے سات گھنٹے گزار دیئے ہیں۔ چل چل کر برا حال ہو گیا۔ سارا نے تو باقاعدہ لنگڑانا شروع کر دیا۔

"اس کی حالت پر رحم کھاؤ" میں نے مون کو کہا۔ نہیں تو بے رحمی حیوانات والے ہمارا چالان

کردیں گے۔

''لیکن میں تو انسان ہوں'' سارا نے احتجاج کیا۔

''یہاں انسانوں سے زیادہ جانوروں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ نیویارک میں بیشمار لوگ روز قتل ہوتے ہیں۔ لوگ اسے روز کا معمول سمجھتے ہوئے کوئی خاص توجہ نہیں دیتے۔ لیکن اخبار میں اگر یہ خبر چھپ جائے کہ فلاں شخص نے اپنی بلی یا کتے کو دو دن بھوکا رکھا ہے تو سارا ملک احتجاج شروع کر دیتا ہے۔ اخبارات ایڈیٹوریل لکھتے ہیں اور کچھ ایسا تاثر دیا جاتا ہے جیسے اس سے بڑا بہیمانہ فعل آج تک سرزد نہیں ہوا!''

''اس سے تو یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ کس قدر حساس اور مہذب ہے جو جانوروں کی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا.....'' سارا سنجیدہ نظر آتی تھی۔

''اس سے یہ بھی تو ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارا معاشرہ توازن کھو بیٹھا ہے اور غلط ترجیحات قائم کر رکھی ہیں۔''

''اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ جانور بے بس اور لاچار ہوتے ہیں جبکہ انسان نسبتاً سمجھ دار اور خود مختار ہوتے ہیں'' مون بحث میں شریک ہوتے ہوئے بولی۔

''دراصل تم نے بے بس اور مظلوم انسانوں کو نہیں دیکھا جو جانوروں سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں..... جس طرح پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے شخص کو گہرائیوں کا احساس نہیں ہوتا..... اسی طرح ایک خوشحال اور امیر معاشرے کے فرد کو مفلس اور نادار لوگوں کے شب و روز کا ادراک نہیں ہوتا''.....

''اب بس کرو!'' سارا کہنے لگی۔ ''میں تھوڑی دیر اور کھڑی رہی تو گر جاؤں گی۔ پھر تمہیں مجھے گاڑی تک اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔ جانتے ہو میرا وزن کس قدر ہے؟''

''ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کا وزن کبھی بھاری نہیں ہوتا۔''

''اس کی وجہ؟'' تینوں بیک وقت بول پڑیں۔

''کیونکہ مرد عورت کو بازوؤں کے زور سے نہیں بلکہ جذبوں کی قوت سے اٹھاتا ہے۔''

''لیکن سائنس کی رو سے تو ہر وزن دار چیز کو اٹھانے کیلئے ایک خاص قوت درکار ہوتی ہے۔''

''عورت خود ایک سائنس ہے۔اس پر دیگر کسی فارمولے کا اطلاق نہیں ہوتا۔''

مون نے پارکنگ فیس ادا کی اور ہم گاڑی میں بیٹھ گئے تو میں نے کہا''ایسے محسوس ہوتا ہے، جیسے ایک دن یہاں ہوا اور روشنی پر بھی ٹیکس لگ جائے گا۔ایئرپورٹ پر سامان کی ٹرالی لینی ہوت و مشین میں ڈالر ڈالنا پڑتا ہے، کہیں گنجان علاقہ میں گاڑی کھڑی کرنی ہو تو ڈالروں کی برسات کرنی پڑتی ہے۔پانی کا گلاس پینا ہو تو پیشگی رقم دینا پڑتی ہے۔حتیٰ کہ کسی سے راستہ پوچھنا ہو تو وہ بھی معاوضہ طلب کرتا ہے۔میں نے نیویارک میں ایک نیگرو سے 42 دین سٹریٹ کا پتہ پوچھا تو بولا"I Will charge for it."

''اس سے اِرتکاز زر نہیں ہوتا۔پیسہ گردش کرتا رہتا ہے۔یہ جو آج تم اس قدر ترقی اور صفائی دیکھ رہے ہو یہ انہیں فیسوں کی مرہونِ منت ہے۔یہاں ادارے ریاست کی طرف کم دیکھتے ہیں اور اپنے وسائل پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔''مون نے وضاحت کی۔

''لیکن تم نیویارک کی بیالیسویں سٹریٹ میں کیا کرنے گئے تھے؟ وہ تو بہت بدنام گلی ہے!''سارا نے میری بات پکڑی۔

''لکھنے سے پہلے مشاہدہ بھی تو ضروری ہوتا ہے!''

''پھر تو چکھنا بھی مجبوری ہوگا!''

''اس سے تجسس جاتا رہتا ہے''

''تم اس سے باتوں میں جیت نہیں سکتیں''کیتھی نے اسے سمجھایا۔''ان لوگوں کو دنیا جہان کی باتیں آتی ہیں۔گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے۔اور تم نے اپنی ریاست سے باہر قدم نہیں رکھا.....!''

''تو کیا ہوا؟''سارا کسمسائی۔''یہ ریاست بھی تو کسی ملک سے کم نہیں ہے۔اس کا نقشہ تو دیکھو!اس کے وسائل پر نظر ڈالو۔اس کے قدرتی حسن پر جس قدر بھی ناز کیا جائے، کم ہے.....''

''سارہ درست کہہ رہی ہے'' میں اس سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر کیلیفورنیا کو امریکہ سے نکال دیتے تو یہ 'امریکا' کبھی نہ بنتا صرف ریل کا یکہ ہوتا..... نیویارک کے نخرے اور شکاگو کی شیخیاں ماند پڑ جاتیں۔''

ڈاؤن ٹاؤن پہنچ کر مون نے گاڑی ویسٹرن بوناونچر ہوٹل کی طرف موڑ دی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ کہنے لگی ''ڈنر ادھر کریں گے۔ میں نے صبح ہی ریزرویشن کرا دی تھیں۔''

''لیکن تمہاری ممی گھر انتظار کر رہی ہوں گی۔''

''وہ یہاں پہنچنے ہی والی ہیں۔ فون پر ان سے بات ہو چکی ہے۔''

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ گھر کھا لیتے، ویسے بھی اب تک پیزا سینے کے اندر پینترے بدل رہا ہے، ہضم نہیں ہوا۔''

بولی، ''کون سا تم نے روز روز آنا ہے۔ ایسے اتفاقات تو کبھی کبھی ہوتے ہیں۔''

''اگر تمہاری نوازشیں اسی طرح رہیں تو ہو سکتا ہے مجھے روز روز ہی آنا پڑے۔''

''روز روز آنے سے تو بہتر ہے کہ آدمی جائے ہی نہیں'' وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔

''آنا جانا کون سا بس میں ہوتا ہے۔ آدمی وقت کے سمندر میں کسی زرد پتے کی طرح لرزتا رہتا ہے۔ بے رحم موجیں اسے جس طرف چاہیں دھکیل دیتی ہیں۔''

بولی، ''کچھ لوگ تو قلزموں کو بھی عبور کر جاتے ہیں۔''

''وہ یا تو ولی ہوتے ہیں یا پھر ہر فکر سے آزاد۔''

''ایسی رسموں کا کیا فائدہ جو انسان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔''

''آدمی یہ زنجیریں اپنے آپ کو خود پہناتا ہے۔''

''لیکن خود اعتمادی اور شوق تو ہر زنجیر کو پگھلا کر رکھ دیتے ہیں۔''

''تاریخ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن تاریخ کے ساتھ ساتھ جغرافیہ بھی ہوتا ہے۔

بارہ ہزار میل کا فاصلہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ تم نے خود ہی کہا تھا کہ بیچ میں سات سمندر حلقوم کھولے کھڑے ہیں۔"

"سمندروں کا پانی بھاپ بن کر فضا میں تحلیل بھی تو ہو جاتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے جس آتش کی ضرورت ہے اسے بسا اوقات مجبوریٔ حالات سرد کر دیتی ہے....."

ویسٹرن بوناونچر، ڈاؤن ٹاؤن میں ٹاؤن ہال کے قریب واقع ہے۔ گلابی اور آف وائٹ رنگ کے اس ہوٹل کی ساخت دیگر فائیو سٹار ہوٹلوں سے کافی حد تک مختلف ہے۔ اندرونی ماحول میں بھی انفرادیت برقرار رکھی گئی ہے اور ڈائننگ ہال میں نہایت عمدہ قسم کا وکٹورین فرنیچر رکھا گیا ہے۔ قالینیں بھی نہایت فیشنی اور دیدہ زیب ہیں۔ مختلف ریسٹورنٹس میں ہر ملک کے کھانے سرو کئے جاتے ہیں۔ ایل اے چونکہ بین الاقوامی شہر بن چکا ہے اس لئے دنیا بھر سے سیاح، بزنس مین، فلمی ستارے، سیاستدان، سائنس دان، ڈاکٹر اور کھلاڑی یہاں آتے ہیں۔ کبھی کبھار کے علاوہ ہر ملک کے لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے مالک کے ماکولات سے لطف اندوز ہوں۔ اس کے پیچھے کوئی خاص قومی جذبہ کارفرما نہیں ہوتا بلکہ عادت کی بات ہے۔ جب ایک دفعہ ذائقہ ڈویلپ ہو جائے تو پھر دیگر کھانے مزہ نہیں دیتے۔ پاکستانی اور ہندوستانی کھانوں میں مرچیں اس قدر زیادہ ہوتی ہیں کہ نیا کھانے والا کان پکڑ لیتا ہے۔ میں نے چند یورپین لڑکیوں کو ایک ہندوستانی ریسٹورنٹ میں مٹن کری کھاتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہرے چقندر کی طرح سرخ ہو رہے تھے۔ اور ناک سے پانی میونسپلٹی کے نلکے کی طرح بہہ رہا تھا۔ یورپین کھانوں میں آلو زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ پاکستان واحد ملک ہے جہاں اسے کھانے کے علاوہ سیاست میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ آلو کو مختلف طریقوں سے پکایا جاتا ہے۔ چپس، پوٹیٹو کٹلس، حیش پوٹیٹو، میش پوٹیٹو اور وہ دن دور نہیں جب طیش پوٹیٹو کی ڈش بھی مارکیٹ میں آ جائے گی.....

ایک کھانا جو ساری دنیا میں مقبول ہے وہ چائنیز فوڈ ہے۔ اس کی مقبولیت کی غالباً یہ وجہ ہے کہ یہ چین میں نہیں پکتا۔ دنیا کے ہر ملک نے چائنیز فوڈ کا اپنا Version تیار کر رکھا ہے۔ پاکستان کی چائنیز ڈشوں اور امریکہ کے کھانوں میں بعد المشرقین ہے۔ ہم نے بھی چائنیز فوڈ کھایا۔ ہوٹل کے

خانسامے کھانا پکانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ خاص طور پر انہیں نے PRAWNS IN HONEY اور پامفرے مچھلی میں تو جان ڈال دی تھی۔ کھانا کھا کر ہم ہوٹل سے باہر آئے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ دوکانوں کے بیرونی چراغ روشن تھے لیکن سب شاپنگ سنٹر بند ہو چکے تھے..... مون کہنے لگی ''شاہ تم تو تھک چکے ہوگے'' تم مام کے ساتھ گھر جاؤ۔ میں سارا اور کیتھی کو ڈراپ کر کے آتی ہوں۔''

''ہم بھی ت ھک چکی ہیں'' سارا بولی۔ ''دس بجے گھر جانے کی کیا تک ہے۔ پہنچتے پہنچتے گیارہ بج جائیں گے۔ صبح پھر یونیورسل سٹوڈیو جانا ہے۔ اس آنے جانے کا کیا فائدہ ہے۔''

''تمہاری مرضی!'' مون نے کندھے اچکائے۔ ''میں سمجھی تھی کہ تمہیں ہوم سکنس HOME SICKNES ہو رہی ہوگی۔''

''گھر میں ہے ہی کیا! جو سکنس پیدا ہوگی'' کیتھی بولی۔

''ایک بھائیں بھائیں کرتا ہوا خالی فلیٹ..... ایک بوسیدہ بیڈ..... جو آہوں اور ہچکیوں کے درمیان لرز رہا ہوگا۔ آج کل اس کی اپنے بوائے فرینڈ ٹونی سے اَن بن ہے۔ دونوں الگ اجنبیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔''

''اچھا!'' مون نے حیرانگی کا اظہار کیا۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا..... ''کیا ہوا؟ ایک ماہ قبل تو یہ اکٹھے جینے مرنے کی قسمیں کھا رہے تھے''.....

''جھوٹی قسمیں!'' سارا بولی۔ ''مجھے علم نہیں تھا کہ وہ کم بخت بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہے۔''

''وہ کیسے؟'' مون حیران ہو کر بولی۔

''زندگی بھر ساتھ نبھانے کی یوں قسمیں کھاتا تھا جیسے مریے سامنے نہیں کسی چرچ میں کھڑا ہو۔ رات کو وہ اکثر دیر سے لوٹتا۔ پہلے تو میں سمجھی کہ پیشہ ورانہ مصروفیت ہوگی۔ وہ بھی ہر وقت کام کی زیادتی کا گلہ کرتا..... اپنے باس کے خاف نازیبا زبان استعمال کرتا..... لیکن جب اس سلسلہ نے طول پکڑا تو مجھے شک پڑنا شروع ہوا۔ اس کی حرکات وسکنات بھی خاصی مشکوک تھیں۔ باڈی لینگویج سمجھتی ہو نا! جب اس

میں ربط نہ رہا تو میرا شک یقین میں بدلنے لگا۔ ایک دن میں نے اس کا پیچھا کیا۔ میں اس کے دفتر کے باہر چھپ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے دفتر سے باہر نکل کر چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا۔ جب اسے تسلی ہوگئی کہ کوئی آس پاس نہیں ہے، تو اطمینان سے اس نے سیٹی بجائی اور گاڑی مرکزی شاہراہ پر ڈال دی۔ گاڑی کی رفتار اور جھٹکوں سے اس کے اندرونی جذبات کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ایک دفعہ جلدی میں یہ ریڈ سگنل عبور کر گیا۔ دو دفعہ ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ میں بھی ہر خطرہ مول لیتے ہوئے اس کا تعاقب کرتی رہی۔ گاڑی وِنٹورا بلیوارڈ سے نکلسن روڈ پر آئی اور پھر 7th سٹریٹ میں مڑ گئی۔ سوگز کے فاصلے پر جا کر ایک نہایت عالی شان مکان کے سامنے رک گئی گاڑی سے نکل کر وہ مکان کی طرف یوں بڑھا جیسے پیاسا دریا کی طرف لپکتا ہو۔ اگر وہ ایک دفعہ بھی مڑ کر دیکھ لیتا تو شاید اس پریشانی سے بچ جاتا۔ لیکن اس کے سر پر تو بھوت سوار تھا۔ مکان کے باہر کوئی آدمی نہیں تھا۔ اس کا مرکزی دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ وہ اس میں سے ہوتا ہوا اندر چلا گیا۔ میں بھی بلا جھجک گیٹ کے اندر چلی گئی..... بیڈ روم میں سے عجیب کھسر پھسر کی آوازیں آ رہی تھیں..... میں نے دروازے پر کان لگا دیئے..... اب میری سمجھ میں ہر بات آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ کسی کے گھر بلا اجازت جانا غیر شائستہ فعل ہی نہیں جرم بھی ہے۔ لیکن یہ خیال صرف ایک لمحے کے لئے آیا۔ اور پھر غم اور غصے کے منہ زور جذبات نے اسے فضا میں تحلیل کر دیا۔ "HOT PURSUIT" وہ میرا مجرم تھا۔ اور اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے ایک دھکے سے کمرے کے کواڑ کھول دیئے۔ جلدی میں وہ کنڈی لگانا بھی بھول گیا تھا..... بڑا دلخراش منظر تھا۔ وہ ایک پکی عمر کی شادی شدہ امیر عورت کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ وہ ٹونی کی آغوش میں بیٹھی تھی اور یہ اس کے ہونٹوں، گالوں اور سارے جسم پر یوں بوسے ثبت کر رہا تھا جیسے ڈاک بابو لفافوں پر مہریں لگاتے ہیں اور وہ اس کے بازوؤں میں یوں مچل رہی تھی جیسے چالیس سال کی فربہ عورت نہ ہو بلکہ کوئی نوخیز کلی ہو۔ میرے اچانک اندر داخل ہونے پر وہ دونوں یوں ہڑبڑا کر اٹھے جیسے کوئی بلائے ناگہانی ان کے سر پر آ پہنچی ہو۔ ''تو یہ ہے تمہاری پیشہ ورانہ مصروفیت؟'' میں نے غصے سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ اس قدر حواس باختہ ہو گیا تھا کہ الفاظ اس کے منہ سے نکل نہیں پا رہے تھے۔

''تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرے گھر میں گھس کر دنگا فساد کرو۔ میں ابھی پولیس کو فون کرتی ہوں۔'' وہ عورت ایک غصیلی کتیا کی طرح چلائی۔

''ضرور فون کرو! ساتھ اپنے اس خاوند کو بھی اطلاع دے دینا جس نے بڑی چاہت سے شادی کی یہ تصویر بیڈ روم میں لگوائی ہے۔'' میرے یہ الفاظ بجلی بن کر ان دونوں پر گرے اور میرے پاؤں پکڑ کر گڑگڑانے لگے۔ جلد ہی غصے کی جگہ ایک گہرے غم میں مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ بیوفائی کا یہ انداز میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ پیشتر اس کے کہ میرے آنسو آنکھوں سے چھلک کر زمین تک پہنچتے میں کمرے سے باہر نکل آئی۔

سارا اپنی پُرنم آنکھیں رومال سے صاف کرتے ہوئے بولی، ''دراصل اُسے اُس عورت سے نہیں، اس کی دولت سے محبت تھی۔''

''لیکن تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' مونت اسف آمیز لہجے میں کہنے لگی۔

''تم ویگاس میں تھیں اور میں یہ ذکر چھیڑ کر ماحول سوگوار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ویسے بھی ایسی باتوں کو دہرانے کا کیا فائدہ!''

''غم بانٹا تو جا سکتا ہے!''

''یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو بٹ نہیں سکتی۔ ہر شخص نے بہرطور اپنی اپنی صلیب خود اٹھانی ہے!''

''مجھے بہت افسوس ہوا ہے!'' میں نے اظہارِ ہمدردی کیا۔ ''تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک بظاہر خوش و خرم رہنے والی، ہنس مکھ، خوبصورت لڑکی اندر سے غمگین بھی ہو سکتی ہے۔''

''چلو کسی بہانے تم نے میری خوبصورتی کا اعتراف تو کیا ہے۔'' ایک سوگوار مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی "IT IS A FLEETING GRIEF, IT WILL EVENTUALLY GO OFF" (یہ وقتی غم ہے۔ زیادہ دیر پا نہیں ہوگا!'')

O

گھر پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے۔ ایک تو سارا کی داستان نے مون کو دکھی کر دیا تھا۔ اور اس کا اثر گاڑی کی رفتار پر بھی پڑ رہا تھا۔ وہ سیدھا جانے کے مختلف سڑکوں پر سے گزر رہی تھی۔ مقصد مجھے 'نائٹ لائف' دکھانا تھا۔ ایل اے اور دیگر مغربی شہروں کی 'نائٹ لائف' ہمارے ہاں سے مختلف ہوتی ہے..... سارا شہر سرِ شام ہی سو جاتا ہے۔ سوائے مخصوص کلبوں کے دیگر دکانیں بورڈ ٹریڈ سنٹر بند ہو جاتے ہیں۔ ہوٹلوں میں بھی ایک خاص وقت کے بعد رات کا کھانا نہیں ملتا۔ دن کے تھکے ہارے لوگ اپنے گھروں میں آرام کرتے ہیں۔ اگر کوئی یورپین لاہور کی 'نائٹ لائف' دیکھ لے تو مارے حیرت کے پاگل ہو جائے۔ بھاٹی میں کھوئے سے کھوا چھلتا ہے۔ دو بجے رات بھی رنگا رنگ روشنیاں اس قدر تیز ہوتی ہیں کہ دن کا سماں نظر آتا ہے۔ سفید پیڑوں والی لسی بڑ کی جا رہی ہے، پہلوان جی اپنے مشکیزہ نما پیٹ پر ہاتھ مار کر فالودے کے ایک اور پیالے کا آرڈر دے رہے ہیں۔ ٹخا ٹخ کی دلفریب موسیقی بج رہی ہے۔ مرغِ مسلم اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے سولی پر لٹک رہے ہیں..... دست بے تاب، ماہی بے آب کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہر طرف ڈیک سے اُٹھتے ہوئے گانوں کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ طربیہ اور غمگین نغمات نے آپس میں گڈمڈ ہو کر ماحول کو نمکین بنا دیا ہے۔ جنگ کو ختم ہوئے برسہا برس گزر گئے ہیں لیکن ڈھول سپاہی ابھی تک اپنی شجاعتوں کی داد وصول کر رہا ہے..... تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ سوتے کب ہیں؟ کام پر کب آتے ہیں؟؟ لیکن واقفِ حال اتنے حیران نہیں ہوتے۔ کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ دفتر میں دو چار گھنٹے کی تاخیر قیامت برپا نہیں کرتی۔ جہاں سرکار نخی ہو وہاں کے لوگوں کے حوصلے بھی بلند ہوتے ہیں!

صبح میری آنکھ جلد کھل گئی۔ سب سو رہے تھے۔ ماحول میں بھی مکمل سکوت تھا۔ میں نے جوگر پہنے اور باغ کی سیر کو نکل گیا۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ فضا میں پھولوں کی مہک تھی۔ ہوا بھی خاصی خنک تھی۔ پارک میں دوسرا کوئی شخص نہ تھا۔ سارا ابیور لے ہلز محوِ خواب تھا۔ میں نے پارک میں دوڑنا شروع کیا۔ دوسرے چکر پر مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی جو آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ ایک نوجوان لڑکی تھی جس نے نیکر اور بکنی پہن رکھی تھی۔ اور مجھ سے تقریباً دگنی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ ''ہائے''..... کہہ کر وہ بغیر رکے مسکرائی، اور آگے نکل گئی..... آدھے گھنٹے کی جوگنگ نے

خنکی کا اثر زائل کر دیا۔ اور مجھے پسینہ آ گیا۔ میں تھک کر ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی سانسیں ہموار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آ گئی۔ اور اسی بینچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گئی۔ ''اجنبی لگتے ہو! کیا کسی کے مہمان ہو؟'' اس نے بغیر کسی تعارف کے استفسار کیا!

''ہاں! لیکن تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟''

''بیورلے ہلز کے مکین ایک دوسرے کو کافی حد تک پہچانتے ہیں۔ پھر پارک میں اس وقت جوگنگ کوئی نہیں کرتا۔ اس لئے مجھے اندازہ لگانے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی.....!''

''یہاں اکثریت تو فلمی اداکاروں کی ہے۔ اور انہیں تو اپنے جسم کی تراش خراش کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بغیر جوگنگ کے وہ اپنے آپ کو سمارٹ کیسے رکھ سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کم خوراک اور ان ڈور مشینوں کے ذریعے ورزش۔ یہاں لوگوں نے ہر چیز کے لئے شارٹ کٹ طریقے ڈھونڈ رکھے ہیں۔''

''تو پھر تمہیں کون سا جذبہ لے آیا ہے؟''

بولی، مجھے کھلی فضاؤں اور تازہ ہواؤں سے محبت ہے'' کمرے کی گھٹن مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ ایک عجیب قسم کا CLUSTROPHOBIC AFFECT ہوتا ہے۔''

''کیا تم بھی کوئی ایکٹریس ہو؟ میرا مطلب ہے بی بی ایکٹریس'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"YOU ARE NOT ALL THAT WRONG" وہ بھی مسکرا دی۔

''میرے ڈیڈی فلم ڈائریکٹر ہیں۔ اور میں بھی تعلیم مکمل کر کے اسی فیلڈ میں آنا چاہتی ہوں۔''

''تم کس قسم کی تعلیم حاصل کر رہی ہو!''

''آرٹ اور میوزک''..... یہاں بامقصد تعلیم حاصل کی جاتی ہے۔ جس شخص نے جس پروفیشن میں جانا ہو، اس سے متعلق علم سیکھتا ہے۔'' تھوڑی دیر ستا کر وہ پھر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی ''کیا مزید جوگنگ کرنا پسند کرو گے؟''

''نہیں'' میں نے کہا۔ ''میرا کوٹہ پورا ہو گیا ہے۔''

''او کے!''.....

''سی جو!'' اس نے ہاتھ ملایا اور پھر دوڑنے لگی۔ پارک میں اب اِکا دُکا لوگ آنے شروع ہو گئے تھے۔ میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھا ماحول سے لطف اندوز ہوتا رہا اور پھر گھر چلا آیا۔

O

جب ہم یونیورسل سٹوڈیو دیکھنے کے لئے کار میں بیٹھے تو مون کہنے لگی، ''شاہ! ایل اے اگر کیلیفورنیا کا دل ہے تو یونیورسل سٹوڈیو اس کی شناخت ہے۔'' ساری دنیا میں اس معیار کی فلمیں نہیں بنتی۔ ہر اچھوتا خیال یہاں جنم لیتا ہے۔ جیسے ہی کوئی ایکٹر یا ایکٹریس دنیائے فلم میں ابھرتا ہے، وہ یہاں کا رخ کرتا ہے''۔

''ہوسکتا ہے کہ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں زیادہ تعداد میں فلمیں بنتی ہوں۔ لیکن ان میں زیادہ تر غیر معیاری ہوتی ہیں اور جو چند ایک اچھی بھی ہوتی ہیں تو وہ بھی عام طور پر یہاں کا چربہ ہوتی ہیں۔ تاریخ، جنگ، ثقافت، مزاج کوئی بھی ایسا موضوع نہیں ہے جس پر فلم نہ بنتی ہو۔ فلم بھی اس معیار کی کہ اگر ٹرائے کی جنگ ہو رہی ہو، تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ہو بہو پانچ ہزار سال پرانے مناظر بیسویں صدی میں فلمائے جا رہے ہیں۔ لباس، مکان، آلات حرت، ڈائیلاگ بالکل نیچرل، اس دور اور اس ماحول کے مطابق..... البتہ آج کل یہ انڈسٹری کافی حد تک روبہ زوال ہے اور اس کی وجہ کسی اور ملک کی برتری یا ان کی نااہلی نہیں۔ بلکہ اس گھر کو آگ لگ گئی، گھر کے چراغ سے!''

''وہ کس طرح؟'' میں نے پوچھا۔

فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا دشمن ٹیلی ویژن ہے۔ جہاں سینکڑوں چینل ہوں، رنگا رنگ پروگرام دکھائے جا رہے ہوں، سپورٹس، ڈسکوری، رومانس، ڈرامے، خبریں، وہاں بطور خاص چل کر سینما ہال میں کون جائے گا.....! خواہ مخواہ کا تردد اور رقم کا ضیاع..... یہی وجہ ہے کہ یونیورسل، آج کل فلموں سے کم کماتا اور اپنی عظمت گم گشتہ کے گیت زیادہ گاتا ہے۔ لاکھوں لوگ اس کے در و بام دیکھنے جاتے ہیں اور اس طرح کمائی کا ایک نیا ذریعہ ڈھونڈ لیا گیا ہے''۔

میں نے کہا ''کسی نے سچ کہا ہے کہ مرا ہوا ہاتھ بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے''۔

''اسے سوا کروڑ کا سمجھو۔ پندرہ ڈالر تو ٹکٹ ہے۔ پھر اندر پیسے بٹورنے کے کئی طریقے ہیں۔ ریسٹورنٹس، گفٹ شاپس اور کھلونے..... ہر شخص پچاس، سو ڈالر خرچ کر کے باہر نکلتا ہے۔ اب اگر انہیں پچاس ہزار سے ضرب دو تو سال میں کروڑوں ڈالر بنتے ہیں''۔

جب ہم ٹکٹ خرید کر یونیورسل سٹوڈیو میں داخل ہوئے تو اندازہ ہوا کہ مون نے سچ ہی کہا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں امریکن اور دیگر ممالک سے آئے ہوئے ٹورسٹ اپنے کیمرے اٹھائے اندر جا رہے تھے..... بالکل میلے کا سماں لگتا تھا۔

''کہاں سے آ جاتے ہیں یہ لوگ؟'' میں نے مون کی طرف دیکھا۔ ''ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اہل امریکہ چھٹی پر ہوں..... ڈزنی لینڈ ہو، ونٹو رابلیوارڈ ہو، ایئر پورٹ ہو یا یونیورسل سٹوڈیو، ہر طرف لوگوں کا جم غفیر نظر آتا ہے۔ اتنی دولت اور وقت کہاں سے نکالتے ہیں؟''

''یہ بہت امیر ملک ہے!'' وہ میرے ہلکے طنز پر مسکرائی۔

''بہت ہی امیر''..... کئی ایشیائی ملک تو اس کی معاشی جیب میں سما سکتے ہیں۔ جو کماتا ہے، وہی اڑاتا ہے۔ اپنی آنے والی نسلوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑتا۔ لوگ زندگی کا مفہوم جانتے ہیں۔ زندہ رہنے کے طور طریقے اپناتے ہیں۔ کام کے وقت کام اور تفریح کے وقت صرف تفریح..... ہفتے میں دو دن..... سال میں ایک ماہ ان کے اپنے ہوتے ہیں۔ صرف انکے اپنے۔ ان دنوں میں یہ ہر فکر، ہر پریشانی کو ذہن کے زندان سے نکال باہر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ لوگ تفریح کے بعد کام پر لوٹتے ہیں تو تازہ دم ہوتے ہیں۔ لوگوں سے خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں اور کام کی زیادتی سے جو چڑچڑا پن آ جاتا ہے وہ جاتا رہتا ہے''۔

مون نے درست ہی کہا تھا..... ایک ہمارا معاشرہ ہے..... جہاں لوگوں کو اپنے سے زیادہ اپنی آنے والی نسلوں کی فکر ہوتی ہے ساری زندگی محنت مشقت میں گزار دیتے ہیں۔ ہر آرام اور سکون تج دیتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں ایک ریٹائرڈ بریگیڈئر تھا جو خود لسی کے ساتھ روٹی کھاتا تھا اور ٹخنوں سے اوپر اٹھا ہوا پاجامہ

پہنتا تھا۔ اپنے بیٹے کو اس نے پنڈی کلب میں کمرہ لے کر دیا ہوا تھا۔ جہاں وہ جین پہنے وسکی کے ہر پیگ کے ساتھ والد صاحب کی چھاچھ اور خوش لباسی کا ذکر ضرور کرتا تھا۔

ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ہجوم بھی زیادہ ہوتا گیا۔ ایک میلے کا سماں تھا۔ کہیں میوزک بج رہا ہے۔ کہیں پر ڈانس ہو رہا ہے، تو کہیں مسخرے لوگوں کو ہنسا کر انعام وصول کر رہے ہیں۔ اگر ایک جملے میں پوچھا جائے کہ 'یونیورسل سٹوڈیو' ہے کیا چیز! تو اس کا آسان سا جواب تو یہ ہے کہ اگر کسی نے قطرے میں دجلہ دیکھنا ہو، رائی کے پہاڑ بننے کا نظارہ کرنا ہو، انچوں کو میلوں پر محیط ہوتے دیکھنا ہو، تو وہ یونیورسل سٹوڈیو ضرور جائے..... نیویارک کی بلند و بالا عمارات کو کس طرح ایک بن مانس زمین بوس کر دیتا ہے، کیسے پہاڑوں پر سے چھلانگ لگا کر بھی ہیرو کے پاؤں کی ہڈیاں نہیں چٹختیں۔ کس طرح ایک گدھے کے جبڑے کی ہڈی سے سیمسن ہزاروں فوجیوں کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ یہ سب انسانی طاقت کے نہیں بلکہ کیمرے کے کمالات وہیں۔ ہم منی ٹرین رائیڈ پر جا کر رک گئے۔ ایک اونچے پلیٹ فارم پر سے ہم نے جھانکا تو بہت نیچے ٹرین کھڑی تھی۔ سو سیڑھیاں نیچے۔ لیکن اس تک پہنچنے کا کوئی آسان راستہ نہ تھا۔ کئی طویل قطاریں لگی ہوئی تھیں..... لوگ بیتابی سے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے محتاط اندازہ لگایا کہ نیچے والی ٹرین اپنی رفتار دگنی بھی کر دے تو پھر بھی دو گھنٹے سے پہلے ہماری باری آنی مشکل تھی اور اگر شروعات ہی اتنی تاخیر سے ہوئیں تو پھر اس تفریح گاہ سے رسمی علیک سلیک ہی ہو سکے گی۔ ہم انہی سوچوں میں غلطاں کھڑے تھے کہ سارا کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کہنے لگی "ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔ اگر اس پر سنجیدگی سے عمل کریں تو ہم اس پل صراط پر سے باآسانی گزر سکتے ہیں"۔

"وہ کونسا نسخہ کیمیا ہے جو تمہارے ہاتھ اچانک ہی آ گیا ہے" میں نے پوچھا۔

"THEY MUST BE GIVEN THE MEDICINE OF THEIR OWN PRESCRIPTION"

"مجھے علم نہیں تھا کہ تم حکمت سے بھی شد بد رکھتی ہو!"

بولی، "اس فرسودہ طنز کو فی الحال اپنے پاس ہی رکھو اور میری بات غور سے سنو یہ لوگ دار ہیں یہ سٹوڈیو ان

کی آماجگاہ ہے یہ اپنی ایکٹنگ سے ساری دنیا کو بے وقوف بناتے ہیں۔ لہذا کیوں نہ اس کے ساتھ اداکاری کی جائے اور انہیں غچہ دیا جائے"۔

"وہ کس طرح؟" ہم سب بیک زبان بول اٹھے۔

"وہ اس طرح کہ میں ایک لنگڑی لڑکی کی اداکاری کرتی ہوں..... شاہ! تم مجھے اپنے بازوؤں میں اس طرح سہارا دو گے کہ جیسے میرے 'بوائے فرینڈ' یا کچھ اور ہو۔ 'Diasabled' کے لئے ایک الگ انکوژر ہے۔ اپاہج، بیمار اور بچے کو دیکھ کر امریکن فوراً پسیج جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم دو گھنٹے کی بجائے چند منٹوں میں ٹرین تک پہنچ جائیں گے..... لیکن ایک بات کا خیال رکھنا!"..... وہ مسکرائی۔

"مجھے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے زور سے نہ بھینچنا۔ مجھے کبھی کبھی تمہاری نیت پر شک ہونے لگتا ہے!"

"تو کیتھی کی بانہوں میں چلی جاؤ! کسی شک یا شکوے کی گنجائش نہیں رہے گی"۔

"اس صورت میں سارا ہجوم شک کرے گا، ایک عورت کا دوسری کو اپنی بانہوں میں لینے کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"تو کیا ضروری ہے کہ ان کو دھوکہ دیا جائے؟"

"اس میں دھوکہ دہی کی کیا بات ہے؟ فریب تو وہ ہوتا ہے جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے!"

"لیکن یہ ج دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں، انکے حقوق پر تو ایک طرح سے زد پڑتی ہے"۔

کہنے لگی، "اگر حقوق کا اتنا ہی خیال ہے تو اس کا مظاہرہ اپنے ملک میں جا کر کرنا جہاں اس نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں"۔

پیشتر اس کے کہ میں جواب دیتا اس نے اچانک آ کر اپنا دایاں ہاتھ میرے گلے میں ڈال دیا اور لنگڑا کر چلنا شروع کر دیا۔ سٹوڈیو کی انتظامیہ کے ایک اہلکار کی ہم پر نگاہ پڑی تو وہ دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا! "May I HELP YOU! POOR YOUNG GIRL" اس نے سارا کی طرف رحم آلود نظروں سے دیکھا۔ کیا وہیل چیئر منگوا دوں؟"

''نہیں اس کی ضرورت نہیں! اس کے ہاتھ کی گرفت پیر تسمہ پا کی طرح میرے گلے کے گرد مضبوط ہوتی چلی گئی HE IS MY WHEEL CHAIR''

''یہ حادثہ کیسے پیش آیا؟'' اس نے ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا۔

بولی، ''حادثے کا کیا ہے، کسی وقت بھی پیش آسکتا ہے۔ کاش حادثے پوچھ کر آتے تو انسان ذہنی طور پر تیار رہتا۔ اسی لئے تو اس دنیا کو دکھوں کا گھر کہا جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے باغ اجڑ جاتا ہے، بادِ نسیم کی جگہ بادِ صرصر لے لیتی ہے، پھول مرجھا جاتے ہیں اور کونپلیں منہ زور آندھیوں میں لرزتی رہتی ہیں'' اس کا لہجہ فلسفیانہ ہوگیا.....''

''یہ باغ کچھ زیادہ ہی اجڑ گیا ہے'' میں نے سارا کی طرف دیکھا۔ مون اور کھیتی بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر پا رہی تھیں۔

''بہر حال تمہارا ایثار قابل قدر ہے'' وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''محبت اور قربانی کے یہی وہ لازوال جذبے ہیں جن کی وجہ سے آج تک یہ مطلبی دنیا قائم ہے!''

''وگرنہ کب کی اجڑ چکی ہوتی'' سارا اس کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بولی۔ میں نے اس کو کئی مرتبہ کہا ہے کہ لنگڑی سارا کا خیال چھوڑو اور کوئی نیا انتخاب کرلو! لیکن یہ مانتا ہی نہیں ہے۔ کہتا ہے یادوں کے سہارے زندہ رہنے کا بھی ایک الگ چارم ہے.....''

اہلکار کہنے لگا ''رومیو جیولٹ محض دو افراد ہی نہیں تھے بلکہ یہ ایک جذبے کا نام بھی ہے..... ایک ایسا جذبہ جس پر کبھی زوال نہیں آتا''۔

ہم باتیں کرتے کرتے ٹرین تک پہنچ گئے اور وہ ہمیں گاڑی پر بٹھاتے ہوئے بولا ''HAVE A GOOD DAY'' گاڑی چلی تو میں نے اپنی گردن سے سارا کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا'' دیکھتے نہیں! کنڈکٹر ہماری حرکات وسکنات نوٹ کر رہا ہے''۔

''کرنے دو! اس نے کونسا آکر تمہاری ٹانگ کا معائنہ کرنا ہے''۔

''یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تمہارا ہاتھ ہٹانے کو جی نہیں چاہ رہا، کھیتی بولی''

''تو تم رکھ لو! لیکن اس کے لئے تمہیں سیڑھی درکار ہوگی!''

''میں بہانہ ساز نہیں ہوں''

''یہی بہانہ تو تمہیں گاڑی تک لے آیا ہے۔ وگرنہ لمبی لائن میں اب تک کھڑی کھڑی دھوپ میں پگھل چکی ہوتیں''۔

بس کرو! مون نے انہیں ڈانٹا۔ ''وہ سامنے دیکھو ہم دریائے نیل پر سے گزرنے والے ہیں''۔

''دریائے نیل لاس اینجلس میں، دریائے نیل ویگاس میں؟'' مجھے حیرانی ہو رہی تھی۔

''ہاں یہ وہی دریا ہے جہاں فرعون اپنے غرور کے ساتھ غرق آب ہو گیا تھا''۔

''میں سمجھا نہیں!''

بولی! تم نے TEN COMMANDMENTS فلم دیکھی ہے''۔

''بالکل! بہت اچھی فلم تھی۔ تاریخی بھی اور سبق آموز بھی''۔

'' وہاں ریمسز دوم حضرت موسیٰؑ کا تعاقب کرتے ہوئے اپنی فوج کے ساتھ ڈوب جاتا ہے''۔

''وہ تو ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا اور یہ پانی کی ایک پتلی سی پٹی ہے''۔

''یہی تو فلمساز کا کمال ہے۔ جس پل سے ہم گزر رہے ہیں اس سے اس کا لشکر گزرا تھا۔ نافرمان اپنے کئے کی سزا پا گیا اور اپنے پیچھے ایک درس عبرت چھوڑ گیا!''

''انسان بھی عجیب جانور ہے'' میں نے کہا! ''تاریخ ساز ہے لیکن تاریخ سے سبق نہیں سیکھتا۔ ذرا سا اقتدار، تھوڑے سے اختیارات، معمولی سی طاقت بھی مل جائے تو اپنے آپ کو خدا سمجھ بیٹھتا ہے۔ قطرہ حقیر کی طبعیت کا تموج اور جولانیاں دیکھنے والی ہوتی ہیں۔ دھرتی پر یوں اکڑ اکڑ کر چلتا ہے جیسے یہ اس کی ازلی میراث ہے۔ ایسے خودسر انسان گردش حالات کا ایک جھٹکا بھی برداشت نہیں کر پاتے..... اپنے آپ کو خدا سمجھنے والا فرعون بچوں کی طرح گڑگڑایا تھا۔ دریا کی بے رحم لہروں نے اس کی ساری فرعونیت نکال دی تھی۔''

گاڑی فرضی نیل کے پل پر سے گزرتی ہوئی آگے بڑھی تو گنتی کے کچھ مکان نظر آئے۔ ایسے مکانات

جن کے اندر کمرے نہیں تھے۔ صرف دیواریں اور دروازے لگے ہوئے تھے۔ گائیڈ کہنے لگا، ''یہاں دیہاتی مناظر فلمائے جاتے ہیں۔ انہی مکانوں کو ادل بدل کر اور ان کا رنگ روغن تبدیل کر کے پورے گاؤں کی شکل دیدی جاتی ہے۔ بازار کا سین دکھانا ہو تو اشیائے خوردونوش رکھ دی جاتی ہیں۔ گلی کوچوں میں گھوڑا گاڑیاں چلتی ہیں..... اور وہ جو سامنے پلیٹ فارم دیکھ رہے ہو نا، اس پر کھڑے ہو کر سوداگر قرون وسطیٰ کے ماحول میں خوبصورت کنیزوں کو نیلام کرتے ہیں..... مرجانہ..... عرصہ جنگ میں جیتی ہوئی رخسانہ..... بے بس اور لاچار عورتیں۔ لرزتی ہوئی، تھر تھر کانپتی ہوئی، ڈر اور خوف سے سکڑتی امور سمٹتی ہوئی..... دلال ان کے انگ انگ کی تعریف کرتا..... شاعروں نے عورت کی شان میں قصیدے لکھے ہیں، زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں، ادیبوں نے اسے پھول اور کلیوں سے تشبیہہ دی ہے۔ بعض ستم ظریفوں نے تو پھولوں کا ہار پہنا کر اس کی کمر دہرتی ہوتی ہوئی دیکھی ہیں..... لیکن تعریف کا جو بھونڈا انداز وہ تاجر اختیار کرتے، اس کا بیان ہی عریانیت کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر ڈی ایچ لارنس لیڈی شیٹرلے کی جگہ اس منڈی کی کسی عورت کی تعریف اس کے دلال کے حوالے سے ہی کر دیتا تو اس کی کتاب کی فروخت دگنی ہو سکتی تھی..... خریداران معوم کلیوں کو اس طرح ٹٹولتے جیسے قصاب، بھیڑ بکریوں کو پرکھتا ہے۔ نرخ بالا کرنے کے لئے بڑے جوسی فقرے بولے جاتے۔ بصرے کی حور، نخشب کا نگینہ، بغداد کی بلبل، شام کی شمع، عورت کی خرید و فروخت آج بھی ہوتی ہے''۔ وہ ایک لمحہ کے لئے رکا۔ ''صرف طور طریقے بدل گئے ہیں۔ شکاری نیا جال لائے ہیں۔ اب عورت ان پتھروں کے جبوترے پر نہیں بلکہ روشن سٹیج پر بکتی ہے۔ کسی دلال کو تردد نہیں کرنا پڑتا۔ اس کا انگ انگ بولتا ہے۔ ناچ کر، گا کر، آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے۔ زمانہ کس قدر ترقی کر گیا ہے؟ کاروبار میں جدت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ مہذب دنیا ہو تو ریشم میں لپیٹ کر دی جاتی ہے''۔

پروفیشلزم کی انتہا تھی۔ گائیڈ کیا تھا، چلتی پھرتی تاریخ تھی۔ ہنستا بولتا جغرافیہ تھا..... طنز و مزاح کی پوٹلی تھی۔ اس کے بولنے کا انداز، الفاظ کا زیر و بم، فقروں کی نشست و برخاست اس کی پیشہ ورانہ مہارت کے صاف آئینہ دار تھے۔ جتنا لطف ان مناظر کو دیکھ کر آ رہا تھا اس سے کہیں زیادہ حظ لوگ ان کی باتوں سے اٹھا

رہے تھے۔

''شاہ! اگر تم قرون وسطیٰ میں ہوتے، تو قرون وسطیٰ میں ہوتے، تو کتنی کنزیں خریدتے!'' سارا سے چپ نہ رہا گیا۔

''بس! ایک لنگڑی کافی ہوتی!''

''..... عورت کی تذلیل ہر دور میں ہوتی ہے۔ ہر زمانے میں اسے Purchaseable Commodity سمجھا گیا ہے!'' مون کہنے لگی۔

''لیکن یہ نہ بھولو کہ اس نے خون خرابہ بھی بہت کرایا ہے.....! اب ٹرائے'' کی جنگ کو ہی لے لو۔ ایک عورت کے جسم کے حصول کے لئے سات سال تک یونانی سپاہ خاک اور خون میں نہاتی رہیں۔ کشتیوں کے پشتے لگ گئے..... تا قیامت زندہ رہنے کا دعویٰ کرنے والے بھی موت کی نیند سو گئے گھر اجڑ گئے..... بستیاں ویران ہو گئیں۔ انسان المیہ کی انتہا اس وقت ہوئی جب واپسی پر یولیسیس کو اس کی بیوی چپوں نے شناخت کرنے سے انکار کر دیا..... اور وہ سب کیونکر ہوا Just For a Pound of Flesh یہ کوئی اکیلا یا انوکھا واقعہ نہیں تھا۔ تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہزاروں سپاہیوں کو موت کی نیند سلانے والا یہ مسحور مست نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور اپنے ہی ہاتھوں سے اس نے اپنی تباہی کی داستان لکھی''۔

کہنے لگی ''اس میں بھی Male Chauvinism ایک پہلو نکلتا ہے..... تاریخ مردوں نے لکھی ہے..... اور اس میں حقائق سے زیادہ ان کے تعصبات جھلکتے ہیں پھر تاریخ کو پڑھنے کے بھی کئی زاویئے ہیں اب ''ٹرائے'' جنگ کو ہی لے لو پارس کو کیا پڑی تھی کہ ایک شادی شدہ عورت کو اغوا کرتا ہے جس شخص نے اسے پناہ دی اور مہمان ٹھہرایا اس کے ساتھ ہی اس نے دغا کیا..... اس تباہی کی ذمہ دار ہیلن نہیں! بلکہ وہ جنس زدہ مرد تھے جنہیں ہیلن سے شادی نہ کرنے کا احساس ٹرائے تک لے گیا تھا ''!

''چلو تمہارا استدلال مان لیتے ہیں'' میں نے مسکرا کر کہا۔

یہاں پانی مرتا ہے سارا چپکی ایسی باتیں اگر میں نے کی ہوتیں تو اس نے دلائل کی ایک دیوار کھڑی کر دینی تھی۔

یہ باتیں تمہارے ذہن میں آتیں کیسے؟ یہ تو ایک مفلس کے پرس کی طرح خالی ہے!'' کیتھی نے پھر اس کی چٹکی لی۔

گاڑی اس دیہاتی ماحول سے نکلی تو ایک غار میں داخل ہوئی جہاں ایک بے حد ڈراؤنا اور سوفٹ قد کا گوریلا اسے دبوچنے کیلئے کھڑا تھا وہ جب اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر چیخ مارتا تو سارا ماحول لرزا اٹھتا..... گائیڈ بتلانے لگا کہ یہی وہی گوریلا ہے جو فلموں میں نیویارک میں تباہی پھیلاتا ہے اور اس کے ہاتھوں سکائی سکریپر کاغذی گھروندوں کی طرح زمین بوس ہوتے ہیں۔

غار سے باہر نکلے تو آگے ایک جھیل تھی جس میں سمندری جنگی دکھائی جاتی ہے مصنوعی طریقے سے لہریں پیدا کی جاتی ہیں اور پھر ان میں گھن گرج کے ساتھ تموج پیدا کیا جاتا ہے۔ گولہ باری پانی میں آگ کے الاؤ آبدوزیں جنگی جہاز! الغرض ایک چھوٹی سی جھیل میں پورا نیول ہیڈ کوارٹر قائم کر دیا گیا تھا ٹرین رائیڈ دو گھنٹے کی تھی لیکن ایسا ماحول پیدا کیا گیا کہ محسوس ہوتا تھا جیسے ایک طویل سفر کے بعد ہم لوٹے ہیں۔

'اب کیا دیکھا جائے؟ مون نے سارا سے پوچھا ''کنٹکی فرائیڈ چکن!'' وہ مسکرائی'

''بھوک چمک اٹھی ہے پہلے لنچ کریں پھر تھری ڈائمنیشن کی طرف چلتے ہیں'' ہم نے اوپن ایئر ریسٹورنٹ سے چکن اینڈ چپس خریدے اور کوکا کولا کے جمبو گلاس جن میں برف زیادہ اور کوکا کولا کم تھا اور لان میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے ریسٹورنٹ میں بڑا رش تھا۔ یہاں بھی کھانا خریدنے کیلئے لائنیں لگی ہوئیں تھیں ٹوکن سسٹم تھا آرڈر دیں اور پھر ٹوکن لے کر اپنی باری کا انتظار کریں۔

اتنے بھرے بھرے ریسٹورنٹ میں نے کہیں نہیں دیکھے'' میں نے کوکا کولا کا گھونٹ بھرتے ہوئے مون سے کہا۔ یہ امریکہ کی بڑی نفع بخش صنعت ہے جہاں تقریباً تیس کروڑ لوگ صبح کا کھانا ہوٹلوں میں کھاتے ہیں وہاں کاروبار نے تو چمکنا ہی ہے..... اب صرف میکڈونلڈ یا کینٹکی فرائیڈ چکن ہی کو

لے لولوگوں نے پانچ پانچ سال سے فرنچائز کیلئے درخواستیں دے رکھی ہیں اور لاکھوں ڈالر جمع کرانے کیلئے تیار ہیں لیکن اس کی باری نہیں آ رہی"۔

ایسا کیوں ہے؟ میں نے پوچھا کمپنی کو رقم مل رہی ہے پھر انہیں اجازت دینے میں کونسا امر مانع ہے۔"

اعلیٰ معیار! کمپنیاں کسی ایسے شخص کو کاروبار کی اجازت نہیں دیتیں جو انکے معیار پر پورا نہ اترتا ہو پھر جگہ کا انتخاب اس شخص کی صوابدید پر نہیں ہوتا بلکہ کمپنی خود کرتی ہے اور اس کے لئے بڑے سائنٹفک طریقے سے سروے کیا جاتا ہے ریسٹورنٹ کھولنے سے پہلے اونر کو پتہ ہوتا ہے کہ اوسطاً کتنے گاہک آئیں گے کس قسم کی اشیائے خوردونوش خریدیں گے اور اس کا نفع کس قدر ہوگا بنک بھی ان تمام باتوں کو مدنظر رکھ کر قرض دیتے ہیں۔"

'اور اگر متوقع منافع نہ ہو تو؟

اکثر ایسا نہیں ہوتا تجارتی دنیا میں یہ نام ہی سکہ رائج الوقت ہیں بالفرض کسی خاص وجہ سے ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو پھر کمپنی اس کو کسی دیگر جگہ پر ریسٹورنٹ کھول دیتی ہے

لیکن میں نے یہاں بے شمار تجارتی کمپنیوں اور بینکوں کو دیوالیہ ہوتے دیکھا ہے۔

بولی یہ درست ہے یہاں فری اکانومی ہے اور کٹ تھروٹ کمپیٹیشن ہوتا ہے ہر وقت چاک وچوبند رہنا پڑتا ہے ذرا سی غفلت یا کوتاہ نظری بھٹہ بٹھا سکتی ہے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پین ایم جیسی بین الاقوامی شہرت کی حامل ائیر لائن یوں تتر بتر ہو جائے گی..... یہی وجہ ہے کہ ہر ریسٹورنٹ کھولنے سے پہلے فوڈ کمپنیاں بہت احتیاط برتتی ہیں"۔

کھانا کھانے کے بعد ہم تھری ڈیز تھیٹر دیکھنے گئے جب آدمی پیلے رنگ کی عینک لگا کر فلم دیکھتا ہے تو ہر چیز اسے اپنے بالکل قریب اور حقیقی رنگ میں نظر آتی ہے ایک شیر لمبا ہوتے ہوئے آپ کی سیٹ تک آن پہنچتا ہے لیکن حیرانگی اس وقت ہوتی ہے جب وہ دھاڑتا ہے تو اس کی منہ سے نکلی ہوئی کف آپ کے چہرے پر آن گرتی ہے اور رومال سے چہرہ صاف کرنا پڑتا ہے'.....

انسان کیسے بن مانسوں اور شیروں کی کھال پہن کام کرتے ہیں اور ان کی حرکات وسکنات بالکل جانوروں کی طرح ہوتی ہیں کیمرہ ٹرک سے ہیرو کس طرح سو منزلہ عمارت سے نیچے گرتا ہے کس طرح پچاس قلابازیاں کھا کر ہیروئن کو ظالموں کے نیچے سے آزاد کرواتا ہے اپنے سے دس گنا طاقتور بیسیوں آدمیوں کو کیونکر مار مار کر لہولہان کر دیتا ہے گلیسرین کے اثر سے ہیروئن کی آنکھوں سے آنسو رم جھم برستے ہیں..... گلیمر رنگ اور روشنی، تصنع اور بناوٹ ہالی وڈ کی شناخت ہیں اور یونیورسل سٹوڈیو کے بغیر ہالی وڈ ایسے ہی ہے جیسے دلہن بغیر ہار سنگھار کے ہو۔

ہم کافی دیر وہاں گھومتے رہے کئی اداکاروں سے ملاقات ہوئی ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو مون کو جانتے تھے بیورلے ہلز کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہاں کے مکین اپنے آپ کو ایک برادری سمجھتے ہیں۔ سب سے بڑی قدر مشترک تو پیسہ ہے پھر پیشہ آتا ہے' مون نے کہا۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنا فن بیچتے ہیں آواز بیچتے ہیں ادائیں فروخت کرتے ہیں''

سٹوڈیو کے مرکزی گیٹ کے ساتھ اوپن ائیر تھیٹر ہے وہاں محفل موسیقی برپا تھی نوجوان سنگر شوقیہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے..... بالی عمریا..... آواز میں جادو..... میٹھی اور سریلی..... ساتھ ساتھ ناچ بھی رہے تھے بیک وقت گانا اور تھرکنا مغرب سے شروع ہوا اور آہستہ آہستہ ساری دنیا میں پھیل گیا ہمارے ہاں بھی یہ مرض اب عام ہو گیا ہے غزل اور گیت کا جو حشر اس اچھل کود نے کیا ہے وہ افسوسناک تو ہے خاصا مضحکہ خیز بھی ہے اردو زبان کی اس طرح ہڈیاں ٹوٹتی ہیں جس طرح نیم ملا عربی کو شہید کرتا ہے.....

'بالکل مزہ نہیں آ رہا ہو جائے ایک گانا!'' سارا نے مون سے فرمائش کی۔

''تو کیا تم گانا بھی گاتی ہو'' میں نے حیران نظروں سے مون کی طرف دیکھا۔

''کبھی کبھار! شوقیہ!!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہو سکتا!'' میں نے سارا کی تائید کی

''پھر کبھی آج موڈ نہیں ہے'' اس نے معذرت کی۔

''آج کیوں نہیں؟ پلیز مون! ہمیں مایوس نہ کرو'' سارا بچوں کی طرح مچل گئی۔

''بالامر مجبوری ہی سہی لیکن اس گھڑی میں بھی اس کی ہمنوا ہوں ایک اچھا گانا سنے ہوئے طویل عرصہ گزر گیا ہے'' کیتھی کہنے لگی'

مون نے ایک نظر ہم سب پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے سٹیج پر چلی گئی اس نے سٹیج منیجر سے چند منٹ بات کی اور کرسی پر بیٹھ گئی لوگوں کی اکثریت کھڑے ہو کر گانا سن رہی تھی پنڈال میں ایک ہزار کے قریب کرسیاں تھیں جو سب بھر چکی تھیں جب گانا ختم ہوا تو مائیک پر کمپیئر کی آواز بھری ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین! اب آپ ایک امیچور سنگر' مون آف بیورلے ہلز سے خوبصورت گانا سنیں گے'' تالیوں کے ایک طویل شور میں مون سٹیج پر آئی تو وہ مزید طویل ہو گیا لوگوں نے اس کا گانا نہیں سنا تھا۔ لیکن اس کی شکل وصورت اور شخصیت نے سب کو مسحور کر دیا اس نے چند منٹ آرکسٹرا کے انچارج کو ہدایات دیں اور گانا شروع کیا! ہر طرف مکمل خاموشی چھا گئی صرف دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں آواز کیا تھی ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی لہر ہے جو خراماں خراماں ساحل کی طرف بڑھ رہی ہے کانچ کی چوڑیاں ہیں جو ایک تسلسل کے ساتھ چھنک رہی ہیں یا آم کے پیڑ پر بیٹھی ہوئی کوئی کوئل ہے جو دھیرے دھیرے بول رہی ہے لفظوں کا سحر کانوں میں رس گھول رہا تھا دل کو بیک وقت ٹھنڈک اور گرمائش پہنچا رہا تھا اور ذہنوں کو تھپکیاں دے رہا تھا اتنی حسین لڑکی اس قدر خوش الحان بھی ہو سکتی ہے لوگوں نے حیرت سے انگلیاں دانتوں میں دبا لیں۔

پریشان کن حیرت بیورلے ہلز حسن وجوانی دلکش آواز' پھر گوشہ گمنامی یہ کیوں ہے؟ یہ کہاں تھی؟؟ کدھر گئے ہیں! وہ فلمی کارپردازان جو اگر شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ بھی سن لیں تو فوراً اچھتے تک پہنچ جاتے ہیں جو اگر خوبصورت پتھر بھی دیکھ لیں تو تراش کر ہیرا بنا دیتے ہیں تحت الثریٰ سے اٹھا کر لوگوں کو بام عروج تک پہنچا دیتے ہیں کیلیفورنیا کی یہ نازک کلی اپنے اصل مقام تک کیوں نہیں پہنچ پائی؟ لوگ انہیں خیالوں میں گم تھے کہ گانا ختم ہو گیا ایک شور اٹھا جو بڑھتا چلا گیا داد وتحسین کے ڈونگر برسنا شروع ہو گئے نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں نے بڑھ بڑھ کر اس کے ہاتھ چومنے شروع کئے کئی کاپیاں

بیک وقت آٹوگراف کیلئے بلند ہوئیں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بڑی مشکل سے آرگنائزرز نے اسے پرستاروں کے ہجوم سے باہر نکالا اور ہم بڑی تیزی کے ساتھ گیٹ سے باہر نکل آئے۔

مون تم نے تو کمال کر دیا اس قدر میٹھی اور سریلی آواز یقین نہیں آتا یہ تم تھیں! مجھے تعریف کیلئے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

اصل تعریف کی مستحق تو میں ہوں سارا بولی جس نے تمہیں اس ترنم سے متعارف کرایا! نہیں تو اس کی صورت میں ہی آنکھوں میں بسائے وطن لوٹ جاتے۔

سارا اور کیتھی کو ڈراپ کر کے جب ہم گھر پہنچے تو رات کو نو بجے رہے تھے ہر چند کہ یونیورسل سٹوڈیو میں ہی سارا دن گزرا تھا لیکن ڈزنی لینڈ کے برعکس تکن اور احساس نہیں ہو رہا تھا اس کی بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ ہم پیدل کم چلے تھے اور پھر اس ایک گانے نے تو روح میں عجیب قسم کی بالیدگی بھر دی تھی تازگی کا انوکھا احساس ہو رہا تھا۔ ڈنر ہم نے گھر پر ہی کیا مون کی ممی نے خاص طور پر آسٹریلین بیف کے مائی بون اسٹیکس بنائے تھے ساتھ جمبو پرانز اور اسپیریکس چکن سوپ تھا کھانا واقعی مزیدار تھا آسٹریلیا کا بیف ساری دنیا میں مشہور ہے ہر چند کہ امریکہ میں بھی بیف کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے خاص مقدار میں درآمد کیا جاتا ہے ان دونوں ملکوں کے درمیان ایک خاموش ٹریڈ وار جاری رہتی ہے کھانے کے بعد مون کافی بنالائی اور ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے مسز رابسن پاکستان کے متعلق پوچھتی رہی مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ امریکنوں کی اکثریت کو نہ تو بین الاقوامی امور کے متعلق کچھ علم ہے اور نہ دلچسپی TV پر یا وہ کھیلوں کی خبریں سنتے ہیں اور یا پھر جرائم کی روئیداد سن کر خط اٹھاتے ہیں البتہ ایک سوال وہ ایسا کر بیٹھیں کہ میں کچھ دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا بولیں اکثر امریکنوں کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ امریکہ کسی نہ کسی رنگ میں ساری دنیا کی مدد کر رہا ہے غریب ممالک کو مالی امداد دیتا ہے جہاں قحط پڑے وہاں کمک پہنچاتا ہے دنیا کے کسی خطے میں زلزلہ، سیلاب یا بیماریاں آئیں تو فوراً امریکن ضمیر جاگ اٹھتا ہے ریلیف کیلئے تمام ایجنسیاں کمر کس لیتی ہیں امریکہ غریب اقوام کا ان داتا نہ سہی مددگار ضرور ہے اس کے باوجود وہی سب لوگوں اس سے

نفرت کرتے ہیں وقتاً فوقتاً اس کے خلاف جلسے جلوس نکالتے رہتے ہیں۔اس کی وجہ کیا ہے؟"

میں نے کہا میرے خیال میں لوگ امریکی عوام کے خلاف نہیں بلکہ حکومت کے مخالف ہیں انہیں احساس ہے کہ اکثر امریکن صاف دل اور صاف گو ہیں وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔انہیں اپنی بینیفٹ نے سے ہی فرصت نہیں ملتی پرائی کا کیا خیال رکھیں گے یہ سی آئی اے ہے جس نے ہر جگہ ٹانگ اڑھائی ہوئی ہے ہر پسلی میں انگلیاں چبھوتی ہیں حکومتوں کا گرنا بننا حکمرانوں کا آنا جانا سب اس کی کوششوں اور سازشوں کا نتیجہ ہے انسانوں کو یہ مکھی مچھر سمجھتے ہیں حکمرانوں کو کٹھ پتلی اور ملکوں کو خراج گزار خراج صرف مالی ہی نہیں ہوتا سیاسی بھی ہوتا ہے اور اس کو غالباً NEO COLONIALISM کہتے ہیں۔

پوچھنے لگیں پاکستان تو ہمارا حلیف ہے کیا تم لوگوں کو بھی ہم سے گلہ شکوہ ہے

بالکل جب امریکی وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس Brinkman Ship کی پالیسی پر عمل پیرا ہوا تو اس نے اعلان کیا کہ غیر جانبداری گناہ کبیرہ ہے اور یہ منافقت کا دوسرا نام ہے کمیونزم کے خلاف جن ملکوں نے امریکہ کا ساتھ دیا ان میں پاکستان سرفہرست تھا ہم نے ہر مصلحت ہر خطرے کو بالائے طاق رکھ کر امریکہ کی مدد کی اس کو ہوائی بس دیا U-2 پشاور سے ہی اڑا تھا سٹیو اور سینٹو میں ہم شامل ہوئے لیکن جب بھی پاکستان پر ہندوستان کی طرف سے جارحیت مسلط ہوئی امریکہ نے مشرقی شاعری کے محبوب کی طرح آنکھیں پھیر لیں اور اس طرح ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپا۔

اس تشبیہ پر وہ مسکرائیں اور کہنے لگیں یہ مشرقی محبوب اتنی جلدی آنکھیں کیوں پھیر لیتا ہے؟ میں نے کہا' پہلے تو آنکھیں ملاتا ہی نہیں ہے لیکن اگر دعاؤں سے وفاؤں سے مسلسل التجاؤں سے رام بھی ہو جائے تو درمیان میں کوئی نہ کوئی راون آ کھڑا ہوتا ہے اور پھر ترک تعلق بھی اتنی تیزی سے کرتا ہے جتنی سرعت سے آپ کے ہاں طلاقیں ہوتی ہیں!

بولیں طلاق یکطرفہ نہیں ہوتی بلکہ فریقین کی باہمی رضامندی سے ہوتی ہے

ہمارے ہاں یکطرفہ ٹریفک چلتی ہے لیکن یہ راستے اقلیم غزل میں کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوتے ہیں

-

کہنے لگیں یہاں نظر یہ بدل گیا ہے محبوب کی تعریف کرنا اور بات ہے اور اس کے پیچھے بھاگنا الگ چیز ہے یہاں مرد وزن برابری کے دعویدار ہیں مرد سوچتا ہے کہ اگر میں کچھ حاصل کرتا ہوں تو کچھ دیتا بھی ہوں اس لئے منت سماجت نہیں کرتا اصولاً

LOVE SHOULD COME OYT TO MEET LOVE WITH OPEN ARMS دراصل ہمارے ہاں عورت اتنی آزاد نہیں ہے معاشرے کی کچھ پابندیاں ہیں کچھ اخلاقی ضابطے ہیں حدود وقیود ہیں۔

یہ درست ہے! وہ کہنے لگیں MORALITY IS THE INATY TO BEHAVE جو لوگ سرگشتہ خمار رسوم وقیود ہوتے ہیں وہ اتنی ہمت اور حوصلہ نہیں رکھتے۔

مام ساری باتیں آج ہی کرتی ہیں؟ مون جمائی لیتے ہوئی بولی دیکھو تو سہی کیا وقت ہو گیا ہے۔

یہ کالج تمہیں کہاں سے یاد آ گیا ہے؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

مسز رابسن کہنے لگیں کرسٹابیل' اس کی فیورٹ نظم ہے کہتی ہے ممی مجھے کبھی کبھی یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ اس نے یہ نظر مجھ پر لکھی ہے۔

یہ اس وقت بھلا کہاں تھی

مون آوگون کی قائل ہے کہتی ہے وہ میرا پہلا جنم تھا وہ کیسل وہ اوک ٹری وہ بد بخت ساحرہ۔

لیکن میدان جنگ میں لڑتا ہوا وہ نائٹ کہاں ہے جس کیلئے اس نے مشکبار زلفیں کھولیں تھیں اور چاند کی روپہلی چاندنی میں نازک دست دعا دراز کئے تھے

غالباً اس کی تلاش میں سرگرداں ہے وہ مسکرائیں اور مون کو اپنے بازوں کے حصار میں لے لیا۔

''مام! آپ بھی میری ہر بات کو بچوں کی طرح پکڑ لیتی ہیں۔'' مون نے ان کے سینے سے سر لگا کر شکوہ کیا۔

''بچوں کی بات کو بچوں کی طرح ہی لینا چاہئے''..... انہوں نے اسے تھپتھپایا۔

صبح مجھے بستر نے اٹھایا۔ عجیب مکینیکل بیڈ تھا۔ مون نے غالباً الارم لگا دیا تھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی وقفے وقفے سے بجنے لگی۔ میں نے اٹھ کر گھڑی دیکھی تو سات بج رہے تھے۔ سیر کا وقت نکل چکا تھا۔ پروگرام کے مطابق ہم نے سانتا مونیکا اور لانگ بیچ دیکھنے جانا تھا۔ مون نے ان ساحلوں اور سفید ریت کی بڑی تعریف کی تھی۔ ویسے بھی لاس اینجلس میں یہ ہمارا آخری دن تھا۔ اگلے روز ہمیں سان فرانسسکو پہنچنا تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ چند دن ہم سان فرانسسکو رکیں گے اور وہاں سے ڈرائیو کرتے ہوئے برکلے، سیکرے مینٹو، لیک طاہو اور رینو جائیں گے۔

سارا اور کیتھی پہنچ چکی تھیں۔ دونوں نے سفید جینز اور مسٹر ڈکلر کی ہاف سلیو قمیصیں پہن رکھی تھیں۔ اور لیدر شوز کی بجائے نائیکی کے جوگر پہنے ہوئے تھے۔

''کیا سرسوں سی کھل رہی ہے'' میں نے کہا۔ ''آج تو دونوں میں بڑا اتفاق لگ رہا ہے۔''

''اگر نوک جھونک نہ ہوئی تو سیر کا کیا خاک مزہ آئے گا!'' سارا کہنے لگی۔

''آج کے دن ہم نے ہر رقابلت کو نذر سمندر کر دیا ہے۔ باقی رہی نوک جھونک تو اس کی فکر نہ کرو۔ تم جو ہو اصل مزہ بھی تو تمہارے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں آتا ہے۔''

''لیکن آج لمپنگ نہیں ہوگی۔ میری گردن پر ابھی تک تمہارے ہاتھوں کے نشان ہیں اور ہلکا ہلکا درج بھی محسوس کر رہا ہوں۔''

بولی ''BEACH'' پر لنگڑانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ موجوں کی روانی دیکھ کر تو لنگڑے بھی سیدھا چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ باقی رہا تمہاری گردن کا درد..... تو یہ کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے البتہ یہ کم بخت دل میں ہو تو خطرناک ہوتا ہے۔

''دل میں تو اس ستم ظریف کے نہیں ہوا جو تمہیں غچہ دے کر ایک دولتمند عورت کے ساتھ بھاگ گیا ہے.....'' باقیوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔

''تم نے پھر اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔'' کیتھی نے مصنوعی تشویش ظاہر کی..... ''ذرا سوچو! تو یہ

گہرے سمندر میں غسل کرنے جا رہی ہے۔"

"معاہدے کی خلاف ورزی!" سارا نے اسے ٹوکا۔ "ابھی تو اس کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی۔"

"بات اگر سخن گسترانہ ہو تو بن کہے رہا بھی نہیں جاتا۔" میں نے کہا۔

یہ سوچتے ہوئے کہا کہ ساحل پر سارا دن گزارنا ہے سب نے ہیوی بریک فاسٹ کیا۔ چکن سانجز روسٹڈ بیف انڈے توس مکھن سیریل اور کافی کا گرم گرم کپ!

گاڑی چلی تو میں نے مون سے کہا "اگر تم لوگوں کو ناگوار نہ گزرے تو سگار سلگا لوں۔"

"اس میں ناگواری کی کونسی بات ہے۔ یہ دونوں سگریٹ پیتی ہیں۔ پھر سگار کا تو اپنا ایک ارومہ ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی بغیر شکر اور دودھ کے بلیک کافی پی رہا ہو!"

"میرا مطلب کچھ اور تھا۔ یہ میڈن ہوانا ہیں ان کے دھویں سے اکثر امریکن الرجک ہیں کیونکہ اس میں انہیں کاسترو کی بو آتی ہے۔"

کہنے لگی "امریکن حکومت الرجک ہو سکتی ہے۔ امریکی عوام نہیں۔ ویسے کاسترو کوئی اتنا قابل احترام انسان بھی نہیں ہے کہ لاکھوں انسانوں کی آزادیاں اس نے اپنے فوجی بوٹ کے نیچے کچل دی ہیں۔ آزادی نام کی کوئی چیز وہاں نہیں ہے..... جو شخص اس براعظم کا ہو کر غیر ملکی فوجوں اور میزائلوں کو دعوت دے اس کے خلاف جدوجہد ہر امریکن کا حق بنتا ہے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتیں کہ خاک کی چٹکی کو پرواز آ گئی ہے۔ کوئی چھوٹا ملک امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے! یہ بھلا اسے کیونکر گوارہ ہوگا۔"

بولی "اگر امریکہ چاہے تو اسے چٹکی میں مسل دے۔ لیکن ایک ڈکٹیٹر کو مٹانے کیلئے ہم لاکھوں لوگوں کو تباہ نہیں کرنا چاہئے۔"

لیکن BAY OF PIGS CRISIS سی آئی اے کی در پردہ سازش؟

"یہ امریکی حکومت کا اقدام تھا، عوام کا نہیں۔ جس دن امریکی عوام اس کے خلاف ہو گئے تو نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔"

''تو پھر میں پی لیوں سگار!'' میں مسکرایا۔

''بڑے شوق سے'' سارا بول اٹھی۔ ''لیکن ایک مجھے بھی دو۔ میرا بھی دل کر رہا ہے میں اور کیتھی ففٹی ففٹی کرلیں گے۔''

''عورتیں سگار پیتے ہوئے کچھ اچھی نہیں لگتیں۔ کم از کم میری جمالیاتی حسوں کو بڑی ٹھیس پہنچتی ہے۔''

''بڑے بہانہ ساز ہو۔ کیا منطق نکالی ہے!''

مون کہنے لگی۔ وہ دن دور نہیں جب امریکہ میں تمباکو نوشی عملاً ختم ہو جائے گی۔ ''حکومت نے اس ضمن میں جو اقدامات کئے ہیں وہ خاصے حوصلہ شکن ہیں۔ بس' گاڑیوں' جہازوں اور ریستورانوں میں سموکنگ ممنوع ہے..... بلکہ اب تو ایسا قانون بن رہا ہے جس کی رو سے شاہراہوں پر بھی تمباکو نوشی نہ ہو سکے گی۔ سموکرز کو ایک طرح سے سماجی شودر بنا دیا گیا ہے۔ ہر آدمی ان کی طرف ایک عجیب بیزاری اور نفرت سے دیکھتا ہے۔ جیسے وہ بلاواسطہ اور بالواسطہ موت بانٹ رہے ہوں۔''

''لیکن اس کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے'' کیتھی کہنے لگی۔ ''جس طرح ہر شخص کو جینے کا حق ہے اسی طرح اسے موت کا بھی اختیار ہونا چاہئے۔ حکومت کا فرض ہے اس کے خطرات اور مضمرات سے آگاہ کرنا وہ اس نے پورا کر دیا۔ اب لوگ کے گھروں یا نجی محفلوں میں جھانکنا کہاں کی شرافت ہے؟''

''ہر حق کے ساتھ ایک فرض بھی منسلک ہوتا ہے۔ تمہاری آزادی اس جگہ ختم ہو جاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے PASSIVE SMOKING بھی اتنی ہی خطرناک ہے جتنی اصل تمباکو نوشی بلکہ ایک اعتبار سے کچھ زیادہ ہی خطرناک ہے کیونکہ تمباکو نوشی نہ کرنے والوں کا مدافعتی نظام اتنا مضبوط نہیں ہوتا۔''

''اس اعتبار سے تو میں بھی آپ کی صحت خراب کر رہا ہوں۔''

''انہیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ تو خود سموکر ہیں۔ باقی رہی میں' تو یہ بھی کوئی تشویش والی بات نہیں ہے۔ یہ جو ہر طرف پھیلی ہوئی SMOG دیکھ رہے ہو اس میں فیکٹریوں کا دھواں' زہریلی گیس' ادھ جلا ہوا ڈیزل' اور گرد و غبار شامل ہے اور یہ بھی کسی طرح سموکنگ سے کم خطرناک نہیں۔''

''اس کیلئے تمہاری حکومت کیا کر رہی ہے؟''

''حتی الوسع کوششیں تو جاری ہیں لیکن اگر مسئلے کی گھمبیرتا دیکھیں تو اس کا کوئی آسان حل نظر نہیں آتا..... شہر شیطان کی آنت کی طرح پھیل گیا ہے۔ ایک کروڑ انسانوں کی روزی کا دارومدار انہی فیکٹریوں پر ہے۔ صحت بحال کرتے کرتے کہیں یہ فاقہ کشی کا اور قحط سالی کا شکار نہ ہو جائیں۔''

''اس طرح تو علاج مرض سے بدتر ہو جائے گا!''

ہمیں ڈرائیو کرتے کرتے دو گھنٹے ہو گئے تھے اتوار کی وجہ سے زیادہ رش بھی نہیں تھا۔ لیکن لانگ بیچ کے کہیں آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ''لانگ بیچ خاصی دور ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ایک شہر سے دوسرے شہر جا رہے ہیں۔''

''ایسا ہی سمجھو۔''

لوگ جتنا وقت اپنے دفاتر میں کم کرتے ہیں اس سے آدھا وقت بسا اوقات آنے جانے میں صرف ہوتا ہے۔ ہر چند کہ شہروں میں سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے لیکن جب پچاس لاکھ گاڑیاں بیک وقت سڑکوں پر آئیں گی تو پھر ٹریفک جام نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟

''تمہیں کیا جلدی ہے؟ کونسا ان تم نے سمندر کک میں تیرنا ہے۔ اتنی پیاری کمپنی میں تو مزید کوئی خواہش نہیں ہونی چاہئے'' سارا نے مجھے کفران نعمت کا احساس دلایا۔

''ادیبوں کو خوب سے خوب تر کی تلاش ہوتی ہے۔ تم تو جانتی ہوں۔ لانگ بیچ پر حسینوں اور مہوشوں کا جھمگٹا لگا رہتا ہے۔'' کیتھی آج واقعی اس کے ساتھ امن کا معاہدہ کر کے گھر سے نکلی تھی۔

ویسے کیتھی نے درست ہی کہا تھا۔ ایک طویل ساحل' نرم اور ملائم سفید ریت' ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر' صاف شفاف لوگ..... ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے تازہ تازہ برسات ہوئی ہے اور ہزاروں کی تعداد میں بیر بہوٹیاں دھرتی سے نکل آتی ہیں۔ رنگ برنگے کاسٹیوم' حسین چہرے' نیم برہنہ جسم' اکثر بکنی کی قید سے بھی آزاد..... اپنے گردوپیش سے بے نیاز..... ریت پر لیٹے غسل آفتابی کر رہے تھے۔ سفید جسموں کو TAN کرنے کا بڑا رواج ہے۔ انسان بھی عجیب مزاج رکھتا ہے ہمارے ہاں کالے اور سانولے سفید ہونے کی انتھک اور سر

توڑ کوشش کرتے ہیں۔ تبت سنو ایمکس اور اس نوع کی ہزاروں کریموں کے چہروں پر پلستر کرتے ہیں۔ سفید رنگ کی تعریف میں شاعر قصیدے لکھتے ہیں اور کالے رنگ کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں حتیٰ کہ فیض جیسے انسان دوست شاعر کو بھی کسی موقع پر کہنا پڑ گیا تھا!

چمپئی رنگ کہ ہے راحت دیدار کا رنگ

سرمئی رنگ جو ہے ساعت بیزار کا رنگ

لیکن وہاں سفید فام قومیں کالی قوموں سے نفرت تو کرتی ہیں لیکن ان کا تھوڑا سا رنگ چرانے میں قباحت بھی محسوس نہیں کرتیں۔

بیچ کے کنارے پر باتھ روم بنے ہوئے تھے۔ سمندر میں نہانے سے پہلے اور نہانے کے بعد لوگ غسل کر کے جاتے تھے۔ اس کا مقصد پانی کو آلودگی سے پاک رکھنا ہے..... سگریٹ کا بٹ' کاغذ کا ٹکڑا' کسی پھل کا چھلکا پھینکنے کی ممانعت ہے..... ایک ہماری BEACHES ہیں جہاں سوائے صاف پانی کے ہر چیز وافر مقدار میں ملے گی۔ انسانوں سے زیادہ جانور نہاتے ہیں۔ رسم ورواج کی وجہ سے عورتیں نہا نہیں سکتیں۔ مرد کی فطرت ہے کہ سمندر میں وہ اسی وقت داخل ہوتا ہے جب عورت ساتھ ہو یا آس پاس ہو۔

ساحل کے ساتھ ساتھ ڈسٹ بن بنے ہوئے تھے لوگ کھانے پینے کا سامان اکثر ساتھ لے جاتے ہیں۔ کھایا اور فالتو سامان پلاسٹک کے بیگ میں بند کر کے کوڑے کے ٹن میں پھینک دیا۔

مناسب فاصلوں پر بارز ہیں۔ منچلے سمندر میں ڈبکی لگانے سے پہلے غرق مئے ناب ہوتے ہیں۔ وائن اور بیئر پانی کی طرح چلتی ہے۔ کسی ممکنہ حادثے سے بچنے کے لئے پانی کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ لال، سبز اور سفید فلیگ لگائے گئے ہیں جس سے پانی کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ موجوں کی روانی کا اندازہ ہوتا ہے کوسٹل گارڈ اپنے حفاظتی ساز وسامان کے ساتھ موجود ہیں اور خطرے کا الارم بجتے ہی سمندر میں کود جاتے ہیں۔

ہم ساحل پر ایک خالی جگہ دیکھ کر بیٹھ گئے۔ سارا کار کی ڈکی سے باسکٹ نکال لائی۔ ہم نے کوکا کولا کے ٹن کھولے اور آہستہ آہستہ سپ لینے لگے۔ سارہ کہنے لگی "اب سمندر میں نہایا جائے اور غسل آفتابی کیا جائے۔

بڑا عرصہ ہوا ہے میں ساحل پر نہیں آسکی"..... ان تینوں نے مجھے دعوت دی، لیکن میں نے معذرت کر لی۔

سارا کہنے لگی، "شاید تمہارے پاس سوئمنگ کاسٹیوم نہیں ہے۔ فکر نہ کرو یہاں کرائے پر مل جاتے ہیں۔ میں ابھی لے آتی ہوں۔ ویسے تمہارا سائز کیا ہے؟"

"سائز تو تمہیں جب بتاؤں اگر میں نے نہانا ہو۔ میں سمندر میں کبھی نہیں نہایا!"

"تو تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے؟ قسم سے بڑا مزہ آئے گا۔ جب لہریں تمہیں اٹھا کر بیچ منجدھار میں لے جائیں گی"۔

"میں زندگی کی منجدھار میں تو کھڑا ہوں۔ اب کوئی لہر میرا مزید کچھ نہیں بگاڑ سکتی"۔

بولی، "اپنی کمزوریوں کو فلسفیانہ رنگ مت دو۔ چلو اب اٹھو بھی نا، بڑی دیر ہو رہی ہے"

میں نے کہا، "اپنا وقت کھوٹا مت کرو!" "میں تمہیں تیرتا ہوا دیکھ کر ہی خط اٹھالوں گا"۔

مون کہنے لگی، شاہ! اگر کسی وجہ سے سوئمنگ نہیں کرنا چاہتا تو اسے مجبور مت کرو۔ جلدی کرو آؤ شاور لے لیں۔ سورج سر پر آ گیا ہے۔

وہ تینوں قریبی باتھ میں شاور لینے چلی گئیں، تو میں نے ایک نگاہ سمندر پر ڈالی۔ بحرالکاہل دنیا کا سب سے بڑا اور گہرا سمندر، دنیائے آب کا شہنشاہ جب طیش میں آتا ہے تو بڑے بڑے جہاز خزاں رسیدہ پتوں کی طرح لرزتے ہیں اس کی ذرا سی ناراضی سے ڈوب جاتے ہیں سفینے موت کی آغوش میں۔ گرجتے ہوئے بادلوں اور کڑکتی ہوئی بجلیوں کی رزم گاہ۔ یہ وہی سمندر ہے جو پہلی مرتبہ آسٹریلیا کے براعظم کو تہہ آب سے نکال کر اب جہان خراب تک لایا۔ امریکہ کا جنگ LAUNCHING PAD دوسری جنگ عظیم میں امریکی شرکت کا آغاز اس کی بدولت ہوا۔ جب جاپان نے پرل ہاربر پر ہوائی حملہ کیا تو یہ امریکہ کا ممد و معاون بن گیا امریکی کمانڈر جنرل ڈگلس میک آرتھر ساری عمر اس کا کیس پلیڈ کرتا رہا۔ اس نے صدر روز ویلٹ کو بار بار باور کرانے کی کوشش کی کہ امریکہ Pacific Power زیادہ ہے اور "اٹلانٹک" کم۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب بجٹ مختص کرنے کا مرحلہ آیا تو روز ویلٹ کے انکار پر میک آرتھر برہم ہو گیا۔ غصے بھری آواز میں صدر امریکہ کو کہنے لگا "جناب صدر! جب آخری امریکی سپاہی خاک اور خون میں غلطاں

زمین پر پڑا سسک رہا ہوگا اور دشمن کا وزنی پاؤں اس کے سر پر اور تیز سنگین گردن پر ہوگی تو مرنے سے پہلے غصے کے عالم میں جو آخری گالی اس کے منہ سے نکلے گی وہ تمہارے لئے ہوگی، میرے لئے نہیں..... یہ کہہ کر وہ پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا جب زینے سے اترتے ہوئے اس نے سوچا کہ وہ کس کو کیا کہہ بیٹھا ہے تو پریشانی کے عالم میں اس کے قدم ڈگمگا سے گئے گھر آ کر وہ اپنی برخواستگی کا انتظار کرنے لگا۔ شام کو فون کی گھنٹی بجی، وہائٹ ہاؤس سے فون تھا..... میک آرتھر تمہارے کیریئر کا آخری لمحہ آن پہنچا ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

ہیلو جنرل! چیف آف سٹاف کہہ رہا تھا صدر روز ویلٹ نے تمہارے سب مطالبات مان لئے ہیں۔

سمندر کے دو روپ ہیں، جلالی اور جمالی۔ اس کے ساحل اس کے حسن کے آئینہ دار ہیں، بیچ کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی کارنیوال لگا ہے۔ امریکن چھٹیاں گھر پر نہیں گزارتے، ساحلوں پر، پہاڑوں پر، مرغزاروں میں چلے جاتے ہیں۔ جھیلوں کے کنارے پر آپ کو کارواں ہی کارواں نظر آئیں گے۔ جتنا حسن ان ساحلوں پر ہوتا ہے اتنا سارے شہر میں نہیں ہوتا میں انہی خیالوں میں غلطاں تھا کہ وہ تینوں سوئمنگ کاسٹیوم پہنے میرے پاس آ گئیں۔ میں نے سارا اور کیتھی کو ایک نظر دیکھا اور پھر میری نگاہ مون پر پڑی۔ مجھے ایک جھرجھری سی آئی۔ اوہ! میرے خدا خوف کی ایک سرد لہر مجھے ریڑھ کی ہڈی میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک حسین چہرے کے نیچے اس قدر خوبصورت، متناسب اور مرمریں جسم، اعضاء کی شاعری؟ یہاں اعضا شاعری نہیں کر رہے تھے بلکہ شاعری ایک ایک انگ کو دیکھ رہی تھی..... محسوس کر رہی تھی..... بغلگیر ہو رہی تھی..... نگاہیں ہزار مست سہی..... لیکن نظارہ نقاب کا کام نہیں کر رہا تھا۔ نظریں بکھر نہیں رہی تھیں بلکہ جہاں پڑتیں وہیں جم جاتیں۔ کس قدر تضاد تھا ہماری زندگیوں میں۔ کس قدر وسیع تھی یہ کلچرل خلیج..... خیالات کا اتنا بڑا بعد..... یکا یک لاس ویگاس کے ایم جی ایم گرینڈ ہوٹل کا آئینہ میرے سامنے آ گیا اور مجھے سرزنش کرنے لگا Don,t Be Silly میں نے نگاہیں جھکا لیں۔

سارا چہکی، کیا اس حسن جہاں سوز کے تاب لانے کی ہمت نہیں رکھتے۔

ہاں! میں نے مختصر جواب دیا اور ہاتھ کی انگلی سے ریت پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنا شروع کر دیں۔

وہ کافی دیر سوئمنگ کرتی رہیں۔ میں کافی دیر تک بے ربط خیالوں میں ڈوبا رہا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے میں خشک ریت پر نہیں بیٹھا، کسی ناؤ میں سوار ہوں جو تند دھارے پر ہچکولے کھا رہی ہے۔ نیچے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، اوپر ناقابل برداشت تمازت آفتاب، حیرتیں اور حسرتیں یکجا ہو رہی تھیں۔ لمحہ موجود نے وقت کا بہاؤ روک دیا تھا۔

جب کار بیچ کی پارکنگ لاٹ سے نکل کر مرکزی سڑک پر آئی تو مون کہنے لگی۔ شاہ! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تمہیں آج کا پروگرام پسند نہیں آیا، کچھ بجھے بجھے سے لگتے ہو؟

دراصل سمندر مجھے ہمیشہ اداس کر دیتا ہے اس کی وسعتوں اور گہرائی کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی عزیز چیز کھو گئی ہو۔

بولی، تلاش کا عمل جاری رکھنا چاہیے۔ ڈھونڈنے والے تو گہرے سمندروں میں سے موتی تک نکال لاتے ہیں۔

وہ پیشہ ور لوگ ہوتے ہیں جن کام ہی ان کی خرید و فروخت ہوتا ہے وہ موتی کی قدر نہیں کرتے ان کو اس کی قیمت سے غرض ہوتی ہے۔

کہنے لگی آج میں بھی بال بال بچی ہوں ایک سرکش موج مجھے اٹھا کر بیچ سمندر میں لے گئی تھی۔ خوش قسمتی سے ایک دوسری لہر اس کے ساتھ ٹکرائی جو مجھے دھکیلتی ہوئی کنارے پر لے آئی۔

اس میں تمہاری خوش قسمتی سے زیادہ موجوں کی رقابت کام کر گئی!

چاند کی کرنیں جب سمندر پر پڑتی ہیں تو اس میں جوار بھاٹا اٹھتا ہے اور اگر پورے جوبن پر آیا ہوا چاند ہی سمندر میں اتر جائے تو پھر طغیانیوں کو کون روک سکتا ہے۔ مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ یہ باقی لوگ صحیح سلامت کیسے نکل آئے۔

پھر تو میں سکیورٹی رسک ہوئی نا؟ ہنسی کا ایک فوارہ اس کے منہ سے چھوٹا..... اگر تم نے ایسے چند جملے اور بول دیئے تو الفاظ کی جادوگری میں بغیر کسی تردد کے مس کیلیفورنیا بن سکتی ہوں!

اس کے لئے تمہیں کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایک دفعہ ارادہ تو کرو! اگر گنجے ججوں کی

دبیز شیشوں والی عینکیں ان کی مخنی ناک کے پھندنوں پر نہ آن گریں تو میرا نام بدل دینا!

اور میرے متعلق کیا خیال ہے؟ سارا تنک کر بولی۔

تمہیں مقابلے میں حصہ لینے کے بجائے جج ہونا چاہیے!

وہ کیوں! وہ کسی سیامی بلی کی طرح غرائی۔

کیونکہ تم مین میخ نکالنے کی ماہر ہو!

شاہ! تم نے میری تعریف کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیا ہے۔ اس نے احتجاج کیا۔

اسے تم تعریف کہتی ہو! کیتھی اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ اگر تمہیں بین السطور ان کا مطلب معلوم ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ تم ایک دفعہ پھر سمندر کی طرف دوڑ پڑو گی۔

نہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں کیتھی کی بات کی نفی کرتے ہوئے بولا۔

سارا بیشک خوبصورت اور سمارٹ لڑکی ہے صرف اس نے سہیلیوں کا انتخاب غلط کیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بیک گراؤنڈ میں چلی جاتی ہے۔

تو کیا میں اپنے حسن کی اہمیت جتوانے کے لئے مون کی دوستی چھوڑ دوں؟

تم نے Bunyantree دیکھا ہے اس کے سائے میں دیگر کوئی پودا پنپ نہیں سکتا!

تو کیا ہوا؟ اس پر کئی Carrier قربان کئے جا سکتے ہیں۔

مون! یہ کیا کہہ رہی ہے؟ مجھے خطرے کی گھنٹیاں بجتی سنائی دیتی ہیں، کیتھی بولی۔

بجنے دو، خود بخود بند ہو جائیں گی اس کی دوستی ہر مصلحت سے ماورا ہے۔

ہم چلتی گاڑی میں کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ واپسی پر مون نے ونٹورا بلیوارڈ کا چکر لگایا۔ لیکن کہیں گاڑی کھڑی نہ کی اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں نے شاپنگ کرنی ہے تو وہ کسی مناسب جگہ پر گاڑی کھڑی کرے۔ لیکن میرا وہی جواب تھا کہ میرا مقصد مشاہدہ ہے خرید و فروخت نہیں! جب ہم رڈیو ڈرائیور سے ہوتے ہوئے گھر پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ مون نے ریموٹ کنٹرول سے بٹن دبایا تو مرکزی دروازہ خود بخود کھل گیا..... گھر میں کوئی نہیں تھا۔ مسز رابسن ایک پارٹی میں شرکت کے لئے گئی ہوئی تھیں..... مون کے

پاس ڈپلیکیٹ چابیاں تھیں اس لئے ہم ڈرائنگ روم کے راستے گھر میں داخل ہو گئے..... وہ جانے سے پہلے کھانا بنا کر فریج میں رکھ گئیں تھیں ہم نے نکال کر اوون میں گرم کیا کھانا کھا کر میں نے اجازت لی اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کپڑے بدل کر میں بستر پر لیٹ گیا۔ سونے کی کوشش بھی کی لیکن ایسے محسوس ہوتا تھا کہ ذہن نے نیند کو شجر ممنوعہ سمجھ رکھا ہے جب آدھے گھنٹے تک کروٹیں بدلنے کے بعد بھی نیند کو کوسوں دور پایا تو میں پہلے دن کی طرح دروازہ کھول کر ٹیرس میں آ گیا۔ کچھ دیر ٹیرس پر بے مقصد گھومتا رہا اور پھر بید کی کرسی پر نیم دراز ہو کر سگار سلگا لیا۔ دھوئیں کے مرغولوں نے یکا یک کیلیفورنیا کی دلچسپ تاریخ نے اپنے پرت کھول دیئے۔

تیسرا باب

جب بھی دنیا میں بڑے ملکوں کا ذکر ہوتا ہے تو گندم کی سنہری بالیوں اور ابراہم لنکن کے سرخ آویزوں والا امریکہ فوراً پردۂ ذہن پر ابھرتا ہے اور جس گھڑی پچاس امریکی ریاستوں کی بات چل نکلتی ہے اور نگاہ مشرق سے مغرب تک دوڑتی ہے تو لامحالہ ایک خوبصورت جگہ پر جا کر رک جاتی ہے اور وہ سنہری دھوپ والی ریاست کیلیفورنیا ہے۔

امریکہ کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستان، ہندوستان، بنگلہ

دیش اور سری لنکا کو یکجا کر کے دو سے ضرب دی جائے تو بھی دو امریکی ریاستیں الاسکا اور ہوائی الگ مسکراتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ امریکہ جو سابق سوویت یونین کو چھوڑ کر سارے یورپ سے بڑا ہے، جس کے آگے آسٹریلوی برِاعظم بھی ہاتھ جوڑتا نظر آتا ہے..... اس کی ریاست کیلیفورنیا رقبے کے لحاظ سے پاکستان سے بڑی ہے۔ لارڈ BRYCE نے کہا تھا، کہ کیلیفورنیا بذاتِ خود ایک ملک ہے۔ اور سان فرانسسکو ایک دارالخلافہ سے کم نہیں۔ یہ اکتیسویں ریاست تھی جو وفاق میں داخل ہوئی یا کی گئی۔ رقبے کے اعتبار سے یہ دوسری بڑی ریاست ہے۔ اس کا رقبہ 1,58693 مربع میل ہے۔ امریکہ کا سب سے اونچا 15 ہزار فٹ بلند پہاڑ ماؤنٹ وہٹنی Mount Whitne اسی ریاست میں واقع ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ امریکہ کا سب سے زیریں مقام وادیٔ موت، جو سطح سمندر سے 276 فٹ نیچے ہے۔ اس سے صرف اسی میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کیلیفورنیا کے نقشے کو یورپ کے نقشے پر رکھا جائے تو یہ ایمسٹرڈیم سے روم تک طویل ہوگا۔ اور اگر اس کا رخ تبدیل کر دیا جائے تو برن (سوئٹزرلینڈ) سے بخارسٹ تک جا پہنچے گا۔ بالفرض اس کا تقابل امریکی ریاستوں سے بھی کیا جائے اور اس کے نقشے کو امریکی نقشے پر دائیں ہاتھ رکھا جائے تو بھی یہ شکاگو سے لے کر بحراوقیانوس تک دراز قد ہے۔ لارڈ برائس نے اپنی کتاب "THE AMERICAN COMMONWELTH" میں لکھا تھا کہ پہلی تیرہ ریاستوں کو چھوڑ کر یہ واحد ریاست ہے جس کی قدرتی سرحدیں ہیں۔ اس کے شمال میں OREGAN کے جنگلا، جنوب میں دریائے کولاراڈو اور میکسیکو کے صحرا، مغرب میں بحرالکاہل کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور مشرق میں مشہور صحرائے نیواڈا ہے، جس کا تفصیلاً ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہاں چالیس پہاڑی چوٹیاں ایسی ہیں جن کی اونچائی دس ہزار فٹ سے زیادہ ہے۔ لیکن ان سے بھی زیادہ جاذبِ نظر 50x350 میل کی وہ سنٹرل ویلی ہے جسے زراعت کا پیالہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ امریکہ کی ان معدودے چند ریاستوں میں سے ایک ہے جس کے دو دارالخلافے ہیں۔ لاس اینجلس اور سیکرے مینٹیو۔ اسی طرح کیلیفورنیا یونیورسٹی بھی عملاً دو حصوں میں منقسم اور کافی حد تک خود کفیل ہیں۔ ایک حصہ لاس اینجلس میں ہے اور دوسرا برکلے میں واقع ہے۔

مزاج کے اعتبار سے، معیشت کے نقطۂ نظر سے، موسم کی متلوّن مزاجی کو دیکھتے ہوئے، شمال اور جنوب میں بعد المشرقین ہے۔ شمال کی شان سان فرانسسکو ہے اور جنوب کی جان لاس اینجلس ہے۔ سان فرانسسکو میں گولڈن گیٹ برج ہے۔ جس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتے پہنچتے موسم بدل جاتا ہے۔ ایک سرے پر سنہری دھوپ نکلی ہوئی ہے تو دوسرے حصے میں دھواں دھواں ہے فضا سحر سامریکی طرح..... ماؤنٹ شاستا، لیک طاہو اور امریکہ کا واحد "ACTIVE" آتش فشاں، ماؤنٹ لیسن MOUNT LASSON ہیں۔ سان فرانسسکو، جہاں دنیا کے بہترین ہوٹل اور ریسٹورنٹ ہیں جو آدھے سمندر میں ہیں اور آدھے زمین پر، پہاڑیوں پر بنا ہوا شہر جسے سمندری پانی کے دھاگوں سے پرویا گیا ہے۔ پھر ہسپانوی کمیونٹی کا مرکز اور چائنہ ٹاؤن جہاں جا کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چین میں آ گئے ہوں۔

جنوب کا مزاج مختلف ہے۔ اس میں پٹرول کی بو بھی ہے اور سنگتروں کی خوشبو بھی رچ بس گئی ہے۔ مذہبی منافرت انتہا کو پہنچی ہوئی، طبقاتی تعصبات عروج پر، کالوں اور گوروں کے درمیان نفرت کی ایک وسیع خلیج، امارت کے آئینہ دار شہر سانتا باربرا، اور پیسے ڈیٹا..... خوشگوار موسم جسے دیوتاؤں کی طرح پوجا جاتا تھا۔ کسی زمانے میں جو لوگ کیلیفورنیا تبادلہ کروانا چاہتے تھے ان کی تنخواہ کم کر دی جاتی تھی۔ کیونکہ حکومت ایک ٹکٹ میں دو مزے لوٹنے کی اجازت نہیں دیتی تھی..... لیکن جنوب کی یہ تمام رونقیں، رنگینیاں اور رنگ رلیاں ایک چیز کی مرہونِ منت ہیں۔ 'لائف میگزین' نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ سارا جنوب پلک جھپکنے میں نیست و نابود ہو جائے اگر اسے مستعار پانی ملنا بند ہو جائے۔ 1947ء کا قحط آج بھی لوگوں کے ذہن میں کسی ڈراؤنے خواب کی طرح محفوظ ہے۔ گورنر وارن نے ایمرجنسی نافذ کر دی تھی اور بلیک آؤٹ نہ سہی، براؤن آؤٹس ضرور ہوتے تھے۔ لیکن جب پانی وافر مقدار میں ملتا رہے تو پھر کون سی چیز ہے جو یہاں پیدا نہیں ہوتی۔ یہاں کے نیول اورنج ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ بغیر بیج کے رس دار، رنگ دار، خوش ذائقہ سنگترے AVACADOS، تربوز، SPINCHASPARAGUS گریپ فروٹ OLIVES..... حیران کن بات یہ ہے کہ ریاست میں زراعت اور صنعت ساتھ ساتھ چلتی ہیں..... ہوائی

جہازوں کے کارخانے، تی ل کے کنویں اور ریفائنریز، فلم انڈسٹری، اسی فیصد آبادی شہروں میں رہتی ہے اور جو لوگ شہروں میں نہیں رہتے ان کی سج دھج دیکھ کر شہر شرماتے ہیں۔

کیلیفورنیا کی تاریخ رنگین بھی ہے اور قدرے تلخ اور ترش بھی۔ جس پہلے شخص نے اس سرزمین پر قدم رکھا وہ ایک پرتگیزی تھا JUAN, RODRIGUZ۔ اس نے 1542ء میں سان ڈی آگو بے دریافت کی۔ اس کے بعد تین سو سال تک پرتگیزی اور ہسپانوی حکمران آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ 1579ء میں سر فرانسس ڈریک اپنے جہاز GOLDEN HIND کو لے کر سان فرانسسکو BAY پر لنگر انداز ہوا۔ 1821ء میں جب میکسیکو نے سپین کی غلامی کا طوق گلے سے اتارا تو اس کے چار سال بعد کیلیفورنیا پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ قبصہ کچھ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ امریکہ ایک عرصہ سے اس پر حریشانہ نگاہیں لگائے بیٹھا تھا۔ ان کا استدلال بھی وہی تھا جو منطقی طور پر طاقتور کمزور حریف کے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔ منطق یہ تھی کہ امریکہ کیلیفورنیا کے بغیر اسی طرح مضحکہ خیز ہے جس طرح برطانیا CORNWALL کے ہوتا۔ یا فرانس بغیر BRITTANY کے۔ BERNERD DE VOTO نے اپنی کتاب 'The year of Decesion, 1846' میں واقعات کی تفصیل بتائی ہے..... وہ لکھتا ہے کہ کیلیفورنیا کے متعلق ہم نے اپنے حالات کو کبھی نہیں چھپایا۔ اور نہ کسی قسم کی منافقت سے کام لیا۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ اس علاقے کو خرید لیا جائے۔ لیکن صدر POLK کی ضد تھی کہ اس کو بزورِ شمشیر ہتھیایا جائے۔ چنانچہ 1846ء میں میکسیکو کے ساتھ جنگ چھڑ گئی۔

جو لوگ تاریخ کا ادراک رکھتے ہیں وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ طاقتور اور غاصب کی اپنی الگ سوچ ہوتی ہے۔ ایتھوپیا پر قبضہ کرنے سے پہلے مسولینی نے برطانوی وزیر اعظم کو کہا تھا

"If your offer me the whole of Ethopia on silver platter I w not accept it, because I have resolved to take it by for

(اگر تم سارا 'ایتھوپیا' چاندی کی طشتری پر رکھ کر مجھے دو تو بھی میں انکار کر دوں گا۔ کیونکہ بزورِ شمشیر لینے کا مزہ ہی کچھ اور ہے) 'امریکہ کو جلدی اس لئے کرنا پڑی کہ اس عرصہ میں برطانیہ نے ریشہ

دوانیاں شروع کر دی تھیں۔ روس کی حریصانہ نگاہیں بھی اس علاقے پر لگی ہوئی تھیں۔

امریکی جنگ زیادہ دیر جاری نہ رہی اور FREIMONT نے جنوری 1847ء میں ہتھیار ڈال دیئے۔ میکسیکو مکمل طور پر دستبردار ہو گیا اور 1850ء میں اس کا آئین لکھا گیا۔ جو فوراً منظور کر لیا گیا۔ 1850ء میں اسے یونین میں شامل کر لیا گیا۔ ریاستوں کے لئے "PROBATIONARY PERIOD" رکھا جاتا تھا۔ اس سے بھی اسے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ آخر سونے کی چڑیا تھی۔ ان قانونی ڈھکوسلوں کی کیا ضرورت تھی۔ پھر دو اشخاص ایسے تھے جنہوں نے کیلیفورنیا کو امریکہ میں ضم کرنے کے لئے نمایاں کردار سرانجام دیا۔ ایک تو فری مانٹ تھا جو زیرک ہونے کیس شاتھ ساتھ بہادر اور نڈر بھی تھا۔ اور دوسرا کم مشہور شخص تھا مس اولارکن "THOMAS-O-LARKIN" جو بیک وقت صحافی بھی تھا۔ اس نے تاجر کیا روپ بھی دھار رکھا تھا اور پس پردہ جاسوسی بھی کرتا تھا۔ اپنی سفارتی مراعات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ اس کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ یا تو کیلیفورنیا کو امریکہ میں شامل کر لیا جائے اور بالفرض کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو اس کو اس قسم کی آزادی دلوائی جائے جیسے VONPOPEN نے آسٹریا کو جرمنی کا حصہ بنانے کے لئے دلوائی تھی۔ دریں اثناء برطانیہ حسب عادت اسے اپنا PROTECTORATE بنانے پر تلا ہوا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ ٹیکساس اور کیلیفورنیا فوراً اس کے زیر اثر آ جائیں۔ برطانیہ کے لئے یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ OREGON کی ریاست کی ڈیل میں اس کو بطورِ ترپ پتے کے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اسی عرصہ میں روسی جہاز اپنے آدمیوں کو لے کر 1812ء میں سان فرانسسکو میں لنگر انداز ہو گیا۔ انہوں نے وہاں نہ صرف قلعہ بنا لیا بلکہ میکسیکو کا اختیارِ اعلیٰ ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ یہ سلسلہ دس برس تک چلتا رہا۔ لیکن روسی دیر تک اس علاقے پر قبضہ برقرار نہ رکھ سکے اور از خود 1841ء میں وہاں سے چلے گئے۔ اس کے بعد امریکہ نے وہی چالیں اور ہتھکنڈے آزمائے جو فاتح قومیں کرتی آئی ہیں۔ اِکا دُکا جھڑپیں، سازشیں، پہلے تو امریکیوں نے 14 جون 1846ء کو ایک الگ ریاست CALIFORNIA REPUBLIC بنائی اور اس کے ساتھ ہی امریکہ نے میکسیکو کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ طبل جنگ زیادہ دیر تک بجنے کی نوبت نہ آئی کیونکہ میکسیکو

کی قوتیں ریت کی دیوار ثابت ہوئیں۔

VIGILANTES, SOUTH PACIFIC AND HIRAM JOHNSO-

کیلیفورنیا کی تاریخ نامکمل ہوگی اگر ان تین طاقتوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ انہوں نے اس کی تاریخ پر نہ صرف انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ بلکہ اسکی تاریخ کا دھارا بھی بدل دیا ہے'vigilants' 1849ء میں شروع ہوا۔ سارے امریکہ سے لوگ دیوانہ وار کیلیفورنیا کی طرف لپکے۔ یوں لگتا تھا جیسے امریکہ کی ہر شاہراہ اس ریاست میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ ایک تاریخ دان لکھتا ہے کہ صلیبی جنگوں کے بعد غالباً یہ تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی تھی۔ یہ دریافت ریاست میں امارت اور رُومانس لائی۔ لیکن جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اس سے جرائم میں بھی اضافی ہوا۔ آج سونا کانوں سے نکل کر خزانوں میں پہنچ چکا ہے۔ کیلیفورنیا کی تقدیر بدل گئی ہے۔ بے پناہ دولت اس کے چہرے پر نکھار اور تروتازگی لے آئی ہے۔ نئے شہر اور بستیاں آباد ہوگئی ہیں لیکن وہ شہر جہاں کان کنی کی وجہ سے رونقیں ہوا کرتی تھیں، اجڑ گئے ہیں۔ بالکل بھوت پریت کا مسکن لگتے ہیں۔ اس لئے انہیں اب 'GHOSTTOWN' کہا جاتا ہے۔ ان کے نام بھی کچھ اس طرح کے ہیں HANG TOWN, HELLS DELIGHT, PIETY HILL PUKERAVIN, PETTICOAT, SLIDE, GOUGEEYE, SW-HEAD, DIGGINGS POKER FL-

اس وقت سے لے کر آج تک کیلیفورنیا کی تاریخ کے تانے بانے ریل روڈ سے جا کر ملتے ہیں۔ ریل نے جہاں امریکہ کو یکجا کیا، لوگوں کے لئے سفری سہولتیں مہیا کیں، سفر کو آرام دہ اور سستا بنایا، وہاں کئی قباحتیں بھی کھڑی کیں۔ معیشت اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ریلوے مالکان نے قانون دانوں کو خریدنا شروع کیا۔ اپنی مرضی کے قوانین بنوائے۔ بے شمار سینیٹرز اور کانگرس کے رکن ان کے تنخواہ دار تھے۔ الیکشن میں ان کی COMPANING ریلوے کمپنیاں چلاتیں۔ تمام اخراجات برداشت کرتیں اور ناپسندیدہ لوگوں کو ہروانے میں بھی ان کا خفیہ ہاتھ ہوتا۔ 10 مئی 1869ء امریکی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دن سینٹرل پیسفک جو بعد میں SOUTHREN

PACIFIC کہلائی UTAH کے مقام پر یونین پیسفک سے ملاپ ہوا۔ اور اس طرح امریکہ کے سب حصے ریل کے ذریعے ایک دوسرے سے مل گئے۔ دوسری 1885 TRANS CONTINTAL LINE ء میں ی اور تیسری 1885 ء میں مکمل ہوئی۔ ان کے اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ یہ اپنے قوانین خود وضع کرتیں بلکہ ایک اعتبار سے ان کا ہر عمل بذات خود قانون تھا LELAND STANFORD جو سنٹرل پیسفک کے مالکان میں سے تھا، نہ صرف ریلوے کمپنی کا صدر تھا بلکہ ریاست کا گورنر اور امریکی سینیٹر بھی تھا۔ ان دنوں میں وہ ایک لاکھ ڈالر کی زرِ کثیر خرچ کر کے اس منصب تک پہنچا۔ ریلوے کمپنیوں نے اپنے اثر و رسوخ سے فیڈرل گورنمنٹ سے مختلف حیلوں بہانوں سے زمین حاصل کی جو ایک وقت میں تیرہ کروڑ ایکڑ تک جا پہنچی۔ اس سے کمپنیوں کو دو فائدے پہنچے، ایک تو آہستہ آہستہ انہوں نے زمین بیچ کر بے حد منافع کمایا اور دوسرے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اپنے ملازمین کی کالونیاں بنائیں۔ جن میں دیگر لوگوں کو بھی شامل کیا گیا۔ اس طرح ووٹ کے حصول میں آسانیاں پیدا کیں۔ آج اگر کسی سکول کے بچے سے سوال کیا جائے کہ کیلیفورنیا کا سب سے بڑا زمیندار کون ہے، تو وہ فوراً جواب دے گا SOUTHREN PACIFI ان کمپنیوں کو مفادِ عامہ کا کوئی خیال نہیں تھا۔ اپنا مطلب نکالنے کے لئے یہ اخلاقی حدود پھلانگ جاتی تھیں۔ دولت ان کا مطمحِ نظر تھا اور اس کے حصول کے لئے یہ قانون شکنی بھی کرتی تھیں اور قانون خریدتی بھی تھیں۔ چونکہ ان کے مالکان کی اکثریت نیویارک، شکاگو اور فلاڈلفیا میں رہتی تھی اس لئے شہریوں کے مسائل سے وہ ناواقف اور لاتعلق تھے LELAND STANFORD کو AMBROSE BRYCE طنزاً TELANDS TANFORD لکھتا تھا۔ BRYCE نے 1888 ء میں لکھا:

"کیلیفورنیا عملاً کئی سال تک سنٹرل پیسفک ریلوے کمپنی کے رحم و کرم پر رہا۔ کیونکہ مسسپی وادی اور بحرالوقیانوس تک جانے کا یہ واحد راستہ تھا۔ اس کمپنی نے ریاست کے ہر قانون کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی۔ یہ درست ہے کہ یہ پٹڑیاں مشرقی سرمائے سے بنی تھیں۔ جس کے مالکان کو مغرب کے لوگوں کی تکالیف اور مشکلات کا نہ تو احساس تھا اور نہ ادراک، قطع نظر اس بات کے کہ وہ سارا منافع یہاں سے کماتے

تھے۔ انہیں یہاں کے لوگوں کا اتنا ہی خیال تھا۔ جتنا ایک انگلش بانڈ ہولڈر کو اہل چلی کے احساسات اور جذبات کا ہوسکتا ہے۔'' یہ کمپنی ہر مخالف کو زیر کرنے اور ناکوں چنے چبوانے کا گر جانتی تھی۔ سینیٹرز کے علاوہ اخبارات بھی ان کے دستِ نگر تھے۔ ان کا بھی ماہانہ وظیفہ مقرر تھا جو فی شخص 250 ڈالر تھا۔ ان دنوں یہ رقم کچھ زیادہ نہیں لگتی۔ لیکن اس وقت یہ زرِ کثیر تھا۔ جس سے شاہانہ گزر اوقات ہوسکتی تھی اور پھر جہاں یہ اس قسم کے دان دیتے تھے وہاں انتقام لینے کا ڈھنگ بھی جانتے تھے۔ ٹریڈ وار میں یہ شاہوں کو گدائے بے نوا بھی بنا سکتے تھے۔ انہوں نے سیاست میں قدم جمانے کے لئے POLITICAL BUREAU قائم کئے ہوئے تھے۔ تاہم جب ان کمپنیوں کی زیادتیاں حد سے بڑھیں تو لوگوں میں نفرت اور بغاوت کے جذبات پیدا ہوئے۔ بغاوت جو بالآخر کامیاب ہوئی اور اس اور اس کامیابی کا کریڈٹ کافی حد تک HIRAM JOHNSO کو جاتا ہے۔ اس بغاوت میں جو ہتھیار ہرم جانسن نے اختیار کیا وہ تیر و تفنگ نہیں بلکہ سیاسی گولیاں تھیں DIRECTPRIMARY کی وجہ سے مشینوں کے لئے لاتعداد لوگوں کو خریدنا ناممکن ہوگیا۔ اس نے کمپنی کے بزرجمہروں کو ایوان سیاست سے نکال باہر کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اُن کے اثر و رسوخ کا بھی جنازہ نکل گیا۔ حیران کن اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہرم جانسن اس شخص کا بیٹا تھا جو ریلوے کمپنی کا سب سے بڑا گماشتہ تھا GROOVEL, JOHNSON جو ریلوے کمپنی CHIEF LOBBYIS تھا۔ یہ جدوجہد نہ صرف مخلوق اور مخصوص مفادات، تنہا جنگجو اور کمپنی بدخو کے درمیان تھی بلکہ ایک غصیلے باپ اور ایک پرعزم بیٹے نے بھی آستینیں چڑھائی ہوئی تھیں GROOVE سابق سزا یافتہ تھا اور اس بات نے باپ اور بیٹے میں نفرت کی ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی جسے گرانا تو درکنار اس پر سے جھانکنا بھی ایک دوسرے کو گوارا نہ تھا۔ ایک کمپنی کا وظیفہ گزار، دوسرا عوام کا مونس و غم خوار۔ ایک ضمیر کا قیدی دوسرا اس کی آبرو، الیکشن میں دونوں یوں آمنے سامنے کھڑے ہوئے جیسے دو نامی گرامی پہلوان اکھاڑے میں اتر کر ایک دوسرے پر غراتے ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے باپ بیٹے کی رگوں میں خون نہیں، رنگین پانی دوڑ رہا ہے۔ ایک گلی میں باپ تو دوسری میں بیٹا دادِ فصاحت دے رہا ہوتا۔ گروو بیٹوں کو گالیاں دیتا تو وہ کمپنی کے لتے لیتے۔ ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے GROOVE گرجا ''ہوسکتا ہے دوسری

گلی میں دو سیاسی نابالغ ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہوں۔ ان میں سے ایک پاؤں کے ناخنوں تک شرابی ہے تو دوسرا کانوں تک منافق۔ کیا آپ جانتے ہیں یہ کون لوگ ہیں؟ یہ میرے بیٹے ہیں۔

ہرم جانسن نے بلاشبہ کیلیفورنیا کی تاریخ کو ایک سمت عطا کی! سیاست کو ایک انوکھی ہمت اور حوصلہ بخشا۔ وہ 79 سال کی عمر میں 1945ء میں فوت ہوا۔ لیکن لوگ آج تک اسے نہیں بھولے۔ اس کی سیاسی بصیرت و بصارت، ہمت و حوصلہ، دور بینی اور دور اندیشی نے اسے اپنے وقت کا ایک ممتاز سیاستدان اور منفرد گورنر بنا دیا۔ اس کی قابلیت کے جوہر پہلی مرتبہ 1908ء میں کھلے۔ سان فرانسسکو میں REUF نامی ایک بدمعاش نے شہر کے لوگوں کا ناطقہ بند کیا ہوا تھا۔ اور اسے ہرم کے باپ کی پشت پناہی حاصل تھی۔ جب لوگوں کا غم و غصہ بڑھا تو REUF کے خلاف قانونی کارروائی ضروری ہو گئی۔ سپیشل پبلک پراسیکیوٹر FRANCIS.S.HENREY نے اس عمدگی سے مقدمہ لڑا کہ ریوف کو سزا ملنی یقینی ہو گئی۔ بدمعاشوں نے اُسے بھری عدالت میں گولی مار دی۔ اس پر لوگ اس قدر بپھرے کہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ حسب سابق کہیں گلی کوچوں میں عوامی عدالتیں لگنی نہ شروع ہو جائیں چنانچہ فوراً ہی ایک نیا پبلک پراسیکیوٹر مقرر کیا گیا اور وہ کوئی دوسرا شخص نہیں بلکہ خود ہرم جانسن تھا۔ ہرم نے مقدمہ لڑا اور ریوف کو پندرہ سال قید کی سزا ہو گئی۔ اس ایک واقعہ نے ہرم کے قد و قامت کو اس قدر بڑھایا کہ 1910ء میں ری پبلکن پارٹی نے اس کو گورنری کے لئے اپنا امیدوار نامزد کیا اور وہ جیت گیا 1914ء میں بطور ایک ترقی پسند کے وہ پھر جیت گیا۔ یہ سلسلہ مزید آگے بڑھا اور 1917ء میں وہ فیڈرل سینٹ کا ممبر بن گیا۔ جیسے کامیابی کو اس نے اپنا جیون ساتھی چن لیا تھا۔ ہر الیکشن وہ اتنی آسانی سے جیتتا، جتنی سہولت سے لوگ امریکہ میں بیئر پیتے ہیں۔ 1917ء اور 1941ء کی جنگوں میں وہ امریکہ کی شمولیت کے خلاف تھا۔ اس کے خیال میں ان سے امریکہ کے مفادات کو براہِ راست زک نہیں پڑتی تھی۔ وہ واقعی قسمت کا دھنی تھا۔ جس حلقے سے بھی وہ الیکشن لڑتا کامیابی دامن نیاز کی طرح اس کی راہ میں بچھتی جاتی۔ اگر 1920ء میں اس کی انانیت آڑے نہ آتی تو 1923ء میں وہ صدرِ امریکہ ہوتا۔ ری پبلکن کنونشن میں اسے نائب صدارت کی پیش کش کی گئی۔ جو اُس نے اس لئے ٹھکرا دی کہ وہ ہارڈنگ کی صدارت میں کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہارڈنگ کی ناگہانی موت

CALVINCOOLDGE کو صدر بنادیا۔اوراس طرح اس کے ہاتھ میں آئی ہوئی صدارت نکل گئی۔

ہرم جانسن کا شمار کیلیفورنیا کے عظیم ترین گورنروں میں ہوتا ہے۔ وہ آہنی عزم وہمت کا مالک تھا اور بے پناہ سیاسی بصارت رکھتا تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس کی خارزار سیاست میں آمد حادثاتی تھی۔ وہ ایک غریب انسان تھا اور اپنے آپ کو قانون کے پیشے تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی کو بھی سیاست کی ہاؤ ہو سے نفرت تھی۔ اس کی سیاست سے ابتدائی اجتناب کی بنیادی وجہ اس کا باپ تھا۔ GROOVE.L.JOHNSO جو اس قدر بدنام ہو چکا تھا کہ وہ اسے باپ کہتے ہوئے بھی شرم محسوس کرتا تھا۔ وہ اکثر دوستوں سے کہتا کہ جب لوگ کہیں گے کہ یہ کس باپ کا بیٹا ہے تو میں کیا جواب دوں گا۔ سان فرانسسکو کرانیکل کے مدیر CHESTER ROWE نے اس کی ہمت بڑھائی اور اس کے اصرار پر اس نے الیکشن لڑنے کی حامی بھر لی۔ سیاست میں اس کی سوچ امریکہ تک محدود تھی۔ اور اس نے اس سے باہر نکلنے کی نہ تو کوشش کی اور نہ اسے شوق تھا۔ بطور سینیٹر وہ خارجہ پالیسی کے معاملات کو اچھی طرح سمجھ نہ سکا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ جنگِ عظیم میں امریکہ کی شمولیت نہیں چاہتا تھا۔ غالباً اس وجہ سے وہ ولسن اور روز ویلٹ سے بھی شدید نفرت کرتا تھا۔ ہر امریکی صدر اس کی تنقید کا نشانہ بنتا۔ نفسیاتی طور پر اُسے اس بات کا ہمیشہ قلق رہا کہ امریکہ میں ایک صدر ہے۔ اور بدقسمتی سے اس کا نام HIRAM JOHNSON نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ وہ انانیت کے اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں لوگ سنکی ہو جاتے ہیں اور انہیں چار سُو اپنا ہی عکس نظر آتا ہے۔

اس کا اندازِ بیان منفرد تھا۔ وہ فن تقریر کا عطاء اللہ شاہ بخاری تھا۔ اس کی تحریر میں بلا کی کاٹ تھی اور تقریریں غضب کی کڑک دار۔ اپنے مخالفین پر بے رحمانہ تابڑ توڑ حملے کرتا۔ 'لاس اینجلس ٹائمز' کے مدیر OTIS کے متعلق ایک دفعہ اس نے لکھا۔

IN THE CITY OF 'SANFRANSISCO' WE HAVE DRUN
TO THE VERY DREGS OF IN FAMY, WE HAVE HAD V

OFFCIALS, WE HAVE HAD ROTTEN NEWSPAPERS.
WE HAVE NOTHINGS SO VILE, NOTHING SOL
NOTHINGS SO DEBASED, NOTHINGS SO INFAMOU
SANFRANSISCO AS HARRISON GREY OTIS. HE
THERE IN SENILEDEMENTIA WITH A GANGRENE HE
& ROTTING BRAIN, GRIMACING AT EVERY REF
CHATTERING IMPOTENTLY AT ALL THINGS THAT
DECET-FROTHING FUMING, VIOLENTLY GIBBNER
GOING DOWN TO HIS GRAVE IN SNARLI
INFAMY-DISGRACEFULL, DEPRAVED AN
PUTERSCENT

لیکن اس میں سے کچھ الفاظ اس کے مخالفین اس کے خلاف بھی استعمال کر سکتے تھے۔ آخری عمر میں وہ کچھ سٹھیا سا گیا تھا اور اس کے حریف گنگناتے تھے۔

" WHY IS 'HIRAM HOHNSON' STILL ALIVE?
BECAUSE HE IS TOO MEAN TO D
O

کیلیفورنیا کی تاریخ طویل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ شاید ان محدود صفحات میں سب واقعات کا احاطہ کرنا ممکن نہ ہو۔ ریاست کی تعمیر مہم جوؤں نے جس موڈ میں کی وہ بقول W.D. BROGAN نے کہا تھا کہ جن لوگوں "MASCULINE, ANARCHICAL BAR BARIS نے ریاست کی تعمیر و ترقی کے لئے کام کیا وہ معمولی انسان نہیں تھے۔ وہ عزم و ہمت کے پیکر تھے۔ اور ان میں ڈر، خوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اُن کے دل اُن کے جوتوں کی طرح بڑے اور مضبوط تھے۔

کیلیفورنیا کی ریاست کا نظام سمجھنے کے لئے چند بنیادی باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ امریکہ میں فیڈرل نظام رائج ہے۔ جس کا محور و مرکز ریاست ہے۔ ووٹ دینے کا حق بھی مرکزی حکومت نہیں بلکہ ریاست کا قانون دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کولمبیا ڈسٹرکٹ کے باشندگان حق رائے دہی نہیں استعمال کر سکتے۔ اس طرح ایک اعتبار سے امریکہ کا صدر بھی 'الیکٹرورل کالج' نہیں بلکہ ریاستیں چنتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دو امریکی صدور RUTHER FORD HAYS اور BENJAMIN HARRISON باوجود اقلیتی ووٹ کے 'وائٹ ہاؤس' پہنچ گئے۔ ریاستیں اپنا آئین خود بناتی ہیں۔ اپنے لئے قوانین خود وضع کرتی ہیں اور چند امور کو چھوڑ کر ہر اعتبار سے مالک مختار ہوتی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے ذرائع ابلاغ ترقی کرتے گئے اور امریکہ نے 'سپر پاور' کا لبادہ اوڑھا لیا تو ریاستیں اپنے حقوق سے کنارہ کش ہوتی گئیں۔ سپریم کورٹ کی روسے DOCTORINE OF IMPLIED POWERS نے ان کے اختیارات پر کاری ضرب لگائی۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ریاستوں میں نقل مکانی اس قدر زیادہ ہے کہ لوگوں میں پرانے تعصبات نہیں رہے۔ اگر ایک شخص پچاس سال نیویارک میں رہ کر کیلیفورنیا چلا جائے تو دوسرے دن ہی وہ اپنے آپ کو ریاستی باشندہ کہلانے پر فخر محسوس کرنے لگے گا۔ اور پچھلی پچاس سالہ رفاقت کو یکسر فراموش کر دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور سیاسی مفکر 'والٹر وتچل' نے سپریم کورٹ کے جج ڈگلس کے مت علق لکھا تھا کہ وہ ریاست میں سونا کے شہر میں پیدا ہوا، واشنگٹن میں اس کی پرورش ہوئی والا والا کے سکول میں تعلیم حاصل کی، نیویارک میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، میری لینڈ میں رہائش رکھی، واشنگٹن ڈی سی میں سروس کی، لیکن اس کے باوجود وہ آریگن 'OREGAN' ریاست کا باشندہ ہے جہاں سا کی زمینیں ہیں۔ تاہم ریاستوں کے اب بھی خاصے اختیارات ہیں اور وہ اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرتی رہتی ہیں۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ ریاست کا سب سے اہم ستون کون سا ہے تو بغیر کسی جھجک کے کہا جا سکتا ہے کہ گورنر ہی ریاست کا اہم ترین ستون ہے۔ ویسے بھی اپنی ریاست کی حد تک اسے قریباً وہی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو فیڈریشن میں امریکی صدر کو ہیں۔ صرف ایک فرق نمایاں ہے کہ یہ اپنی کابینہ خود مقرر نہیں کرتا بلکہ وہ بھی منتخب ہو کر آتے ہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ گورنر کا تعلق ایک پارٹی سے ہے اور اس کا

سیکرٹری دوسری پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ گورنر کوئی شخص بھی بھرتی نہیں کر سکتا۔ وہ بلحاظ عہدہ STATE GUARD کا کمانڈر انچیف ہوتا ہے، جو فیڈرل گورنمنٹ کے زیر کمان نہیں ہوتی۔ گورنر کو صدر کی طرح ویٹو پاورز ہوتی ہیں۔ چونکہ ریاست میں اس کا الیکشن براہ راست ہوتا ہے اس لئے اسے بیشمار ایگزیکٹو اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ بڑی ریاستوں کی گورنری ایک بہت بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ اور اسے قصر صدارت تک پہنچنے کے لئے STEPPING STONE سمجھا جاتا ہے۔ کلیولینڈ، ولسن، کولج اور ہر دور وزویلٹ اسی راستے سے 'وائٹ ہاؤس' پہنچے تھے۔ کچھ ریاستوں میں گورنر کو چار سال کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ بعض نے اس کے لئے دو سال کی مدت مقرر کر رکھی ہے۔ نیو جرسی میں کسی زمانے میں تین سال کی ٹرم مقرر تھی جو بعد میں چار برس کر دی گئی۔ کئی ریاستوں میں گورنر دوسری رمتبہ الیکشن نہیں لڑ سکتا۔ اس کیلئے وقفہ ضروری ہے۔ اسے EUNACHRULE کہا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے عام فہم فلسفہ یہ ہے کہ اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے وہ غیر آئینی ہتھکنڈے استعمال کر سکتا ہے۔ اور منتخب ہوتے ہی اسے دوسرے الیکشن کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ اس طرح امور ریاست متاثر ہوتے ہیں۔ ریاست میں لیفٹیننٹ گورنر کا عہدہ بھی ہوتا ہے جو صحیح معنوں میں کسی کے کام نہ آنے والا مشتِ غبار ہوتا ہے۔ وہ سینٹ کے اجلاس کی صدارت کرتا ہے اور باقی وقت، چونکہ امریکہ میں مکھیاں نہیں ہوتیں اس لئے 'خیالی پتنگ' اڑانے میں گزارتا ہے۔ مجلس قانون ساز بھی فیڈریشن کی طرح دو حصوں پر مشتمل ہے۔ سینٹ اور اسمبلی۔ کیلیفورنیا میں سینٹ کی چالیس سیٹیں ہیں۔ زیادہ سیٹیں دیہاتی علاقوں کو دی گئی ہیں۔ لاس اینجلس اور سان فرانسسکو کو جن کی آبادی بہت زیادہ ہے اور جہاں دولت، تعلیم، عقل و دانش، آرٹ اور لٹریچر کی فراوانی ہے، ان کے حصے میں چالیس میں سے دو سینٹ کی سیٹیں آتی ہیں۔

امریکہ میں لابی صحیح معنوں میں کامیابی کی چابی ہے۔ کسی قانون کو منظور کروانے یا ختم کروانے یا ختم کرانے میں LOBBIESTS کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ مختلف تجارتی کمپنیوں، اداروں اور مفادات کی نگہداشت کرتے ہیں۔ ان کے پاس پیسہ بھی ہوتا ہے اور ٹیکنیک بھی۔ یہ جہاں رائے عامہ کو پریس اینڈ پبلسٹی کے ذریعے اپنا ہمنوا بناتے ہیں، وہاں قانون دانوں کی جیبیں بھی گرم رکھتے ہیں۔ یہ

ضروری نہیں ہوتا کہ دس ہزار ڈالر سینیٹر کی جیب میں براہ راست ڈال دیئے جائیں، اس کے لئے بھی وہی حربہ استعمال کیا جاتا ہے جو یہاں مولویوں اور سیاستدانوں پر برتا جاتا ہے۔ مولوی کا منہ مسجد کے چندے سے بند ہوتا ہے اور سیاستدان کی جیب پارٹی فنڈ دے کر گرم کی جاتی ہے۔ وہاں بھی اگر کوئی وکیل ہے تو اسے مقدمات کی فیس ادا کی جاتی ہے۔ اگر کوئی چھوٹا موٹا رائٹر ہے تو ایک دن میں پانچ دس ہزار کتابیں، اور اگر کوئی تاجر ہے تو اس کی پراڈکٹس تھوک کے حساب سے خرید لی جاتی ہیں۔

شرع و آئین پر مدار سہی ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

کوئی مروجہ قانون انہیں پکڑ نہیں سکتا۔ لابی کرنے کے متعلق کئی قوانین بنے ہیں لیکن بے اثر ہیں۔ قانون بعد میں بنتا ہے، اس کو بے اثر کرنے کا توڑ پہلے تلاش کر لیا جاتا ہے۔ کیلیفورنیا میں ایک مشہور لابیسٹ سمیشن نے کہا تھا "میں مجلس قانون ساز کا ورنر ہوں، کیلیفورنیا کی گورنری بھاڑ میں جائے" دیگر کئی مغربی ریاستوں کی طرح کیلیفورنیا میں بھی "INITIATIVE REFRENDUM & RECALL ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ قانون اسمبلی میں ہی بنے، اسے کوئی شخص بھی تجویز کر سکتا ہے۔ اور اگر ایک خاصی تعداد میں لوگ اس پر دستخط کر دیں تو وہ قانون بن جاتا ہے۔ لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ایک لاکھ لوگوں کو PETITION پر دستخط کرنے ہوتے ہیں۔ پھر سیکرٹری آف سٹیٹ سے اس بات کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوتا ہے کہ تمام دستخط اصل ہیں اور کسی قسم کا فراڈ نہیں کیا گیا۔ برسہا برس سے کیلیفورنیا پر ری پبلکن پارٹی کا تسلط رہا۔ لیکن فرینکلن روز ویلٹ کی شخصیت نے اسے ڈیموکریٹ بنا دیا۔ اسے 1932ء، 1936ء، 1940ء اور 1944ء میں یہاں سے بھاری اکثریت سے ووٹ ملے۔ اسی طرح ٹرومین بھی 1948ء میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن 1950ء میں ایک دفعہ پھر ری پبلکن چھا گئے۔

تیل اور زراعت کیلیفورنیا کی معیشت کی جان ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو اس کی سنہری دھوپ بے معنی ہو کر رہ جاتی۔ سنٹرل ویلی کو ریاست میں وہی اہمیت حاصل ہے جو مصر میں وادی نیل کو ہے۔ دنیا میں کوئی وادی اس کی زرخیزی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ دریائے سیکرے مینٹو کے پانیوں نے اس کی دھرتی کو گلزار بنا ڈالا ہے۔ لہلہاتے ہوئے کھیت، چہچہاتے ہوئے طیور اور سرسراتے ہوئے پھلوں کے پیڑ اس کی

زرعی عظمت کے امین ہیں۔ پانی کو کنٹرول کیا گیا ہے۔ کھیتوں کو ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ سیراب کیا جاتا ہے۔ پھلوں اور پھولوں کی فراوانی دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اورنج اور ایپل جوس بچے کو گھٹی میں ملتے ہیں۔ خالص دودھ پی کر اور صحت مند جانوروں کا گوشت کھا کر وہ جوانی سے پہلے ہی جوان ہو جاتا ہے۔

امارت کی رہی سہی کسر تیل نے پوری کر دی ہے۔ ٹیکساس کے بعد یہ دوسری ریاست ہے جہاں تیل بکثرت نکلتا ہے۔ تیل یہاں حکومت کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ اس پر افراد اور کمپنیوں کی اجارہ داری ہے۔ سارے ملک کا قریباً بیس فیصد تیل صرف اس ریاست سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بیس ہزار سے زائد کنویں ہیں۔ جتنا تیل ان سے نکلتا ہے وہ ٹینکرز کے ذریعے آئل ریفائنری میں چلا جاتا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ تیس سال میں تیل کی قیمتیں ایک سطح پر قائم ہیں اور انہیں بڑھنے نہیں دیا گیا۔ ہماری معیشت کا تو یہ عالم ہے کہ اگر عربوں کو چھینک بھی آجائے تو یہاں کی معیشت میں زلزلہ آجاتا ہے۔

ایشیائی ملکوں میں ایک تاثر قائم ہو گیا ہے کہ امریکہ اپنے ملک سے تی ل اس لئے نہیں نکالتا کہ پہلے عربوں کے ذخائر ختم کرنا چاہتا ہے۔ یہ خیال خام ہے۔ اول تو وہاں اس سلسلے میں حکومت کی اجارہ داری نہیں ہے دوسرے اگر اتنے دور سے تیل منگوایا جاتا تو پھر قیمتیں ضرور بڑھتیں۔ دراصل ساری دنیا میں امریکی جنگی بیڑے گشت کر رہے ہیں۔ ان کے لئے تیل نزدیک ممالک سے خریدا جاتا ہے۔ تیل کو انسانی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ کارخانے، جہاز، ٹرانسپورٹ سب اس کے مرہونِ منت ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے متعلق کہا گیا ہے "IF YOU DIG DEEP INTO THE POLITICS OF MIDDLEEAST YOU WILL FINE (اگر آپ مشرق وسطیٰ کی سیاست کی گہرائی میں جائیں تو تہہ میں تیل صاف نظر آئے گا)۔ اس کی دریافت نے دنیا کو نہ صرف اس کا دستِ نگر کر دیا ہے بلکہ اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی محال ہو گیا ہے۔ آخر یہ تیل ہے کیا چیز؟ یہ سوال اسی طرح ہے جیسے پوچھا جائے، کہ محنت کیا شے ہے؟ عام فہم زبان میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ HYDROCARBON کا مکسچر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لاکھوں برسوں کے کیمیائی عمل اور

شکست وریخت سے درخت، جانور، جمادات اور نباتات نے تہہ سمندر میں چٹانوں کی شکل اختیار کر لی اور انہیں میں سے یہ سیال مادہ نکلا۔ جس نے دنیا کی نظروں کو خیرہ بھی کر دیا ہے اور سارے جہان کو ہلا کر بھی رکھ دیا ہے۔ ہمارے سائنسدان، حکمران اور سیاستدان جب سوچتے ہیں کہ تیل ختم ہو گیا تو کیا ہوگا؟ تو ایک ہی سوچ انہیں لرزہ براندام کر دیتی ہے کہ ''کیا نہیں ہوگا!''

پتہ نہیں انسان کو کالے رنگ سے چڑ کیوں ہے؟ قدرت نے بے شمار رنگ بنائے ہیں لال، نیلا، پیلا، گلابی، عنابی، سفید اور سیاہ، سرخ۔ پھر یہ کیسے تصور کر لیا گیا ہے کہ سفید کو سیاہ پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ سفید فام عقل و دانش میں بہت آگے تھے۔ انہوں نے اپنے علم کے زور پر اوزار بنائے اور پھر تلوار سے نیم مہذب، سیاہ فام لوگوں کو مطیع کیا۔ چونکہ حاکموں کا رنگ سفید تھا اس لئے حاکم کے ساتھ رنگ کو بھی محکوم کے رنگ پر برتری حاصل ہو گئی، اور سیاہ فام لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جانے لگا جو جانوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور طوقِ غلامی ان کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ ارسطو ایسے لوگوں کو HUMANISED BEASTS کہتا ہے۔ ایسے لوگ جو فہم و ادراک نہیں رکھتے، صرف اشاروں پر عمل کرتے ہیں۔ اور اس بات کو اس نے غلامی کا جواز بنایا۔ نیگرو امریکہ کے اصل باشندے نہ تھے۔ Native ریڈ انڈین کا رنگ اور شکل و صورت ان سے یکسر مختلف ہے۔ جیسے جیسے یورپ سے سفید فام قومیں یہاں آ کر بستی گئیں وہ اپنے ساتھ غلامی بھی لائے۔ آقاؤں کے ساتھ ساتھ غلاموں کی نسل بھی بڑھی اور سارے امریکہ میں پھیل گئی۔ وہ تو بھلا ہوا ابراہم لنکن کا جس نے بیک جنبش قلم، غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑا قدم تھا۔ ایک تاریخی کارنامہ جس کے نتیجے میں اُسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ قانونی طور پر حبشی آزاد تو ہو گئے لیکن سابقہ آقاؤں کے دل سے نفرت اور کدورت ختم نہ ہوئی۔ سکولوں، کالجوں، کلبوں اور ہوٹلوں میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ معاشرے میں انہیں اچھوت سمجھا جاتا۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کی جدوجہد رنگ لائی۔ ہر طرف احتجاج کی لہریں اٹھیں اور ان کو اپنے کھوئے ہوئے حقوق مل گئے۔ لیکن ابھی تک ان کا وحشی پن دور نہیں ہوا۔ امریکہ میں جتنے بڑے جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے اس میں یہ پیش پیش ہیں۔ نیویارک کی بدنامی محض ان کی وجہ سے ہے۔ مسافروں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جیب

میں کچھ ڈال کر باہر نکلیں۔ نیگرو راہزن کو اگر کچھ نہ ملتو کچھ بھی کر سکتا ہے۔

جنگ کے بعد سیاہ فاموں نے بڑی تعداد میں کیلفورنیا کا رخ کیا۔ جہاں ان کے رہنے کے لئے نہ تو مکانات تھے اور نہ کوئی انہیں نوکری دینے کے لئے تیار تھا۔ لیکن اب آہستہ آہستہ برف پگھل رہی ہے۔ معاشرے میں ان کے مکمل ادغام پر تو بہت وقت لگے گا لیکن اس سلسلے میں مثبت پیش رفت ہو چکی ہے۔ کھیلوں پر یہ چھائے ہوئے ہیں۔ باکسنگ کی دنیا کے یہ بے تاج بادشاہ ہیں۔ گاتے ہیں تو سمندر کی لہروں میں بھی ہلچل پیدا ہوتی ہے اس قدر سریلی آواز کہ دل کے نہاں خانوں میں اترتی چلی جاتی ہے اور کانوں میں عجب رس گھولتی ہے۔

الغرض کیلیفورنیا ایک ریاست ہے جو مزاج کے اعتبار سے، معاشی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے منفرد ہے۔ اس کو امریکہ کی معیشت اور دفاع میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ بحرالکاہل تک پہنچنے کا ہر راستہ ادھر سے گزرتا ہے۔ بارہ سو میل اس کا ساحل ہے۔ لوگ شوقین اور رنگین مزاج ہیں۔ خوبصورت اور فیشن ایبل نامور کھلاڑی، عالمی شہرت یافتہ اداکار اور اداکارائیں، کروڑ پتی سرمایہ کار، صرف یہاں رہتے ہی نہیں بلکہ رہنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ لوگ راگ رنگ کے رسیا ہیں۔ کاروں کا شوق کریز کی حد تک ہے۔ اگر کسی شخص کو مکان اور کار کی CHOICE دی جائے تو لامحالہ اس کے ہاتھ سٹیرنگ پر جائیں گے۔ پہلے تو شادی کرنے کی کسی کو جلدی نہیں ہے، اور بالفرض ہو بھی جائے تو طلاقیں لاس ویگاس سے زیادہ ہوتی ہیں۔ انانیت اور انفرادیت اختلاف کو طول نہیں پکڑنے دیتیں۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ کا محاورہ تو آپ نے سن رکھا ہوگا۔ یہاں جھٹ جھگڑا اور فٹ طلاق ہو جاتی ہے۔ جب دلوں میں میل آ جائے تو پھر میلوں چلنے میں کوئی تک نہیں ہوتی۔ تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔

جب آدمی تاریخ کے حصار میں چلا جائے تو پھر باہر نکلنے کو جی نہیں کرتا۔ کیلیفورنیا کی تمام تاریخ کسی فلم کی طرح ذہن کے پردۂ سکرین پر چل رہی تھی۔ اور میں اس ہنڈولے پر بیٹھا ہچکولے کھا رہا تھا۔ موت کے علاوہ بڑے کم لمحات ایسے ہوتے ہیں جب آدمی زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ فلک بوس پہاڑ، گہرے نیلگوں سمندر، وسیع صحرا کچھ بھی تو راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ راہوارِ خیال بے روک ٹوک

دوڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ میں انہی خیالات میں غلطاں تھا کہ سگار نے پوروں کو لو دینی شروع کر دی۔ سگار کی خوبی یہ ہے کہ بڑی دیر تک سلگتا رہتا ہے اور جب جھتے بجھتے اپنا پتہ چھوڑ جاتا ہے۔ میں نے ہڑبڑا کر گھڑی دیکھی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ یہ دوسری رات تھی جو عملاً میں نے بید کی کرسی پر بیٹھ کر ٹیرس میں گزاری تھی۔ ایل اے میں چار بجے کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ نہ تو صبح پر جھوٹ کی تہمت لگائی جا سکتی ہے اور نہ اس کی صداقت کی گواہی دی جا سکتی ہے۔ اندھیرا اور اجالا یوں گڈمڈ ہوتے ہیں کہ زبان دانوں کو ان کے لئے صادق اور کاذب کی بجائے کوئی نئی اصطلاح وضع کرنی پڑے گی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ کپڑوں پر سے سگار کی راکھ جھاڑی اور کمرے میں چلا آیا۔ سونا بیکار تھا۔ ایک تو نیند اڑ گئی تھی اور دوسرا ہمیں صبح کی فلائٹ سے سان فرانسکو جانا تھا۔ وقت گزارنے کے لئے میں نے ٹی وی آن کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم سے متعلق کوئی جنگی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ ہر طرف بارود کے بادل، گولیوں کی تڑتڑاہٹ، انسانی گوشت کے لوتھڑے، فضا میں روئی کے گالوں کی طرح اڑتے ہوئے گرد آلود چہرے، خون آلود خاک، ہر چیز مرجھائی اور جھلسی ہوئی۔ خندق میں بیٹھے ہوئے سپاہی کی اپنے خون سے لکھی ہوئی آخری تحریر' اپنے محبوب کے نام..... یارب ذوالجلال' انسان کو کیا ہو گیا ہے؟ اس قدر وحشی پن کا مظاہرہ تو جنگلی درندے بھی نہیں کرتے۔ یہ کیسا نظام ہستی ہے؟ ایک قاتل معاشرے کا بدنام ترین شخص ہوتا ہے۔ بالفرض قانون کے شکنجے سے نکل بھی جائے تو ساری زندگی اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہاں سینکڑوں انسانوں کے قاتل خوشی سے [redacted] زعم خود سمجھتے ہیں کہ جنت کا ہر دروازہ ان کیلئے وا ہو گیا

خاموشی مجھے ایک لمحہ کیلئے جھرجھری آئی۔ ہمارے پارکوں میں تو میلے کا سماں ہوتا ہے۔ لوگ سیر کم کرتے ہیں' گپ شپ زیادہ لگاتے ہیں۔ دراصل ہمارے پارک ایک طرح سے BREATHING SPACES ہیں۔ چند کمروں کے مکانوں میں رہائش رکھنے والے لوگ گرمی اور حبس سے تنگ آئے ہوئے انسان' ان کو غنیمت جانتے ہیں۔ ٹولیوں میں بٹے ہوئے بڑے زور شور سے بحث کرتے ہیں۔ ''وہ لوٹ کر کھا گئی ہے'' ایک گروپ دہائی دیتا ہے۔ ''اس نے کیا کم کھایا ہے'' دوسرا گروپ پہلی کی کرپشن کا جواز پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد ٹمپر ہائی ہونا شروع ہوتے ہیں۔ ہوا میں مکے لہرائے جاتے ہیں۔ اپنے اپنے گلوں کو ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ نوبت بعض اوقات ناراضگی یا لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے۔ یا مظہر العجائب! کس قدر سادہ لوح ہیں۔ تیرے بندے..... کوئی بھی تو نہیں کہتا کہ لٹ گیا ہوں۔ یہ سب رقم قومی امانت ہے۔ یہ میرے ٹیکس سے وصول کی گئی ہے۔ اور عورتیں دنیا جہان کے سکینڈلز پر لچھے دار زبان میں تبصرہ کرتی ہیں۔ جو لوگ اہل مغرب کی جنسی بے راہروی کا ذکر کرتے ہیں اگر وہ یہ تبصرے سن لیں تو کانوں کو ہاتھ لگا کر اس بے جا تنقید سے توبہ کر لیں۔

میں بنچ پر بیٹھا جوگرز کے تسمے باندھ رہا تھا کہ وہی لڑکی باغ میں داخل ہوئی۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھی میرے پاس آئی اور ہائے کہہ کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ ''تم کل نہیں آئے؟'' اس نے پوچھا۔

''آنکھ نہیں کھلی'' میں نے جواب دیا۔

''کتنے دن رہنے کا ارادہ ہے؟''

''میں آج واپس جا رہا ہوں!''

''تو چلو آج آخری جوگ ہو جائے!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں تمہارے ساتھ نہیں دوڑ سکتا!''

''لیکن کیوں؟'' وہ قدرے حیران ہو کر بولی۔

''تم ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہو۔ میں نے پرسوں تمہیں دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا تمہارے پاؤں میں اسپرنگ لگے ہوں اور وجود میں پارہ تھرک رہا ہو۔ میں تمہارے ساتھ کیسے دوڑ سکتا

ہوں !"

"کوشش تو کرو!" وہ بڑے زور سے ہنسی۔ "تمہارے وجود میں بھی بجلیاں کڑکڑائیں گی۔

"اپنی عمر اور میری عمر کا فرق دیکھا ہے!"

بولی "یہ واک مین لے لو بجلیوں کے نشیمن اس چھوٹے سے آلے میں ہیں۔ جب فرینک سناترا فل میوزک کے ساتھ گاتا ہے تو پھر قدم اٹھتے نہیں اڑتے ہیں۔ ایک ایسی جذباتی اور نفسیاتی فضا پیدا ہوتی ہے کہ انسان اپنی تھکن بھول جاتا ہے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں کسی خارجی سہارے کی ضرورت ہے۔"

"دراصل اکیلے دوڑنے کا عمل بڑی بوریت پیدا کرتا ہے" واک مین کو تم ایک ساتھی کہہ سکتے ہو۔

"تو پھر اسے جیب میں ڈال دو" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہاری موجودگی میں ان مشینی آسروں کی ضرورت نہیں ہے۔"

ہم نے باغ کے تین چکر لگائے۔ میری وجہ سے اس نے اپنی رفتار کم کر دی تھی۔ باتوں کی وجہ سے تھکن کا احساس بھی نہ ہوا۔ ہم دوبارہ بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا "مجھے احساس ہے کہ تمہارا کوٹہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ تم دوڑ جاری رکھو" میں واپس چلتا ہوں۔ اس نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ "اگر کبھی پاکستان آنا ہو تو تم سے ضرور ملاقات ہوگی!"

"ضرور! تمہیں پاکستان بہت پسند آئے گا!" ہم نے رسمی جملے ادا کیے۔ نہ اس نے پاکستان آنا تھا نہ اس سے ملاقات کرنی تھی۔ لیکن جملے پھر وہی ادا ہو گئے' رسم جو ٹھہری۔ وہ پھر سے جوگنگ ٹریک پر چلی گئی۔

جب میں تیار ہو کر نیچے آیا تو سارا اور کیتھی بھی پہنچ چکی تھیں۔ جب مسز رابسن نے ناشتے کا کہا تو سارا ہنس کر بولی "کہ اس کی ضرورت نہیں۔ شاہ چند باتیں کرے گا تو خود بخود ناشتہ ہو جائے گا"۔

"لگتا ہے تم نے اسے ڈرا دیا ہے۔" مون بھی مسکرائی اور بولی "یہ ڈرنے والی شے نہیں ہے۔ اس کے انکار میں بھی اقرار کا پہلو ہوتا ہے۔"

"میرے خیال میں تو اس نے کبھی انکار ہی نہیں کیا۔ یہ بہت نرم دل ہے"۔ کیتھی بولی۔

''انکار اور اقرار کا انحصار تو درخواست پر ہوتا ہے۔ تم اس اعتبار سے خوش قسمت ہو کہ اس کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی!'' سارا اس کے طنز کو بھانپتے ہوئے بولی۔

''کس فضول بحث میں پڑ گئے ہو! چلو ناشتہ کریں۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے''۔ مون نے ڈائننگ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا! ناشتہ بڑا مزیدار تھا کیونکہ INTERNATIONAL HOUSE OF PANCAKES سے منگوایا گیا تھا۔

میکڈونلڈ کی طرح یہ بھی ایک فرنچائز ہے۔ جس طرح میکڈونلڈ برگر اور کینٹکی' فرائیڈ چکن بنانے میں مشہور ہیں اس ریسٹورنٹ نے ناشتہ بنانے میں خصوصیت پیدا کی ہے۔ سپیشل پین کیکس' رنگ برنگے مزیدار شربت' مکسڈ چکن' فرائی فش اور ایک خاص طریقہ سے بنا ہوا آملیٹ۔ ناشتہ کرتے ہوئے مون کی ممی پوچھنے لگیں کہ 'سان فرانسسکو' کے بعد میرا کیا پروگرام ہے؟'' میں نے انہیں بتایا کہ میں وہاں سے ہوائی جاؤں گا اور ہو سکتا ہے پہلے چند دن ڈلس میں رکوں۔ پھر وطن واپس لوٹ جاؤں گا''۔

''کیا اس سے پہلے بھی ہوائی اور ڈلس گئے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ڈلس تو گیا ہوں' ہوائی جانے کا یہ پہلا اتفاق ہوگا''۔

کیلیفورنیا اور ٹیکساس میں کیا فرق محسوس کرتے ہو؟''

''ان میں چند ہی قدریں مشترک ہیں باقی تو بعد المشرقین ہے''۔

''مثلاً؟'' ان کی دلچسپی بڑھنے لگی۔

دونوں ریاستیں دیو ہیکل ہیں۔ ماضی میں دونوں کا مزاج جنگجویانہ رہا ہے۔ ایک وقت میں دونوں آزاد ریاستیں تھیں۔ جن کا اپنا جھنڈا اپنا آئین تھا۔ سوائے VERMONT کے امریکہ کی کسی ریاست کو یہ اعزاز نصیب نہیں ہوا۔ ٹیکساس دس سال تک خود مختار رہا جبکہ کیلیفورنیا کی ری پبلک چند ہفتوں تک قائم رہ سکی۔ دونوں میں کسی حد تک امپیریلسٹ رجحانات ہیں۔ جب کیلیفورنیا اور ایری زونا میں پانی کی تقسیم کا جھگڑا چلا تو کئی کیلیفورنین یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ کیوں نہ ایری زونا سے بزور شمشیر اپنے مطالبات منوائے جائیں۔ یہ تو نیواڈا کو بھی اپنی ذیلی ریاست تصور کرتے ہیں اور اس کے سینیٹرز کو اپنا تیسرا اور چوتھا سینیٹر سمجھتے

ہیں۔ لیکن یہاں مشترک قدریں ختم ہوجاتی ہیں"۔ میں ان کے اشتیاق کو دیکھ کر ایک لمحے کیلئے رکا۔
"ٹیکساس کے مزاج میں اکھڑ پن نمایاں ہے۔ کیلیفورنیا سراسر رومانس ہے۔ سیاسی معاملات میں اس کا
انداز شائستہ ہے۔ مذہبی طور پر البتہ ACCENTRIC ہے۔ لیکن ان میں سب سے بڑا تفاوت کلچر کا
ہے۔ کیلیفورنیا کے مقابلے میں ٹیکساس اسی طرح ہے جیسے فرانس کے مقابلے میں البانیہ ہو۔ شعروادب اور
فنون لطیفہ کے ضمن میں ٹیکساس میں قحط الرجال ہے۔ اس کی پوری تاریخ میں گنتی کے شاعر، نغمہ گو، سنگتراش،
سائنسدان اور موسیقار بھی ایسے نہیں گزرے جن کا نام تفاخر سے لیا جاسکے۔ کسی آرٹسٹ کی ٹیکساس میں
تلاش اسی طرح ہے جیسے صحرا میں برف تلاش کی جائے۔ اس کے مقابلے میں کیلیفورنیا میں ادیبوں،
آرٹسٹوں، سنگتراشوں اور شاعروں کی ایک پوری کہکشاں اتر آئی ہے۔
ROBINSON, سے جو سلسلہ شروع ہوا وہ BRETHARTE, AMBROSE BI
JACK پر ہی ختم نہیں ہوا۔ درمیان میں JEFFERS, HOHN STEINB EC
LONDON, LINCLON STEFFENS, FRANK NORIS, WILL
SAROYAN, UMPTON SINCLIAR, DONALD CULRO
پر بھی ختم نہیں ہوا۔ یہ سب یا تو کیلیفورنیا میں پیدا ہوئے یا پھر یہاں کی شہریت اختیار کی۔ PEATTIE
اس ریاست میں چالیس سے زیادہ نوبل پرائز ونر پیدا ہوئے جبکہ ٹیکساس میں کھوج لگانی پڑتی ہے۔ بعض
لوگ کیلیفورنیا کا تقابل فلوریڈا سے کرتے ہیں جو سراسر ناانصافی ہے۔ فلوریڈا نے STRAVINSKY
MONTEMEZZI, ALDOUS HUXLY, ARTHUR RUBINST
جیسے نابغہ روزگار لوگ کہاں HEIFETZ, FRANZ, WERFEL THOMAS M
پیدا کئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی فلوریڈا جانے کی خواہش کا کبھی اظہار نہیں کیا۔ ان کے دل کی
دھڑکن میں کیلیفورنیا بستا تھا۔ JESSE HUTCHIN SON! کیسا خوبصورت جملہ کہا تھا:
THEN, HO, BROTHER, HO, TO CALIFORNIA,
THEREIS PLENTY OF GOLD IN THE WORLD WE

"TOLD, ON THE BANKS OF SACRAMEN

"مائی گاڈ!" "شاہ تم بڑے دھوکہ باز نکلے"۔ مون حیرت سے اپنی مخروطی انگلی منہ میں ڈالتی ہوئی بولی "میں نے تمہیں کیا گائیڈ کرنا ہے۔ تم تو ریاستوں کے راز دروں تک سے بخوبی واقف ہو!"

"یہ سب کتابی باتیں ہیں" میں نے پیار سے مون کا کندھا تھپتھپایا۔ ویگاس اور کیلیفورنیا کی روح سے تو تم نے مجھے روشناس کرایا ہے۔ اگر تم ملتیں تو شاید کیلیفورنیا اس قدر خوبصورت نظر نہ آتا۔ تم پھر اسے شاعرانہ تعلی کہو گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس ریاست کی رعنائیوں' حسن اور بے باکی نے مجسم شکل اختیار کر لی ہو۔ کہتے ہیں کہ سچائی اگر مجسم شکل میں آتی تو وہ شیر کی شکل میں ظاہر ہوتی ۔اسی طرح اگر ریاست کی نمائندگی کسی فرد واحد کے سپرد کی جاتی تو تمہارا نعم البدل ملنا مشکل ہو جاتا"

مون کو چھ کہنا چاہتی تھی کہ اس کی ممی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ شاہ کو بولنے دو۔ آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میری برسوں کی ریاضت رنگ لائی ہو۔ شاہ کا انداز یقیناً دلچسپ اور دلفریب ہے لیکن میں نہیں سمجھتی کہ اس میں کوئی مبالغہ آرائی ہے۔

ایک ماں اور سمجھ بھی کیا سکتی ہے۔ مون مسکرائی۔ لوگ گائیڈ کو معاوضہ دیتے ہیں۔ میں بھی اسے زر الفاظ سمجھ کر قبول کرتی ہوں۔

اگر یہ بات ہے تو میں سمجھوں گا کہ لفظ غریب ہو گئے ہیں! میں نے کہا کہ

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈرائیور ڈیوڈ آ گیا' بولا "جلدی کریں فلائٹ کا ٹائم ہو گیا ہے۔ میں نے مسز رابسن کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور سامان ڈگی میں رکھ کر کار میں بیٹھ گیا۔

بیورلے ہلز سے باہر نکلتے ہی کار فراٹے بھرنے لگی۔ پتہ نہیں ڈیوڈ کی فلائٹ چھوٹنے کا ڈر تھا یا ویسے ہی ترنگ میں آیا ہوا تھا۔ اس کا پاؤں ایکسی لیٹر دبتا ہی چلا گیا۔ اوورٹیک کرتے ہوئے اس نے کئی دفعہ ہچکولے کھائے۔ میں اسے منع کرنے ہی والا تھا کہ مون نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔ عام حالات میں ڈرائیور کو سرزنش نہیں کرنی چاہیے۔

لیکن کیوں؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا "IT EITHER RESULTS IN

NERVOUSNESS, OR FURTHER SHOW" ڈرائیور یا تو گھبرا جاتا ہے یا پھر شوخی پر اتر آتا ہے۔

مجھے ایک دم خیال آیا کہ یہ ہمارے ڈرائیور تھوڑے ہیں کہ ڈانٹ ڈپٹ سہہ لیں گے۔ فیصل آباد میں ہمارے دوست چن پیر شاہ نے بغیر تنخواہ کے ایک ڈرائیور رکھا ہوا تھا۔ شاہ صاحب وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ پیری مریدی کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ غالباً شاہ صاحب نے اسے باور کرا رکھا تھا کہ تنخواہ کے بدلے اسے جنت کا ٹکٹ دلوائیں دیں گے۔ جنت کی خواہش میں اس نے دنیا میں ہی جہنم کی جھلک دیکھ لی تھی۔ جب بھی شاہ صاحب گاڑی سے نکل کر ادھر ادھر جاتے وہ آتے جاتے ہر راہگیر کو کھڑا کر کے اپنا حال اور شاہ صاحب کا تعارف کراتا۔ انہیں بتاتا کہ شاہ صاحب نے ایک طویل عرصہ سے تنخواہ نہیں دی" اور یہ جو جھگا میں نے پہنا ہوا ہے۔ وہ اپنے پہنے بوسیدہ کپڑوں کی طرف اشارہ کرتا یہ چند سال پہلے میری ماں نے بھجوایا تھا۔

گاڑی جب آدھا سفر طے کر چکی تو یکدم ہوٹر بجنے لگے۔ مارے گئے ڈیوڈ کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔

یہ کیا بات ہے ڈیوڈ؟ میں نے گھبرا کر پوچھا

بولا پیچھے گولائیتھ آ رہا ہے۔ اس کا اشارہ ٹریفک سارجنٹ کی طرف تھا۔

کیا ڈیوڈ گولائیتھ سے گھبرانے لگا ہے؟ میں نے اسے چھیڑا۔

کہنے لگا' وہ ڈیوڈ اور تھا' اس نے روحانیت کے زور پر گولائیتھ فتح پائی تھی۔ یہ روح قبض کرنے والا درندہ ہے۔

سارجنٹ نے مرسیڈیز کے آگے گاڑی کھڑی کر دی اور ڈیوڈ کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ تم تیز رفتاری کے مرتکب ہوئے ہو۔ اپنا لائسنس نکالو تا کہ تمہیں ٹکٹ دیا جا سکے۔ سارجنٹ نے اسے کسی ڈانٹ ڈپٹ کے بغیر فرد جرم سنا دی۔ ڈیوڈ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک سارجنٹ کی نظر بیک سیٹ پر پڑی۔ سارا کی گردن ڈھلک گئی تھی اور وہ بے ہنگم لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ کیتھی گھبراہٹ کے عالم میں اس کی ہتھیلیاں رگڑنے

لگی ARE TOU ALL RIGHT سارجنٹ نے تشویشناک لہجے میں پوچھا۔

اس کو دمے کا اٹیک ہوا ہے۔ کیتھی کہنے لگی۔ یہ ٹھیک طرح سے بول بھی نہیں سکتی۔ دمے کی پرانی مریضہ ہے ہم اس کو ہسپتال لے جا رہے ہیں۔ ایمرجنسی!

آئی ایم سوری! سارجنٹ کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو گیا۔ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟

نہیں شکریہ! ہمیں اسے ہسپتال لے جانے کی جلدی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ راستے میں دم توڑ دے۔

ہری اپ! سارجنٹ نے عملاً ڈیوڈ کو گاڑی میں دھکیل دیا۔ ڈونٹ ویسٹ ٹائم'' ڈیوڈ نے ایک دفعہ پھر ایکسی لیٹر پر مشق آزمائی شروع کر دی۔ میں اس سارے واقعے پر حیران ہی ہو رہا تھا کہ سارا اٹھ بیٹھی اور کھلکھلا کر ہنسنا شروع کر دیا۔ کہنے لگی ''اگر آج میں یہ ڈرامہ نہ کرتی تو ڈیوڈ تمہیں جیل یاترا کرنی پڑتی۔ پہلے ہی دو دفعہ تمہیں ٹکٹ مل چکا ہے۔

کیا امریکن اس قدر سادہ لوح اور چالاک ہوتے ہیں؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

بولی اس قسم کی ہیرا پھیریاں تم لوگ زیادہ کرتے ہو۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کچھ پرانے واقعات یاد آ گئے۔ میرا ایک پرانا کلاس فیلو پاکستان آیا تو میں اس کی اور اس کی بیوی کی سج دھج دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جتنا عرصہ وہ پاکستان میں تھا تنگدستی کا رونا روتا رہا۔ اس کے پاس اکثر مکان کا کرایہ بھی نہیں ہوتا لیکن اب اس نے نہایت قیمتی لباس پہنا ہوا تھا اور اس کی دھرم پتنی ٹخنوں تک زیوارت میں لدی ہوئی تھی۔ ایک دن وہ دونوں میاں بیوی رونی صورت بنا کر میرے پاس آئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگے کہ سارے زیوارت چوری ہو گئے ہیں اور وہ پرچہ کٹوانا چاہتے ہیں لیکن پولیس F.I.R درج نہیں کرتی۔ میں نے متعلقہ تھانیدار کو ڈانٹا کہ اتنا بڑا جرم ہو گیا ہے اور وہ کارروائی نہیں کر رہا وہ ایف آئی آر کی کاپی لے کر امریکہ چلے گئے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ زیور وہ مقامی صرافہ بازار میں بیچ گئے تھے اور ایف آئی اور آر انشورنس کمپنی کے لئے تھی۔ ایک سال بعد وہ پھر آئے اور مجھے کہنے لگے کہ ہمیں کسی ہسپتال سے سرٹیفکیٹ دلوا دو کہ ہم میاں بیوی چار ماہ تک یہاں داخل رہے ہیں۔ ہمیں پچاس ہزار ڈالر مل جائیں گے۔

اگر تمہیں پچاس لاکھ ڈالر بھی مل جائیں تو میں یہ کام نہیں کروں گا۔ تم لوگ ملک کو بدنام کر رہے ہو۔ میں نے انہیں ڈانٹا۔ وہ پیر پٹخ کر غصے کے عالم میں چلے گئے اور پھر کبھی نہیں ملے۔

ایئرپورٹ پر پہنچے تو ڈیوڈ کی بے تابیاں سمجھ میں آ گئیں۔ سان فرانسسکو جانے والا جہاز اڑ چکا تھا دوسری فلائٹ میں دو گھنٹے کا وقفہ تھا۔ وقت گزارنے کے لئے مون مجھے ایئرپورٹ کے مختلف حصے دکھانے لگی۔ واقعی بہت بڑا ایئرپورٹ ہے۔ کئی رن وے ہیں جو ٹرمینل بلڈنگ کے دونوں اطراف پھیلے ہوئے ہیں۔ بیک وقت کئی جہاز اتر سکتے ہیں اور ٹیک آف بھی کر سکتے ہیں۔ ایئرپورٹ کے ایک سرے سے دوسرے تک پہنچنے کے لئے گاڑی چاہیے۔ دنیا کے اکثر بین الاقوامی ہوائی اڈوں کی اندرونی ساخت ایک جیسی ہوتی ہے۔ جہاز سے اترتے ہوئے مسافر کو امیگریشن کاؤنٹر تک پہنچنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی۔ ہر جگہ راستہ ایک جیسا ہوتا ہے اور آدمی غلط جگہ پر جا ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح باہر جانے والوں کو بھی تردد نہیں کرنا پڑتا۔ اگر ایئرپورٹ کے سوگیٹ بھی ہوں تو ان کی نشاندہی اس طرح کی جاتی ہے کہ آدمی فوراً اپنے مطلوبہ جہاز تک پہنچ جاتا ہے۔ ہر چند کہ سکیورٹی کا مناسب انتظام ہے لیکن بے جا پابندیاں نہیں ہیں۔ مسافروں کے عزیز رشتہ دار اگر چاہیں تو جہاز کے خاصے قریب تک جا سکتے ہیں۔ ہر چیز کے لئے وقت کا تعین کیا گیا ہے۔ مسافروں کے پہنچنے سے پہلے ان کا سامان پہنچ جاتا ہے۔ ایشیائی لوگوں کے سامان کی کسٹم حکام بڑی چھان بین کرتے ہیں۔ خصوصاً پاکستانیوں کے ساتھ تو کچھ زیادہ ہی مخاصمت ہے۔ سبز پاسپورٹ پکڑتے ہی ان کے ہاتھ میں بجلی کا کرنٹ دوڑ جاتا ہے۔ اگر ان کا بس چلے تو شاید ان کی ہڈیوں کی بھی تلاشی لے ڈالیں۔ اس تضحیک آمیز رویے کے کافی حد تک ہم خود ذمہ دار ہیں۔

ایل اے سے سان فرانسسکو تک سوا گھنٹے کا راستہ ہے۔ 500 میل! باتوں باتوں میں پتہ ہی نہ چلا اور ہم سان فرانسسکو پہنچ گئے۔ سان فرانسسکو ایئرپورٹ سے باہر آئے تو جی خوش ہو گیا۔ اس قدر حسین موسم، جیسے کاروان بہار تازہ دم خیمہ زن ہوا ہو۔ تیز چلتی ہوئی سمندری ہوا۔ جس میں سونف اور الائچیوں کی سی خوشبو تھی۔ سورج سفید بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کر رہا تھا۔ کھلا نیلا آسمان، نہ دھواں نہ گرد و غبار، ایک سیاس ماحول جہاں سورج دوست بن کر طلوع ہوتا ہے۔ اور بادل نخواستہ غروب ہوتا ہے۔

باہر مون کے کزن پیٹر نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ کہنے لگا ''آپ لوگوں کے انتظار میں' میں تو بوڑھا ہو چلا تھا۔ اگر سفر کرنا ہو تو گھر سے بروقت نکلنا چاہیے۔ کسی شریف آدمی کو اتنا انتظار کرنا بھلا کہاں کہاں کی شرافت ہے۔ اس نے مسکرا کر سارا کی طرف دیکھا۔

یہ تم نے شرافت کا لبادہ کب سے اوڑھ لیا ہے۔ سارا نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔ تم CROOKED STREET سے بھی زیادہ ٹیڑھے ہو جہاں بدقسمتی سے تم نے رہائش اختیار کر رکھی ہے۔

کیا تم نے اس بھڑ کو ضرور چھیڑنا تھا۔ مون لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

دراصل جب تک ہی اس کی جلی کٹی باتیں نہ سن لے اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ کیتھی نے وضاحت کی۔

جس کی ڈور ہی کٹ جائے اس کے لہجے میں تلخی تو آتی ہے۔۔ اس نے سارا کو پھر چھیڑا۔ س نے اس ڈور کو پکڑنے کی کوشش میں کئی مرتبہ اپنے ہاتھ زخمی کیے ہیں۔ سارا کہنے لگی۔

کبھی نہ کبھی تو یہ پتنگ میرے ہاتھ ضرور آئے گی۔ اس نے پیار سے سارا کو گلے لگا لیا۔

واقعی بوڑھے ہو جاؤ گے۔ سارا اپنے گلے سے اس کے بازو ہٹاتے ہوئے بولی۔

دنیا امید پر قائم ہے۔ اگر اگلا بوائے فرینڈ بھی بیوفا نکلا تو تم پکی ہوئی خوبانی کی طرح میری گود میں آ گرو گی۔ اس نے پھر اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

اب بس بھی کرو! سارا اس کے بازوؤں کے حصار سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔ کیا میری پسلیاں توڑنے کا ارادہ ہے؟

کیا شاہ سے نہیں ملو گے یا اپنی جھوٹی محبت کا اظہار ہی کرتے رہو گے۔ مون نے اسے جھنجھوڑا۔

اوہ! آئی ایم سوری۔ اس نے میرے ساتھ معذرت آمیز مصافحہ کیا۔ دراصل مون نے تمہارا غائبانہ تعارف اس قدر کرا دیا ہے کہ کسی رسمی تعارف کی ضرورت نہیں رہی۔

جب گاڑی چلی تو میں نے چار سو دیکھا کہ کشادہ سڑکیں' ٹریفک انجینئرنگ کا شاہکار' بعض مقامات پر چار چار سڑکیں اوپر نیچے سے گزر رہی تھیں۔ ٹریفک کافی تھی لیکن شور بہت کم تھا۔ گاڑیاں ایک دوسرے کو

یوں کراس کرتیں جیسے سمع خراشی پر معذرت خواہ ہوں۔ بڑا پر سکول شہر ہے۔ میں تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کے لئے لوگوں نے بری جدوجہد کی ہے۔ پیٹر کہنے لگا۔ ایک وقت تھا کہ سان فرانسسکو کا شمار امریکہ کے لوفر اور لفنگے شہروں میں ہوتا تھا۔ قانون شکنی بدمعاشوں کا وطیرہ بن چکی تھی۔ ڈر اور خوف نے شریف شہریوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ 1849ء سے لے کر 1856ء تک ہزار قتل ہوئے لیکن سزا صرف ایک شخص کو ہوئی۔ اس سے لوگوں کا عدالتوں سے اعتماد اٹھ گیا اور انہوں نے عوامی عدالتیں لگانی شروع کر دیں۔ بدمعاشوں کو سرعام چرچ کی گھنٹیوں کے شور میں پھانسی دی جاتی۔ ان پھانسیوں نے H OUNDS گینگ کی کمر توڑ دی۔ کسی فرد واحد کو ڈرا دھمکا لینا اور بات ہے لیکن جب اجتماعی شعور پیدا ہو جائے تو پھر مقابلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان بیدار لوگوں نے اپنی پولیس کھڑی کر لی اور اسلحہ بھی اپنی مرضی کا حاصل کر لیا۔ نتیجتاً کچھ بدمعاش پھانسی چڑھ گئے اور باقیوں کو شہر بدر کر دیا گیا۔ اس طرح اس شہر کا امن وسکون بحال ہو گیا۔

تاریخ کا سب سے بڑا سبق بھی یہی ہے کہ جب ظلم بڑھتا ہے تو بے نواؤں کو نوا ملتی ہے اور جب مظلوم ایک دفعہ سینہ سپر ہو جائیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ می نے کہا کہ

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ پیٹر نے سٹیرنگ سے نظریں ہٹائے بغیر کہا! جس شخص نے صحیح معنوں میں فرانسسکو کی تقدیر بدلی۔ وہ ڈینس کرنی تھا۔ ہر چند کہ یہ آئرش مین کم پڑھا لکھا تھا لیکن بے حد ذہین تھا۔ اس نے جو پارٹی بنائی اس کا نام SANDLOTPARTY رکھا۔ یہ شخص طبعاً امیروں کا دشمن تھا اور ارتکاز زر کا زبردست مخالف۔ وہ کمیونسٹ نہیں تھا لیکن اس کے خیالات کمیونزم کے بے حد قریب تھے۔ الیکشن میں اس کی پارٹی نے واضح اکثریت لے اور بالآخر وہ اپنے خیالات اور فلسفے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو گیا۔ 1879ء میں اس نے ریاست کا نیا آئین بنایا جس کی ہر شق میں غریبوں کے لئے نوید مسرت تھی۔ اس قانون کی رو سے امیروں کی مراعات ختم کر دی گئیں۔ آٹھ گھنٹے اوقات کار مقرر کئے گئے۔ لا بنگ کو جرم قرار دیا گیا۔ ریلوے مالکان کے منہ میں لگام ڈالی گئی۔ ایسا ترقی پسند آئین کسی اور امریکی ریاست میں نہیں ہے۔

تم لاس اینجلس اور سانفرانسسکو میں کیا فرق محسوس کرتے ہو؟ میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

بولا یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے۔ کیونکہ ایک نووارد کو تضادات واضح طور پر نظر آتے ہیں مجھے تو اس شہر کے حسن نے بے حد متاثر کیا ہے۔ ایسی آب و ہوا' اس قدر سہانا موسم تو شعر و شاعری میں بھی نہیں ملتا۔

کہنے لگا یہ درست ہے۔ بحرالکاہل کے پانیوں نے اسے ایک عجیب انفرادیت عطا کی ہے۔

فرق میں بتاتی ہوں! مون جو پچھلی سیٹ پر سارا اور کیتھی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ان کی مثال دو ایسے بھائیوں کی طرح ہے جن کی طبیعت اور مزاج میں بعدالمشرقین ہو۔ ایک اپنی دولت اور ظاہری سج دھج پر مغرور ہے تو دوسرا نرگسیت کا شکار ہے۔ وہ آئینہ بھی خود ہے اور عکس بھی خود..... ایل اے سمجھتا ہے کہ اس سے بڑا شہر دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اس کے برعکس سان فرانسسکو کا دعویٰ ہے کہ اصل حسن تناسب میں ہے۔ بے ہنگم ڈیل ڈول میں نہیں۔ چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیوں پر بنا ہوا یہ شہر جس کے چار سو سمندر ہے۔ سونے ریلے اور بندرگاہ نے اس شہر کو بسانے' چمکانے اور جگمگانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ اس کے برعکس لاس اینجلس کی امارت کا راز تیل' پراپرٹی اور فلم انڈسٹری میں ہے۔ سان فرانسسکوں کے لوگوں میں برداشت کا مادہ زیادہ ہے۔ لاس اینجلس قدامت پسند ہے اور یہاں کے لوگ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ ایل اے بنیادی طور پر حاسد ہے۔ اور اپنے چھوٹے بھائی کی کوئی خطا معاف نہیں کرتا۔ جب وی جے ڈے پر سان فرانسسکو نے مستی کے عالم میں کچھ ناجوازیاں کیں تو ایل اے نے شمال کی کھل کر مذمت کی۔ اس کے برعکس جب ایل اے میں ZOOT, SUIT, ROITS ہوئے تو سان فرانسسکو جس کو کسی زمانے میں VERBA BAAUNA بولتے تھے۔ درگزر کی یہ زیادہ پختہ مزاج اور خاموش طبع ہے۔ اس کی طرح گلی میں پھولوں کی کیاریاں نظر آئیں گی۔ یہ مجسم جمال اور ایل اے سراسر جلال۔

آج تو تم بھی شاعری کرنے لگی ہو۔ پیٹر نے حیرت سے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ شعروں میں کرے گی اور شراب کی جگہ عرق گلاب پیے گی۔

کتنے اچھے ماحول کو تم نے پراگندہ کر دیا ہے۔ اتنی خوبصورت باتیں روز روز تھوڑی ہوتی ہیں۔ کیتھی نے اسے ڈانٹا۔

ایک گھنٹہ کی ڈرائیو کے بعد جب گاڑی نے تقریباً عمودی پہاڑ پر رینگنا شروع کای تو پیٹر نے مجھے بتایا کہ' کروکڈ سٹریٹ شروع ہوگئی ہے اور پہاڑی کی چوٹی پر اس کا گھر ہے۔ ''یہ سٹریٹ سان فرانسسکو کی شناخت ہے!'' اس نے وضاحت کی۔ ''اس کو اس شہر میں وہی حیثیت حاصل ہے جو ایل اے میں بیورلے ہلز کو ہے اگر سان فرانسسکو مغرب کا بغداد ہے تو یہ اس کا دل ہے اتنی قیمتی زمین نیویارک کے مین ہٹن میں بھی نہیں ملتی یہاں کوئی گھر ایسا نہیں جس کے اندر باہر' اوپر نیچے پھولوں کی کیاریاں نہ ہوں۔ بظاہر یہ چھوٹے چھوٹے گھر نظر آتے ہیں لیکن اس قیمت میں سان فرانسسکو میں دس گھر خریدے جاسکتے ہیں''۔

''کیا فائدہ ایسے قیمتی گھروں کا جن کے باہر گاڑی بھی ٹھیک طرح سے پارک نہ کی جاسکتی ہو''۔ سارا اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''کیونکہ یہ شہر ایل اے کی طرح بے ہنگم نہیں! ہمارے چاروں طرف سمندر ہے اور ظاہر ہے کہ سمندر میں مکان نہیں بنتے۔''

پہلے تو گاڑی رینگ رہی تھی' اب اس نے باقاعدہ ڈکرانا شروع کر دیا' رارا' روں روں' گھوں گھوں پر مجھے قدرے تشویش لاحق ہوئی۔ مبادا پیچھے کی طرف ہی نہ لڑھک جائے لیکن یہ میرا واہمہ تھا۔ ایک تو نئی نویلی VOLVO تھی پھر پیٹر اس اس علاقے کے اس قدر نشیب و فراز دیکھ چکا تھا کہ اگر اس کی آنکھوں پر پٹی بھی باندھ دی جاتی تو گھر بخیر و عافیت پہنچ جاتا کروکڈ سٹریٹ' سان فرانسسکو کا بلند ترین مقام ہے اور پیٹر کا گھر پہاڑ کی چوٹی پر تھا گاڑی پارک کر کے جب ہم مکان کے اندر داخل ہوئے تو اندر کوئی مکین نہیں تھا چار بیڈ روم کا مکان بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

'تمہارے والدین کہاں ہیں؟ میں نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

انہوں نے اس سے بھی بلند جگہ پر رہائش اختیار کر لی ہے!'' اس نے ایک سوگوار مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''کیا ناراض ہو گئے ہیں؟''

''ہمیشہ ہمیشہ کیلئے روٹھ گئے ہیں!'' اس نے وضاحت کی۔ ''ان کا چند برس پہلے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔''

''اوہ! آئی ایم سوری!'' میں نے تعزیت کی۔

''جو ہونا ہو وہ ہو کر رہتا ہے'' پیٹر کہنے لگا۔ ''اس دن وہ کتنے خوش تھے۔ اپنی شادی کی 30 ویں سالگرہ منانے ''لیک طاہو'' جا رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے گاڑی پھسلی اور ایک گہری کھائی میں جا گری۔''

اتنے بڑے گھر میں تمہیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔''

''یہ کبھی گھر رہا ہو تو اسے احساس بھی ہو! سارا ہمیں سوگوار ماحول سے باہر نکالتے ہوئے بولی سارا دن تو شہر کی گلیاں اور سڑکیں ناپتا پھرتا ہے والدین کافی دولت چھوڑ گئے ہیں اس لئے اسے فکر فردا ہے نہ غم روزگار ۔

تو کیا پراپرٹی ڈیلر سارا دن کرسی پر چپکا رہے گا؟'' کیتھی کہنے لگی۔

''میری اصل پراپرٹی تو یہ ہے' پیٹر نے صرارت سے سارا کو دیکھا۔ جنت گم گشتہ میں تناسخ کا قائل ہوں پہلے جنم میں ہم یقیناً ایک ساتھ رہے ہوں گے۔'

''ہاں! مجھے بھی کچھ کچھ شک پڑتا ہے'' سارا چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولی! غالباً تم میرے باغ کے مالی تھے اور سارا دن باغیچے میں گھاس کاٹتے تھے۔

چلو! شکر ہے تمہیں کچھ یاد تو آیا!' پیٹر مسکرایا۔ لیکن جو چیز تم بھول رہی ہو وہ یہ ہے کہ آج کل کی طرح اس وقت بھی تمہارا چمن ویران تھا میں نے صرف گھاس ہی نہیں کاٹی تھی بلکہ اس اجڑے ہوئے گلشن میں پھول بھی کھلائے تھے۔

مون کہنے لگی سارہ تم SENSE OF TIMING بالکل نہیں ہے اس لاحاصل بحث میں پڑی رہو گی تو پیٹر یہ بھی بھول جائے گا کہ ہم نے لنچ بھی کرنا ہے۔

وہ میں کیسے بھول سکتا ہوں آپ لوگ سامان رکھ کر واش کر لیں آج PIER39 پر چلیں گے اور سمندر کے کنارے بنے ہوئے ریستوران میں کھانا کھائیں گے۔

وہ سب منہ ہاتھ دھونے غسلخانے میں چلی گئیں تو میں نے اپنے کمرے میں سامان رکھا اور باہر ٹیرس میں نکل آیا پیٹر کا مکان دو منزلہ تھا ایک تو کروکڈ ہلز خاصی بلند تھیں پھر مکان کی اپر سٹوری' سارا شہر ایک نظر میں دیکھا جا سکتا تھا۔ سرسبز پہاڑیاں' وسیع نیلگوں سمندر رہائی رائز عمارت' سنہری نرم گرم دھوپ اور کھلا آسمان! سڑکوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اور ان پر رینگتی ہوئی ان گنت گاڑیاں' ایسے محسوس ہوتا جیسے سارا شہر سمندری دھاگوں سے پرو دیا گیا ہو بے برج گولڈن گیٹ' برج اور وسیع و عریض پارک جن کے بعض درختوں کی عمریں امریکہ کی عمر سے زیادہ تھیں حیران کن بات یہ ہے کہ یہ لوگ دو تین سو سال کے عرصہ میں یورپ سے ہجرت کر کے یہاں آئے اور بس گئے زرخیز زمینیں پانی کی فراوانی' تازہ اور معطر و ہا کھلی کھلی فضا ان کی آبادی خودرو جھاڑیوں کی طرح بڑھی' پھیلی پھولی اور پھلی۔ انگلستان کی آبادی چھ کروڑ کے لگ بھگ ہے جب کہ یہ نو آبادی تیس کروڑ کے قریب پہنچ گئی ہے۔

ہڈیوں میں اتر جانے والی سردی میں رہنے والے لوگوں نے اس قدر توانائیاں کیسے حاصل کر لیں کہ تمام دنیا پر کسی نہ کسی رنگ میں تسلط جما لیا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا اس کیلئے بڑی ہمت اور جدوجہد اور علم کی ضرورت تھی آج بھی ہم جب تاریخ کے ورق الٹتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے کبھی کوئی لارنس عربوں کا روپ دھار لیتا ہے اور اہل زبان سے زیادہ شستہ عربی میں گفتگو کرتا ہے تو کبھی کوئی کلائیو کروڑوں کی آبادی میں میر جعفر اور صادق ڈھونڈ لیتا ہے یہ ہندوستان تھا یہاں آسٹریلیا کے ایب اور جینز اور امریکہ کے ریڈ انڈین نہیں بستے تھے بلکہ ایسا کلچر پروان چڑھا تھا جس نے چانکیہ جیسے شاطر اور چندر گپت موریہ جیسے حکمران پیدا کئے تھے پھر کروڑوں لوگ اگر پھونک بھی مارتے تو غاصب غرض سمندر ہو جاتے یا پھر ہوا میں اڑ جاتے دراصل جب سلاطین' ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ کا ورد کرنے لگیں اور ظل سبحانی' اپنے آپ کو مشت غبار سمجھنے لگے تو پھر تباہی اور بربادی ان قوموں کا مقدر بن جاتی ہے۔

جب ہم لنچ کیلئے پیٹر کے گھر سے باہر نکلے تو سارا کہنے لگی' پیٹر اب گاڑی میں چلاؤں گی تم ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر مزے سے نظارے دیکھو!'' پیٹر نے حیران کن نظروں سے سارا کو دیکھا کیا تم سان فرانسسکو میں ڈرائیونگ کر لو گی؟''

تمہیں کوئی شک ہے؟'' اس نے سٹیرنگ سنبھال لیا۔ ویسے تمہارے ڈرنے کی عادت ابھی تک نہیں گئی ''!

ڈرنے اور مرنے میں بڑا فرق ہے تمہارے لئے میں جان تو دے سکتا ہوں لیکن حرام موت مرنا بالکل پسند نہیں کروں گا۔

پیٹر کے خدشات بالکل درست ہیں'' کیتھی کہنے لگی۔ غفلت اور تیز رفتاری کی وجہ سے اس کا لائسنس دو دفعہ معطل ہو چکا ہے تیسری دفعہ لائسنس معطل نہیں ہوتا جیل جانا پڑتا ہے الکٹراز کی جیل کا تو تم نے سن رکھا ہوگا بڑوں بڑوں کے کس بل نکل جاتے ہیں۔'' پیٹر مسکرایا۔

'جیل سے زیادہ ہسپتال جانے کا امکان زیادہ ہے'' کیتھی کے لہجے میں شرارت تھی۔

''تو تم لوگ پیدل آ جاؤ میں مون اور شاہ کو لے کر چلتی ہوں اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

اب بیٹھ بھی جاؤ کیوں بے چاری کو زچ کرنے پر تلے ہوئے ہو!'' مون نے سرزنش کی۔

''بے چاری''.....! پیٹر کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ IT IS A JOKE OF THE CENTURY جب ہم PIER39 پر پہنچے تو دن کے تین بج رہے تھے بیشمار لوگ لان میں کھڑے پتنگ اڑا رہے تھے سمندر سے اٹھتی ہوئی نم آلود ہوائیں ان کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ قریب ہی کوسٹل گارڈ کا جہاز کھڑا تھا جہاز کا عملہ دوربینوں کی مدد سے وسیع و عرض سمندر پر نگاہ رکھے ہوئے تھا سمگلنگ جرائم پیشہ لوگ اور میکسیکو سے آئے ہوئے غیر قانونی تارکین وطن کی روک تھام ان کے من جملہ فرائض میں شامل ہیں سمندر میں بیشمار بادبانی کشتیاں راج ہنسوں کی طرح ڈول رہی تھیں۔ نیلگوں سمندر میں سفید بادبانوں والی کشتیاں بڑی بھلی لگتی ہیں خوبصورت گھاس بڑی نفاست سے کاٹی گئی تھی وہ لوگ جو پتنگ نہیں اڑا رہے تھے وہ گھاس پر لیٹے ہوئے تھے سمندر کے کنارے بے شمار ریستوران تھے جو کاف حد تک سمندر کے اندر چلے گئے تھے ڈرائنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھے ہوئے کچھ ایسا احساس ہوتا جیسے آدمی ریستوران میں نہیں بلکہ کسی سمندری جہاز میں بیٹھا ہوا ہو جہاں گراسی لان ختم ہوتے تو ان کے آگے بے شمار دکانیں تھیں ہم کچھ دیر چہل قدمی کرتے رہے اور پھر ریسٹورنٹ میں چلے گئے جب ویٹرس نے مینو کارڈز ہمارے سامنے رکھا تو

پیٹر انہیں بغیر پڑھے ہوئے بولا۔ ''آج سی فود ہو جائے بالکل فریش ہے تمہاری طرح! اس نے سارا کی طرف دیکھا۔

یہ تمہیں تر و تازہ نظر آتی ہے؟ تم اپنی نظر کا معائنہ کراؤ دیکھتے نہیں نیند سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں اور شب بیداری سے ان کے گرد حلقے سے بن گئے ہیں کیتھی نے اسے ٹوکا

آنکھوں کی اس نیم خوابی نے تو اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں پیٹر اس کو زچ کرنے کے موڈ میں تھا۔

کیا باتوں پر ہی ٹرخاؤ گے یا کھانا بھی کھلاؤ گے؟'' سارا مسکرائی۔

اس قدر امیر کنجوس میں نے زندگی میں نہیں دیکھا!''

کھانا واقعی مزیدار تھا پام فرے مچھلی' جمبو پرانز' لابسٹر اویسٹر پیٹر نے ضرورت سے زیادہ کھانا منگوا لیا تھا سان فرانسسکو کو فوڈ سنٹر آف دی ورلڈ کہا جاتا ہے یہاں کے باورچی اپنے فن میں یکتا ہیں کھانے میں انواع واقسام کی چٹنیوں' ساسجز' سرکوں اور شرابوں کی آمیزش ہوتی ہے شاید وہی کوئی ایسا قیمتی کھانا ہو جس میں سرخ شراب کا تڑکا نہ لگا ہو اس سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ باورچی کو اپنی مسلمانی کا یقین دلا دیا جائے لیکن جو چیز کھانے کے مزہ کو دوبالا کرتی ہے وہ ماحول ہے حد نگاہ تک پھیلا ہوا سمندر ہلکی لیکن دلکش موسیقی خوبصورت کراکرای' پھرویٹرس اس قدر خوبصورت جوان اور ہنس مکھ کہ دل کرتا ہے کہ آدمی ان کو میز پر بٹھا کر خود کھانا سرو کرنا شروع کر دے ہمارے چند دوستوں سے بنکاک کی مساج گرلز کو ہمیشہ یہ شکوہ رہا ہے کہ یہ کیسے گاہک ہیں جو مساج کروانے کے بجائے الٹا مساج کرنا شروع کر دیتے ہیں پاگل کہیں گے گرہ سے خرچ کر کے الٹا مشقت کرتے ہیں.....!

کھانا کھا کر ہم باہر نکلے تو شام کے چار بج رہے تھے مون نے مشورہ دیا کہ چائنہ ٹاؤن دیکھ لیا جائے کیونکہ اگلا دن گولڈن گیٹ برج اور نیشنل پارکس کیلئے وقف کر رکھا تھا پیٹر کہنے لگا میری ہیئر مینیجر کے ساتھ ساڑے چار اپائنٹمنٹ ہے ساڑے پانچ تک کیرن مجھے فارغ کر دے گی پھر چائنہ ٹاؤن تو کیا چین تک تیار ہو۔

میں کچھ سمجھا نہیں! میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اس نے بال کٹوانے ہیں بار بر کی شاپ پر اس نے وقت لے رکھا ہے مون نے وضاحت کی۔

تو کیا بار بر کو یہاں ہیئر مینجر کہتے ہیں؟

ہاں ہم امریکیوں نے ہر چیز میں جدت پیدا کر لی ہے بار بر کو یہاں ہیئر مینجر کہتے ہیں مالی کو لان ڈاکٹر اور ٹائلٹ کو سروس روم۔ ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انگریزی گرائمر کی بھی حتمی الوسع ہڈیاں توڑی ہیں بے شمار ایسے الفاظ ہیں جن کی یا تو لام الف ہوئی ہے یا ای اڑا لی ہے۔

،تو کیا قدامت پسند انگریز اس پر احتجاج نہیں کرتا؟

قدامت پسند انگریز خوشامد پسند ہو گیا ہے دست طمع دراز کرنے والے زبان درازی نہیں کرتے ایمپائر کا سورج کیا غروب ہوا ہے انا کی آگ بھی سرد پڑ گئی ہے مون کا لہجہ فلسفیانہ ہو گیا ہم آزاد ہیں 'ہماری فکر اور سوچ آزاد ہے لہٰذا زبان میں تبدیلیاں بھی اپنی سہولت کے مطابق کی ہیں مجھے افسوس ان قوموں پر ہوتا ہے جو آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہوئیں۔

میرا سر شرم سے جھک گیا وطن عزیز سے انگریز آقا تو چلے گئے ہیں لیکن کثیر تعداد میں اپنی معنوی اولاد چھوڑ گئے ہیں ان غلام زادوں کی عادات واطوار میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے مشرقی کہا جا سکے انہیں پانی قومی زبان سے نفرت ہے اردو ادب پڑھنا گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں تمباکو کے پائپ کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے دریائے ٹیمز میں دھلی ہوئی انگریزی بولتے ہیں اور جب بھی کسی کانفرنس یا سوشل تقریب میں غیر ملکیوں کو ملکیت ہیں تو ایسا رویہ اختیار کر لیتے ہیں جیسے انہوں نے اس ملک میں پیدا ہو کر بہت بڑی غلطی کی ہو ایک انتہائی منظم اقلیت قوم کے اعصاب پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہے جیمز بانڈ کی طرح چومکھی لڑتے ہیں اقتدار کے ہر چشمے پر ان کا قبضہ ہے صداقت' انصاف' دیانت' جذبہ حب الوطنی ان کے نزدیک بے تکی اور فضول اصطلاحیں ہیں البتہ کبھی کبھی بامر مجبوری استعمال کرتے ہیں۔

جب ہم کھانا کھا کر ریسٹورنٹ سے نکلے تو دن کے پانچ بج رہے تھے لیکن سورج ہنوز بڑی آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا سنہری دھوپ جو بدن کو کاٹتی نہیں تھی لیکن ہلکی ہلکی ٹکور کرتی تھی پنگل باز بھی اپنی رنگا

رنگ پتنگیں سمیت کر جا چکے تھے مختلف ڈیزائنوں میں اتنی خوبصورت پتنگیں میں نے کہیں اور نہیں دیکھیں البتہ لاہوریوں کی طرح شور وغل اور بوکاٹا کے نعرے نہیں لگتے شوکاشا کی بھی نہیں ہوتی پتنگ کی ڈور بجلی کی تاروں کے ساتھ بھی نہیں ٹکراتی کیونکہ ہوا ان کا رخ ہمیشہ سمندر کی طرف رکھتی ہے کھابے' ہریسہ' روغنی نان اور سری پائے کا بندوبست بھی نہیں کیا جاتا جس قسم کی آزمائش کام ودہن کا اہتمام ہمارے یہاں کیا جاتا ہے اس کے تصور سے بھی وہ لوگ لرز اٹھتے ہیں کوئی ایک آدھ سینڈوچ انگور کے چند دانے سیب کی ایک قاش یا سالم نیول اورنج کھانا کھا کر ہڈیوں یا چھلکوں کو زینت زمین نہیں بناتے بلکہ پلاسٹک کے تھیلوں میں بند کر کے ڈسٹ بن میں ڈال دیتے ہیں اور اس طرح بالکل پتہ نہیں چلتا کہ یہاں کھانوں کا میدان کا بازار گرم رہا ہے۔

بار برشاپ سڑک کے پار تھی۔ اس لئے ہم پیدل چلتے چلتے چند منٹوں میں وہاں پہنچ گئے کیرن اس کی منتظر تھی گھڑی دیکھتے ہوئے قدرے خفگی کے ساتھ بولی پیٹر تم پانچ منٹ لیٹ ہو۔ اگر تم تھوڑی سی بھی مزید تاخیر کرتے تو میں دکان بند کر دیتی کیونکہ تم آخری کسٹمر ہو۔

اوہ! آئی ایم سوری' کیرن ڈیئر'' وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا مجھے تمہاری مصروفیات کا بخوبی علم ہے نیا معاشقہ ہمیشہ نازک مرحلہ ہوتا ہے اسی لئے کسی نے سچ کہا ہے خدا انتظار کر سکتا لیکن محبت انتظار نہیں کر سکتی تمہارا نیا بوائے فرینڈ بھی تمہاری طرح سیماب صفت ہے پیٹر مسکرایا ویسے اس سے آج کہاں مل رہی ہو ؟ساحل سمندر پر کسی PUB میں؟

یا پیٹر نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ملاقات ملاقات ہوتی ہے بھولے! جگہیں کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں'

ویسے تمہارے حسن انتخاب کی بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے

اب بال بھی کٹواؤ گے یا مجھے مسکا ہی لگاتے رہو گے! وہ بھی مسکرا دی تمہاری ہمیشہ دیر کر دینے کی عادت کسی دن تمہیں لے ڈوبے گی۔

پیٹر کرسی پر بیٹھ گیا کیرن کہنے لگی بال کٹوانا یا بال کٹتے دیکھنا کوئی زیادہ خوشگوار عمل نہیں ہوتا اس لئے اگر

تمہاری ٹیم چاہئے تو باہر گھوم پھر سکتی ہے ویسے بھی تم نہیں چاہو گی کہ کوئی تمہارے اناڑی پن کا مشاہدہ کرے پیٹر بولا اگر میں اناڑی ہوتی تو تم جیسے پیشہ ور کھلاڑی یہاں گردن ہموڑا کر کبھی نہ بیٹھتے کبھی گاہکوں کی تعداد دیکھی ہے لوگ ہفتہ بھر انتظار کرتے ہیں کیرن اترائی تم تو جانتے ہو میرے ریٹ سارے شہر کی بار بر شاپس سے زیادہ ہیں۔

اس میں تمہارے فن کا کوئی کمال نہیں بلکہ وہ جمال ہے جو تمہیں قدرت نے ودیعت کیا ہے بال کیسے بھی برے کٹے ہوں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔'

LEFT HANDED COMPLIMENT کا شکریہ! کہیں ایسا نہ ہو کہ بے خیالی میں قینچی تمہاری اس راج ہنس جیسی گردن کے پار ہو جائے''۔ پیٹر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کیرن نے اس کی گردن پر چند خوشبودار پاؤڈروں کا چھڑکاؤ کیا۔ معطر پانی سے اس کے بالوں کو گیلا کیا، اور بال کاٹنے شروع کر دیئے۔

ہم باہر نکل آئے۔ کچھ دیر تو بے مقصد عقبی بازار میں گھومتے رہے اور پھر سمندر کے اس حصے میں آ گئے جہاں نسبتاً بھیڑ نہیں تھی۔

ہم کنارے پر پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ گئے اور موجوں کی روانی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اس سمندر نے کیلیفورنیا کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اب سمجھ آئی ہے کہ امریکہ اسے میکسیکو سے ہتھیانے میں اس قدر بے قرار کیوں تھا۔

مون کہنے لگی، ''میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ اس انتہائی اقدام کے پیچھے کوئی جمالیاتی حسیں کار فرما نہیں تھیں بلکہ زندہ رہنے کی جبلت تھی۔ امریکہ کی سکیورٹی کیلئے ویسٹ کوسٹ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جاپان کو شکست دینے کیلئے ضروری تھا کہ مضبوط بحری بیڑہ یہاں سے روانہ کیا جاتا۔ اگر کیلیفورنیا ہمارے قبضے میں نہ ہوتا تو آج 'ہوائی' کی ہوا نکل چکی ہوتی اور 'ہونالولو' 'ہونالولو' نہ ہوتا''۔

باتوں باتوں میں کافی وقت گزر گیا۔ مون گھڑی دیکھتے ہوئے بولی ''وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔ جلدی چلیں کہیں اس ساحرہ نے پیٹر کو بت ہی نہ بنا دیا ہو''۔

''میرے خیال میں تو بال کٹوانے کا ایک بہانہ ہے۔ یہ محض دل لگی کیلئے وہاں جاتا ہے''۔ سارا نے شک کا اظہار کیا۔

''اگر وہ سنجیدہ ہوتا تو اب تک وہ اس کے گلے کا ہار بن چکی ہوتی۔ پیٹر زندہ دل نوجوان ہے۔ وہ ہر لڑکی کو اسی طرح چھیڑتا ہے جس طرح تمہیں تنگ کرتا ہے''۔ کیتھی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''تو پھر تمہیں کیوں نہ چھیڑتا۔ تم بھی تو خاص بری نہیں ہو''۔ سارا کو کیتھی کی بات ناگوار گزری۔

''کیونکہ میں تمہاری طرح ڈھلمل یقین نہیں ہوں''۔

''پگلی یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ اگر اسے تعریف ہی کرنا ہوتی تو مون کی کرتا۔ جس کے حسن کا جادو سر پہ چڑھ کر بولتا ہے''۔

''یہ کام شاہ نے جو اپنے ذمے لے رکھا ہے''۔ سارا نے قہقہہ لگایا۔ ''وہ بے چارہ نہ تو شاعر ہے اور نہ شیشے میں اترنے کا فن جانتا ہے''۔

''شاہ اس کو بھی کسی نہ کسی شیشے میں اتار دو۔ اس کا روز روز کا گلہ شکوہ تو ختم ہو''۔ کیتھی نے تجویز دی۔

''شیشہ تو چھوٹی چیز ہے۔ اگر کہے تو سمندر میں اتار دوں؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں سمندر کا سکون غارت کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ اس کی شوخیوں اور شرارتوں کی کی وجہ سے اگر سمندر میں طغیانی آ گئی تو کئی سفینے ڈوب جائیں گے''۔ مون نے پیار سے سارا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''جس نے اپنی کشتی کے لنگر بیچ منجدھار میں توڑ دیئے ہوں وہ بھلا دوسروں کا کیا بگاڑ سکے گی''۔ کیتھی اسے معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''سارا یا تو کیتھی سے معاف مانگ لو یا پھر صلح کر لو نہیں تو یہ تمہیں ٹکنے نہیں دے گی''۔ میں نے مشورہ دیا۔

''اپنے مشوروں کو اپنے پاس ہی رکھو۔ میں اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں۔ سو سنار کی اور ایک لوہار کی۔ اگر چاہوں تو ایک جملے سے ہی اس کا منہ بند کر دوں لیکن یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ہر حماقت قابل گرفت نہیں ہوتی!''

''یہ بخشنے والی نہیں ہے۔ وہ ظالم اس کے ترکش کا ہر تیر نکال کر لے گیا ہے۔ یہ ایسی کمان ہے جس سے تیر تو کیا تنکا بھی نہیں چھوڑا جا سکتا''۔

''اب بس بھی کرو!'' مون نے انہیں ڈانٹا۔

''اگر تم نے یہ جملہ بازی بند نہ کی تو مجبوراً مجھے تمہیں واپس بھیجنا پڑے گا!'' مون کی دھمکی کام کر گئی اور وہ دونوں آپس میں یوں لپٹ گئیں جیسے مدتوں کے بچھڑے ہوئے دوست اچانک ملاقات پر ایک دوسرے سے بلغگیر ہوتے ہیں۔

جب ہم دکان پر پہنچے تو پیٹر پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ کیرن حجامت کے بعد اڑنچھو ہو گئی تھی اور وہ ہمیں تلاش کرنے کے بعد واپس دکان کے باہر کھڑا ہو گیا تھا۔ ''اب ہمیں 'چائنہ ٹاؤن' جانا ہے''۔ پیٹر نے مشورہ دیا ''کار کی بجائے ٹرام سے سفر کیا جائے''۔ اس کیلئے سات منزلہ پارکنگ لاٹ سے کار نیچے لانا اچھا خاصا دردسر تھا۔ ویسے بھی کسی شہر کو دیکھنے کا بہترین طریقہ بھی یہی ہے کہ اس کے ہر MODE OF TRANS POR پر سفر کیا جائے۔ ٹرام کا سفر اچھا خاصا ایڈونچرس تھا۔ پٹریوں کے اوپر بجلی کی تاروں کا ایک جال سا بچھا تھا HORN کی جگہ روایتی گھنٹی بجتی تھی۔ رفتار اس قدر کم تھی کہ اکثر و بیشتر مسافر دوڑ کر بھی اتر چڑھ سکتا ہے۔ پائیر 39 سے چائنہ ٹاؤن چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ باوجود سست رفتار ہونے کے ٹرام نصف گھنٹے میں پہنچ گئی۔ جب کنڈیکٹر نے آواز لگائی کہ چائنہ ٹاؤن والے مسافر اتر جائیں تو میں نے ہڑبڑا کر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ جب نیچے اترے تو حیرانگی مزید بڑھی۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے ہم چین میں آ گئے ہوں یا چین سکڑ سمٹ کر اس شہر کے ایک حصے میں بس گیا ہو۔ جدھر نگاہ اٹھتی چینی لوگ، چیں چیں کرتے نظر آتے۔ جو لوگ چینی زبان نہیں سمجھتے وہ اس کے صوتی اثرات کو کچھ ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ ٹرام ٹرمینل کے بالمقابل مارکیٹ تھی۔ تقریباً سب عمارات کا طرز تعمیر بھی چینی تھا۔ آدمی سارا امریکہ گھوم پھر کر دیکھ لے یہ بات صرف سان فرانسسکو میں ہی نظر آتی ہے۔ امریکی تہذیب جس نے ساری دنیا کو بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر کیا ہے، یہاں بے بس نظر آتی تھی۔ اس سے بھی حیران کن بات

امریکیوں کا صبر و تحمل تھا۔ جس ملک نے چین کا ناطقہ بند کیا ہوا ہو اس کو اپنے 'اٹوٹ انگ' تائیوان سے نہ ملنے دیتا ہو۔ وہ اپنے ہی ملک میں لٹل چائنا کیسے برداشت کر سکتا ہے؟

''کیا یہ خواب ہے یا حقیقت؟'' میں نے پیٹر کی طرف دیکھا۔ ''صاف' کھری' کھردری اور نظر آنے والی حقیقت۔ اس سے تمہیں ہم امریکیوں کی جمہوریت پسندی اور قوت برداشت کا اندازہ ہو جانا چاہئے'' وہ مسکرایا۔ ''چین کے باہر سب سے بڑی چینی کمیونٹی یہاں آباد ہے۔ لاکھ سے اوپر یہاں کی آبادی ہے سنٹرل پیسفک ریلوے اور کان کنی ان لوگوں کو یہاں لے آئی۔ جو لوگ تلاش معاش میں یہاں آئے تھے یہاں کی آب و ہوا' ماحول اور امارت دیکھ کر یہیں بس گئے۔ یہ لوگ ہر اعتبار سے خود کفیل ہیں۔ شہر کے اندر ایک شہر آباد کیا گیا ہے۔ ان کا اپنا ہسپتال ہے' ڈاک خانہ ہے' اپنی دکانیں ہیں' ریڈیو سٹیشن ہے' ٹی وی چینل ہیں' ٹیلیفون ایکسچینج ہے' اپنے اخبارات نکالتے ہیں' تھیٹروں میں چینی ڈرامے دکھائے جاتے ہیں۔ جو لڑکیاں ان اداروں کو چلاتی ہیں وہ پشت ہا پشت سے یہی کام کرتی چلی آ رہی ہیں۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ انہیں چھ DIALECT اور چار ہزار سے زائد نام اور نمبرز زبانی یاد کرنے پڑتے ہیں۔ ٹیلیفون ڈائریکٹری بھی چینی زبان میں موجود ہے۔ ہر چند کہ اب ان سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا''۔ وہ ایک لمحے کیلئے رکا اور سگریٹ سلگا کر دھواں سارا کے منہ کی طرف چھوڑا۔

''چینیوں کی تعریف کرتے کرتے حرکتیں بھی چینیوں جیسی کرنے لگے ہو!'' سارا تنک کر بولی۔

''شاہ! تم نے غور نہیں کیا۔ اس کی صورت میں دیومالائی چینی شہزادی چنگ چی کی جھلک ہے اگر لانگ مارچ کے وقت یہ 'ماؤزے تنگ' کے ہتھے چڑھ جاتی تو اسے بورژوائی باقیات سمجھ کر کم از کم بیس سال جیل میں رکھتا''۔ وہ مسکرایا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اسے بیس سال تک دل میں بٹھائے رکھتا!'' میں نے کہا۔

''پھر وہ ماؤزے تنگ نہیں بلکہ پیٹر پال آف سان فرانسسکو ہوتا''۔

چائنا ٹاؤن کا انتظام و انصرام ایک کمپنی کرتی ہے SIX COMPAINES کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس میں تمام قبیلوں کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ یہ امراء بورڈ آف گورنرز کے اہم رکن ہوتے ہیں اور

انہی میں سے ایک کو سال بھر کیلئے صدر منتخب کیا جاتا ہے۔ کمیونٹی امریکہ کے صدارتی انتخابات میں متفقہ طور پر ووٹ ڈالتی ہے۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک یہ سب ری پبلکن تھے۔ اس کے سیاس رجحان کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے۔ جو جان ہے (JOHN HAY) سے شروع ہو کر OPEN DOOR تک جا پہنچتی ہے۔ پانچویں دہائی میں یہ ڈیموکریٹ ہو گئے۔ دراصل ان کی حمایت کے پیچھے کوئی اخلاقی فلسفہ کار فرما نہیں ہے۔ اصل چیز مفادات ہیں۔ جو وقت اور حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

چائنا ٹاؤن نے کئی نامور ہستیاں پیدا کی ہیں۔ ڈاکٹر مارگریٹ، 'چنگ'۔ جس نے اپنے کیریئر کا آغاز برتن مانجھنے سے کیا اور محض محنت کے بل بوتے پر کیلیفورنیا کی ممتاز سرجن بنی۔ فرینک فیٹ (FRANK FAIT) جس نے تیس ڈالر ماہوار پر ملازمت اختیار کی اور امریکہ کا کروڑ پتی بن گیا۔ نیشنل ڈالر سٹورز اس کی ذاتی ملکیت ہیں۔ جو پورے کیلیفورنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ امریکہ کا امیر ترین چینی نژاد تھا۔ امریکہ کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی اور ہے کہ وہاں EQUILITY OF OPPORTUNITY ہے۔ غریب آدمی بھی محنت کرے اور قسمت کی دیوی بھی مہربان ہو تو دیکھتے ہی دیکھتے کروڑ پتی بن سکتا ہے۔ سب سے اچھوتی مثال بل گیٹ کی ہے۔ جو دنیا کا امیر ترین آدمی ہے اور جسے 'کمپیوٹر کنگ' بھی کہتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ وہ نان جویں کو ترستا تھا اور آج لاکھوں لوگ اس کے قائم کردہ خیراتی اداروں میں پل رہے ہیں۔ کمیونزم نے اس لئے مات کھائی ہے کہ وہاں لوگوں کیلئے INCENTIVES نہیں تھے۔ ایک موچی کو پتہ تھا کہ وہ بطور ایک کفش دوز ہی مرے گا اور ایک مزدور تا زیست مزدور ہی رہے گا۔ دراصل انسان جب خواب دیکھنے بند کر دیتا ہے تو پھر زندہ رہنے کی تڑپ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ترقی کا پہیہ منجمد ہو جاتا ہے۔ روس میں جو حالیہ انقلاب آیا ہے وہ باہر سے درآمد نہیں کیا گیا بلکہ اس کا محور و مرکز وہ ناآسودہ خواہشات تھیں جو آدمی کا تمام عمر پیچھا کرتی ہیں۔ سان فرانسسکو میں جاپانی بھی ہیں لیکن وہ اپنا کوئی ٹاؤن نہیں بنا سکے۔ ان کے ساتھ جنگ کے دوران نہایت بے رحمانہ سلوک کیا گیا۔ امریکہ میں جاپانی دو قسم کے تھے۔ 'ISSEI' اور 'NISEI'۔ پہلے امریکہ سے باہر پیدا ہوئے لیکن دوسری نسل امریکہ میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ 'ISSEI' 4500 کے لگ بھگ تھے جبکہ نسیوں کی تعداد اسی ہزار تک جا پہنچی تھی۔ ایک

فوجی فرمان کے تحت انہیں گھروں سے گرفتار کر کے خاردار کیمپوں میں رکھا گیا کیونکہ امریکیوں کا خیال تھا کہ جاپانی خواہ دنیا کے کسی کونے میں کیوں نہ ہوں' کیسے ہی ماحول میں پلا ہو' اس کے دل کی ہر تار ٹوکیو کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ اپنے بادشاہ کے ساتھ وفاداری میں استواری ہوتی ہے۔ اڑھائی ہزار سال میں دنیا بدل گئی ہے لیکن جاپانی کی سوچ نہیں بدلی۔ قید و بند کی یہ صعوبتیں صرف کیلیفورنیا کے جاپانیوں کے حصہ میں آئیں تھیں۔ باقی جگہوں پر انہیں اس قدر تنگ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ باقی ریاستوں میں اتنی بڑی تعداد میں یہ لوگ رہائش پذیر نہیں تھے۔ بغیر کسی جرم کے اس قدر لوگوں کی گرفتاری انسانی حقوق کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھی۔ اور قانونی ضابطوں کو بھی پامال کیا گیا ہے۔ لیکن جب جنگ ہو رہی ہو تو پھر ان باتوں کی کون رواہ کرتا ہے۔ بااین ہمہ امریکہ میں اس وقت بھی ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے ان بلا جواز گرفتاریوں پر صدائے احتجاج بلند کی۔ ان میں سرفہرست 'YALE' یونیورسٹی کے ماہر قانون پروفیسر 'یوجین' تھے۔ انہوں نے ستمبر 1945ء میں اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ ایک لاکھ لوگوں کو ایسی شہادت کے بل بوتے پر جیل بھیجنا صریحاً ظلم ہے جس کی بناء پر ایک شخص کو 'کتا' چوری کرنے پر بھی سزا نہیں دی جا سکتی۔ اس کی تحریر صدر بصحرا ثابت نہ ہوئی اور فوج نے جاپانیوں کی اکثریت کو رہا کر دیا۔ یہ بدقسمت لوگ قید سے تو رہا ہو گئے لیکن معاشی طور پر تباہ ہو گئے۔ واپس آ کر انہیں پتہ چلا کہ ان کی زمینوں پر گوروں نے قبضہ کر لیا ہے' ان کے کاروبار پر غاصب قابض ہو گئے ہیں۔ یہ جہاں کہیں بھی جاتے ان کا تمسخر اڑایا جاتا' سوشل بائیکاٹ کیا جاتا' آوازے کسے جاتے اور ایک طویل مدت تک ان پر عرصہ حیات تنگ رہا۔ جاپان نے پرل ہاربر پر چند سو امریکی کیا مار دیئے، ہیروشیما اور ناگاساکی تباہ کر کے بھی ان کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ آج بھی اگر ہونالولو جائیں تو امریکی گائیڈ آنکھوں میں آنسو بھر کے پرل ہاربر کا قصہ یوں سناتے ہیں جیسے جاپانیوں نے ایک جہاز نہیں ڈبویا پورا امریکہ غرق نیل کر دیا ہو۔

ہم چلتے چلتے ایک بہت بڑے چینی سٹور میں داخل ہو گئے۔ سٹور میں اکثر و بیشتر مصنوعات چین اور ہانگ کانگ کی تھیں۔ کچھ آرٹیکل 'HAND KNOTTED' تھے۔ وہ بھی چینی کاریگروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے تھے۔ ہاتھ سے بنی ہوئی اشیاء میں وہ نفاست نہیں ہوتی جو مشینیں پیدا کرتی ہیں تاہم امریکی ان

کے بہت زیادہ شوقین ہیں۔ اور انہیں دوگنی تگنی قیمت پر خریدتے ہیں۔ اس سے ایک تو محنت کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے دوسرا ایک قسم کے NOSTELGIA کا اظہار ہوتا ہے۔ چیز جس قدر پرانی' دقیانوسی اور کٹی پھٹی ہوگی انٹیک کہلائے گی۔ اور بہت مہنگے داموں فروخت ہوگی۔ امریکی سیاح ساری دنیا میں اس شوق کے ہاتھوں لٹتے ہیں۔ ہندو پاکستان میں تو یار لوگ پرانی کنگھیاں یہ کہہ کر بیچ دیتے ہیں کہ ان سے مغل ملکہ نور جہاں زلفیں سنوارا کرتی تھی۔

چینی سلک ساری دنیا میں مشہور ہے اور سٹور میں اس کی بہتات تھی۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے ہم وادی ریشم میں اتر آئے ہیں۔ چین کی دو گھوڑا بوسکی بڑی مشہور ہے۔ اس کا عام رنگ ہلکا سنہری ہوتا ہے۔ شنگھائی سٹور میں یہ آٹھ مختلف رنگوں میں دستیاب تھی۔ گلابی' عنابی' نارنجی' مسٹرڈ اور ہلکا آسمانی۔ اکثر تھان چیک کی صورت میں تھے جن میں ایک سے زیادہ رنگوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ خوبصورت چھتریاں' ہیٹ اور جڑی بوٹیوں سے تیار کئے گئے ہربل آئل بھی دستیاب تھے۔ ہاتھ سے بنی ہوئی مختلف رنگوں میں سویٹر اور شالیں بھی شوکیسوں میں سجی ہوئی تھیں۔ کوٹ کی فرنٹ پاکٹ میں ڈالنے کیلئے رومالوں کی اس قدر ورائٹی میں نے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ میں نے ایک درجن رومال خریدے اور دوستوں کیلئے رنگین بوسکی کی چند قمیصیں لیں۔ مون نے ہائی نیک کا کریم کلر کا HANDKNOTTED' خریدا۔

''تم بھی کچھ خریدو گی یا صرف ونڈو شاپنگ پر اکتفا کرو گی!'' پیٹر نے سارا کو پھر چھیڑا۔ ''کہو تو تمہارے لئے کچھ ریشمی تھان خرید لوں''۔

''پہلے ہی بال کٹوانے پر کافی رقم خرچ کر چکے ہو' مزید اخراجات سے تمہاری کمر دوہری ہو جائے گی''۔ سارا نے متوقع حملے کے دفاع کی پہلے ہی سے تیاری کر رکھی تھی۔

''کوئی بات نہیں' میں قرض لے لیتا ہوں۔ ادائیگی بعد میں ہوتی رہے گی!''

''قرض سے زیادہ مجھے تمہارے 'مرض' کی فکر ہے۔ اس قدر دل پھینک لوگ تو کتابوں میں بھی نہیں ملتے''۔

''اس قدر حسین لوگ بھی تو روز روز نہیں ملتے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں آج بہت خوش ہوں۔ روزمرہ کے

معمولات میں ایک بوریت آمیز یکرنگی ہوتی ہے جو تم لوگوں کے آنے سے ختم ہوگئی ہے"۔

"تو ہر ماہ ٹکٹ بھیج دیا کرو ہم آجایا کریں گے"۔

"ہر ماہ کا سفر ضروری ہے۔ تم ایک دفعہ ہی کیوں نہیں آجاتیں؟"

"تمہارے میرے مزاج میں بعد المشرقین ہے۔ میں ٹھہری آرٹ کی دلدادہ اور تم ہو پراپرٹی ڈیلر جو محبت کو بھی جائیداد سمجھتا ہے اور انہیں پیمانوں سے ناپتا ہے"۔

پیٹر مسکرایا۔ "آزمائش شرط ہے۔ ایک تجربہ اور کر ڈالو"۔

کیتھی کہنے لگی "ناکامیوں کی داستان میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا"۔

"یہ بھاری پتھر تم ہی کیوں نہیں چوم لیتیں۔ پکے ہوئے آلو کی طرح ایک روز گل سڑ جاؤ گی"..... سارا غرائی۔

ہم نے شنگھائی سٹور میں کافی پی، بل ادا کیا اور باہر نکل آئے۔

"اب واپس چلنا چاہئے" پیٹر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "رات کا کھانا باہر کھانا ہے یا گھر میں ہی کچھ پکا لیا جائے"۔

"ابھی ابھی تو کھایا ہے۔ سب تھکے ہوئے ہیں بہتر ہوگا کہ گھر چل کر آرام کیا جائے" مون نے مشورہ دیا۔

O

ہم جب گھر پہنچے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ سمندر سے اٹھتی ہوئی ہواؤں نے موسم کو مزید خوشگوار بنا دیا تھا۔ شہر کی بتیاں جل چکی تھیں۔ سمندر کا پانی رنگ برنگی روشنیوں کے عکس سے ہلکا عنابی نظر آ رہا تھا۔ کروکڈ سٹریٹ کے پھولوں سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ ٹیرس سے سان فرانسسکو ایئرپورٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ جہاز ایک تسلسل اور تواتر سے اتر اور پرواز کر رہے تھے۔ ایل اے، نیویارک، شکاگو، سان فرانسسکو، ڈلس فورٹ، ورتھ بڑے مصروف ایئرپورٹس ہیں جہاں پر نہ راتیں سوتی ہیں اور نہ دن آرام کرتے ہیں۔ جہاز یوں قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں جس طرح

بادامی باغ میں بسیں کرتی ہیں۔ جہاں تیس کروڑ کی آبادی ہوائی سفر کی عادی ہو اور ایک ملک میں بڑی چھوٹی ملا کر سینکڑوں ایئر لائن ہوں وہاں کے ہوائی اڈوں کی مصروفیت کا انداز بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ یہی حال ہوٹلوں کا ہے۔ شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا ملک ہو جہاں ہوٹل اس قدر بزنس کرتے ہوں۔ ایک تو امریکن کھانے پینے کے بڑے شوقین ہیں۔ جب دیکھیں منہ چلاتے نظر آئیں گے۔ ہر کوئی کام کرتا ہے۔ میاں، بیوی، والدین، ظاہر ہے کہ لنچ کے لئے کوئی گھر نہیں جاتا۔ قریبی ہوٹل یا ریسٹورنٹ سے کھانا خریدنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سکول میں بچے بھی لنچ کینٹین میں کرتے ہیں۔ عملاً جس ملک کے تیس کروڑ آدمی لنچ ہوٹلوں میں کرتے ہوں وہاں بزنس تو ضرور پھلے پھولے گا۔ پھر انگریزوں کی طرح چپس یا ہلکا پھلکا سینڈوچ نہیں کھاتے بلکہ کھانے کے ساتھ باقاعدہ دنگل ہوتا ہے۔ امریکہ میں ریستوران کے بے شمار "CHAIN" ہیں۔ جہاں بوفے، لنچ اور ڈنر نسبتاً ارزاں ہیں۔ کیفے ٹیریا..... جیک ان دی باکس..... انٹرنیشنل ہاؤس آف پین کیکس (L.H.O.C) میں چار پانچ ڈالر میں گاہک جس قدر چاہے کھا پی سکتا ہے۔ صف فر کیفے ٹیریا (Fur CafeTARIA) میں تیس کے قریب کھانوں کی ورائٹی ہے۔ جب آدمی نے پیسے پورے دینے ہوں اور کھانے پر پابندی نہ ہو تو پھر اکثریت محض کھانا نہیں کھاتی، باقاعدہ کشتی کرتی ہے۔ یہ انسانی نفسیات ہے اور معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر طبعاً کم خوراک بھی بسیار خوری پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ امریکنوں کے بڑھتے ہوئے قد بت کو دیکھ کر بعض اوقات یوں گمان ہوتا ہے جیسے 'ڈائنا سار' ایک بار پھر معرضِ وجود میں آ رہے ہیں۔

جب لاہور میں ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل نے پہلی بار 'بوفے ڈنر' کا اہتمام کیا اور غالباً بارہ روپے فی کس قیمت مقرر کی تو اس کی بھنک بھولو برادران کو پڑ گئی چنانچہ ایک دن سارا خاندان اپنے ریشمی لاچوں اور زعفرانی پگڑیوں کے ساتھ نمودار ہوا اور چشم زدن میں پراتوں کو پلٹ کر رکھ دیا۔ جب خاندان کے سربراہ نے مونچھوں پر تاؤ اور پیٹ پر تین مرتبہ ہاتھ مار کر الحمدللہ کہنے کے بعد بل مانگا تو ہوٹل کے منیجر نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''بل چکانے کی ضرورت نہیں پہلوان جی۔ آپ اس ملک کا سرمایہ ہیں اور یہ ہوٹل وطن عزیز کا 'STATUSSYMBO' ہے۔ اگر آپ نے چند دن اور قدم رنجہ فرمایا تو نہ اسٹیٹس رہے گا اور نہ

سمبل۔آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہیں نا''۔مینجر گھگیایا۔

''آ.....ہو''.....بھولو پہلوان ڈکار مارتے ہوئے مسکرائے۔اور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ہانگ کانگ میں پہاڑ کی چوٹی پر ایک خوبصورت پوائنٹ ہے جسے 'MOSTBEAUTYFULL NIGHT SPOT OF THE WO کہا جاتا ہے۔اس پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو جڑواں شہر کولون اور ہانگ کانگ صاف نظر آتے ہیں۔مین ہٹن کے بعد غالباً دنیا کے اس سب سے بڑے اور زیادہ سکائی سکریپر کی روشنیاں جب سمندر میں پڑتی ہیں تو ان کے عکس سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ اس قدر دلکش، دلنشین اور رنگین ہوتی ہے کہ انسان قدرت کی صناعی اور انسان کی مساعی کو لامحالہ اور بے محابہ داد دیتا ہے۔ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ستاروں سے جگمگ کرتا ہوا روشن آسمان سمندر میں اتر گیا ہو۔لیکن جب آدمی 'کروکڈ سٹریٹ' کی بلند و بالا عمارتوں سے سان فرانسسکو کے سمندر کو دیکھتا ہے تو ہانگ کانگ کا نائٹ سپاٹ اس کے مقابلہ میں ہیچ نظر آتا ہے۔ساؤتھ چائنا سی کسی طور بحرالکاہل کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔پھر کہاں، گرمی اور پسینے سے چپچپاتا ہوا بدن اور کہاں ایک نہایت خوشگوار ہلکی خنکی والی حسین شام، کیلیفورنیا محض ''سنہری دھوپ والی'' سرزمین ہی نہیں ہے بلکہ حسین شام والی ریاست بھی ہے۔اس حسین منظر نے میری دن بھر کی تھکن دور کر دی تھی۔وہ روشنیاں جو سمندر کے سینے میں جذب ہو رہی تھیں مجھے اپنے وجود میں اترتی ہوئی محسوس ہوئیں۔میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔انسان سکون کی تلاش میں تمام عمر بھٹکتا رہتا ہے۔دنیا کے تمام مذاہب کا نچوڑ صرف اسی ایک نکتہ پر آ کر ختم ہوتا ہے۔سچائی کی تلاش میں کوئی اندھیری گھپاؤں میں بیٹھ کر برسہا برس تپسیا کرتا رہا۔کوئی برگد تلے بیٹھا بیٹھا خود شاخِ برگد بن گیا تو کسی نے انا الحق میں حق کو تلاش کیا۔یہ تگ و دو کبھی ظاہر تک محدود رہی تو کبھی باطن پر مرکوز۔کتاب کے چکر سے نکلی تو جام و مینا سے جا ٹکرائی۔فلسفہ، منطق، حکمت اس کی تلاش میں سر ٹیکتے رہے۔لیکن قدرت کے ان لطیف اشاروں کی طرف کوئی نگاہ نہ اٹھی۔وہ سطحِ آب پر مچلتی، پھسلتی، پھچلتی موجیں، وہ زلفِ محبوب کی طرح ڈولتے ہوئے بادل، وہ قطار اندر قطار اٹھکیلیاں کرتے ہوئے سمندری پرندے، وہ مستی کی شراب

پڑے ہوئے سنگِ موح تک ابھرتی ہوئی رنگا رنگ مچھلیاں، وہ ڈوبتے سورج کا نیلے پانیوں کے آئینے پر قرمزی، نارنجی، عنابی اور زعفرانی رنگ بکھیرنا، وہ رنگوں کے حسین امتزاج سے شفق کے گلاب کھلنا، ان لافانی لمحوں میں آدمی اپنی ساری تھکن، کوفت اور پریشانیاں بھول جاتا ہے اور روح کی ساری کثافت دھل جاتی ہے۔ میں انہی خیالات میں غرق تھا کہ مون، سارا، کیتھی اور پیٹر اوپر آ گئے۔

''شاہ! کہاں کھو گئے ہو!'' مون نے میرا کندھا جھنجھوڑا۔ ''تم نے ابھی تک لباس تبدیل نہیں کیا؟ یہاں ٹیرس میں کرسی پر سونے کی غلطی نہ کرنا۔ یہ سان فرانسسکو ہے ایل اے نہیں اگر سردی میں اکڑ گئے تو تمہارے اکڑے ہوئے اعضاء کو قابل ترین سرجن بھی نہیں کھول سکے گا۔'' سارا نے مشورہ دیا۔

''تمہیں شاہ کا خیال کب سے ستانے لگا ہے؟'' کیتھی قدرے حیران ہو کر بولی۔

''تمہارے اس بظاہر طنز کے پیچھے مجھے تشویش کی لکیریں ابھرتی محسوس ہو رہی ہیں۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مجھے کسی اور کی تشویش لاحق ہو۔'' اس نے شرارتی نظروں سے مون کو دیکھا۔ ''بہر حال یہ ہمارا مہمان ہے اور امریکن کتنے ہی مادہ پرست کیوں نہ ہوں، چند بنیادی انسانی قدروں پر ضرور یقین رکھتے ہیں۔''

''تم ذات کے حصار سے کبھی باہر نہیں نکلیں۔ تمہیں کسی کی تشویش کیسے لاحق ہو سکتی ہے۔'' کیتھی کہنے لگی۔

''میرے خیال میں اب آرام کیا جائے'' میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں کل بھی ایک مصروف ترین دن گزارنا ہے۔''

''اس قدر حسین شام سو کر گزارنا چاہتے ہو۔ یہ کفرانِ نعمت ہے!''

''سونا بھی تو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ صرف سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''جب دن بھر کا تھکا ہارا انسان نرم و داز بستر پر لیٹتا ہے اور نیند اسے ہلکی ہلکی لوریاں دے کر خوابوں کے جزیرے میں لے جاتی ہے۔ ایک ایسا جزیرہ جس میں چار سو ہریالی ہے۔ ہر طرف پھول کھلے

ہیں۔ دور بہت دور پہاڑوں کے پیچھے شہنائی بج رہی ہے، فضا میں زعفران اور سونف کی خوشبو ہے، نم آلود سکون بخش ہوا چل رہی ہے، اتنے میں شہنائی کی آواز کے درمیان پائل کی چھن چھن سنائی دیتی ہے جیسے کوئی آرہا ہو۔ کوئل کی کوکو میں ایک پیغام ہے، ایک سندیسہ ہے۔ ایک ایسا سنہری ماحول جس میں کوئی غم کوئی فکر کوئی آلام پاس نہیں پھٹکتا، ''جاگ کر انسان کیا حاصل کرتا ہے؟'' فکرِ فردا، غمِ روزگار..... اندیشہ ہائے دوردراز''۔

''تو پھر جلدی سے سو جاؤ!'' وہ مسکرائی اور وہ تینوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

O

صبح حسب دستور جلد آنکھ کھل گئی۔ ہر چند کہ سورج طلوع نہیں ہوا تھا لیکن اپنے آس پاس ہونے کا پتہ ضرور دے رہا تھا۔ سرمئی اندھیرا، ملگجی اجالے میں ڈھل گیا تھا۔ سمندر کی جانب سے آتی ہوئی ہوا میں تیزی آگئی تھی۔ میں نے جوگرز پہنے اور پہاڑیوں سے نیچے اتر گیا۔ چلتے چلتے میں ساحل پر آ گیا۔ بیشمار لڑکے، لڑکیاں اور زن و مرد جوگنگ کر رہے تھے۔ ایک ستر سالہ جوڑا بنیانیں اور نیکریں پہنے مسلسل دوڑ رہا تھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھے لیکن کہیں رکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ وطن عزیز میں اگر کوئی شخص اس عمر میں دوڑے تو لوگ دیوانہ سمجھ کر پتھر مارنا شروع کر دیتے یا ہنس ہنس کر پاگل ہو جاتے۔ میں ساحل پر کافی دیر بریسک واک کرتا رہا۔ اس حسین موسم اور رنگین ماحول میں تھکن کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ البتہ واپسی پر جب پہاڑی چڑھنا پڑی تو صحیح اندازہ ہوا کہ پیٹر کا مکان کس قدر بلندی پر بنا ہوا ہے۔ اور عمودی چڑھائی چڑھنا کتنا مشکل کام ہے..... جب بیڈروم میں جوگرز اتارے تو کچھ ایسے محسوس ہوا جیسے پانچ دن کی سیر میں نے ایک دن میں کر ڈالی ہے۔

وہ سب ہنوز سو رہے تھے۔ پچھلے دن کی تھکن اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ ویسے بھی آدمی جب چھٹی کے موڈ میں ہو تو زیادہ سوتا ہے، زیادہ کھاتا ہے اور شاید ضرورت سے زیادہ ہنستا ہے۔ چھٹی کا صحیح تصور اہلِ مغرب کے پاس ہے۔ وہ ہر لمحے کو صحیح معنوں میں انجوائے کرتے ہیں۔ اس کا رس نچوڑتے ہیں اور پھر

چسکی کے انداز میں پیتے ہیں۔ ہم لوگوں نے چھٹیوں کو کبھی ٹھیک طرح سے نہیں گزارا۔ اس کی ایک وجہ تو معاشی ناہمواریاں اور معاشرتی ناصبوریاں ہیں۔ اور سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ انجوائے تو اس چیز کو کیا جاتا ہے جس کا انتظار ہو۔ جب قوم کی اکثریت نے عملاً ہفتے کے سارے دن چھٹی پر رہنا ہے تو لطف اندوزی کیا خاک ہوگی۔ آپ دفتر میں چلے جائیں پہلے تو کوئی اہلکار ملے گا نہیں! اور اگر مل بھی جائے تو آپ کو کچھ ایسا تاثر دے گا کہ جیسے آپ کرسی پر نہیں بیٹھے اس کے کندھوں اور حواس پر سوار ہیں.....

میں نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا۔ پورچ میں پڑا ہوا اخبار اٹھایا اور باورچی خانے میں جا کر کافی کا کپ بنایا اور باہر ٹیرس میں کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ اخبار پڑھنے کا لطف صحیح معنوں میں جبھی آتا ہے کہ چھٹی کا دن ہو، گلابی جاڑا ہو، صبح کا وقت ہو۔ اس پر کافی کا کپ اور سگار شامل ہو جائیں تو سمجھیں سونے پر سہاگہ ہے۔ اخبار کو ہماری زندگی میں اس قدر عمل دخل ہو گیا ہے کہ آدمی اس کے بدلے ناشتے سے کنارہ کش ہو سکتا ہے، ایک وقت کی روٹی کو فراموش کر سکتا ہے۔ دیگر چھوٹی موٹی قربانی دے سکتا ہے۔ لیکن اگر صبح کا اخبار نہ پڑھے تو اسے زندگی میں ایک خلا سا محسس ہوتا ہے۔ سارا دن کھویا کھویا رہتا ہے لیکن یہی عادت قاطع اعصاب بھی ہے۔ جس شوق سے ہم اخبار اٹھاتے ہیں اسی سرعت سے ہمارے بلڈ پریشر کی رفتار بڑھنی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے یہ دنیا دارالمحن ہے اور کسی طور رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اغوا، قتل، ڈاکے، لوٹ مار، جنگیں، بارود کی بو، انسانی خون کے لوتھڑے، ظلم، بربریت یہ سب خبریں نمایاں طور پر جلی حروف میں چھاپی جاتی ہیں کیونکہ یہ اپنے اندر 'خبریت' کا پہلو رکھتی ہیں۔ انسان کی فطرت کا یہ عجیب تضاد ہے کہ جس چیز سے وہ نفرت کرتا ہے اس کو بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔ دل کی دھڑکن بڑھ رہی ہے، فشارِ خون سے رگیں چٹخ رہی ہیں، پسینہ ماتھے پر سے پہاڑی چشمے کی طرح پھوٹ رہا ہے لیکن جب ت ک خبر کا آخری حصہ پڑھا نہیں جاتا تسلی نہیں ہوتی۔ امریکی اخبارات میں یہ تمام باتیں ملتی ہیں۔ امریکی بال کی کھال اتارنے میں ماہر ہیں۔ کوئی قتل ہو جائے تو واردات کی تمام جزئیات کے علاوہ قاتل کا سارا شجرۂ نسب، اُس کی عادات و حرکات، اُس کے جاننے والوں کے انٹرویو اور ماہرین نفسیات کی ایک پوری ٹیم اپنے وزنی دلائل کے ساتھ آ ٹپکتی ہے۔ آخر میں تان اس بات پر آ کر ٹوٹتی ہے کہ

THAT ABNORMAL ACT WAS T HE RESULT OF S

PRE NATAL OR POST NATAL MISFORTU۔وکیل صفائی یہ ثابت کرنے میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے ہیں کہ ایسے شخص کو کیسے سزادی جاسکتی ہے۔ جواپنے عمل کا ذمہ دار ہی نہیں تھا! یہی وجہ ہے کہ صدر ریگن پر دن دہاڑے حملہ کیا گیا۔ گولی اس کے معدے میں لگی۔ دوسری اس کے سیکرٹری کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اور قاتل یوں صاف بچ کر نکل گیا جیسے دودھ سے مکھی نکلتی ہے۔ لیکن جو چیز ایک عام قاری کو حیران کرتی ہے وہ قتل وغارت یا اغواڈاکے کی خبریں نہیں بلکہ بین الاقوامی معاملات میں امریکیوں کی عدم دلچسپی ہے۔ خبروں کا سارا زور سرخیوں کا سب متن ان کے اپنے اندرونی حالات پر ہوتا ہے۔ دنیا میں کیا ہورہا ہے، افریقہ بھوک سے بلک رہا ہے، ایشیا غربت کی آگ میں سلگ رہا ہے، یورپ کس نہج پر سوچ رہا ہے یا کس سمت میں رواں ہے، انہیں اس بات سے کوئی دلچسپی ہے نہ سروکار۔ اپنی حکومت کی کارکردگی کو بھی معاشی پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ اگر ملک میں بیروزگاری ہے، کساد بازاری ہے، اشیاء خوردونوش کی قیمتیں بڑھی ہیں تو اچھی حکومت بھی بری ہے اور اگر معاشی خوشحالی ہے تو پھر بری حکومت بھی عوام میں مقبول ہے۔ دراصل یہ لوگ اپنی ذات کے حصار سے باہر نہ تو نکل پائے ہیں نہ غالباً نکلنا چاہتے ہیں۔ ان کی زندگی کا محور ومرکز پانچ دن کا کام اور دو دن کی چھٹی ہے۔ بچے بالغ ہوکر والدین کو چھوڑ جاتے ہیں۔ والدین بھی ان کا نان ونفقہ بند کر دیتے ہیں۔ خود کماؤ خود کھاؤ بوڑھے ہوکر والدین نرسنگ ہوم منتقل ہوجاتے ہیں۔ ہماری طرح والدین کی آخری دم تک خدمت کرنے کی وہاں نہ تو کوئی خواہش ہوتی ہے اور نہ ضرورت۔ اتوار کے روز یا کسی قومی تہوار پر جب بوڑھوں کے بچے اپنے بچوں کو لے کر نرسنگ ہوم جاتے ہیں تو باقاعدہ پوتوں کو دادا، دادی سے متعارف کرانا پڑتا ہے۔ سو صفحوں کا اخبار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ہماری طرح سارا اخبار نہیں پڑھا جاتا۔ ہم لوگ دراصل اخبار نہیں پڑھتے بلکہ اس سے انتقام لیتے ہیں۔ آخر قیمت جو وصول کرنا ہوتی ہے"FOUNDED BY QUID-E-AZAM سے لے کر PRINTED BY ANAYAT MUHAMMAD ALI JINNA ULLAH تک سب پڑھ جاتے ہیں۔ پھر جتنی دیر اخبار پڑھتے ہیں اس سے دوگنا وقت خبروں پر تبصرے

میں گزار دیتے ہیں۔ تبصرہ جس میں مقصدیت کم ہوتی ہے اور چسکا زیادہ۔ اسکینڈلز، سنسنی خیز خبریں اس طرح پڑھتے ہیں گویا پڑھ نہیں، برت رہے ہوں، چکھ رہے ہیں یا چسکی لے رہے ہوں مزہ آرہا ہے۔ وجود میں ہلکی سی گرمائش، پیٹ میں تھوہ، ری سی گدگدی، جذبات میں بہت زیادہ ہلچل، گویا خبر نہیں کوئی متلاطم سمندر ہے جس میں کشتی وجود ڈولتی رہتی ہے۔ ہچکولے کھاتی ہے۔ ایک بے نام تسکین، ایک غیر منطقی انتقام، ایک غیر مرئی نفرت، آخر اپنی محرومیوں، ناکامیوں، حسرتوں آرزوؤں اور ناآسودہ خواہشوں کی کچھ تو تسکین چاہئے۔ کس قدر عیاشی، کتنی معصوم بدمعاشی، گناہ بے لذت.....!! اس کے برعکس وہاں ہر آدمی اپنے مطلب کا صفحہ پڑھتا ہے۔ تاجر سٹاک ایکسچینج دیکھے گا، فلم بین فلمی صفحے کو کھنگالے گا، ادیب یا ادب دوست لٹریچر پڑھے گا اور ایک عام قاری سستی چیزوں کی خبر پر توجہ دے گا۔ ہوائی کمپنیوں میں مقابلہ، کرایوں میں حیرت انگیز کمی، بنکوں میں مقابلے، کون سود در سود دے گا۔ بڑے بڑے سٹورز میں تجارتی محاذ آرائی۔ ایک چیز خریدیں دوسری مفت۔ چار خریدنی ہوں تو پانچ مفت.....لوٹ سیل۔ پیو کہ مفت لگا دی ہے، خونِ دل کی کشید۔ یوں لگتا ہے کہ تمام دنیا کی دولت، اشیائے خورد و نوش ایک ملک میں جمع ہوگئی ہیں۔ ایک ایسا ملک جو اپنے آپ میں ایک دنیا بھی ہے۔ یہ غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جو کافی حد تک خود کفیل ہے۔ دنیا کا کوئی اور ملک دیکھ لیں، اگر وہاں صنعت ہے تو زراعت نہیں ہے۔ زراعت ہے تو صنعتی ترقی سے محروم ہے۔ بالفرض دونوں چیزیں ہیں تو تیل نہیں ہے۔ خام مال باہر سے منگوانا پڑتا ہے۔ آلاتِ حرب کے لئے تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ دنیا کی واحد سپر پاور جس کی طاقت تمام دنیا کی طاقت سے زیادہ ہے۔ اگر ان کا سٹار وار پروگرام کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ گھر بیٹھے بیٹھے تمام دنیا کو تاراج کر سکتے ہیں اور ان کی طرف آتا ہوا ہر میزائل راستے میں ہی تباہ ہو جائے گا۔ ایک ایسی حقیقت جس سے تمام دنیا خائف ہے۔ کئی وسوسے ذہن کے زندان میں اٹھ رہے ہیں۔ کوئی ملک کیسا ہی جمہوریت اور آزادی پسند کیوں نہ ہو، وہاں کے اخلاقی ضابطے کیسے ہی سخت کیوں نہ ہوں، تاریخی حقیقتوں سے سرگردانی نہیں کر سکتا۔

میکاولی نے کہا تھا کہ اخلاقی ضابطے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک افراد کے درمیان اور دوسرا ریاستوں کے مابین! ایک فرد کے لئے لازم ہے کہ وہ اخلاقی دروں پر یقین رکھے اور ان پر عمل کرے۔

جھوٹ، فریب، دغا، مکاری ناپسندیدہ عمل ہیں اور گناہ ہیں۔ قربانی ایک ایسا جذبہ ہے جو شرطِ وفا ہے اور قابل تعریف ہے۔ آفرین ہے ایک دوست پر جو دوسرے کے لئے جان قربان کر دے۔ لیکن ریاستی نظام کے اپنے تقاضے ہیں۔ ریاست کے مفاد میں ہو، تو حکمران کے لئے یہ بات بالکل جائز ہوگی کہ وہ جھوٹ، فریب اور مکاری سے کام لے۔ ہر چند کہ اخلاقیات کا یہ معیار دوہرا ہے لیکن ضروری ہے۔ ایک قوم کا مفاد دوسری کے لئے قربان نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بین اجلاقوامی تعلقات میں کوئی مستقل دوست نہیں ہوتے۔ جو چیز مستقل اور پائیدار ہے وہ صرف اس ملک کا اپنا مفاد ہے جسے ہر حالت میں ہر کسی کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہے۔

نرم گرم دھوپ، مصالحے دار، چٹ پٹی خبریں، گرم گرم کافی، ہوائی سگار کا اروما، میرے اعصاب پر غنودگی طاری ہونے لگی اور ذہن نیند اور بے خوابی کی منزلوں کے درمیان بھٹکنے لگا۔ لیکن مجھے زیادہ دیر سونا نصیب نہ ہوا کیونکہ سارا کے ایک کرخت قہقہے نے مجھے بیدار کر دیا۔ کہنے لگی ''عادتی نہیں بدلتی۔ یہ انسان کی قبر کا بھی سات مرتبہ طواف کرتی ہے۔ آج پھر باہر سو گئے؟''

''کیا جاگرز پہن کر سویا ہے؟'' مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے شک زہر بن کر تمہارے خون میں دوڑ رہا ہے۔'' کیتھی نے اسے جھڑکا۔

''مجھے تم سے سو فیصد اتفاق ہے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ غالباً اس کا آخری بوائے فرینڈ بھی بے قصور تھا۔ یہ اس کا واہمہ تھا جس نے ایک لڑکی کو اس کی بغل میں لا کھڑا کیا۔

''مجھے خواب نہیں آتے، نہ میں خواب دیکھنا پسند کرتی ہوں۔ حق بات کہنا میری عادت ہے اور شاید سچ بھلے لوگوں کو پسند نہیں آتا۔'' اس نے زہر خند نظروں سے کیتھی کو دیکھا۔

''تم تو سیریس ہو گئی ہو! یہی بات تو یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم ان کی وکٹ پر کھیلو۔'' مون نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

UNHOLYALLIANCE۔ ان دونوں نے میرے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔''

''تم موقع ہی کیوں دیتی ہو۔ مجھے علم ہے کہ جملہ بازی تمہاری پرانی عادت ہے۔''

''جملہ بازی اور آوازہ کسنے میں بڑا فرق ہے۔'' کیتھی اُسے معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''کیا نوک جھونک ہو رہی ہے؟'' پیٹر اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ''یقیناً تم لوگوں نے سارا کے خلاف محاذ بنایا ہوگا۔ میں اب آ گیا ہوں۔ اس کا ساتھی اور.....'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تم نہ آتے تو بہتر ہوتا۔ ان کی شرارت تمہاری بے ہودہ شرافت سے بہر ہے!'' سارا نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''کاش تم مجھے کبھی سمجھ پاتیں۔'' پیٹر نے ماتھے سے خیالی پسینہ پونچھا۔

''تم پہلے اپنے آپ کو تو جان لو۔ سان فرانسسکو کی پتنگوں کی طرح تمہاری ڈور کئی ہاتھوں میں ہے۔''

''کیا بات کہی ہے۔'' مون مسکرائی! ''تمہارے اس ایک جملے نے پیٹر کو لاجواب کر دیا ہے۔''

جب ہم ناشتہ کر کے باہر نکلے تو دن کے دس بج رہے تھے۔ آسمان صاف تھا اور تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سمندر کی طرف سے اٹھتی ہوئی ہوا نے البتہ اس کی تمازت کو کم کر دیا تھا۔

گولڈن گیٹ برج پر جانے سے پہلے پیٹر نے شہر کا چکر لگایا۔ ڈاؤن ٹاؤن کے علاوہ شہر میں بلند و بالا عمارات نہیں تھیں۔ سرخ اینٹوں سے بنے ہوئے مکانات جو خوبصورت بھی تھے اور ان میں قدیم و جدید کا حسین امتزاج بھی تھا، شہر کے مرکز میں دکانوں کے درمیان ایک مستطیل شکل کا پارک تھا جس میں جگہ جگہ بنچ رکھے ہوئے تھے۔ ایک آرٹسٹ گٹار پر کوئی پرانا گیت گا رہا تھا۔ آنکھیں بند، بال لمبے اور شاخِ برگد کی طرح پھیلے ہوئے۔ پرانی گھسی ہوئی جین جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی، سننے والے حسبِ توفیق اسے سامنے پڑی ہوئی چادر میں سکے پھینک دیتے۔ نکل، ڈیم کوارٹر، چند نوٹ بھی نظر آئے جو سکوں کے نیچے تقریباً دبے ہوئے تھے۔ مشرقی کونے میں ایک پرانا 'COLLONIAL WARRIOR' کا مجسمہ کھڑا تھا۔ زرہ بکتر پہنے ہوئے رنگ برنگی یونیفارم اور شمشیر بکف۔

''شاہ یہ مجسمہ کیسا ہے؟'' مون نے پوچھا!

''کمالِ فن ہے۔ میں نے اس سے زیادہ خوبصورت مجسمہ آج تک نہیں دیکھا!''

''یہ مجسمہ نہیں بلکہ زندہ انسان ہے۔ جس نے میک اپ کر کے یہ روپ دھارا ہے!''

''مون تم پر بھی سارا کا اثر ہو گیا ہے۔ مبالغہ آرائی کی بھی حد ہوتی ہے!''

''یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''ان لوگوں کو سانس روکنے کی بڑی مہارت ہوتی ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ پلکیں تک نہیں جھپکاتا۔ اس کے جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوتی۔'' غالباً مون کی باتیں اس نے سن لی تھیں۔ آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں جھپکائیں، دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''یہ خوبصورت لڑکی سچ کہہ رہی ہے۔ میں مجسمہ نہیں بلکہ تملوگوں کی طرح گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہوں۔ اس پاپی پیٹ نے مجھے بہروپ دھارنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' مون نے پرس کھولا اور دو سو ڈالر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

''مائی گاڈ!'' اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی۔ ''اتنی رقم تو میں ہفتے میں نہیں کماتا۔'' اس نے قریب رکھا ہوا اپنا بیگ اٹھایا اور ہمیں الوداعی نظروں سے دیکھا۔

''سارا دن پڑا ہے تم نے ابھی سے بوریا بستر سمیٹ لیا ہے؟'' میں نے کہا۔

بولا ''قناعت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ جب دن بھر کی کمائی منٹوں میں مل جائے تو پھر مزید کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ اب میں آرام سے گھر جاؤں گا، بیئر کے دو مگ پی کر اور برگر کھا کر سو جاؤں گا۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ اس ایکٹنگ سے اعصاب پر کتنا زور پڑتا ہے۔ شام کو جب میں گھر لوٹتا ہوں تو سارا بدن چور چور ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی کام آسان نہیں۔ بظاہر آسان نظر آنے والے کام بھی بڑے مشکل ہوتے ہیں۔''

جب وہ چلا گیا تو مون نے میری طرف دیکھا ''شاہ سٹور کھل گئے ہیں کوئی چیز خریدنا پسند کرو گے؟''

''اس کی ضرورت نہیں، پہلے ہی بہت شاپنگ ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں ہمیں گولڈ گیٹ برج کی طرف چلنا چاہئے۔ یہ نا ہو کہ ہمارے پہنچتے پہنچتے سونے کے دروازے بند ہو جائیں۔''

''یہ سونے کا نہیں بلکہ خالص لوہے کا بنا ہوا ہے۔ اس قدر اسٹیل استعمال ہوا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔''

جب ہم گولڈن گیٹ برج پر پہنچے تو سورج نصف النہار پر تھا۔ صاف، سنہری اور چمکیلی دھوپ نے سارے پل کو اپنے رنگ میں رنگ ڈالا تھا۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے سونے کا ایک جال ہے جو نیلگوں سمندر کے اوپر معلق کھڑا ہے۔ اس قدر طمطراق رعب دبدبہ اور نخوت دنیا میں کسی اور پل کو نصیب نہیں ہوئی۔ ہر چند کہ سڈنی ہاربر برج بھی کوئی کم خوبصورت نہیں لیکن اگر مقابلہ کیا جائے تو اس کی کمر خم ہو جاتی ہے۔ سان فرانسسکو میں BAY BRIDGE طوالت کے لحاظ سے اس سے بھی بڑا ہے اور دنیا کے طویل ترین پلوں میں شمار ہوتا ہے لیکن اس میں بھی اتنی گریس اور گریجر نہیں ہے چونکہ پل ستونوں پر نہیں کھڑا اس لئے اس کا توازن تکونی گارڈرز اور فولادی رسوں کے ذریعے قائم کیا گیا ہے۔ جس شخص نے اس کا ڈیزائن تیار کیا اور جن لوگوں نے اس کو عملی شکل دی یقیناً داد کے مستحق ہیں۔ یہ پل نہ صرف سان فرانسسکو کی شناخت ہے بلکہ فنی مہارت کا ایک نادر اور اچھوتا شاہکار ہے۔ پل خاصا طویل اور چوڑا ہے۔ بیک وقت ہزاروں گاڑیاں اس کی چھ رویہ سڑکوں پر سے گزر سکتی ہیں۔ پل پر سے گزرتے ہوئے مجھ پر ایک نہایت دلچسپ حقیقت منکشف ہوئی..... اور وہ تھی سڈنی اور فرانسسکو کا تقابل..... میں نے ''سلگتے ساحل'' میں کینبرا اور اسلام آباد کا تقابل کیا ہے جو دو جڑواں بھائی نظر آتے ہیں۔ یہ دو شہر اس قدر ہم رنگ اور ہم روپ ہیں کہ ان پر بھی جڑواں بہنوں کا گمان ہوتا ہے۔ دونوں شہر سرسبز پہاڑیوں پر آباد ہیں جن کو سمندری پانی کے دھاگوں سے پرویا گیا ہے۔ دونوں بحرالکاہل کے کنارے پر ہیں۔ دونوں Temperate Zone میں ہیں۔ آب و ہوا معتدل اور خوشگوار ہے۔ یہاں اگر گولڈن گیٹ برج ہے تو وہاں ڈنی ہاربر برج بھی سیاحوں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ اگر آپ گولڈن گیٹ برج پر کھڑے ہو کر اپنے دائیں طرف دیکھیں تو ٹھیک پانچ میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی نظر آئے گی جس پر قلعہ ایلکٹرا ز ہے۔ جس میں امریکہ کی سب سے بڑی جیل ہے۔

جہاں خطرناک ترین مجرم رکھے جاتے ہیں۔ اس طرح اگر سڈنی ہاربر برج پر کھڑے ہو کر اپنے دائیں طرف دیکھا جائے تو قریباً اتنے ہی فاصلے پر پہاڑی پر فورٹ ڈینی سن (DENNISON) ہے جہاں کی جیل بھی اپنے آہنی ضابطوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ پتہ نہیں یہ حسن اتفاق ہے یا آسٹریلیا نے نقل ماری ہے۔ اہل آسٹریلیا امریکی کلچر اور طور طریقوں سے اس قدر متاثر ہیں کہ ہر چیز میں ان کی پیروی کرتے ہیں اور کیا خبر کہ کچھ عرصہ بعد ملکہ برطانیہ کی بجائے یہ امریکی صدر کو ہز میجسٹی کہنے لگیں۔

O

پانچ منٹوں میں ہم نے پل کراس کر لیا۔ لیکن ان پانچ منٹوں میں دنیا بدل گئی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کاروانِ بہار پلک جھپکنے میں گزر گیا ہے اور ماحول پر جاڑے نے اپنے سرد پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ وہ ہوا جو ایک سرے پر بادِ لطیف لگتی تھی دوسرے کنارے پر خاصی کثیف اور تیز ہو گئی تھی۔ سنہری دھوپ کو دبیز دھند نے نگل لیا تھا۔ تمام فضا دھواں دھواں ہو گئی تھی۔ لڑکیاں چونکہ رم لباس پہن کر نہیں آئی تھیں اس لئے کانپنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ مون کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ کچھ ایسا تاثر دے رہی تھی جیسے سردی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ میں نے اپنا کوٹ اتارا اور اسے مون کے کندھوں پر ڈال دیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے میری طرف دیکھا ''کیا تم فولاد کے بنے ہوئے ہو جو تمہیں سردی نہیں لگتی۔''

''میری خیر ہے لیکن اگر گائیڈ بیمار پڑ گیا تو پھر سفر مشکل ہو جائے گا۔''

''میں جو ہوں۔'' سارا کوٹ میں گھستے ہوئے مسکرائی۔ ''باقی ماندہ سیر میں کرا دوں گی۔''

''مس گائیڈ Misguide'' کیتھی سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمہیں بھی خاصی سردی لگ رہی ہے بہتر ہو گا کوٹ کی کسی جیب میں گھس جاؤ۔'' سارا نے اسے گھورا۔ میں نے ایک نظر سمندر پر ڈالی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی جہاز میں بیٹھے ہیں جو نیچی پرواز کرتا ہوا سمندر پر سے گزر رہا ہے۔ دبیز دھند کی وجہ سے سورج کی کرنیں ہم تک بمشکل پہنچ پا رہی تھیں۔ سرخ پل کے گارڈر بھی نیم سفید نظر آتے تھے۔ ہوا اس قدر تیز تھی کہ توازن قائم رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ سارا ماحول

بالکل طلسم ہوشربا لگتا تھا۔ نیچے سمندر کے سینے پر بے شمار بادبانی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ کشتیوں میں بیٹھے ہوئے لوگ گڑیوں کی طرح لگ رہے تھے۔ دور ہیلکٹر از کی پہاڑی کشتی نوح کی طرح متلاطم سمندر میں ڈول رہی تھی۔

جس شخص نے یہاں جیل بنانے کا سوچا وہ ضرور ہمدرد انسان ہوگا۔ وسیع و عریض ٹھاٹھیں مارتا ہوا من موجی سمندر، تیز مست ہوائیں، پہاڑ کی بلندی، ایئر کنڈیشنڈ بیرکیں اور مناسب خوراک۔ قیدی یقیناً اپنا دکھ بھول جاتے ہوں گے۔

''یہ تمہاری بھول ہے'' پیٹر کہنے لگا۔ Maximum Security Prisiop تھی۔ یہاں نہایت خطرناک مجرم لائے جاتے ہیں اور کیسا ہی اکڑفوں والا مجرم ہو چند ہی دنوں میں اس کے کس بل نکل جاتے ہیں۔ اس مہذب دور میں بھی ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ جیل حکام 'تھرڈ ڈگری میتھڈ' استعمال کرتے ہیں۔ خوراک چاہے سونے سے بنی ہوئی ہی کیوں نہ ہو بند پنجرے میں زہر لگتی ہے۔ کیا تم نے کبھی قید تنہائی کا تصور کیا ہے۔ جب انسان دیوانوں کی طرح دیوار و در کو گھورتا ہے۔ وحشت میں اپنے بال نوچتا ہے اور خود کلامی کرنے لگتا ہے۔ حیوانِ ناطق کو بات چیت کے لئے حیوانِ ناطق چاہئے۔ نہیں تو دماغ کی رگیں چٹخ جاتی ہیں اور دل کے تار ٹوٹنے لگتے ہیں!''

''یہ تم فلسفی کب سے بن گئے؟'' سارا نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ زندگی کے تلخ حقائق ہیں جنہیں کم عمری کی وجہ سے تم نہیں جان پاؤ گی'' پیٹر مسکرایا۔ ''تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے؟''

''تمہیں جو دیکھا ہے۔ اس سے بڑی تلخ حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے!'' سارا کے اس بے ساختہ جملے پر سب مسکرا دیئے۔

''کیا کسی نے جیل سے بھاگنے کی کوشش کی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ انسان کی جبلت میں ہے کہ وہ آزادی چاہتا ہے۔ کوشش تو کئی لوگوں نے کی لیکن فرار صرف چند شخص ہو سکے۔ ان کا انجام بھی کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ جیل کے چار سو شارک مچھلیوں سے بھرا ہوا سمندر

ہے۔ بغیر کسی کشتی کے اسے عبور کرنا ناممکن ہے۔ سمندری شارک انسان کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو باز چڑیوں کے ساتھ کرتا ہے۔"

"کیا تم نے کبھی مچھلی دیکھی ہے؟" پیٹر نے سارا کی طرف دیکھا۔

"کاش میں شارک ہوتی اور تم ایلکٹر از کے بھگوڑے، بدنام مجرم۔ پھر دیکھتے کھلے سمندر میں تمہارا کیا حشر کرتی۔"

"دل کا خون تو تم نے یہاں ہی کر ڈالا ہے جسم کا کیا ہے ہوا ہوا..... نہ ہوا نہ ہوا۔"

"شاہ! تمہارے ملک کی جیلیں کیسی ہیں۔ وہاں کس قسم کے مجرم رکھے جاتے ہیں؟" مون پوچھنے لگی۔

اب میں اسے کیا بتاتا کہ ہمارے ملک کی جیلیں کس قسم کی ہوتی ہیں۔ اور وہاں مجرموں سے کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ ایک اعتبار سے ہماری جیلیں بھی ایئر کنڈیشنڈ ہیں۔ بادِ صرصر چلے یا بادِ سموم، بلا کی گرمی پڑ رہی ہو یا غضب کا جاڑا، قیدیوں کو آہنی سلاخوں کے پیچھے سخت زمین پر سونا پڑتا ہے۔ گرمیوں میں سخت گرم ہوا اور سردیوں میں ہڈیوں میں اترتا ہوا پالا۔ کھانا اس قدر مزیدار کہ اس میں اور ہسپتال میں بس ایک جست کا فاصلہ ہوتا ہے۔ یعنی ادھ جلی ہوئی روٹیاں اور اَن گلی دال کھائی، پیٹ میں مروڑ اٹھا اور 28 نمبر کی شیشی میں پڑی ہوئی لال دوا پیئے ہسپتال پہنچ گئے۔ ہسپتال پہنچنے کے لئے بیماری سے زیادہ جیب پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ ایوب خان کے زمانے میں کسی شاعر نے سچ ہی لکھا تھا کہ "اپنے خرچ پر لوگ قید ہیں تیرے راج میں۔" ہمارے ملک میں تین قسم کے قیدی جیل میں جاتے ہیں۔ ایک وہ جو پیشہ ور مجرم ہوتے ہیں یا بنا دیئے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جن سے وقتی اشتعال میں جرم سرزد ہو جاتا ہے یا اپنے کسی عزیز کے گناہوں کی پاداش میں وہ بھی دھر لئے جاتے ہیں۔ تیسری قسم البتہ خاص قیدیوں کی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کوئی خاص جرم تو نہیں کرتے لیکن جیل میں جانا ان کی مجبوری ہوتی ہے۔ یہ سیاسی قیدی ہوتے ہیں۔ وطن عزیز میں یہ بڑی اچھی روایت رہی ہے کہ ایوانِ اقتدار سے لوگ سیدھے جیل یاترا کرتے ہیں اور پابند سلاسل لوگ ان کے عشرت کدوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ عمل ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ جاری رہتا

ہے۔یعنی ہر شخص اپنی باری پر ٹل لگاتا ہے اور اپنی باری پر ''جھرتا'' ہے۔ویسے بھی وقتی قید ایک سیاستدان کی مجبوری ہوتی ہے۔ جب ان کی شہرت کا آفتاب گہناتا ہے تو چند دن کی قید اسے دوبارہ نصف النہار پر لے آتی ہے۔ اگر چھٹ گئے تو ہم خرما وہم ثواب۔لیکن اگر کسی وجہ سے تاخیر ہوگئی تو پھر ذیابیطس، اختلاجِ قلب، ہائی بلڈ پریشر۔ یہ وہ بیماریاں ہیں جو ہر اچھے سیاستدان سے پیدائشکے وقت ہی چمٹ جاتی ہیں..... میں اسے کیا جواب دیتا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، دیر ہوگئی ہے اب ہمیں چلنا چاہئے۔

O

گھر جانے سے پہلے پیٹر ہمیں نیشنل پارک لے گیا۔ ایک نہایت وسیع وعریض پارک جہاں نفاست سے کٹی ہوئی گھاس بالکل سبز مخملیں قالین لگتی تھی۔ امریکیوں نے دیگر چیزوں کی طرح گھاس اور درخت اگانے میں بھی جدت پیدا کی ہے۔ گھاس اگاتے کہیں اور ہیں اور لگاتے کسی اور جگہ پر ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے یہاں ٹینٹ سروس والے خشک دھرتی کو قالینوں سے ڈھک دیتے ہیں۔ اسی طرح پورے قد آور درخت بھی جڑوں سمیت اکھاڑ لئے جاتے ہیں۔ لاس ویگاس کی طرح اولمپک کے موقع پر لاس اینجلس میں بھی کئی غیر سایہ دار سڑکوں پر ان کی چھتری تان دی گئی تھی۔

پارک میں پھول اس قدر اور اتنے رنگوں میں کھلے تھے کہ قوسِ قزح ان کی خوشہ چین لگتی تھی۔ آٹھ قسم کے گلاب تھے لال، گلابی، عنابی، نیلے، پیلے، کالے۔ گلاب تو کئی جگہ پر لگے دیکھے تھے لیکن ان رنگوں کے امتزاج سے کئی نئے رنگ پیدا کئے گئے تھے۔ نیلے رنگ کو سرخ میں مدغم کیا گیا تھا۔ پیلے میں کالے کی ملاوٹ تھی۔ بعض ایسے پھول بھی تھے جنہیں دیکھ کر باقاعدہ غور وفکر کرنا پڑتا تھا کہ وہ کس رنگ کا ہے یا کون سے رنگوں سے ان کے تانے بانے بنے گئے تھے.....

ان نوزائیدہ پودوں اور درختوں کے ساتھ ساتھ ایسے بزرگ صورت درخت بھی تھے جن کی عمر نئے امریکہ کی عمر سے کہیں زیادہ تھی۔ سینکڑوں برس سے یہ اس جہانِ خراب کو دیکھ رہے تھے۔ ایک اعتبار سے سارے امریکہ کی تاریخ ان کے سینے میں دفن تھی۔ ان کے تنے اگر ثریا سے سرگرمِ سخن تھے تو ٹہنیاں دھرتی کو چھو رہی تھیں۔ ہر درخت پر اس کی عمر، قسم اور تاریخ لکھی تھی۔ امریکن ان کی پوجا تو نہیں کرتے لیکن

ان کا احترام دیوتاؤں کی طرح کیا جاتا ہے۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے مالیوں کے علاوہ بانٹنی کے ماہرین کی ٹیمیں مامور ہوتی ہیں۔ درخت کا کوئی پتا وقت سے پہلے زرد ہو جائے یا شاخ جھک جائے تو یہ اس کو اُسی تشویش سے دیکھتے ہیں جیسے کوئی ڈاکٹر مریض کو دیکھتا ہے۔ اخباروں میں مضامین چھپنا شروع ہو جاتے ہیں۔ تحفظ ماحول کی انجمنیں مختلف سطح پر احتجاج کرتی ہیں۔

مغرب کے پارکوں کی ایک اور خصوصیت قومی ہیروز کے وہ مجسمے ہیں جو جگہ جگہ نصب ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف فن سنگ تراشی کا بہترین شاہکار ہیں بلکہ مجسم تاریخ بھی ہیں۔ زندہ قومیں اپنے محسنوں کو نہیں بھولتیں۔ وہ شہداء جنہوں نے مادرِ وطن کے لئے جان کا نذرانہ پیش کیا، وہ سائنسدان جنہوں نے دکھی انسانیت کے لئے موثر دوائیں بنائیں، وہ شاعر اور ادیب جنہوں نے آزادی اور محبت کے گیت گائے۔ فرانس سے مجسمۂ آزادی کس طرح امریکہ پہنچا ہوگا اور اسے نصب کرنے میں کتنی محنت اور وقت لگا ہوگا، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے جدوجہد کی ہو اور آزادی کی قیمت ادا کی ہو۔

سبزہ و آب و گل و گلزار جب ایک جگہ یکجا ہو جائیں تو اس ماحول میں روح کی ساری کثافت دھل جاتی ہے۔ ایک عجیب طرح کا احساس پیدا ہوتا ہے اور رنگ و نور کی لہریں سارے وجود کا طواف کرتی ہیں۔ ہم کافی دیر سبز گھاس پر بیٹھے رہے۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو دماغ میں سرایت کرتی رہی۔ فواروں سے ترل ترل گرتے ہوئے پانی کی موسیقی جسم کو لوریاں دیتی رہی۔ سنہری پرندے ہمارے اردگرد رقص کرتے رہے۔ بے خوف..... بے خطر۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمین میں

''یہ ڈرتے کیوں نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید آزاد قوموں کی ہر چیز آزاد ہوتی ہے۔ کھیل کے میدان میں جتنے تماشائی ہوتے ہیں اتنے ہی پرندے نظر آتے ہیں Seagulls جنہیں انسان دوستی گہرے سمندروں سے کھینچ لاتی ہے۔ ہمارے بزرجمہر کہتے ہیں کہ اہل مغرب کو اس منزل تک پہنچتے پہنچتے بہت وقت لگا ہمیں بھی اتنا ہی وقت چاہئے۔ وہ وقت ہے کہاں؟ وقت رینگ نہیں رہا۔ سرپٹ دوڑ رہا ہے، پرواز کر رہا ہے۔ اس کے بے رحم دور میں مہلت

نہیں ملتی..... سفر خاصا طویل بھی ہے اور دشوار بھی۔ تھکن تو درکنار احساسِ تھکن بھی دشواریاں پیدا کر سکتا ہے۔

لنچ ہم نے پارک ہی میں کیا۔ برگر اور کافی۔ پیٹر اور سارا قریبی ریسٹورنٹ سے پیک کروا کے لائے۔ سارا سامان پیٹر نے دونوں ہاتھوں میں اٹھا رکھا تھا۔ کافی کی وجہ سے وہ قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا۔ سارا بجائے اس کا ہاتھ بٹانے کے الٹے اس ڈانٹ رہی تھی۔ جلدی کیوں نہیں چلتے..... ''ہری اپ'' ''کیا ابھی سے ٹانگیں جواب دے گئی ہیں آگے چل کر کیا کرو گے۔'' پیٹر نے زہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔

''بجائے ہاتھ بٹانے کے الٹا سرزنش کر رہی ہو۔''

''تمہاری آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔'' کیتھی مسکرائی۔

''اگر خدانخواستہ شادی کر بیٹھے تو ساری عمر پچھتاؤ گے۔ یہ تم سے اتنا کام کروائے گی جتنا شاہ کے ملک میں گدھوں سے کروایا جاتا ہے۔''

مجھے ایک دم بہت پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ میں قلات میں اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ ایک شام میر قادر بخش زہری کا داماد کے ڈی بلوچ میرے گھر آیا۔ وہ خاص پریشان اور گھبرایا گھبرایا لگتا تھا۔ میرے استفسار پر کہنے لگا ''شاہ صاحب میری مدد کریں، میری زندگی اور موت میں ایک جست کا فاصلہ رہ گیا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا ''میرا اپنے سسر سے کچھ لین دین کا جھگڑا ہے اور میرے سالے نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر دو دن میں رقم ادا نہ کی تو وہ مجھے مار دے گا۔''

''لیکن تم تو اس گھر کے داماد ہو۔''

''اے سی صاحب! آپ ہمارے رسم و رواج کو نہیں جانتے۔ جب داماد گھر آ جائے تو بلوچ اپنا گدھا بیچ دیتا ہے'' وہ ڈکرایا۔

جب میں نے انہیں یہ واقعہ سنایا تو سب مسکرا دیئے۔

پیٹر کہنے لگا ''شاہ مجھے اس کی جتنا نہیں ہے کیونکہ یہ بڑی بھولی ہے، بیچاری گدھے اور گھوڑے تک میں تمیز نہیں کر سکتی۔''

سارا تنک کر بولی ''گھر داماد آنے پر بلوچ گدھا بیچ دیتا ہے لیکن گدھے پر بیٹی کی شادی تو نہیں کرتا۔''

بات چونکہ لطیف پیرائے کے اظہار سے باہر نکل رہی تھی اس لئے مون مداخلت کرتے ہوئے بولی ''اب بس کرو۔ ہنسی مزاح بھی ایک حد تک خوشگوار ہوتا ہے۔ کس قدر خوبصورت ماحول ہے جس سے تم پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو رہے۔ سبزے کے اس وسیع سمندر پر پڑتی ہوئی سنہری کرنیں کتنی خوبصورت لگ رہی ہیں۔ زمرد اور سونے کا اس قدر حسین امتزاج دنیا کا کوئی مصور یا نقاش نہیں بنا سکتا۔'' مون سچ کہہ رہی تھی۔ جب دنیا میں خوبصورت مناظر پر مبنی پینٹنگ کی نمائش ہوتی ہے تو لوگ مصوروں کو کھل کر داد دیتے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں میں نیلام ہو جاتی ہیں۔ ان کی تعریف میں رائٹرز زمین آسمان کیقلابے ملا دیتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ وہ نظارہ فراہم کس نے کیا ہے۔ خالق کائنات نے! جو مصورت بھی ہے، منظر بھی ہے اور ناظر بھی!.....

گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ چونکہ اگلے دن سیکرے مینو اور لیک طاعو جتا تھا اس لئے میں نے تجویز دی کہ ڈنر سے اجتناب کیا جائے اور جلد سو جانا چاہئے تا کہ اگلے دن تازہ دم ہو کر سفر کا آغاز کر سکیں۔

سارا مچل گئی۔ کہنے لگی ''اس قدر جلد سو جانے میں کیا تک ہے۔ جب آدمی چھٹیاں منا رہا ہو تو پھر ہر لمحے کا رس نچوڑنا چاہئے۔ اگر آرام کرنا ہی مقصود ہو تو پھر گھر سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہوتی۔'' اس نے تجویز دی کہ برج کھیلی جائے۔

ہر چند کہ برج بہت دلچسپ کھیل ہے اور تاش کے باون پتوں سے کھیلا جانے والا شاید یہ واحد کھیل ہے جس پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس میں جیتنے کے لئے قسمت کے ساتھ مہارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جو شخص جتنا اچھا پلیئر ہو گا اس کی اتنی ہی عزت ہو گی۔ جرنیل، سیاستدان، بزنس مین، سبھی اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک بڑی خرابی ہے اچھا پلیئر اپنے کمزور ساتھی کو ضرور

ڈانٹے گا، ناراض ہوگا اور اس طرح بدمزگی کا امکان ہر وقت رہتا ہے۔ مگران میں کسٹم انسپکٹر سلیم اپنے باس اسسٹنٹ کلکٹر کسٹم احمد حسین شاہ صاحب کو غلط کھیل پر اکثر ڈانٹ دیتا تھا۔ ''سر! آپ نے کیا حماقت کی ہے۔ سر! اس طرح تو کوئی طفل مکتب بھی نہیں کھیلتا۔'' ''آئی ایم سوری'' کہہ کر شاہ صاحب اپنی خجالت چھپا جاتے۔ اسی وجہ سے میں نے یہ کھیل چھوڑ دیا تھا۔ میں نے معذرت کر لی اور کمرے میں چلا آیا۔ تھکن کی وجہ سے نیند نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا اور میں جلد ہی سو گیا۔

میں گہری نیند سو رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہوئی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ خواب دیکھ رہا ہوں لیکن جب وقفے وقفے سے تین چار بار دروازہ کھٹکھٹایا گیا تو میں نے بادل نخواستہ آنکھیں کھول دیں۔ گھڑی دیکھی تو چار بج رہے تھے۔ اس سے کون آیا ہے مجھے قدرے حیرانی ہوئی۔ پھر گمان گزرا کہ ضرور سارا نے کوئی شرارت کی ہوگی۔ وہ مجھے چھوڑ کسی کو بھی زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو مجھے نہایت خوشگوار حیرت ہوئی۔ باہر مون کھڑی تھی۔

''مون! تم اور اس وقت؟ خیریت تو ہے؟''

کہنے لگی ''تمہیں قبل از وقت جگانے پر معذرت خواہ ہوں نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوچا تمہارے ساتھ آج سمندر کی سیر کی جائے۔ ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے طلوع کا منظر نہیں دیکھا۔''

''تو کیا لاس اینجلس میں سورج نہیں نکلتا؟''

''نکلتا ہے لیکن سموگ کی وجہ سے پوری طرح روشن نہیں ہوتا۔ بیورلے ہلز پر جب لوگ جاگتے ہیں تو سورج اکثر نصف النہار پر ہوتا ہے۔ چڑھے ہوئے سورج اور نیلگوں سمندر سے ابھرتے ہوئے آفتاب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہی سورج جس کی کرنیں دن کو چبھتی ہیں صبح کے وقت جسم اور روح کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی ہیں۔ تم اس اعتبار سے بڑے خوش قسمت ہو کہ ہر صبح طلوع کا منظر دیکھتے ہو۔ ہمیں تو یہ نعمت کبھی کبھی میسر ہوتی ہے۔''

''بڑی حیران کن بات ہے کو جو نعمت ہر شخص کو ہر روم میسر آ سکتی ہے لوگ اس سے استفادہ نہیں کرتے۔ رہی میری خوش قسمتی کی بات تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے خورشید قبل از وقت طلوع ہو گیا ہو اور

اس کی نورانی کرنوں سے روح ہلکورے لے رہی ہو۔"

وہ مسکرائی۔ "چلو اب چلتے ہیں۔ طلوع سے قبل ہمیں سمندر تک پہنچنا ہے"۔

"لیکن ابھی تو صبح کاذب ہے۔ سمندر تک نصف گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ کیا اس سے گھر سے نکلنا مناسب ہوگا؟

بولی "ہر چند کہ جرائم یہاں بھی ہوتے ہیں لیکن یہ علاقہ نیویارک یا شکاگو کی طرح مادر پدر آزاد نہیں ہے۔ پھر تم جو ساتھ ہو"۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

عورت چاہے کتنی ہی ایڈوانس معاشرے کی کیوں نہ ہو اسے مرد کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر چند کہ کافی حد تک یہ نفسیاتی تسلی ہوتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو ہماری زندگی کی اکثر الجھنیں نفسیاتی ہوتی ہیں۔ تحفظ سے زیادہ احساس تحفظ اہم ہوتا ہے۔

ہم گھر سے نکلے تو خاصا اندھیرا تھا۔ خنکی بھی معمول سے زیادہ تھی۔ برقی قمقموں کی زرد روشنی اندھیرے کے سینے میں جذب ہو رہی تھی۔ سمندر سے اٹھتی ہوئی نم آلود ہوائیں پہاڑی پر براہ راست یلغار کر رہی تھیں۔ چاروں طرف کھلے ہوئے پھول تو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ان کی بھینی بھینی خوشبو نتھنوں میں سرایت کر رہی تھی۔

"کس قدر عطر بیز ہوائیں ہیں۔ کتنا رومانوی ماحول ہے۔ کیسا حسین ساتھ ہے۔ قدرت کے ان عطیات پر ہماری توجہ نہیں جاتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان ساری زندگی کسی ایک نعمت کا بدلہ بھی نہیں چکا سکتا"۔

بولی "یہ درست ہے لیکن ناشکرا پن بھی شاید انسان کی سرشت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ وہ کسی حال میں بھی خوش نہیں رہتا۔ کسی صورت میں بھی قناعت نہیں کرتا۔ کبھی اپنی سطح پر یا اپنے سے نیچے نہیں دیکھتا۔ اوپر ہی اوپر نگاہیں دوڑاتا ہے۔ نتیجہ فرسٹیشن کی شکل میں نکلتا ہے"۔ مون نے ایک ایسی حقیقت کی نشاندہی کی تھی جس سے اکثر معاشرے دوچار ہیں۔ انسان خوابوں کے حصار سے باہر نہیں نکلنا چاہتا اور حقائق کا سامنا کرنے سے حتی الوسع گریز کرتا ہے۔

چلتے چلتے مون نے ایک بار پھر میرا ہاتھ تھام لیا۔ کہنے لگی ''اترائی اس قدر عمودی ہے اور اندھیرا اتنا گہرا کہ اگر میں ٹھوکر کھا کر گر گئی اور میرے پاؤں میں موچ آ گئی تو تمہیں مجھے میل بھر اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔ اب یہ نہ کہنا کہ پھول کا وزن ہی کتنا ہوتا ہے''۔ اس نے شریر نظروں سے مجھے دیکھا۔

''تم کبھی گر نہیں سکتیں۔ یہ بات میں اپنے مشاہدے کے زور پر وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ جنہیں ٹھوکر کھانی ہوتی ہے انہیں لاکھ سہارے بھی نہیں بچا سکتے''۔

''اتنی جلدی رائے قائم کر لینا اچھا نہیں ہوتا!''

''پہلے اتنی جلدی شاید کبھی رائے قائم نہیں کی.....''

بولی، ''میں خود بھی حیران ہوتی ہوں۔ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں کر ہو گیا ہے۔ لوگ برسوں کی شناسائی کے بعد بھی اجنبی رہتے ہیں!''

میں نے کہا ''سفر کی طوالت انسان کو تھکا دیتی ہے اور سفر میں قیام کا قائل نہیں ہوں۔ لیکن آج ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے سات سمندروں کا پانی بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو گیا ہو اور میں ایک ایسے نخلستان میں داخل ہو گیا ہوں جہاں ہر جگہ پھول کھلے ہوں، چار سو رنگ برنگی تتلیاں پرواز کر رہی ہوں، کوئل کی کوکو میں ایک پیغام ہو ایک سندیسہ ہو!''

''تو گویا منزل پر پہنچ گئے ہو؟'' اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔

''منزل دکھائی تو دے رہی ہے لیکن ایل اے کی سموگ اسے دھندلا دیتی ہے''

''انسان کو ڈھلمل یقین نہیں ہونا چاہئے''۔

''یہ تو زندگی کا المیہ ہے'' میں نے اس کے ہاتھوں کی تپش محسوس کرتے ہوئے کہا ''بعض لوگ سرگشتہ خمار رسوم و قیود ہوتے ہیں۔ سات سمندر پھلانگنے والے بعض اوقات گھر کی دہلیز بھی پار نہیں کر سکتے''۔

بولی ''اہل مشرق کو سمجھنا مشکل ہے۔ کبھی آگ کی طرح گرم ہوتے ہیں تو کبھی برف کی طرح سرد اور بے حس!''

''یہی تو زندگی کا المیہ ہے سمندر ایک ہوتا ہے لیکن تہ آب کئی روئیں چل رہی ہوتی ہیں''۔ کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔ ہم چپ چاپ چلتے رہے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کہنے کیلئے باقی کچھ نہ رہ گیا ہو۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ صرف قدموں کی چاپ اور ہوا کا شور سنائی دے رہا تھا۔ ''مون! کوئی بات کرو۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سیر کیلئے نہیں چوری کی غرض سے نکلے ہوں''۔ میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''اور وہ چوری پکڑی گئی ہو'' اس کے ہونٹوں پر ایک سوگوار مسکراہٹ ابھری۔ ''بیورلے ہلز بھی ایک بہت بڑی سماجی دہلیز ہے۔ ایک ایسی دہلیز جسے بے پناہ حسن اور دولت کے باوجود میری ماں پار نہیں کر سکتی۔ لیکن کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں تو اب رکاوٹوں کو پار کرنا ہی پڑتا ہے''۔

''مجھے بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ تم نے کوئی بوائے فرینڈ نہیں بنایا!''

''شاہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے کئی دوست ہیں لیکن صرف دوست ہیں۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی حیا کی لہر ابھری۔ آج تک کوئی ایسا دوست نہیں ملا جس کی آواز نے دل کے دروازے پر دستک دی ہو''۔

''وہ بڑے خوش نصیب ہوں گے جنہیں تمہاری پل دو پل کی رفاقت نصیب ہوئی ہوگی''۔

بولی ''مجھے خوش کرنے کیلئے اب یہ نہ کہنا کہ تم بھی ان میں شامل ہو''۔

''یقیناً۔ تم نے میرے ہونٹوں پر آئی ہوئی بات چھین لی ہے۔ کسی شاعر نے کہا تھا کہ سایہ دیوار یار میں بیٹھا ہوا شخص شاہوں سے کم نہیں ہوتا۔ اور جب دوست سائے کی طرح ساتھ ساتھ چلے تو پھر وہی شخص مقدر کا سکندر ہوتا ہے''۔

''بغیر اقلیم کے سکندری کا کیا فائدہ ہے''۔

''یادیں کبھی نہیں مرتیں۔ جب لمحے امر ہو جائیں تو پھر مادی سہاروں کی ضرورت نہیں رہتی''۔

ہمیں چلتے چلتے کافی دیر ہوگئی تھی لیکن سمندر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اندھیرے میں غالباً غلط موڑ کاٹ گئے تھے۔ عمودی سڑک نسبتاً ہموار ہوگئی تھی۔ ہم راستہ بھول گئے تھے۔ مجھے قدرے پریشانی لاحق ہوئی۔ راستہ بھولنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ اگر دیر ہوگئی تو مون کی معصوم سی خواہش پوری نہ ہو سکے گی۔ وہ

شاہ خاور کی سنہری کرنوں کو نیلگوں سمندر کے سینے سے ابھرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ سنہری اور نیلے رنگ کی آمیزش سے بڑے عجیب سے رنگ بنتے ہیں..... ایسے رنگ جن کیلئے غالباً آج تک کوئی نام تجویز نہیں ہوا۔ میں انہیں خیالات میں غلطاں تھا کہ لیمپ پوسٹ کی روشنی میں میلا کچیلا لباس پہنے ہوئے ایک نیگرو نظر آیا۔ میل کی وجہ سے اس کا لباس بدن کے ساتھ چپک گیا تھا۔ لمبے اور کھردرے بال کسی جانور کا گھونسلہ نظر آرہے تھے۔ چھوٹی آنکھیں جو مزید دھنس گئی تھیں..... میں اس کے قریب گیا اور سمندر کا راستہ پوچھا۔ اس نے مدہوش نظروں سے ہمیں دیکھا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولا "I Will charge it"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرات ہو کر مون کی طرف دیکھا۔ راستہ بتانے کا معاوضہ وصول کرتا ہے۔

"یہ منشیات کا عادی ہے۔ اس کا نشہ اکھڑ رہا ہے اسے ہیروئن کیلئے رقم چاہئے۔ بھیک ملے یا چوری کرنی پڑے!" یہ کہہ کر اس نے پانچ ڈالر کا نوٹ اس کی طرف پھینک دیا۔

"Thank you buds" حبشی کی آنکھیں فرط مسرت سے پھیل گئیں۔ آج کا دن آرام سے گزر جائے گا۔ آپ سامنے والا سگنل کراس کر کے بائیں ہاتھ مڑ جائیں اس کے بعد فسٹ ٹرن رائٹ And you cant miss۔ ہم مزید کچھ بات کئے آگے بڑھ گئے۔

"کس قدر برا نشہ ہے۔ قسطوں میں موت۔ آدمی قطرہ قطرہ پگھلتا ہے' ریزہ ریزہ بکھرتا ہے۔ موت برحق ہے لیکن جب یہ رینگنا شروع کر دے تو بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ دل پسلیوں سے گھڑی کے پنڈولم کی طرح ٹکراتا ہے اور سینے کی دھونکنی سے نکلتی ہوئی ہر سانس دشنہ رقیب لگتی ہے۔ میرے لہجے میں تاسف تھا۔

"یہ موت تم لوگ برآمد کرتے ہو"۔ مون کے لہجے میں بلا کا طنز تھا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ اس نے امریکہ کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ اس کی روک تھام کیلئے جو بجٹ مختص کیا جاتا ہے وہ تمہارے قومی بجٹ سے یقیناً زیادہ ہوگا....."

"یہ ایک تاریخی عمل ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ ہمیں ان نشوں کی لت مغربی

آقاؤں نے ڈالی تھی آج جب ان کا رخ ان کی طرف مڑا ہے تو اخلاقیات کا ہر زریں اصول انہیں یاد آ گیا ہے"۔

کہنے لگی "یا ک غلطی دوسری کا جواز نہیں بن سکتی۔ اگر استعماریت کی خاطر چند طالع آزماؤں نے یہ نسخہ استعمال بھی کیا تھا تو اس کی سزا آنے والی نسلوں کو نہیں ملنی چاہئے....."

"دراصل تاریخ کے دھارے جب بہتے ہیں تو کوئی اخلاقی بند انہیں روک نہیں سکتا۔ یقین کر وہم لوگ بھی اسی قدر پریشان ہیں جتنی تشویش تمہیں لاحق ہے۔ لیکن حرص و آز کے سمندر میں کشتیاں چھوڑ سفینے ڈوب جاتے ہیں"۔

"تو کیا تمہارے ملک میں بھی لوگوں کو اس کی لت پڑ گئی ہے؟"

"ہاں! بدقسمتی سے یہ آکاس بیل کی طرح دن بدن بڑھ رہی ہے۔ تمہارے ہاں تو پھر علاج معالجے کی سہولتیں میسر ہیں، وہاں تو یہ بھی نہیں ہوتا"۔

بولی "لوگوں کو اس کی تباہ کاریوں سے آگاہ کرنا ضروری ہے"۔

"بہت!" میں نے تائید کی۔ "اگر اس کا سدباب نہ کیا گیا تو پھر کسی ایٹم بم کی ضرورت نہیں رہے گی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ آج سے بیس پچیس سال قبل لوگوں کو بھی علم نہیں تھا کہ اس قدر مضر صحت اور جان لیوا نشہ تیار کر لیا گیا ہے۔ لفظ ہیروئن سے صرف اس کا فرادا کا تصور ابھرتا تھا جو پردہ سکرین پر ناچ گا کر روح کو برماتی اور دلوں کو گرماتی تھی....."

مسکرا کر بولی "تم نے الفاظ سے چسکا لینا شروع کر دیا ہے۔ سچ سچ بتاؤ کسی فلم سفار کو دل تو نہیں دے بیٹھے؟"

"قسم کھا کر بتاؤں یا ویسے ہی یقین کر لوگی"۔

"اس سے آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ دیکھتے نہیں تاریکی صبح صادق میں ڈھل گئی ہے اور وہ سامنے سمندر نظر آ رہا ہے"۔ اس نے بچوں کی طرح مچل کر میری طرف دیکھا۔ واقعی ہم سمندر کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اکا دکا لوگ سیر کر رہے تھے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے سمندر ابھی ابھی خواب سے بیدار ہوا

ہو۔ ہم ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور نگاہیں مشرقی حصے پر مرکوز ہو گئیں۔

''سورج کب نکلے گا؟'' مون مچل گئی۔ ''میں مزید انتظار نہیں کر سکتی''۔

''وہ دیکھو! سامنے! انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئی ہیں''۔

بڑا عجیب منظر تھا۔ سورج کی ایک ڈری ڈری سہمی سہمی کرن نے وسیع نیلگوں سمندر کے آخری کونے سے جھانکا اور پھر روپوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد چند چنچل سہیلیوں کے جلو میں پھر نمودار ہوئی۔ یہ تاک جھانک کچھ دیر چلتی رہی۔ پھر ایک دم ایسے محسوس ہوا جیسے بحرالکاہل بیدار ہو گیا ہو۔ لاکھوں کروڑوں میگاواٹ کے بلب جل اٹھے۔ روشنی چار سو پھیل گئی۔ باادب! باملاحظہ! ہوشیار! شاہ خاور کی سواری آ رہی ہے۔ ایک Seagull چہکا۔ بارہ گھوڑوں کی رتھ نظر نہ آئی لیکن زیوس دیوتا ایک مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ہر طرف زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک عجیب سی مسرت' آسودگی اور طمانیت اس کے چہرے پر بکھر گئی۔

"Wonderful-Fantastic" مون کو اپنے جذبات کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ ''شاہ یقین کرو گے کہ میں نے یہ خوبصورت منظر پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ وہ لوگ کس قدر بدقسمت ہیں جو سحر خیز نہیں ہیں۔ اگر کسی نے کیلیفورنیا کا اصل روپ دیکھنا ہو تو اسے اِدھر اُدھر جانے کی ضرورت نہیں۔ بس یہیں کھڑا ہو کر چند لمحوں میں اس کا سارا حسن سمیٹ سکتا ہے.....''

ہم کافی دیر بیٹھے رہے۔ سورج کی نرم، ملائم اور سنہری کرنوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ میں نے اچانک گھڑی دیکھی تو نو بج رہے تھے۔ ''اب چلنا چاہئے۔'' میں نے مون کا کندھا تھپتھپایا۔ دس بجے ہمیں جانا ہے اور میرے خیال میں سب انتظار کر رہے ہوں گے اور ہو سکتا ہے قدرے پریشان بھی ہوں۔ ہم بھی تو بغیر بتائے ہوئے اتنی دور نکل آئے ہیں.....''

''واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔'' مون نے میری طرف دیکھا۔ ''دل کرتا ہے ساری عمر یہ نظارہ دیکھتے دیکھتے بیت جائے۔ کیلیفورنیا کا گولڈرش بہت مشہور ہے۔ سارے یورپ سے لوگ امیر بننے کے چکر میں یہاں پہنچے۔ دور دراز علاقوں میں خاک چھانتے رہے۔ کچھ کامیاب ہوئے اور دوسرے ناکامی کی

رسوائیاں لے کر واپس چلے گئے۔ لیکن اس خالص سونے کی طرف کسی کی نگاہ نہ پڑی جو کبھی ختم نہیں ہوتا اور جسے انسان جتنا چاہے حسب ظرف لوٹ سکتا ہے!"

"اس کے لئے بھی تگ و دو ضروری ہے" میں نے کہا۔ "یہ تلاش باہر نہیں بلکہ اپنے من کے اندر کرنی پڑتی ہے۔ جمالیاتی حسیں مادیت کیبوجھ تلے دبی رہتی ہیں جب تک وہ بیدار نہ ہوں اس سونے کی اہمیت کا احساس اجاگر نہیں ہوتا۔"

لوگوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ سارا سمندر جاگ اٹھا تھا۔ اِکا دُکا بادبانی کشتیاں بھی سمندر کے سینے پر اٹھلانے لگی تھیں۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ پیدل جانے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا لہٰذا ہم نے وقت بچانے کے لئے کیب پکڑی اور پندرہ منٹ میں واپس آ گئے۔ کرایہ دے کر جب ہم مکان کے مرکزی دروازے پر آئے تو ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بنے ہوئے سامنے سارا کھڑی تھی۔ پتہ نہیں وہ ناراض تھی یا چہرہ پر مصنوعی غصہ سجایا ہوا تھا، ہمیں دیکھتے ہی پھٹ پڑی۔ "کہاں گئے تھے؟ وقت دیکھا ہے۔ ٹیکسی میں سامان نہیں اتارا؟"

"کیب کے اندر جو کچھ تھا وہ باہر آ گیا ہے" مون مسکرائی۔ "لیکن تم اس قدر پریشان کیوں ہو خیریت تو ہے۔ کہیں پیٹر کے ساتھ پھر جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟"

"رات میں تمہارے کمرے میں سوئی تھی لیکن تم کہاں تھیں؟"

"وہیں جہاں تم تھیں!" مون نے اس کے گالوں کو تھپتھپایا۔ "صبح سیر کے لئے میں نے تمہیں اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس قدر گہری نیند سو رہی تھیں کہ کوئی پانچ ماہ کا بچہ بھی نہیں سوتا۔ پھر تمہارے وہ خراٹے جن کے لئے مجھے کوئی موزوں تشبیہ نہیں مل رہی....."

بولی "اس ہنسی مذاق سے میرا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو گا۔ اگر تم شاہ کو جگا سکتی تھیں تو مجھے بھی اٹھایا جا سکتا تھا۔"

"لیکن تم وہاں جا کر کرتیں بھی کیا؟" میں نے کہا۔ "اس قدر طویل واک کے بعد تو مہارے لئے سٹریچر منگوانا پڑتا۔"

''صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم لوگ اکیلے سیر کرنا چاہتے تھے۔ میری رفاقت منظور نہیں تھی۔''

''تو کل تم اور پیٹر چلے جانا۔ وہ بیچارہ بھی ایک عرصے سے تمہارے ساتھ اکیلے واک کرنے کا خواہشمند ہے۔''

''توبہ کرو!'' اس نے مون کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''میں اس کے ساتھ گھر کے لان میں سیر کرتے ہوئے بھی گھبراتی ہوں۔ گھپ اندھیرے میں اتنا لمبا سفر.....'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور ہماری طرف ایک بار پھر مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ اتنے میں پیٹر اور کیتھی بھی باہر آ گئے۔ وہ ہماری باتیں تو شاید نہ سن پائے تھے لیکن انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ سارا جھگڑ رہی ہے۔ پیٹر اس سے کہنے لگا ''جب بھی کسی پروگرام میں تاخیر ہوتی ہے تمہاری وجہ سے ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی شادی کے موقع پر بھی تم دو گھنٹے لیٹ پہنچو گی۔ اور اتنے میں پادری اور باراتی مایوس ہو کر واپس لوٹ چکے ہوں گے اور دلہا کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی۔''

''تو کیا اتنی طویل سیر میں نے کی ہے؟'' اس نے احتجاج کیا۔ ''شاید انہوں نے سیر پر اتنا وقت نہیں گزارا جتنا تم نے بحث میں ضائع کر دیا ہے۔ لیک طاءو پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی'' کیتھی کہنے لگی۔

جب ہم تیار ہو کر گھر سے نکلے تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ پیٹر نے بتایا کہ سیکرے میٹو پہنچنے کے دو راستے ہیں جو آگے چل کر آپس میں مل جاتے ہیں۔ ایک گولڈن گیٹ برج کی طرف سے جو نیپا ویلی سے ہو کر گزرتا ہے اور دوسرا بے برج کو کراس کر کے برکلے کو جاتا ہے۔ تم کون سے راستے سے جانا پسند کرو گے؟

میں نے کہا جو اچھا ہو!

بولا ''اس کا انحصار تو اپنی پسند پر ہے۔ ہو سکتا ہے جو راستہ مجھے اچھا لگے تمہیں پسند نہ ہو اور جو تمہاری پسند ہو اس کے متعلق میرے تحفظات ہوں.....

''مثلاً''

مثلاً سارا کو کوئی سیدھا راستہ پسند نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ ٹیڑھے ٹیڑھے راستوں اور پگڈنڈیوں پر چلی ہے اس لئے کبھی اس کے پاؤں میں ناکامی کی موچ آ جاتی ہے۔ تو کبھی ہمت ہار بیٹھتی ہے۔

سارا تنک کر بولی "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مجھے ہر راستہ پسند ہے بشرطیکہ وہ تمہارے گھر تک نہ پہنچتا ہو۔

اف اس قدر بیزاری! پیٹر مسکرایا' آخر اس کی کوئی وجہ تو ہوگی؟

کوئی ایک ہو تو بتاؤں ایک پورا دفتر ہے۔ اگر میں نے بیان کرنا شروع کیا شام ہو جائے گی۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ دو راستے ہیں۔ ایک شراب کی جھیل سے ہو کر جاتا ہے تو دوسرا دریائے علم و ادب سے گزرتا ہے۔ نیپا ویلی..... کیلیفورنیا کی شراب بنانے والی فیکٹریوں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ہر طرف سرخ' عنابی اور سبز انگوروں کی بیلیں ہیں جو ہر آنے جانے والے کا دامن نگاہ تھامتی ہیں۔ چار سو پھیلی ہوئی دختر زر کی بھینی بھینی خوشبو۔ انسان چھوڑ کل پرزے بھی رقص کرنے لگتے ہیں۔ پھر مفت کی شراب جو سنا ہے تمہارے ہاں بھی حلال ہوتی ہے ایسا خوبصورت منظر تم نے جیسے صوفی Non Dringers لوگوں نے کہاں دیکھا ہوا۔ دوسرا البتہ تمہارا جانا پہچانا ہوگا۔ کیونکہ علم کی شراب کی خوشبو ایک جیسی ہوتی ہے۔ برکلے کالج' جو لبرل آرٹس کا مرکز بھی ہے۔ آزاد خیالی کی ہر تحریک یہاں سے اٹھی ہے!

برکلے کا راستہ مناسب رہے گا۔ شراب کا کیا ہے۔ یہ تو ہر جگہ دستیاب ہو جاتی ہے اور پھر علم بھی تو ایک قسم کی شراب ہے جس کا الگ سرور ہے! میں نے کہا۔

کاش اس کے چند گھونٹ تم نے بھی پیئے ہوتے' پیٹر نے سارا کی طرف دیکھ کر کہا۔

پیئے ہیں تمہاری طرح تلچھٹ نہیں چکھی۔

ہم تیار ہو کر باہر آئے تو گیارہ بج رہے تھے۔ بادلوں نے سورج کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا تھا۔ سمندر سے اٹھتی ہوئی ہوائیں پہاڑی سے براہ راست ٹکرا رہی تھیں۔ بارش کے اکا دکا قطرے گرنے شروع ہو گئے۔ گاڑی رینگتی ہوئی جب پہاڑی سے نیچے اتری تو موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر جل تھل ہو گیا۔ مکانات' درخت' گھاس' ہر چیز دھل کر نکھر آئی تھی۔ پیٹر گاڑی پوری رفتار سے چلا رہا تھا کیونکہ سڑکوں پر کسی قسم کا کیچڑ نہیں تھا۔ نکاسی آب کا اس قدر عمدہ نظام تھا کہ پانی جمع نہیں ہو سکتا تھا۔ سارے شہر کا پانی دیکھتے ہی دیکھتے سمندر میں جا گرتا ہے۔ سمندر بھی ایسا جس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ ہر وقت ہل من مزید

پکارتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں دنیا کے سب سے بڑے سمندر کا نام کس منچلے نے بحرالکاہل رکھا۔ یہ بڑا ہی نہیں بلکہ گہرا بھی بہت ہے۔ بعض جگہوں پر تو اس کی گہرائی میلوں تک چلی جاتی ہے اور جب کبھی یہ جوش میں آ کر سر پٹختا ہے۔ تو ڈوب جاتے ہیں سفینے موت کی آغوش میں' بڑے سے بڑا جہاز بھی سنبھل نہیں پاتا۔ یوں لگتا ہے کہ کوئی پہلوان مگدر پھیر رہا ہے۔

بے برج کراس کرتے ہوئے احساس ہوا ہے کہ اس قدر گہرے سمندر میں اتنا طویل پل بنانا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے فنی مہارت اور زر کثیر کی ضرورت تھی جو بہر حال دستیاب ہوئی۔ پل کراس کرتے ہی برکلے آ گیا۔ برکلے کالج کی خوبی یہ ہے کہ یہ سان فرانسسکو کا حصہ بھی اور اس سے الگ بھی۔ طالب علم جہاں شہری سہولتوں سے استفادہ کرتے ہیں وہاں فطرت کے بے پناہ حسن سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔

مون کہنے لگی ''شاہ برکلے کالج کے کسی ریستوران میں کافی پیتے ہیں۔ ان چند گھنٹوں میں تم شاید پوری طرح تو لطف اندوز نہ ہوسکو لیکن یقیناً اندازہ ہو جائے گا کہ یہ درسگاہ دنیا میں اس قدر مشہور اور مقبول کیوں ہے۔ اس کی لائبریری' عمارات اور وسیع و عریض پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے لان اس کی عظمت کے امین ہیں۔ کالج لبرل آرٹس کے لئے مشہور ہے۔ آزادی اور آزاد خیالی کا جو درس یہاں پر ملتا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ویت نام کی جنگ کے خلاف پہلی آواز یہیں سے اٹھی تھیں۔ وہ صدائے احتجاج جو چار سو کو بکو پھیل گئی اور بالآخر اتنی بڑی عظیم طاقت کو رائے عامہ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

تو گویا امریکہ کی شکست کا سبب اس کے اپنے عوام تھے۔ اس میں ویت نامیوں کی عزم و ہمت اور جنگی حکمت عملی کو کوئی دخل نہیں تھا؟ میرے لہجے میں طنز کا عنصر نمایاں تھا!

میں یہ نہیں کہتی کہ ویت نامی بے جگری سے نہیں لڑے۔ وہ یقیناً بہادر قوم ہیں۔ ان کی قیادت بے لوث اور دور اندیش تھی۔ امریکہ کو شاید ان کی بردباری اور کمال فن حرب کا علم نہ تھا۔ لیکن قوت اپنی قوت کو خوب سمجھتا تھا۔ اگر جاپان جیسی عظیم طاقت دو بم گرانے پر گھٹنے ٹیک سکتی تھی تو یہ کیسے مدافعت کر سکتے تھے؟

کیا امریکہ کو جاپان پر بم گرانے پر ناز ہے؟

نہیں، پشیمانی بے حد یشمانی اور وہی تاسف ویت نام کی آزادی کی بنیادی وجہ بن گیا۔

بم نہ گرانے میں روس کا ڈر خوف بھی تو شامل تھا۔

روس کا پانی تو کیوبا کرائسس میں ٹیسٹ ہو چکا تھا۔ دراصل ویت نام پر ایٹم بم گرانے کی امریکی عوام کبھی اجازت نہ دیتے۔ یہ تو ان درسگاہوں کا کارنامہ ہے جنہوں نے رائے عامہ کو بیدار کیا۔ امریکہ کو دنیا کا پولیس مین بننے سے روکا حتیٰ کہ یہی جنگ جانس کے دوربارہ صدر منتخب نہ ہونے کی وجہ بن گئی۔ جو جنگ جیتی نہ جاسکے اسے شروع کرنے کا کیا فائدہ؟ آغاز بھی رسوائی انجام بھی رسوائی۔ لیڈر شپ کوتاہ نظرMyopic تھی۔ مون کہنے لگی۔ فرانس کا انجام ان کے سامنے تھا۔ ویت نامیوں نے ڈی ان فویں فرانسیسیوں کو یک بینی دوگوش نکال باہر کیا تھا۔ دراصل امریکی رہنما کیمونزم کے خلاف اس قدر نفرت اور حقارت رکھتے تھے کہ انجام کی پرواہ کئے بغیر جنگ کی آگ میں کود گئے۔ شاید انہوں نے Goat Bearded Presidenہو چی منہ کی جسامت اور خال وخد سے ویت نام کی طاقت کا اندازہ لگایا تھا۔

آپ لوگ برکلے سے ویت نام پہنچ گئے ہیں۔ پیٹر کہنے لگا۔

تم یقیناً اس کالج اور یہاں کے نظام تعلیم کے متعلق کچھ جاننا پسند کرو گے۔ میں نہایت اختصار کے ساتھ اس کی تاریخ پر روشنی ڈالوں گا۔

تم کیا بتا پاؤ گے۔ سارا نے اسے ٹوکا۔ تم کسی یونیورسٹی کی دہلیز تک تو پار کر نہیں سکے اور پھر یہ پراپرٹی تھوڑی ہے جس کی قیمت کا تخمینہ لگا لو گے۔

میں سارا کے اس طنز کے باوجود اس ادارے کی تاریخ ضرور بیان کروں گا۔ پیٹر مسکرایا۔ کیونکہ جب میں نے یہاں داخلہ لیا تھا تو یقیناً یہ ایل اے کے مضافات میں کھلونوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔

سارا بولی ''کسی نے درست کہا ہے کہ ہر جھوٹ کے پس پردہ کسی نہ کسی سچ کا پہلو نکلتا ہے۔ چلو اس انکشاف سے تمہاری عمر کا اندازہ تو ہوا۔

کیا تمہیں علم نہیں کہ آج کل کی نوجوان لڑکیاں پکی عمر کے مردوں کے ساتھ رومانس کرنا پسند کرتی ہیں۔!

اس کی وجہ؟

عقلمند نگاہ چہرے اور جیب پر بیک وقت پڑتی ہے۔ کھوکھلے الفاظ کے سہارے کب تک زندہ رہا جا سکتا ہے۔
میری نگاہ تو صرف تمہاری کھوپڑی پر پڑتی ہے۔ جہاں سے ناامید ہو کر لوٹ آتی ہے۔
پیٹر اب اس حسین بھڑ سے صلح کر لو نہیں تو لیک طاعو پہنچتے پہنچتے یہ تمہیں زچ کر دے گی۔
مون نے مسکرا کر اسے مشورہ دیا۔
میں تو صلح سے بھی چند قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں لیکن یہ نیک بخت موقع ہی نہیں دیتی۔ پیٹر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
تمہارے اور میرے ستارے نہیں ملتے۔ ہمارے مزاجوں میں بھی بعد المشرقین ہے۔ تم ہر چیز کو دولت کے ترازو میں تولتے ہو اور میں ٹھہری جمالیاتی ذوق کی مالک بہتر ہے کہ تم اس ہیئر ڈریسر پر ہی ڈورے ڈالتے رہو۔
کہو تو تمہیں بھی سونے کے ترازو میں تول دوں!
کیلیفورنیا کا سارا سونا ختم ہو جائے گا۔ اب کے کیتھی سے چپ نہ رہا گیا۔ اس کا وزن دیکھتے نہیں کھا کھا کر گائے بن گئی ہے۔
پیٹر نے ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی کھڑی کی۔ کہنے لگا آؤ کافی کا کپ پیتے ہیں۔ باقی باتیں کافی ٹیبل پر ہو جائیں گی۔ ریسٹورنٹ جو خاصا بڑا تھا بھرا ہوا تھا۔ مختلف ممالک اور امریکہ کی ریاستوں سے آئے ہوئے طالب علم آزمائش کام و دہن میں صرف مصروف تھے۔ ہم نے اپنی تعلیمی درسگاہوں کے کیفے ٹیریا دیکھے ہیں جہاں کان پری آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہر آواز بے ہنگم شور اور ہاؤ ہو دب جاتی ہے۔ لیکن یہاں شور نسبتاً بہت کم تھا۔ سیلف سروس کے باعث ہم نے کافی اور چکن سینڈوچ لئے اور کونے میں رکھا ہوا خالی ٹیبل سنبھال لیا۔ پہلے بھی کبھی یہاں آنے کا اتفاق ہوا ہے؟ پیٹر نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے میری طرف دیکھا۔
نہیں لیکن اس کے بارے میں سنا بہت کچھ ہے۔ ہمارے ملک کے چند حکمرانوں نے یہاں تعلیم حاصل کی! بڑی حیران کن بات ہے کہ آزادی کی اس فضا میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود تیسری دنیا کے حکمرانوں کا رویہ ہمیشہ منفی رہا ہے۔ مون سینڈوچ کی پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''انہوں نے آزادی اظہار پر ہمیشہ قدغن لگائی ہے اور اپنے مخالفین کو پابند سلاسل کیا ہے۔''

میں نے کہا'' دراصل انسان کتنا تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو جائے اس کی بنیادی وجہ فطرت نہیں بدلتی۔ ظالمانہ سرشت لباس علم سے کسی نہ کسی طور باہر نکل آتی ہے۔ جاگیردارانہ نظام کے باعث خوئے حکمرانی ان لوگوں کے خون میں رچ بس جاتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کو یہ لوگ محض شستہ انگریزی بولنے تک محدود کر دیتے ہیں اور غالباً اس قسم کے لوگ مغربی حکومتوں کو سوٹ کرتے ہیں۔ یہ لوگ حکمرانی اپنے ملک پر کرتے ہیں اور ملک کی لوٹی ہوئی دولت مغرب کے بینکوں اور لاکرز میں محفوظ کی جاتی ہے۔ وہ دولت جو عملاً ان کے کسی کام نہیں آتی ۔اس سے صرف مغربی ممالک کا کاروبار چلتا ہے۔ سینکڑوں بلین ڈالرز جو نہ تو ان سے خرچ ہو سکتے ہیں اور نہ ہی کبھی واپس لائے جا سکتے ہیں۔ اگر سوئس بینکوں اور دیگر مغربی ممالک کے بینکوں کے Assets دیکھے جائیں تو سوائے گمنام کھاتوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔ کون کہتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام ختم ہو گیا ہے، یا اب کالونیاں نہیں رہیں۔ وہی رقم جو کبھی تمہارے آباؤ اجداد لوٹ کر لاتے تھے اب خود بخود ان لٹیروں کے ذریعے یہاں پہنچ جاتی ہے.....''

''تو لوگ ایسے لوگوں کو برسر اقتدار کیوں لاتے ہیں؟ کی اپنی کمزوریوں، خامیوں اور کوتاہیوں کو دوسروں کے سر تھوپنا مناسب ہے؟''

''یقیناً نہیں۔ لیکن لوگ کیا کریں۔ جہاں جہالت ہو، غربت و افلاس نے خیمے ڈالے رکھے ہوں، مذہبی منافرت کے عفریت جبڑے کھولے کھڑے ہوں، لسانی تعصبات کی لہریں اٹھتی رہتی ہوں وہاں اجتماعی شعور بیدار ہونے میں وقت لگتا ہے۔ یہ تمہاری ایجنسیاں ہیں جو انہیں برسر اقتدار لاتی ہیں۔ جب تک یہ پتلیوں کی طرح ناچتے رہتے ہیں، قائم رہتے ہیں اور کبھی بھولے سے بھی ان کے اندر غیرت کی کوئی رمق جاگ اٹھتی ہے تو پھر ان کی رخصتی اور رسوائی میں دیر نہیں لگتی.....''

''بحث کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گئی ہے''۔ پیٹر نے سارا کی طرف دیکھا۔

''تم بھی اس میں شامل ہو جاؤ تا کہ سنجیدگی کا تاثر ختم ہو سکے۔ جب تم اس کی تاریخ بتاؤ گے تو خود بخود کسی لطیفے کا گمان ہو گا''۔

''ہاں تو شاہ! میں برکلے کالج کی تاریخ بیان کر رہا تھا'' پیٹر سارا سے اتفاق کرتے ہوئے بولا ''اس کالج کی بنیاد 1934ء میں رکھی گئی۔ یہ دراصل ایڈورڈ ہارکینس کی طرف سے ایک تحفہ تھا جو اہل کیلیفورنیا کو دیا گیا۔ ریاست میں یہ آٹھواں Residential College تھا۔ اس کیلئے مختلف نام تجویز کئے گئے لیکن بالآخر بڑی سوچ و بچار کے بعد Rev.George Berkeley کے نام پر اس کا نام رکھا گیا کیونکہ برکلے وہ شخص تھا جس نے اٹھارویں صدی میں Yale کے مالی امداد کی تھی اور اپنی زمین اس کیمپس کیلئے عطیہ میں دی تھی۔ یہ جو تم بیضوی عمارات کا Cluster دیکھ رہے ہو۔ اس کے علاوہ بھی کئی خوبصورت عمارات چار سو پھیلی ہوئی ہیں طلبہ کو رہائش اور تعلیم کی جو سہولیات یہاں میسر ہیں وہ محض چند یونیورسٹیوں کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتیں۔ ہر کمرے میں ملحقہ باتھ روم ہے۔ فریج، اوون، سنک، ایئر کنڈیشنر، کچن، مائیکرو ویو، کافی ٹیبل، خوبصورت صوفہ اور دو آرام دہ کرسیاں۔ اس کی لائبریری میں دنیا جہاں کی کتابیں موجود ہیں۔ جس طرح کسی گھر میں صاحب خانہ کی نفاست کا پتہ اس کے باتھ روم سے چلتا ہے اسی طرح کسی کالج کا علمی ماحول جاننے کیلئے اس کی لائبریری میں جانا ضروری ہے۔ محض کتابوں کا انبار لگا دینے سے لائبریری نہیں بن جاتی۔ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ کس قدر لوگ کتنے ذوق و شوق سے اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

چونکہ ذہنی ورزش کے ساتھ ساتھ جسمانی ورزش بھی ضروری ہوتی ہے اس لئے اس کا PAYNE WHITNEY GYM بھی بہت مشہور ہے۔ اتنے طلبہ غالباً چرچ نہیں جاتے جتنے یہاں ایکسرسائز کیلئے آتے ہیں۔ یہاں کے تعلیمی ماحول سینری اور 178 ایکڑ کے Wooded Campus کو دیکھنے کیلئے ہر سال ہزاروں لوگ آتے ہیں۔ سٹرابیری کے جھنڈ حد نگاہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

''پیٹر تم نے بڑے اچھوتے انداز میں اس کی خوبصورتی کی تعریف کی ہے اور اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ تم نے یہاں کچھ عرصہ گزارا ہے لیکن میں تعلیمی ماحول اور طرز تعلیم کے متعلق کچھ جاننا چاہوں گا!''

''کچھ عرصہ اس نے یہاں بطور گائیڈ گزارا ہے۔ یہ جو اس نے ہزاروں سیاحوں کا ذکر کیا ہے۔ جھوٹ سچ سنا کر ان سے پیسے بٹورتا تھا۔ کیا تمہیں علم ہے کہ ایک گائیڈ تاریخ کم بیان کرتا ہے اور اپنی چرب زبانی کے

زیادہ جوہر دکھاتا ہے؟'' سارا میری معلومات میں اضافہ کرنا چاہتی ہے۔

پیٹر نے سارا کی طرف دیکھا ''بیچ میں مت بولو۔ چلو مجھے گائیڈ کے طور پر ہی سہی بات تو مکمل کر لینے دو!''

''تو میں نے کب ٹوکا ہے۔ صرف تمہاری اصلیت بتا رہی تھی''۔

''امریکی نظام تعلیم کی سب سے بڑی خوبی پرائیویٹ اور پبلک ایجوکیشن کا حسین امتزاج ہے!''

پیٹر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ''یہ ادارے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کیلئے بڑی تگ و دو کرتے ہیں۔ انہیں خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہے۔ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کیلئے تحقیق و تفتیش ہر وقت جاری رکھتے ہیں۔ تعلیم عام کرنے کیلئے پبلک یونیورسٹیوں کا قیام ضروری تھا۔ ان کی فیس نسبتاً کم ہوتی ہے۔ جمہوریت کے پھیلاؤ اور جمہوریت کو سمجھنے کیلئے ان اداروں نے بڑا کام کیا ہے۔ جب فیڈرل گورنمنٹ نے انہیں زمین الاٹ کی تو بالواسطہ دیہی زراعت، مائننگ اور صنعت کو فروغ ملا۔ لیکن اب حالات کچھ اس نہج پر چل نکلے ہیں کہ پرائیویٹ اور پبلک کا فرق آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ پرائیویٹ یونیورسٹیوں کو ''Research'' کے نام پر فیڈرل گورنمنٹ سے گرانٹ ملتی ہے اور اسی طرح چونکہ پبلک یونیورسٹیوں کی گرانٹ دن بدن کم ہو رہی ہے لیکن نسبتاً اخراجات زیادہ ہیں۔ اس لئے حکومت کے علاوہ بھی انہیں فنڈز حاصل کرنا پڑتے ہیں!''

''برکلے کو ہی لے لو.....'' پیٹر کافی کی پیالی کو پرچ پر گھماتے ہوئے بولا ''ریاست کیلیفورنیا بجٹ کا صرف 34 فیصد حصہ ادا کرتی ہے باقی اخراجات انتظامیہ اپنے ذرائع سے پورا کرتی ہے۔ اس کے لئے لامحالہ فیسوں میں اضافہ کرنا پڑتا ہے پھر ایک بلین ڈالر کی رقم کا بندوبست کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ فیسوں میں اضافے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ غریب لوگوں اور متوسط لوگوں کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ پبلک سکولوں کے بچے یہاں داخلہ لیتے تھے اب 20 فیصد سے زائد تعداد ان طلبہ کی ہے جو پرائیویٹ سکولوں سے آتے ہیں''۔

''تو کیا فیڈرل گورنمنٹ یا وفاقی محکمہ تعلیم امداد نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''آتی ہے لیکن تم اسے ایک اعتبار سے اونٹ کے منہ میں زیرہ کہہ سکتے ہو۔ دراصل حکومت کی ترجیحات

بدل گئی ہیں۔ تمہیں شاید حیرانی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ سالانہ بجٹ میں تعلیم کی مد میں رکھی گئی رقم اس رقم سے کہیں کم ہے جو ایک Stealth Bomber کی ڈویلپمنٹ پر خرچ ہوتی ہے۔ آلات حرب میں برتری کے جنون نے تعلیم اور صحت کے بجٹ کو خاصا متاثر کیا ہے۔ پرائمری تعلیم تو یہاں ہر کوئی حاصل کرتا ہے لیکن اعلیٰ تعلیم کے مواقع دن بدن کم ہو رہے ہیں۔ ارباب اقتدار کو اس کے دوررس مضمرات کا یا تو ادراک نہیں ہے یا پھر حالات کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔

''کیا اس محرومی کو ختم نہیں کیا جا سکتا؟'' میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

''ایک علاج ڈھونڈ تو لیا گیا ہے۔ ہر چند کہ اس کے اپنے مضمرات ہیں'' اس نے سگار کا دھواں عمداً سارا کی طرف اچھالا۔

''Do not make me passive smoker'' سارا نے اسے جھاڑ پلائی۔

''کیا تمہیں اس کا اروما اچھا نہیں لگتا؟ کس قدر مست خوشبو ہے''..... وہ مسکرایا۔

''تمہیں شاید احساس نہیں کہ اس میں تمہاری سانسیں بھی شامل ہیں اس طرح یہ AROM.....TRAUMA میں بدل گیا ہے'' سارا کے اس بے ساختہ جواب پر ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا جس میں نمایاں آواز خود پیٹر کی تھی۔

''تم نے مجھے لاجواب کر دیا ہے۔ تمہاری انہیں باتوں پر تو.....'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر کہنے لگا ''ٹیکنالوجی کا انقلاب۔ طلبا کو یونیورسٹی آنے کی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑے گی۔ گھر بیٹھے بیٹھے سارا ٹیچنگ میٹری کمپیوٹر کے ذریعے پہنچ جائے گا Distance Learning ''ہم خرما و ہم ثواب'' یونیورسٹیوں کے اخراجات کم ہو جائیں گے اور طلبہ لرزہ طاری کر دینے والی فیسوں کے چنگل سے نکل جائیں گے''۔

''گویا تعلیمی درسگاہیں تجارتی اداروں میں بدل جائیں گی.....؟''

''ایک حد تک یہ درست ہے۔ طلبہ اب Advance Professional Degrees حاصل کر سکتے ہیں۔ ڈیوک سے M.B.A کی ڈگری خط و کتابت کے ذریعے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس لئے صرف دو ہفتے کیمپس میں رہنے کی شرط ہے اور پچاسی ہزار ڈالر درکار ہیں۔ اسی طرح University

of Phoeni نے جگہ جگہ شاخیں کھول دی ہیں..... ان کی دیکھا دیکھی Hercourt Brace نے بھی اسی طرح کی تعلیم عام کرنے کا اعلان کر دیا ہے.....اس قسم کے ماحول میں شہرت یافتہ یونیورسٹیاں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں!''

''لیکن تعلیم کے ساتھ اخلاقیات کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ کچھ روایات ہوتی ہیں، کچھ تاریخی تفاخر ہوتا ہے، وہ سارا ختم ہو جائے گا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے امریکہ نے ہر چیز کو دولت کے ترازو میں تولنا شروع کر دیا ہے۔ کھیلوں کی تاریخ میں پہلی مرتبہ امریکہ نے LA اولمپکس میں کچھ کمایا ہے۔ گنوایا نہیں ہے''۔ میرے لہجے میں تاسف تھا۔

''اگر تمہارا استدلال درست بھی مان لیا جائے تو عصری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انقلاب تو چشم تاریخ نے کئی دیکھے ہوں گے لیکن یہ اپنی نوعیت کا انوکھا انقلاب ہے۔ جہاں دنیا ایک ''گلوبل ولج'' میں تبدیل ہو جائے گا، ستارے گھر کی چوکھٹ کے قریب آ گئے ہوں، حال اور مستقبل کی سرحدیں غلط ملط ہونے لگیں تو وہاں موریلٹی کے بھی نئے اصول وضع کرنے پڑتے ہیں۔ تم صرف اس کے تاریک پہلو دیکھ رہے ہو ذرا مثبت سائیڈ پر بھی غور کرو۔ ''Virtual University'' کے قیام سے اعلیٰ تعلیم ان لوگوں کیلئے بھی ممکن ہو سکے گی جو پہلے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اب غربت، عمر یا Location کوئی چیز بھی رکاوٹ نہیں بن سکے گی۔ شاید اسی وجہ سے PETER DRUCKER نے پیشین گوئی کی ہے کہ تیس سال کے اندر اندر تمام بڑی یونیورسٹیاں قصہ پارینہ بن جائیں گی اور لوگ انہیں آثار قدیمہ کے طور پر دیکھنے جایا کریں گے۔ Soft Were، معمر استاد کے کرخت لہجے کی جگہ لے لے گا.....''

''ایسا نظام تعلیم روبوٹ تو پیدا کر دے گا لیکن شاید اچھے انسان نہ پیدا کر سکے۔ استاد اور طالب علم کے درمیان ایک روحانی رشتہ بھی ہوتا ہے جو بالآخر تکریم انسانیت پر ختم ہوتا ہے۔ اکتساب علم ضروری ہے لیکن اسے بانٹنے کے بھی طور طریقے ہیں۔ استاد کی شخصیت، اس کا کردار، اس کا لب ولہجہ طالب علم کی شخصیت پر بھی دوررس نتائج مرتب کرتا ہے۔ میں شاید سکول میں پڑھے لکھے ہوئے نصاب کو تو بھول گیا ہوں لیکن اس استاد کا نورانی چہرہ آج بھی روشن نظر آتا ہے۔ بادصرصر ہو یا بادسموم، غضب کی گرمی پڑ رہی ہو یا کڑاکے کا

جاڑا، ٹھیک آٹھ بجے ڈھیلی ڈھالی شیروانی پہنے سر پر مائع لگی پگڑی باندھے ماسٹر محمد خان سکول میں موجود ہوتا تھا"۔

"شاہ کی بات میں وزن ہے"۔ مون بحث میں شریک ہوتے ہوئے بولی۔" کلاس میں استاد کی موجودگی، بات سے بات پیدا کرنے کا فن، سوال و جواب کا ایک ایسا سلسلہ جس سے مزید کئی سوال نکلتے ہوں، طلبہ کا آپس میں Inter Action کیمپس کی فضا میں ہی ممکن ہے۔ ماڈرن ریسرچ یونیورسٹی صرف Converyor of Knowledge ہی نہیں ہوتی بلکہ Creator of Knowledge بھی ہوتی ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں جو تحقیق ہوتی ہے اس کی وجہ سے کئی ایجادات ہوتی ہیں اور لوگوں کو روزگار کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ 30 فیصد Bio Technology کمپنیاں یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کے اردگرد واقع ہیں۔ اور دس میں سے چھ نہایت اہم ادویات اس یونیورسٹی کی لیبارٹری میں بنی ہیں۔ میرے خیال میں مستقبل میں یونیورسٹیوں کا رول مزید بڑھ جائے گا اور سائنسدانوں اور طلبہ کے InterAction سے تحقیق و تفتیش کے نئے دور کھلیں گے!"

"میں نے ایک اٹل حقیقت کی نشاندہی کی ہے آپ لوگوں میں Nostalgia کچھ زیادہ آ گیا ہے اور جذباتی ہو گئے ہیں....." پیٹر قدرے اکتا کر بولا۔

سارا کہنے لگی" پیٹر لگتا ہے کہ تم بھی کچھ گھبرا گئے ہو اور اس کیفیت میں شاید ان تمام سوالات کا جواب نہ دے سکو۔ اس لئے تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ بل ادا کرو اور گاڑی کا سٹیرنگ سنبھالو"۔

"بل ادا کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اب کے کار تم چلاؤ گی"۔

"اور تم کیا کرو گے؟"

"میں میٹھی میٹھی باتیں۔ تمہیں احساس بھی نہیں ہوگا کہ تم نے ڈیڑھ سو کلومیٹر گاڑی چلائی ہے"۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری فضول باتیں سن کر یہ ڈیڑھ سو مجھے ڈیڑھ ہزار لگنے لگیں"۔

"کیا تم نے آئن سٹائن کی Theory of Relativity نہیں پڑھی۔ اس کا بنیادی اصول ہی یہی ہے کہ وقت کا تصور کیفیات پر مبنی ہے۔ یعنی اگر انسان اپنے محبوب کے ساتھ دو گھنٹے گزارے تو اسے وہ دو

منٹ لگتے ہیں اور اگر دو منٹ کسی جلتے ہوئے تنور کے قریب گزریں تو نہایت طویل گھڑیاں معلوم ہوتی ہیں"۔

"پھر تو مجھے ایسا محسوس ہوگا کہ جیسے میں نے ساری زندگی تپتے ہوئے صحراؤں میں گزار دی ہے" سارا مسکرائی۔

"تمہاری یہی حس مزاح تو مجھے پسند ہے"۔ پیٹر بظاہر گھائل ہوگیا۔ "تم یقیناً اتنی کند ذہن نہیں ہو جتنی بظاہر نظر آتی ہو"۔

"تم نے یہ کیسے تصور کرلیا کہ اس کے کہنے پر میں ڈرائیور کروں گی؟"

"تو کیتھی چلائے گی۔ یہ کونسا مسئلہ ہے"۔ میں نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا۔

اس پر سارا نے ایک زبردست قہقہہ لگایا کہ کیفے ٹیریا میں بیٹھے ہوئے سب لڑکے اور لڑکیاں متوجہ ہو گئے۔ بولی "کمال کرتے ہو، اگر اس کے ہاتھ سٹیرنگ پر ہوں تو پاؤں بریکوں تک نہیں پہنچ پاتے اور بالفرض پاؤں بریکوں پر ٹک جائیں تو ہاتھ دعائیہ انداز میں اوپر اٹھ جاتے ہیں اور سٹیرنگ ان کی پہنچ سے باہر ہوتا ہے"۔

"مبالغہ آرائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے!" مون نے سرزنش کی۔ "اس کا پیارا سا قد ہے۔ چھوٹا سا، منا سا، پیارا سا" سارا نے بچوں کی طرح توتلے لہجے میں ہونٹوں کو جوڑ کر نیم وا کیا۔

برکلے میں ہم تقریباً ایک گھنٹہ رکے۔ ماحول اس قدر جاذب نظر تھا کہ جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ہمیں سیکرے مینو پہنچنا تھا اور وہ وقت کا تعین پیٹر نے پہلے سے ہی کر رکھا تھا۔ میرا بڑا دل تھا کہ چند گھنٹے لائبریری میں گزارے جائیں کیونکہ برکلے کالج کی لائبریری کا شمار بہترین لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ پیٹر چونکہ برکلے میں پڑھ چکا تھا اس لئے طلبہ سے بات چیت کی نوبت نہ آئی۔ ہر سوال کا جواب وہ خود ہی دے دیتا۔

جب ہم ہائی وے پر آئے تو ایک بج چکا تھا۔ چونکہ کافی کے ساتھ ہم سب نے سینڈوچ کھائے تھے اس لئے فیصلہ ہوا اسی کو لنچ سمجھ لیا جائے۔ پیٹر مزے مزے سے گاڑی چلا رہا تھا اور ساتھ ساتھ برکلے کلچر پر

روشنی ڈالتا جاتا تھا۔

سڑک نہایت کشادہ تھی۔ چھ لین..... اردگرد بڑی خوبصورت لینڈ اسکیپنگ کی گئی تھی۔ نفاست کے ساتھ کٹی ہوئی گھاس اور خودرو جنگلی پھول۔ نیلے، پیلے، عنابی، گلابی۔ کہیں بھی خشک زمین کا ٹکڑا نظر نہ آتا تھا۔ اور نہ کہیں گرد کے بادل نظر آ رہے تھے۔ جمالیاتی ذوق کے علاوہ بھی یہ اہتمام ضروری سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ بہت بڑا ملک ہے۔ لوگ جب لانگ ڈرائیو پر نکلتے ہیں تو بسا اوقات ہزاروں میل تک سفر طے کر جاتے ہیں۔ ان کی اکتاہٹ دور کرنے کیلئے لینڈ اسکیپنگ ضروری ہے۔ اس سے ان کے ذہن پر ایک خوشگوار تاثر پیدا ہوتا ہے اور وہ بغیر اکتاہٹ یا نیم غنودگی کے گاڑی چلا سکتے ہیں۔ ایک قسم کی یکرنگی، بوریت پیدا کرتی ہے جس سے حادثے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ حد رفتار ساٹھ سے ستر میل فی گھنٹہ ہے۔ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔ قانون کی خلاف ورزی پر جرمانے کی صورت میں سزا ضرور ملتی ہے۔ اور کیسا ہی بااثر آدمی کیوں نہ ہو بچ نہیں سکتا۔ قانون کی لاٹھی بے آواز ہے اور خشک و تر میں تمیز بھی نہیں برتتی۔ پولیس مین نرم لہجے میں بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ اگر خدانخواستہ لائسنس منسوخ یا معطل ہو جائے تو اس سے بڑی سزا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ بغیر قید کے بھی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ جس ملک میں 90% لوگوں کی آمد و رفت کا انحصار اپنی کار پر ہو اور ڈرائیور خواب میں ہی نصیب ہوتا ہو، وہاں لائسنس کی معطلی سے ہر کام رک جاتا ہے۔ بغیر لائسنس کے گاڑی چلانا ناممکن ہے۔ پکڑے جانے کی صورت میں جب ٹریفک سارجنٹ نام اور نمبر اپنی گاڑی کے کمپیوٹر میں ڈالتا ہے تو پردہ سکرین پر نامہ اعمال، شجرہ نسب کی طرح نمودار ہوتا ہے اور سب جرائم (اگر کئے ہوں) روز روشن کی طرح آشکار ہو جاتے ہیں۔ اس آزاد ملک میں بھی فوری طور پر جیل یاترا کرنا پڑتی ہے۔ دعا اور منت سماجت کام نہیں آتے۔ عدالت میں جرم سے انکار بھی ممکن نہیں۔ پولیس مین کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ سچ سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ سچ ہی بولتا ہے۔ ہماری طرح ابھی ان لوگوں نے یہ فن نہیں سیکھا کہ اگر جوڑا ہوٹل کے بند کمرے سے پکڑا جائے تو بھی وہ شاہراہ عام پر بوس و کنار کرتا ہوا ظاہر کیا جاتا ہے (کیونکہ قانون کے مطابق اگر وہ اپنے کمرے میں بوس و کنار کریں تو وہ جرم نہیں بنتا۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ لوگوں کے جذبات میں ہیجان اٹھے) برطانوی سامراج ہمیں جو تحفے دے گیا ہے اس میں یہ ادارہ

بھی شامل ہے۔ میکاولی نے کہا تھا Ends Justiffy Means یعنی اچھے کام کیلئے اگر برا ذریعہ یا طریقہ بھی استعمال کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں اور وہ ایک اعتبار سے جائز ہے۔ لفظ خیر تو ان لوگوں کی لغت میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ ہر برائی کے فروغ کیلئے مزید برے طریقے اپنانے سے یہ ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کرتے۔ جن معاشروں میں اس قسم کے ادارے ہوں وہاں ان اداروں سے زیادہ معاشرہ کے لوگ قابل مذمت ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو لوگ اجتماعی طور پر ظلم برداشت کرتے ہیں وہ مظلوم نہیں رہتے ان کا شمار بھی ظالمین میں ہوتا ہے۔ کتاب مبین کے سب اشارے اس امر کی تلقین کرتے ہیں کہ خدا اس قوم کی حالت صرف اس صورت میں بدلے گا جب اسے اپنے حالات بدلنے کا احساس ہوگا.....

پیٹر آرام سے گاڑی چلا رہا تھا۔ غالباً وہ چاہتا تھا کہ میں اردگرد کے نظارے تسلی کے ساتھ دیکھ سکوں۔ ویسے بھی سیکرے مینٹو ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ امریکہ میں شہروں کے فاصلے میلوں کے حساب سے نہیں بلکہ وقت کے حساب سے بتائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ سیلوں فرانسسکو سے سیکرے مینٹو کتنا دور ہے تو کوئی کہے گا کہ پچھتر میل ہے وہ فوراً جواب دے گا کہ سوا گھنٹے کی ڈرائیو ہے.....

''سارا تمہاری خاموشی مجھے بے چین کر رہی ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' پیٹر نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

بولی ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ کر بیٹھو۔ ایسے لگتا ہے جیسے میں تمہارے اس کھٹارے میں نہیں بلکہ کسی جہاز پر بیٹھی ہوئی ہوں''۔

کہنے لگا ''تم نے وہ سلوگن نہیں سنا Speek thrills but kills۔ مجھے اپنا نہیں تمہارا خیال ہے۔ یہ عمر مرنے کی نہیں بلکہ مارنے کی ہے۔ پتہ نہیں کتنے لوگ زندہ درگور ہو چکے ہوں گے.....!''

''سارا! اس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال دو'' کیتھی کہنے لگی۔ ''اس کی روح حلق میں اٹکی ہوئی ہے''۔

''یہ بڑا سخت جان ہے۔ اس کو مارنے کیلئے نینوں کے بان نہیں بلکہ قینچی اور استرے کی ضرورت ہے۔ جو صرف اس حرافہ کے پاس ہے''.....

مون بولی ''مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے تم نے اس ہیئر ڈریسر کو غیر شعوری طور پر اپنا رقیب سمجھ لیا ہے''۔

''لیکن میرا اس سے کیا تعلق ہے؟'' پیٹر نے احتجاج کیا۔ ''یہ بڑی شکی مزاج ہے''۔

ہر چند کہ چھ رویہ سڑک تھی لیکن ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے سارا سان فرانسسکو لیک طاہو جا رہا تھا۔ لیک طاہو میں بھی کیسینو ہیں اور یہ نیواڈا کا سرحدی قصبہ ہے۔ ایک سڑک ہے جو کیلیفورنیا کو نیواڈا سے الگ کرتی ہے۔

سیکرے مینٹو سے 15 میل پہلے پیٹر نے گاڑی بائیں ہاتھ بغلی سڑک پر موڑ دی۔ سب نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ کہنے لگا ''میں نے آپ لوگوں کیلئے ایک Pleasent Surprise رکھا ہوا ہے۔ ہم آرنلڈ کے فارم پر جا رہے ہیں۔ اتنا خوبصورت پرائیویٹ فارم کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ ہر سال جو پھولوں کی نمائش ہوتی ہے یہ اس میں اول آتا ہے۔ اس کے سیب ہاتھوں ہاتھ بکتے ہیں اور سٹرابری میٹھی بھی ہے' پکی ہوئی بھی اور مفت بھی!''

''کیا مطلب؟'' سارا نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیا اس نے خیراتی فارم کھول رکھا ہے؟''

''نہیں'' پیٹر اس کی لاعلمی اور حیرانی سے خط اٹھاتے ہوئے بولا ''یہ کمرشل Gimmick ہے۔ لوگ یہاں آ کر مفت کھا تو سکتے ہیں لیکن ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ اس کیلئے فارم شاپ سے خریدنا پڑتا ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ کوئی نہ کوئی چیز ضرور خریدتے ہیں۔ فروٹ کے علاوہ یہاں سبزیاں ہیں۔ نرسری ہے' جہاں پھولوں اور پھلوں کے پودے بکتے ہیں۔ گفٹ شاپ ہے۔ بچوں کے کھلونوں کی شاپ ہے۔ مفت میں آدمی کتنا کھا سکتا ہے۔ اس سے چوگنی قیمت کی شاپنگ کر جاتا ہے.....!''

پیٹر نے درست کہا تھا۔ جب ہم فارم کے مرکزی گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو پھولوں اور پھلوں کا ایک جہاں آباد نظر آیا۔ ہوا کے ساتھ بھینی بھینی خوشبو بھی اڑ رہی تھی۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے بہت سارے کلونوں کی کاک ٹیل کا فضا میں چھڑکاؤ کر دیا گیا ہے۔ سنہری دھوپ نے سرخ اور سفید سیبوں کا رنگ کچھ اور نکھار دیا تھا۔ سیب کھانے کا مزا منفرد ہے لیکن درختوں پر لگے ہوئے سیبوں کے نظارے کا لطف کچھ اور ہی ہے۔ جب درختوں پر سفید پھولوں کا بار آتا ہے تو ان کی خوشبو اور رنگ روح کو فرحت بخشتے ہیں۔ یہی سیب پک کر مزید خوشنما لگتے ہیں۔ پھولوں کی کیاریوں کو بھی بڑی ترتیب کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ گلاب کے پھول کی کوئی

ایسی قسم نہیں تھی جو وہاں موجود نہ تھی۔ حد نگاہ تک پھیلی ہوئی سٹرابری یوں لگتی جیسی تازہ تازہ بارش کے بعد دھرتی پر ان گنت بیر بہوٹیاں نکل آئی ہوں۔ مرد عورتیں بچے چار سو پھیل گئے تھے اور انہیں بڑے شوق سے کھا رہے تھے..... ہم کافی دیر تک فارم میں گھومتے رہے۔ فارم کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ فروٹ سیکشن، ویجیٹیبل سیکشن، فلورل پارک اور چوتھا حصہ عمارات پر مشتمل تھا۔ جن کے اندر ریسٹورنٹ سے لے کر زرعی آلات تک کی دکان تھی۔ فارم کے متعلق باقاعدہ لٹریچر چھاپا گیا تھا جس میں اس کی تاریخ، کارہائے نمایاں اور اس جدوجہد کا ذکر تھا جو آرنلڈ نے کی تھی۔ پانچ سو ایکڑ کا فارم ایک دن میں نہیں بنا تھا۔ اس کے پیچھے بے شمار لوگوں کی انتھک محنت اور ایک قابل دماغ شامل تھا۔

ریسٹورنٹ سے ملحقہ آئس کریم پارلر تھا جس پر بڑا رش تھا۔ عورتیں، خاص کر بچے آئس کریم بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ پارلر کے باہر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا Home Made Recipe اور واقعی اس ذائقے کی آئس کریم ہر جگہ دستیاب نہ تھی۔ سٹرابری، سیب، کیلے، اخروٹ، پستے اور بادام کو خالص دودھ میں مکس کیا گیا تھا۔ آئس کریم کے اوپر اناس کی تہہ جمائی گئی تھی۔ سب نے بڑے شوق سے دو مرتبہ کھائی۔

پیٹر کہنے لگا ''جس شخص نے موٹا ہونا ہو وہ کچھ روز یہاں گزارے۔ پھول کر کپا ہو جائے گا!''

اس پر سیل گرل بولی ''جس نے وزن کم کرنا ہو وہ بھی یہاں کچھ دن گزارے، پیٹ پسلیوں سے جا لگے گا''۔

''وہ کیسے؟'' پیٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس وسیع و عریض فارم کی سیر کرے، کھلی فضا میں رہے، بجائے آئس کریم کے پھل کھائے، کیسا ہی بوڑھا شخص کیوں نہ ہو پھر سے جوان ہو جائے گا''۔

''پیٹر تمہیں یہاں ضرور رہنا چاہیے''۔ سارا نے مشورہ دیا۔

''پکی عمر جو تمہارے چہرے کی چغلی کھا رہی ہے کسی حد تک ختم ہو جائے گی''۔

''یہ طفل تسلیاں ہیں انسان کتنی دیر تک اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا ہے''۔

''یہ ایک ایسی ناگوار حقیقت ہے جس نے ایک نہ ایک دن ظاہر ہونا ہے'' میں نے کہا۔

''یہ ذاتی ضرورت کے علاوہ معاشی اور معاشرتی ضرورت بھی بنتی جارہی ہے۔ ہالی وڈ کے ایکٹرز اور دیگر شوبز کے لوگ اپنی عمر کو گھٹانے اور چہرے کو دلکش بنانے میں ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ پلاسٹک سرجری کا کاروبار خوب چمک اٹھا ہے۔ ساٹھ سال کا شخص چالیس کا لگتا ہے''۔ مون نے کہا۔

سیلز گرل مون کی طرف دیکھ کر کہنے لگی ''یہ لڑکی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آپ لوگ کم از کم آج کی رات یہاں ضرور ٹھہریں۔ آج گالا نائٹ ہے۔ باربی کیوڈنر ہوگا۔ ریڈ انڈین گلوکار اور موسیقار آئے ہوئے ہیں۔ اگر آپ لوگوں نے دو سو سال قبل کا امریکہ دیکھنا ہے تو یہ شب یہاں ضرور بسر کریں۔ وہی نغمے، وہی رقص اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ڈرنکس مفت ہوں گے On the House I mean''۔

''تو کیا آرنلڈ کی حس مہمان نوازی جاگ اٹھی ہے؟'' سارا نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

''آرنلڈ نے اسی فارم میں ایک ہوٹل بھی کھول رکھا ہے جس کا کرایہ سیکرے میڈو کے ہوٹلوں سے بہت کم ہے۔ پھر ایسا ماحول روز روز کہاں میسر آتا ہے۔ جنگل میں منگل۔ ایک ایسی رات جسے آپ کافی دیر تک یاد رکھیں گے!'' اس کے لہجے میں ایک تجربہ کار سیلز مین کی سی پختگی تھی۔

''آفر بری نہیں'' پیٹر نے مون کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

''شام ہو چکی ہے۔ یہاں ٹھہریئے یا وہاں قیام کر لیا کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بیس منٹ کی ڈرائیو ہے صبح سیکرے میڈو پہنچ جائیں گے.....!''

''صاف کیوں نہیں کہتے پیسے بچانا چاہتے ہو'' کہاں سیکرے میڈو ہلٹن کا آرام دہ ماحول اور کہاں یہ دشت تنہائی''۔ سارا نے پیٹر کی بات بیچ میں کاٹ دی۔ ''ویسے بھی دل پھینک انسان ہو سیلز گرل کی چرب زبانی نہیں حسن کام دکھا گیا ہے''۔

''بڑی شکی ہو۔ تمہارے چہرے سے نظر ہٹتی ہی نہیں اور کیا دیکھنا ہے؟''

''ہار کر ہی ڈالو'' مون نے اسے تھپتھپایا۔

''اس قدر استقامت تو سادھوؤں میں بھی نہیں ہوتی۔'' تنک کر بولی ''اس سے بہتر تو یہ ہے کہ میں کسی وحشی ریڈ انڈین کا تیر کھا کر گھائل ہو جاؤں اور وہ مجھے اٹھا کر اپنے خیمے میں لے جائے.....!''

پیٹر بولا ''یہ ممکن نہیں ہے۔ میری جینز کی جیبوں میں پڑے عشایہ 222 کے ریوالور دیکھے ہیں۔ تمہیں ہاتھ لگانے سے پہلے ہی میں اس کا کام تمام کر دوں گا۔''

''اگر ڈر کر بھاگ نہ گئے تو۔'' سارا مسکرائی۔

''آزمائش شرط ہے۔'' پیٹر چہرے پر مصنوعی غصہ طاری کرتے ہوئے بولا۔ ''آج کے ناچ کو میں دہشت میں بدل دوں گا۔''

''ڈائیلاگ اچھے بول لیتے ہو۔ میں مون سے سفارش کروں گی کہ تمہیں ہالی وڈ میں کسی ایکسٹرا کا کردار دلوا دے!''

''دراصل تمہیں دیکھ کر جذبات الفاظ کا روپ دھار لیتے ہیں۔ کسی قسم کے تردد یا سوچ و بچار کی نوبت نہیں آتی۔''

''ہاں!'' سارا ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر بولی۔ ''سوچ و بچار سے تو ہمیشہ سے عاری رہے ہو۔ تمہارا اپر چیمبر کسی مفلس کے پرس کی طرح خالی ہے۔'' جملہ اس قدر بے ساختہ تھا کہ سب مسکرا دیئے۔

پلازہ ہوٹل ہر لحاظ سے آرام دہ تھا۔ کمرے کشادہ، ہر کمرے میں فریج، ٹی وی سیٹ، اوون، سنک، ایئر کنڈیشنر اور الگ سے استری کا انتظام تھا۔ میز پر Complementry فروٹ باسکٹ جس میں سیب، اورنج، سٹرابیری اور کیلے بڑی نفاست سے سجائے گئے تھے۔ باسکٹ کے ساتھ ایک کارڈ پڑا تھا جس پر رات کے ڈنر کی تفصیل تھی۔ باربی کیو ڈنر جس کا انتظام کھلی فضا میں لاگ فائر اور کینڈل لائٹ میں کیا گیا تھا، کیلیفورنیا کی سرخ اور سفید شراب آن دی ہاؤس تھی یعنی بالکل مفت جسے جو جتنا چاہے حسب ظرف اور حسب طبیعت پی سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بروشر بھی تھا جس میں رقص اور گانے والے طائفے کے نام اور ان کے قبیلے اپاچی APACHE کی مختصر تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں وال ٹو وال کارپٹ خوبصورت منقش پردے اور چاروں کونوں میں پھولوں کے گلدستے رکھے تھے۔ کس قدر آرام دہ اور سکون آور ماحول ہے! میں نے سوچا۔ باہر حدِ نگاہ تک رنگ و نور کی برسات، اندر حسیں تنہائی۔ کیا تنہائی میں بھی حسن کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے؟ کیا خوبصورتی کے بعد بھی خوبصورتی ہوتی ہے۔ آرام دہ صوفے پر بیٹھتے ہی

مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ مون کہہ رہی تھی کہ جلدی سے تیار ہو جاؤ ڈنر کا وقت قریب آ رہا ہے۔ ہاٹ واٹر باتھ کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی نے تھکن کا طوق جسم سے اتار دیا ہو۔ اور ہلکا پھلکا ہو کر خلاؤں میں اڑ رہا ہو۔ بعض لوگ ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا شیوۂ مردانگی سمجھتے ہیں۔ سردی سے اکڑے رہیں گے، ان کی بتیسی بجنا شروع ہو جائے گی، پیٹ پسلیوں کے ساتھ جا لگے گا، بے سرے گانے کی سرگم حلق کی سرنگ میں ڈوب جائے گی، مہینے میں چار مرتبہ کھانسی، نزلہ اور زکام میں مبتلا رہیں گے، اس کے باوجود بڑے فخر سے سکڑے ہوئے سینے کو کشادہ کر کے کہیں گے،، او جی غسل ہو تو ٹھنڈے پانی کی۔ گرم پانی سے تو ہر کوئی نہا لیتا ہے۔'' ایسی سادگی پہ مرنے کو نہیں مارنے کو جی چاہتا ہے۔

جب میں تیار ہو کر لابی میں آیا تو پیٹر بے تابی سے گھڑی دیکھ رہا تھا۔ ''باقی لوگ کدھر ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''عورتوں کی تیاری تم جانتے ہی ہو۔ جتنے عرصے میں سات مرد تیار ہوتے ہیں اس سے دگنا وقت ایک عورت بننے سنورنے میں لیتی ہے۔ خصوصاً اگر کوئی تقریب ہو۔ فیشن پریڈ زوروں پر ہوتی ہے۔ آئینے میں ہزار بار اپنا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پندرہ قسم کی لپ اسٹکس کے تجربے دو چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر کیے جاتے ہیں۔ بلش آن، جنہیں دیکھ کر اکھڑ قسم کے مرد بھی بلش (Blush) کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر خوشبوؤں کا ایک ریلہ آتا ہے۔ ہم نے اپنی زندگی کو کتنے حصاروں میں بند کر دیا ہے۔ تصنع اور بناوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے!'' پیٹر کی تقریر زوروں پر تھی کہ وہ تینوں مسکراتی ہوئی کاریڈور سے نمودار ہوئیں۔ سب سے آگے سارا تھی۔ اس نے نیلڈ کی گہرے نیلے رنگ کی اسکرٹ اور اس سے میچ کرتی ہوئی ہلکے نیلے رنگ کی ہاف سلیو شرٹ جس پر سفید پھول پرنٹ تھے پہنی ہوئی تھی۔ کانوں میں یاقوت کے سرخ آویزے تھے۔ بالوں کی پونی ٹیل کی شکل میں گوند کر باندھ دیا تھا۔ بازوؤں میں چوڑیوں کی طرح بنے ہوئے دو گجرے تھے۔ اس کے پیچھے کیتھی جس نے مسٹرڈ کلر کی میکسی پہن رکھی تھی۔ کاموں میں زرد کے آویزے تھے جو اس کے چہرے کے گناسب سے ذرا بڑے لگتے تھے۔ سب سے پیچھے مون تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چاند

بادلوں کی اوٹ سے نہیں نکلا بلکہ بادل رعبِ حسن سے ڈر کر چھٹ گئے ہیں۔ اس نے بلیک کلر کی اسکرٹ پہن رکھی تھی جس کے اوپر ہلکے گلابی رنگ کی قمیص تھی۔ گلے میں بارہ ہیروں سے پرویا ہوا ہار تھا۔ کانوں میں بھی ہیروں کے آویزے تھے۔ باقی عورتوں کے برعکس میک اپ برائے نام تھا۔ جب وہ قریب آئیں تو ایسا محسوس ہوا جیسے خوشبوؤں کی کاک ٹیل آ گئی ہو۔

''آئی ایم سوری، پیٹر!'' مون نے معذرت کی۔ ''زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟''

''معذرت کی کوئی ضرورت نہیں'' پیٹر کے بولنے سے پہلے سارا بول پڑی۔ ''ابھی ابھی تو ہمارے خلاف شاہ کے کان بھر رہا تھا۔ یوں بار بار جھنجھلا کر گھڑی دیکھتا جیسے ہمارا نہیں کسی راحتِ جان کا انتظار ہو۔''

''تھا تو کسی راحت جاں کا انتظار!'' پیٹر جھنجھلا کر بولا۔ ''تم کب سدھرو گی، کب سنبھلو گی، کیسے سمجھاؤں بڑی ناسمجھ ہو!''

''میں سب سمجھتی ہوں۔ تمہارے متعلق تو میں اتنا جان گئی ہوں کہ چاہوں تو ڈاکٹریٹ کر سکتی ہوں! اتنی پیچ دار شخصیت، اتنا دوغلہ پن تو سارے سان فرانسسکو میں نہیں ملتا۔''

''اب راضی بھی ہو جاؤ'' پیٹر اسے مناتے ہوئے بولا۔ ''اس قدر روح پرور ماحول روز روز کہاں نصیب ہوتا ہے۔ آج کی یہ حسین شام میں تمہارے نام کرتا ہوں!''

☆

ہمارے خلاف شاہ کے کان بھر رہا تھا۔ یوں بار بار جھنجھلا کر گھڑی دیکھتا جیسے ہمارا نہیں کسی راحت جان کا انتظار ہو''۔

''تھا تو کسی راحت جاں کا انتظار!'' پیٹر جھنجھلا کر بولا۔ ''تم کب سدھرو گی، کب سنبھلو گی، کیسے سمجھاؤں بڑی ناسمجھ ہو!''

''میں سب سمجھتی ہوں۔ تمہارے متعلق تو میں اتنا جان گئی ہوں کہ چاہوں تو ڈاکٹریٹ کر سکتی ہوں! اتنی پیچ دار شخصیت، اتنا دوغلہ پن تو سارے سان فرانسسکو میں نہیں ملتا''۔

''اب راضی بھی ہو جاؤ'' پیٹر اسے مناتے ہوئے بولا۔ ''اس قدر روح پرور ماحول روز بروز کہاں نصیب ہوتا ہے۔ آج کی یہ حسین شام میں تمہارے نام کرتا ہوں!''

فضا میں خنکی تھی۔ چاندنی رات تھی، آسمان پر بادلوں کے آوارہ ٹکڑے چاند کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ہوٹل، دفاتر اور ریسٹورنٹ کے درمیان ایک اوول بنا ہوا تھا۔ اوول کے عین وسط میں صندل کی لکڑی کا ایک چبوترا بنا ہوا تھا۔ مناسب فاصلے پر ایک نیم دائرے کی شکل میں میز بچھے تھے۔ ہر میز کے اردگرد چار چار اور چھ چھ کرسیاں دھری تھیں۔ لاگ (LOG) کے بائیں طرف لکڑی کا بنا ہوا فلور تھا۔ فلور کے آخری کونے پر ایک پلیٹ فارم بنایا گیا تھا جس پر مائیک اور میوزیکل انسٹرومنٹ رکھے گئے تھے۔ میزوں پر بڑی بڑی موم بتیاں چاندنی کے چار خانوں میں جل رہی تھیں۔ جب ہم پہنچے تو قریباً سبھی مہمان آ چکے تھے۔ یوں لگا جیسے انہیں ہمارا انتظار تھا۔ جونہی ہم اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھے تو وہی سیلز گرل جس نے ہمیں ہوٹل میں ٹھہرنے پر راغب کیا تھا مائیک پر آئی۔ اپنی سریلی لیکن نپی تلی آواز میں مخاطب ہوئی ''ہائے فوکس!'' ہر طرف سے ہائے ہائے شروع ہو گئی۔ وہ قدرے جھینپی اور پھر مسکرا دی۔ ''میں آپ کو آرنلڈ فارم، مسٹر اور لیڈی آرنلڈ کی طرف سے خوش آمدید کہتی ہوں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے آج ہمیں شرف مہمان نوازی بخشا ہے۔ جہاں ہم آپ لوگوں کے ممنون ہیں وہاں ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ ان لمحوں کو امر کر دیں۔ یادگار بنا دیں۔ آج ہم جو پروگرام پیش کریں گے وہ صرف تفریح تک محدود نہیں ہوگا بلکہ اس میں آپ کو امریکہ کی تاریخ متحرک نظر آئے گی۔ یہ جو سٹیج پر رقاص اور نغمہ سنج بیٹھے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ریڈ انڈین قبائل کی امیدوں، امنگوں، آرزوؤں اور ارادوں کا چمن زار سمیٹ لائے ہیں۔ تاریخ کے دھارے جب بہتے ہیں تو وہ اپنی سمت خود متعین کرتے ہیں۔ حق و انصاف، عدل گستری و اخلاقی ضابطے کچھ بھی تو ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ تاریخ کی اپنی ایک منطق ہے جو ان تمام لطیف جذبات سے ماورا ہے۔ آج تاریخ میں سکندر یونانی کا ایک مقام ہے۔ اسے سکندر اعظم کہا جاتا ہے۔ ہر حکمران کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ کاش اسے بھی ایسا مقام اور مرتبہ حاصل ہو سکے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا، کوئی یہ نہیں کہتا کہ میں اور ایک بدنام ڈاکو، قاتل اور لٹیرے میں کیا فرق تھا۔ اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ لاکھوں بے گناہ لوگوں

کہ تہ تیغ کردے، ان کے گھر جلا ڈالے اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کوچہ زنداں میں دھکیل ڈالے۔ تاریخ کے تعصب کے سامنے سب اخلاقی آوازیں دب جاتی ہیں۔ سب ضابطے بے بس نظر آتے ہیں۔ یہی تاریخ یہاں بھی دہرائی گئی۔ کولمبس نے نہ جانے یورپین اقوام کے کان میں کیا پھونکا تھا کہ یورپ کا ہر راستہ امریکہ کی رف کھلنے لگا۔ ہر للچائی ہوئی نگاہ سونے کی چڑیا پر پڑنے لگی۔ گولڈ رش Mad رش میں بدل گیا۔ بارود کی بو نے معطر فضا کو گہنا دیا۔ چار سو گولیوں کی تڑتڑ، جوان، محنتی جسم جھلسے ہوئے درختوں کی طرح گرنے لگے۔ جائیداد کی حرص و ہوس نے اخلاقی ضابطوں کو روند ڈالا۔ عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے!'' امریکن سامعین نے بے چینی سے پہلو بدلے۔ کچھ دبی دبی آوازیں بھی بلند ہوئیں..... ''میں آپ کے جذبات سمجھتی ہوں میں بھی آپ میں سے ہوں، ہمارے آباؤ اجداد ایک تھے۔ ہماری تاریخ بھی ایک ہی ہے۔ شاید ہم ان کے اعمال کے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جا سکتے!'' اس نے گہری نظر سے سامعین کے چہروں پر اٹھتے ہوئے مد و جزر کا جائزہ لیا۔ ''لیکن تاریخ حقیقتوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ You can not corrupt History اب وقت آ گیا ہے کہ ان ناانصافیوں اور ناجوازیوں کا ازالہ کیا جائے اروشاید کیا بھی جا رہا ہے۔ عدالتیں ان کے حق میں فیصلے دے رہی ہیں۔ حکومت نے مراعات کا حوصلہ افزا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب ان کے گلے شکوے دور ہو جائیں گے۔ من و تو کی تقسیم ختم ہو جائے گی''۔

''Native کی تعریف کیا ہے؟'' سامعین میں سے کسی نے اٹھ کر سوال کر ڈالا۔

''یہ ایک اچھا سوال ہے''۔ اس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کیلئے کہا۔ ''بحث کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ارض خدا انسانوں کیلئے بنی ہے۔ نقل مکانی ہر دور میں اور تاریخ کے ہر موڑ پر ہوئی ہے۔ آرئین کب ہندوستان آئے؟ یونانی کہاں کہاں گئے، سامراج نے کن خطوں کو ''فیض یاب'' کیا۔ اگر یورپین اقوام سے پہلے ریڈ انڈین آئے، آسٹریلیا میں برطانوی سپاہ سے پہلے ادیب اور ویجنل موجود تھے یہ لوگ کہاں سے آئے تھے؟ کوئی نہ کوئی قوم کہیں نہ کہیں سے ضرور آتی ہے۔ محض وقت کی اکائیاں ان کا حق فائق نہیں کرتیں لیکن جو سلوک ان کے ساتھ روا رکھا گیا وہ یقیناً نامناسب تھا۔ انہیں جنگلی سوروں اور کتوں

کی طرح مارا گیا''۔ میں ان جملات معترضہ کو یہیں ختم کرتی ہوں کیونکہ وقت نکلا جا رہا ہے۔ ہمیں ان حسین لمحات کو سمیٹنا ہے اپنی روح میں اتارنا ہے اور یادگار بنانا ہے۔ پروگرام شروع کرنے سے پہلے ہمیں ایک مقامی رسم پوری کرنی ہے اور وہ یہ ہے ''صندل کی لکڑیوں کے اس گھٹے کو ٹارچ دکھانی ہے۔ آگ کے الاؤ کی روشنی میں محفل رقص و سرود جمے گی.....''

حاضرین کا تجسس بڑھانے کیلئے وہ ایک لمحے کیلئے رکی۔ اور پھر کہنے لگی ''آپ یقیناً جاننا چاہیں گے کہ ٹارچ کونسے خوبصورت ہاتھ پکڑیں گے۔ مسٹر آرنلڈ، مسز آرنلڈ اور ریڈانڈین میوزیکل پارٹی کا لڈر آج کی اس محفل کی سب سے خوبصورت لڑکی کا انتخاب کریں گے''۔ اس ڈرامائی اعلان پر ایک لمحے کیلئے خاموشی چھا گئی۔ اور پھر تالیوں اور ہاؤ ہو کے شور سے سارا پنڈال گونج اٹھا۔ لڑکیوں کے ہاتھ بے اختیار اپنے وینیٹی بیگ Vanity Bags کی طرف بڑھے۔ غیر رسمی طور پر رہی سہی یہ مس سیکرے مینو کا انتخاب تھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی بجنے لگی۔ چاند نے بادلوں کی اوٹ سے سر نکالا۔ تمام موم بتیاں جلا دی گئیں۔ آرنلڈ کی سربراہی میں جج صاحبان نے دائرہ کا چکر لگانا شروع کیا۔ نپے تلے قدموں سے آہستہ آہستہ چلتے انہوں نے ہر چہرے کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا اور بغیر انتخاب کئے واپس سٹیج پر آ گئے۔ کچھ دیر آپس میں کھسر پھسر ہوتی رہی اور پھر اعلان ہوا کہ وہ دوسرا راؤنڈ لیں گے کیونکہ پہلے راؤنڈ میں وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پائے۔ دلوں کی دھڑکنیں مزید تیز ہو گئیں۔ چہرے امید و بیم سے تمتمانے لگے۔ نگاہیں ایک ساتھ ان کی طرف اٹھ گئیں۔ ایسی نظریں جن میں آرزو بھی تھیں، خواہش کی رمق تھی اور التجا بھی تھی۔ چلتے چلتے وہ ہمارے پاس آ کر رک گئے۔ مون اس تمام کارروائی سے بے تعلق ہو کر چہرے پر دونوں ہتھیلیوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ دو چاند بیک وقت کیسے جگمگا رہے ہیں۔ ریڈانڈین چیف کی زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکلا اور جب مون بادل نخواستہ کھڑی ہوئی تو ہر طرف سے داد و تحسین کے ڈونگرے برسنا شروع ہو گئے۔ اس نے معذرت خواہانہ نظروں سے ججوں کو دیکھا لیکن مسز آرنلڈ کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ مزید انکار کی نہ تو گنجائش تھی اور نہ موقع۔ کتنی عجیب بات ہے میں نے سوچا۔ دنیا کے دو الگ خطوں میں تاریخ کے دو مختلف ادوار میں ایک رسم اپنے اپنے طریقے سے منائی جا رہی ہے۔ ایک خطے میں مردوں کو جلانے کیلئے لکڑیوں کو آگ دکھائی

جاتی ہے اور دوسرے میں ایک مردہ رسم کو زندہ کرنے کیلئے انہیں روشن کیا جاتا ہے۔ مون نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے نارچ لکڑیوں پر ڈال دی۔ سرکش آگ کے شعلے فضا میں بلند ہوئے۔ روپہلی لکڑیاں چٹخنے لگیں۔ سنہری آگ نے ماحول کو مزید روشن کر ڈالا۔ تمازت کی وجہ سے مون کے چہرے پر پسینے کے چند قطرے نمودار ہوئے۔ بینڈ تیز ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی رقص شروع ہو گیا۔ مون تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنی سیٹ پر واپس آ گئی۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''پسینہ پونچھ لو۔ گرم اور ٹھنڈی آگ کو پہلی دفعہ بالمقابل دیکھا''۔

کہنے لگی ''رومال خراب ہو جائے گا۔ میں ٹشو سے چہرہ صاف کر لیتی ہوں''۔

''اس رومال نے بھی میرے ساتھ بارہ ہزار میل کا سفر کیا ہے اتنی جلدی خراب نہیں ہوتا''۔

ہنس کر کہنے لگی ''ہاں، صحبت کا تھوڑا بہت اثر تو ضرور ہوتا ہے لیکن یہ بھی اگر صرف شاعر نکلا تو؟''

''تو بھی کیا برا ہے۔ خوشبو تو بہر حال سمیٹے گا''۔

''پھر اسے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ اس نے سب خوشبو سمیٹ لی ہے تو میں اسے تمہارے حوالے کر دوں گی''۔

''آرزو بھی تو ایک قسم کی خوشبو ہے۔ مجھے شاید اب ان عارضی سہاروں کی ضرورت نہ ہو۔ جب لمحے اور یادیں روح میں رچ بس جائیں تو پھر وہ مشام جاں کو ہر گھڑی ہر لحظہ تر و تازہ رکھتے ہیں.....''

ریڈ انڈین ثقافتی طائفہ اپنے کلچر اور تاریخ کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔ اس کا تعلق اپاچی قبیلے سے تھے۔ جب یورپین اقوام نے اس دھرتی پر قدم رکھا تو اس وسیع براعظم میں بے شمار قبائل آباد تھے۔ جن میں اپاچی، ناواہو NAVAHO چینک CHEYANNC چاروکی CHAROKEE اور چوکتا CHOCTAW زیادہ مشہور تھے۔ ان کی زبانیں مختلف تھیں۔ کوئی رسم الخط نہ تھا۔ تصویروں کی مدد سے اور اشاروں کنایوں میں ماضی الضمیر بیان کرتے تھے۔ جنگ و جدل اور مرغزاروں پر قبضے کیلئے ایک دوسرے سے بھی گتھم گتھا ہوتے رہتے چونکہ ان کی تعداد بہت کم تھی اور ملک بہت وسیع و عریض تھا اس لئے اپنی عملداریوں سے باہر کم نکلتے۔ اپاچی قبیلہ جنوبی ایری زونا کے پہاڑوں اور میدانوں میں آباد تھا۔ اس

کے علاوہ نیو میکسیکو اور میکسیکو میں بھی ان کی بستیاں تھیں۔ مرد اور عورتیں نیم برہنہ رہتے۔ ہرن کی کھال کو بطور اسکرٹ اور نیکر استعمال کرتے۔ بھینس اور دیگر جانوروں کی کھال سے بنے ہوئے جوتے پہنتے۔ لکڑی اور گھاس پھونس سے اپنے گنبد نما خیمے بناتے۔ ان کے مذہب اور دیگر رسومات کا اظہار بھی رقص کے ذریعے ہوتا۔ بارش ناچ Rain Dance رقص بلوغت Puberty Dance فصل ناچ Harvest Danc اور روحوں کا رقص ان کے مرکزی عقائد میں شامل تھے۔ اپاچی اور ناواہو قبائل کے شجرہ نسب سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد ایک تھے۔ اس لئے ان کے عقائد و اوہام، رسم و رواج بھی ملتے جلتے ہیں۔ یہ بڑے جنگجو، وحشی اور چالاک قسم کے لوگ تھے جو دوران جنگ کبھی لومڑی کی طرح روپوش ہو جاتے تو کبھی چیتے کی

طرح حملہ آور ہوتے۔ دشمن کے لئے رحم نام کا کوئی لفظ ان کی لغت میں نہیں تھا۔ لیکن اپنے عزیز و اقارب اور برادری کے ساتھ نرم رویہ رکھتے تھے۔ چے نی قبیلہ ALGONQUIA (CHEYENINE) زبان بولتا تھا۔ یہ منسوٹا اور شمالی ڈکوٹا کی ریاستوں میں آباد تھے۔ خانہ بدوش تھے جو بالائی مسسپی دریا Mississpp سے ہجرت کر کے دریائے چے نی کے کناروں پر آباد ہو گئے۔ ان کا لباس بھی ہرن کی کھال کا تھا۔ البتہ پرندوں کے پروں اور رنگدار پتھروں سے اسے سجاتے۔ ان کی مذہبی رسومات چار تیروں کے گرد گھومتی تھیں۔ جنہیں یہ ایک پول پر لٹکا دیتے۔ قبیلے کا ہر فرد ان کی زیارت کے لئے آتا اور بآواز بلند اپنے دل کا حال کھولتا اور دعائیں مانگتا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قبیلے کی سلامتی کا انحصار تیروں کی حفاظت پر ہے۔ اس کے علاوہ سورج دیوتا کو بھی رقص کے ذریعے خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ ہر قبیلے کے رواج کسی حد تک مختلف تھے لیکن ایک چیز جو مشترک نظر آتی ہے وہ انجانا خوف تھا۔ تمام رسومات اور قربانیوں کے پیچھے جو جبلت چھپی ہوئی تھی Isntinct of self preservation تھی۔ قحط، بیماری، قدرتی آفات اور غنیم سے بچنے کے لئے یہ ان دیکھے اور نظر آنے والے خداؤں کے حضور رقص کی شکل میں اپنی معروضات پیش کرتے۔

محفل رقص و سرود زوروں پر تھی۔ آگ کے سرکش شعلے اپنے جوبن پر تھے۔ چند اماموں بھی تاک

جھانک کر کے بادلوں کی اوٹ میں چلے گئے تھے۔ شرابِ ناب کے خم پہ خم لنڈھائے جا رہے تھے۔ کیلیفورنیا عمدہ شراب کشید کرنے کے معاملے میں اپنے آپ کو فرانس کا ہم پلہ سمجھنے لگا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے پیٹر اور سارا میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ دونوں نے پہلے سفید شراب کے چند جام پیے اور اس کے بعد سرخ شراب سے گتھم گتھا ہو گئے۔ مون شاید میرا دل رکھنے کے لئے اورنج جوس پی رہی تھی۔ کیتھی نے بھی چند جام پینے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ نصف شب کے قریب ریڈ انڈین ڈانس اور گانے ختم ہوئے تو مائیک پر اعلان ہوا کہ اب گروپ ڈانس ہو گا جو چاہے اس میں شرکت کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ کلوک روم میں ہرن کی کھال سے بنے ہوئے پرانے قبائل کے ملبوسات پڑے ہیں۔ اگر کوئی شوقین چاہے تو وہاں جا کر لباس بدل سکتا ہے۔ بے شمار جوڑے مستی کے عالم میں اٹھے اور ڈانسنگ فلور پر جا کر تھرکنے لگے۔

آؤ سارا ہم بھی ماضی کی طرف لوٹ جائیں۔'' پیٹر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''یہ ڈانس ہماری زندگی کا یادگار رقص ثابت ہو گا۔''

''تم جاؤ، مجھے تمہارے ساتھ ڈانس کرنے سے ڈر لگتا ہے۔'' سارا کی زبان کثرتِ مے نوشی سے لڑکھڑا رہی تھی۔

''مگر کیوں؟ ہم جنگل میں نہیں بلکہ جنگلیوں کے ساتھ ناچیں گے۔''

''کیا پتہ ہے تم مجھے اٹھا کر آگ میں پھینک دو!''

''کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ کوئی شخص اپنا دشمن نہیں ہوتا۔ تم میری زندگی ہو۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو!'' سارا نے اس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔

''کہو تو آگ میں کود جاؤں!''

''سچ!'' سارا خوشی سے چہکی۔ ''اگر تمہارے قتل کا الزام مجھ پر لگ گیا تو؟''

''میں تحریر لکھ دیتا ہوں، وہ بھی اپنے خون سے۔ ذرا وہ کانٹا میری طرف بڑھاؤ۔''

''نہ بابا ناں۔ مجھے ایسا پاگل عاشق نہیں چاہئے۔'' سارا نے ڈر کر چھری اور کانٹا میز کے نیچے پھینک دیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں چند منٹ تک سرگوشیاں کرتے رہے اور پھر تیزی کے ساتھ کلوک روم

میں چلے گئے۔ دس منٹ کے بعد جب وہ باہر نکلے تو ہم سب حیران رہ گئے۔ دونوں نے ہرن کی کھال سے بنا ہوا لباس پہن رکھا تھا۔ جو دھپوری طرز کے جوتے جو گھٹنوں تک لمبے تھے۔ سارا نے سر پر تاج بھی پہن لیا تھا جو مور کے پروں، موتیوں اور دیگر اس قسم کی الم غلم چیزوں سے تیار کیا گیا تھا۔ کافی دیر تک وہ ڈانسنگ فلور پر ناچتے رہے۔ کافی دیر تک انہوں نے بانہوں میں بانہیں ڈالے رکھیں۔ جسم تھرکتے رہے۔ جسم مسکراتے رہے۔ جسم بولتے رہے۔ نظریں بہکتی رہیں.....

ایک بجے اعلان ہوا کہ اب بوفے ڈنر سرو ہوگا۔ سب لوگ واپس اپنے اپنے ٹیبلز پر آ گئے۔ لیکن وہ دونوں ڈانسنگ فلور پر ہی کھڑے باتیں کرتے رہے۔ ہم چل کر ان کے پاس گئے۔

''میرے خیال میں کچھ زیادہ چڑھ گئی ہے۔ چلو کھانا کھالیں۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''کیا مطلب؟'' دونوں نے بیک زبان ہو کر الٹا سوال کر ڈالا۔

''شاہ کا مطلب یہ ہے کہ تم نشے میں ہو۔ اب کھانا کھانا چاہئے۔'' کیتھی نے وضاحت کی۔

''میرے خیال میں تو نشہ اب اترا ہے۔'' سارا چہکی۔

''تو کیا آج بھوکے رہو گے؟'' مون نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بھوک کس کم بخت کو لگی ہے صرف پیاس ہے جو بجھ نہیں پا رہی۔'' پیٹر ہنوز لڑکھڑا رہا تھا۔

''صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ غلطی ہم سے ہوئی ہے۔ انہیں زیادہ پینے سے روکنا چاہئے تھا.....!''

''بڑی حسین غلطی تھی۔'' سارا نے قہقہہ لگایا۔ ''میرے خیال میں تم بھی کر ہی ڈالو۔''

''کیتھی کہنے لگی'' لگتا ہے کھانے کے ساتھ ساتھ تمہارا سونے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔''

''رات حسین ہے۔ رات جوان ہے۔ رات مشکبار ہے' سارا کی زلفوں کی طرح' چاند جوبن پر ہے' اس کی جوانی کی طرح' ان لمحات میں آرام کرنا حرام ہے!'' پیٹر نے سارا کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

''اس خانہ خراب کی سب سے بڑی برائی یہی ہے کہ انسان کا ذہن ماؤف کر دیتی ہے''۔ میں نے تاسف

بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''اس کی خوبیاں کیوں نہیں گنواتے''۔ پیٹر کہنے لگا۔ ''اسے پی کر حق بات زبان پر آ جاتی ہے''۔

''تم جاؤ جہنم میں!'' مون کے لہجے میں پہلی بار غصے کا عنصر شامل تھا۔ ''ہم کھانا کھانے جا رہے ہیں' اب مزید انتظار نہیں کر سکتے''۔

''جنت کہو جنت'' پیٹر مسکرایا۔ ''بابا آدم ایک بنیادی حقیقت نہ سمجھ سکا۔ جنت کے باہر بھی تو ایک چھوٹی سی جنت بن سکتی ہے۔ غالباً یہی حقیقت جاننے کیلئے خلدِ بریں سے نکالا گیا تھا''۔

''یہ اپنا بوگس فلسفہ اپنے پاس رکھو'' مون کہنے لگی۔ ''ہم چلتے ہیں''۔

''خدا حافظ!'' دونوں بیک زبان ہو کر مسکرائے۔ ''صبح ہمیں سیکرے مینو لے جانا نہ بھولنا''۔

کھانا کھاتے کھاتے دو بج گئے۔ نہ بھی کھاتے تو شاید گزارا ہو جاتا کیونکہ دختر رز کے ساتھ سنیکس بھی سرو کئے جا رہے تھے۔ کھانے میں اس حد تک جدت پیدا کی گئی تھی کہ مختلف کاؤنٹرز پر الگ قسم کا کھانا بن رہا تھا۔ آسٹریلوی بیف کے ٹی بون اسٹیکس' مٹن' چاپس اور چکن کی کئی ڈشیں تھیں۔ ایک کونے میں سیلف کوکنگ سروس تھی' اگر کوئی از خود کھانا بنانا چاہتا تو اس کا بھی انتظام تھا۔ زیادہ تر لوگ اسٹیکس کھا رہے تھے۔ ہاف ڈن' آدھا کچا آدھا پکا یعنی بے حد جوسی! انسان کتنا ہی ترقی کر لے اور تہذیب یافتہ ہو جائے اس کی وحشی جبلت کہیں نہ کہیں آشکار ہو جاتی ہے۔ میں نے جب شیف کو ویری ویل ڈن اسٹیک بنانے کو کہا تو اس نے بھی بڑی حیران کن نظروں سے مجھے دیکھا۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ انسان کو کچا گوشت نہیں کھانا چاہئے تو وہ طنز بھرے لہجے میں کہنے لگا کہ ''یہ عمل بذاتِ خود وحشی پن کی علامت ہے''۔

''کوئی بات نہیں' اگر تمہاری باور چیانہ حسیں مجروح ہوتی ہیں تو میں سبزیوں پر قناعت کر لوں گا''۔ میں نے اسے تھپتھپایا۔

''میں سیلز مین ہوں جسے صرف گاہکوں کی خوشی اور خوشنودی عزیز ہوتی ہے!'' اسے شاید اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ''میں ایسا ٹینڈر اسٹیک بناؤں گا کہ تم یقیناً دوسری بار بھی یہاں آؤ گے''۔

''یقیناً۔ اتنے دلفریب نظارے، پھولوں اور پھلوں کی آمیزش سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو، حدِ نگاہ تک وسیع مرغزار اور سبزہ زار، مشروبات اور ماکولات کی اس قدر بھرمار۔ ہر طرف رنگ اور نور کی برسات، چار سو حسن و جوانی کی موجیں۔ آرنلڈ کو ایک اعتبار سے عصرِ حاضر کا شداد ہی کہا جا سکتا ہے جو اس تاریخی Tyrant کے برعکس خدائی کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ ثبوتِ حق اور خدا کی شان کی گواہی دیتا ہے''۔

''شاہ تمہاری فلسفیانہ باتیں یہ کہاں سمجھ پائے گا'' مون میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس کی دنیا اور فلسفہ گائے کے گوشت سے شروع ہوتا ہے اور شاید یہیں ختم ہو جاتا ہے''۔

''تم تو سمجھ رہی ہو۔ ضروری نہیں کہ جب کو مخاطب کیا جائے وہ بات اسی کو سمجھانا مقصود ہو!''

جب اسٹیکس تیار ہو گئے تو شیف کہنے لگا ''اگر اجازت دو تو اس کو سرخ شراب کا تڑکا لگا دوں۔ اس سے یہ مزید نرم، رس بھرا اور خوشبودار ہو جائے گا''۔

''اس کی ضرورت نہیں!'' میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ تم نے پہلے ہی بڑی محنت کی ہے۔

''شکریہ!'' اس کے لہجے میں ممنونیت تھی۔

کھانا کھا کر ہم ہوٹل پہنچے تو مون کہنے لگی ''صبح کی سیر کرنی ہے تو بتا دو۔ میں تمہیں بروقت اٹھا دوں گی''۔

''میں نہیں چاہتا کہ دو گھنٹے سو کر پھر تمہیں جاگنا پڑے، ویسے سیر کیلئے اس سے بہتر ماحول نہیں مل سکتا''۔

''تو پھر ناشتہ کی میز پر ملیں گے''۔ ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور اپنے اپنے کمروں کو چل دیئے۔

☆

کمرے میں پہنچ کر میں نے کپڑے بدلے۔ بستر پر لیٹ تو گیا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ ایک انجانا خوف مجھے بھی اپنے وجود کے اندر محسوس ہو رہا تھا۔ اس قدر خوبصورت اور مہربان ماحول میں اس کا کوئی عقلی جواز نہ تھا لیکن زندگی میں کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو کہ عقل کے ترازو میں تولی نہیں جا سکتیں اور وہ فہم و ادراک سے ماورا ہوتی ہیں۔ یہ کون سی چیز ہے جو مجھے بے کل کئے جا رہی ہے۔ یہ کون سا حادثہ ہے جو نہ ہونے کے باوجود ہوتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ یہ کیسا جذبہ ہے جو میرے پاؤں کی زنجیر بنتا جا رہا ہے۔ خیالات کی یلغار نے ذہنی انتشار میں اضافہ کرنا شروع کیا تو میں اٹھ بیٹھا۔ کمرے کی بتی جلائی اور ٹی وی آن کر دیا۔ کوئی پرانی

وارمووی دکھائی جارہی تھی۔ ہر طرف آگ اور بارود کی بارش' گھنا جنگل' مورچے میں بھوک اور پیاس جاں بلب سپاہی' جوان آخری لمحات میں اپنی محبوبہ کو آخری خط لکھ رہا تھا۔ سیاہی کے بجائے اس نے قلم اپنے زخموں سے رستے ہوئے خون میں ڈبودی تھی۔ یا مظہر العجائب! یہ کیسا نظام ہستی ہے؟ یہ کون سی بستی ہے؟ آخری لفظ لکھنے کے بعد یہ آخری سانس لے گا' تیز ہوا' زرد پتے اور گرد کے بادل اس کے مردہ جسم کو ڈھانپ لیں گے۔ موت کا تصور ویسے تو بڑا بھیانک ہے لیکن غریب الوطنی کی موت بڑی روح فرسا ہوتی ہے۔ قبر پر کوئی پھول نہیں چڑھتا' عرق گلاب کی طرح کوئی پاکیزہ آنسو ٹپ ٹپ نہیں گرتا' سنگ مرمر کی کوئی تختی نہیں لگتی۔ یہ خط کسی نہ کسی روز اس کے محبوب تک پہنچے گا۔ دو آنسو اس خون آلود تحریر پر گریں گے پھر ہر چیز وقت کی راکھ کے نیچے دب جائے گی۔ یادوں کے سہارے کب تک زندہ رہا جا سکتا ہے۔ وقت ہر زخم مندمل کر دیتا ہے۔ پرتِ حقیر کے پرزے فضا میں اڑ جائیں گے۔ یادیں نسیاں میں ڈال دی جائیں گی۔ اہل وطن کے دل سے وطن کے سپاہی کی یاد محو ہو جائے گی۔ وہ نغمے' وہ رانے' وہ گیت جو اس کی یاد میں اس کی تعریف میں گائے گئے تھے تاریخ کے سرد خانے میں دفن ہو جائیں گے۔ یہی نظام زندگی ہے' یہی قانونِ قدرت ہے۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔

میں نے ٹی وی بند کر دیا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ماحول پر ہنوز رات کی حکمرانی تھی۔ وہ پنڈال جہاں کچھ دیر پہلے محفل رقص و سرود جاری تھی بالکل سنسان پڑا تھا لیکن خوشبوئیں اب بھی چار سو بکھری ہوئی تھیں۔ آگ کا الاؤ سرد پڑ چکا تھا۔ شمعیں اپنی عمر طبعی گزار کر خاموش ہو گئی تھیں۔ چاند بھی بادلوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے تھک کر مغربی سمت سرک گیا تھا' البتہ کہیں کہیں برقی قمقمے روشن تھے۔ ان کی مدھم روشنی میں درختوں کے نیچے چند سائے رقصاں نظر آئے۔ کمرے کو چھوڑ کر باہر کھلی فضا میں رومان؟ انسان بڑا جدت پسند ہے۔ ہر حال میں ایڈونچر اور ورائٹی چاہتا ہے۔ مٹی سے بنے ہوئے انسان کی فطرت ہنوز نہیں بدلی۔ جب کبھی موقع ملے خاک کی طرف لوٹتا ہے۔ ان اشجار کے سائے تلے کوئی سپرنگ دار بیڈ نہیں تھے' کوئی فوم کشن نہیں تھا۔ بجلی اور پانی کی سہولتیں بھی ناپید تھیں لیکن ایک تنوع تھا۔ یادوں کو محفوظ کر دینے والا ماحول تھا۔ خنک ہوا تھی اور فرانس کے کلونوں کی جگہ قدرتی خوشبوؤں کے در کھلے تھے۔ ویسے بھی جوانی دیوانی ہوتی

ہے۔ یہ وہ دور ہوتا ہے جب انسان کو اپنی ہر سانس سے، پسینے سے اٹھنے والی بو میں بھی مہک محسوس ہوتی ہے۔

میں غالباً واحد شخص تھا جو اکیلا بے مقصد گھوم رہا تھا۔ چار سو قانون فطرت کی حکمرانی تھی۔ پولیس کا کوئی Sleuth ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ کسی کے جذبات برانگیخت نہیں ہو رہے تھے، کوئی شراب کے نشے میں غل غپاڑہ بھی نہیں کر رہا تھا۔ انگریز چلا گیا ہے لیکن برصغیر میں تحفتاً ایک ایسی پولیس دے گیا ہے جو ہر اس چیز کی دشمن ہے، جس کا تعلق شخصی آزادی اور اعلیٰ انسانی اقدار سے ہو۔

بے مقصد چلتے چلتے میں کافی دور نکل گیا۔ شجر اور سائے بہت پیچھے رہ گئے۔ اسٹرابری کے کھیت، سبزیوں کی کیاریوں سے بھی آگے نکل گیا۔ گھڑی دیکھی تو چار بج رہے تھے۔ میں واپس جانے کے ارادے سے مڑ ہی رہا تھا کہ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سیب کے درخت کے بالکل نیچے، آخری لیمپ پوسٹ سے ذرا ہٹ کر سارا اور پیٹر بیٹھے تھے۔ سارا پیٹر کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی اور وہ آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ بھی ان کے انہماک کو نہ توڑ سکی، جب دل میں چور ہو تو انسان ہوا سے بھی بدکتا ہے۔ یہاں قاضی دیکھ بھی لیتا تو کیا کر سکتا تھا۔ میں نے ان کے ''آرام'' میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور دبے قدموں واپس لوٹ آیا۔

صبح ناشتے کی میز پر ہم تینوں سارا اور پیٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ خلاف توقع وہ لیٹ تھے۔ مون نے گھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے۔ اس نے مشورہ دیا کہ ناشتہ شروع کر دیا جائے، ہو سکتا ہے کہ وہ ارلی بریک فاسٹ کر چکے ہوں۔

''ایسا ممکن نہیں ہے'' کیتھی کہنے لگی۔ ''میں ان کو بلا لاتی ہوں!'' وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ سامنے کے دروازے سے وہ دونوں نمودار ہوئے۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، قدموں سے قدم ملاتے ہوئے جیسے ناشتہ کرنے نہیں پریڈ پر نکلے ہوں۔

''انتظار کرانے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے''۔ مون نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ ''اگر دیر سے آنا تھا تو پہلے بتا دیتے''۔

''آئی ایم سوری'' پیٹر نے معذرت کی۔ ''دراصل سارا اپنے والدین سے بات کرنا چاہتی تھی اور کال مل

نہیں رہی تھی"

"خیریت تو ہے؟" مون کے لہجے میں تشویش تھی۔

"بالکل خیریت ہے!" وہ مسکرائی۔ میں انہیں ایک خوشخبری سنانا چاہتی تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھے ان کی رسمی منظوری درکار تھی!"

"کس چیز کی خوشخبری؟ کیسی منظوری؟" کیتھی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا تمہاری لاٹری نکل آئی ہے"۔

"لاٹری ہی سمجھو زندگی کی لاٹری' میں نے اور پیٹر نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم لیک طاعو میں شادی کریں گے۔ والدین بھی وہیں پہنچ رہے ہیں"۔ سارا نے انکشاف کیا۔

جوس کے گلاس ہمارے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچے "ناقابل یقین! ناممکن!" کیتھی کے حلق سے آواز نکلی۔

لیکن وہ نوک جھونک، وہ اظہار ناپسندیدگی، وہ طنز و تشنیع! کیا یہ سب فراڈ تھا؟

پیٹر کہنے لگا ہمیں علم نہ تھا کہ اس غیریت اور مخاصمت کے پیچھے ازلی پیار چھپا ہوا ہے ایک زمزمہ محبت بہہ رہا ہے۔ اس ایک رات نے دخترز کے چند جاموں نے انانیت کے خول کو توڑ دیا ہے۔ ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ ایک نیا سفر جو آرفلڈ کے فارم کی طرح ہموار خوشبودار اور پر کشش ہو۔ ہمیں آپ کی دلی دعاؤں اور نیک تمناؤں کی ضرورت ہے۔ خاص کر مون کی۔ اگر یہ سارا کو اس سفر میں نہ لاتی تو اس دل کی گرہیں کبھی نہ کھلتیں۔

لیکن اب سفر کا خاک مزہ آئے گا۔ میں نے ہنس کر کہا اس قدر بے ساختہ جملہ بازی اب کہاں سننے کو ملے گی کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم لوگ چند دن تک اپنا فیصلہ ملتوی کر دو یا کم از کم Cease fire کو Decrease fire میں بدل ڈالو۔

ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ خیال خاطر احباب ہمیں بڑا عزیز ہے لیکن جس جگہ تم اب جا رہے ہو وہ تمہیں مکمل طور پر اپنے حصار میں لے لے گی۔

کیا واقعی لیک طاؤ بڑی خوبصورت جگہ ہے؟

بہت! اگر یقین نہیں آتا تو نائٹ کوئین سے پوچھ لو اس نے مون کی طرف اشارہ کیا۔

نائٹ انگیل، سکوآف کیلیفورنیا، جس شخص کو یہ دل دے بیٹھی وہ بیچارہ تو بے یقینی کے بوجھ تلے ہی دم توڑ دے گا۔ پیٹر نے جملے میں اضافہ کیا۔

تو کیا تمہارے خیال میں ابھی تک اس نے دل کسی لاکر میں رکھا ہوا ہے؟ سارا مسکرائی، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میری طرح یہ بھی حرف مدعا زبان پر نہ لاتی ہوں۔

مون کے ساتھ اپنی مثال نہ دیا کرو، کیتھی نے سرزنش کی۔

تو کیا تمہارے ساتھ دوں؟

ناشتہ بھی بڑا مزیدار تھا۔ بوفے بریک فاسٹ۔ ٹیبل سروس کا رواج آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے ایک تو بہت مہنگا ہے پھر وقت اور کھانا بھی خاصا ضائع ہوتا ہے۔ پیتل کی پراتوں میں سجے ہوئے کھانے..... آدمی حسب خواہش اور حسب ضرورت اپنی پلیٹ بھر سکتا ہے۔ کھانے کی چیزوں کا انبار دیکھ کر میں نے منیجر سے ازراہ تفنن پوچھا کہ کہیں رات کے بچے ہوئے کھانے تو سرو نہیں ہو رہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ جملہ مزاحاً کہا یا ہے اس نے ایک طویل وضاحت ضروری سمجھی۔ کہنے لگا یہاں فوڈ لاز بہت سخت ہیں۔ باسی کھانا پیش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس کی بہت کڑی سزا رکھی گئی ہے۔ پھر اگر کسی کو باسی کھانے کی وجہ سے Food Poisioning ہو جائے تو عدالتیں معاوضہ اس قدر بھاری مقرر کرتی ہیں کہ مالک کا بھٹہ بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی کھانا اگر پکنے کے چھ گھنٹے کے اندر نہ بکے تو اسے ضائع کر دیا جاتا ہے!

وہ لوگ جنہوں نے وطن عزیز میں گندگی کے ڈھیروں سے لوگوں کو خوراک نکالتے دیکھا ہے انہیں یقیناً تعجب ہوگا۔ مغربی ممالک پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اپنے لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ایشیا اور افریقہ کے عوام کو تہی دست رکھا جائے یہ جو ہر طرف لڑائی جھگڑے ہیں یہ جو چار سو خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں ایک نہ ختم ہونے والی دشمنی، نار جہنم کی طرح دہکتا ہوا انتقام..... یہ سب ان کی حکمت عملی کے شاخسانے ہیں۔ ایران عراق جنگ دس سال لڑی گئی، 345 بلین ڈالر بارود کی طرح بھک

سے اڑ گئے۔ دس لاکھ لوگوں نے جام شہادت نوش کیا اس سے دگنے لوگ مفلوج ہو گئے۔ نتیجہ کیا نکلا؟ عراق جنگ شروع کرنے سے پیشتر جہاں تھا ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ دنیا کے جتنے خون آشام درندے ڈکٹیٹروں کے روپ میں حکمرانی کر رہے ہیں ان کے مربی یہ ہیں ان کے محسب یہ ہیں بظاہر طاقتور لوگ دراصل کٹھ پتلیاں ہیں ہر تار مغرب سے ہلتا ہے۔

ہم سب نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ ناشتہ کیا۔ پچھلے کئی روز سے پیٹر اور سارا کے درمیان جو نوک جھونک ہوتی رہی تھی اس کے بعد تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک نیم روشن شام ان کی زندگی میں نوید صبح لائے گی..... ناشتے کے بعد جب پیٹر نے بل کا کہا تو منیجر نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ ان کے ہاں یہ رسم ہے کہ جو شخص آگے روشن کر کے تقریبات کا آغاز کرتا ہے وہ ہوٹل کا مہمان خصوصی ہوتا ہے اور اس سے بل نہیں لیا جاتا۔

پھر تو ہمیں یہاں چند روز اور قیام کرنا چاہیے! سارا نے اس کی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھا۔

بڑے شوق سے وہ مسکرایا۔ یہاں ٹورسٹس کا تانتا بندھا رہے گا وہ آگ جو رات روشن ہوئی ہے اس نے کئی روحوں کو گرمایا ہے اور کئی قلوب منور ہوئے ہیں۔

گویا اس کرٹسی کے پیچھے جمالیاتی حسوں سے زیادہ کاروباری مصلحتیں کارفرما ہیں۔ میرے لہجے میں قدرے تاسف تھا۔ بولا، یہ امریکہ ہے، الف لیلوی بغداد نہیں ہے ہر چیز دولت کے ترازو میں تلتی ہے۔

تو پھر ہم بل دینے پر اصرار کریں گے! میں نے پہلی بار جیب سے بٹوا نکالا۔

شاہ رہنے دو۔ اس نے سچ بات ذرا کھردرے انداز میں کہی ہے ہمیں ان روایات کا احترام کرنا چاہیے مون نے پرس لیکر واپس میری جیب میں ڈال دی۔

O

اب کے گاڑی چلی تو پتہ ہی نہ چلا کہ ہم سیکرے مینٹو پہنچ گئے ہیں۔ جب سڑکیں کشادہ اور ہموار ہوں، موسم مہربان اور ساتھی ہم خیال ہوں تو وقت کا احساس بالکل نہیں رہتا۔ شہر دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ لاس اینجلس اور سان فرانسسکو کے سکائی سکریپرز کے مقابلے میں یہاں چھوٹے چھوٹے مکانات تھے بلکہ

پورا شہر ایک قصبہ نظر آتا تھا۔ امریکیوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد ریاستوں کے دارالخلافے چھوٹے شہروں میں منتخب کیے۔ جہاں گورنر اور اسمبلیاں بڑے سکون کے ساتھ قانون سازی کر سکتی تھیں۔ جن لوگوں نے ناول Stanger in Secramento پڑھا ہے انہیں اس شہر میں جا کر احساس ہوتا ہے کہ اجنبیت نام کی کوئی چیز اب وہاں موجود نہیں ہے۔ صاف ستھرا شہر ماحولیاتی آلودگی سے پاک، مہربان موسم، شفیق لوگ، پرانی اور نئی تہذیب کا حسین امتزاج۔ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریائے سیکرے مینٹو کے کنارے یہ شہر 1839ء میں کیپٹن جان آگسٹن سٹر نے آباد کیا۔ پہلے اس کا نام New Helvetia رکھا گیا لیکن 1849ء میں دریا کی مناسبت سے اسے موجودہ نام دیا گیا۔ جب سونا دریافت ہوا تو اس شہر کے نصیب جاگے اور اس کی چہرت چار دانگ پھیل گئی۔ 1854ء میں اسے کیلیفورنیا کا دارالخلافہ بنا دیا گیا۔ اس شہر میں کیلیفورنیا یونیورسٹی کی شاخ کے علاوہ تین کالج بھی ہیں۔ سیکرے مینٹو سٹی کالج امریکن ریور جونیئر کالج اور کنزیومرز ریور کالج قابل دید مقامات ہیں Old Fort Sulter اب میوزیم میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انڈین میوزیم کراکرز آرٹ گیلری اور کیلیفورنیا اسٹیٹ لائبریری بھی خاصی مشہور ہیں۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے ہم نے لائبریریوں، پرانا ریلوے سٹین اور اسٹیٹ کیپٹل بلڈنگ دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ تین لاکھ کی آبادی کا یہ شہر دیودار کے درختوں میں گھرا ہوا ہے۔ جب پیٹر نے گاڑی کا رخ اسٹیٹ کیپٹل بلڈنگ کی طرف کیا تو مون کہنے لگی ''شاہ! آج تمہاری ملاقات کیلیفورنیا کے گورنر سے کراتے ہیں۔''

''کیا یہ بھی بیورلے ہلز کا رہنے والا ہے؟'' میں نے بے یقینی کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔

بولی ''نہیں تو۔ میں نے اسے صرف تصویروں میں دیکھا ہے!''

''کیا پہلے سے اپائنٹ منٹ لے رکھی ہے؟''

''اس کی ضرورت نہیں.....''

''پھر تو خوابوں خیالوں میں ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''میں سمجھی نہیں؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''تم نے ہمارے لاٹ صاحب کا طمطراق نہیں دیکھا۔ گورنر سے ملنا تو درکنار گورنر ہاؤس کے

سامنے سے گزرنا بھی مشکل ہوتا ہے....."

"میں امریکہ کے گورنر کی بات کر رہی ہوں جو ہماری طرح ہی گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہے۔ آزاد ملک کے شہری اور آزاد ملک کے گورنر میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ دونوں اپنے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

"ملک تو ہمارا بھی آزاد ہے" میں نے سوچا۔ لیکن شاید آزادی ہمیں راس نہیں آئی۔ فکر و نظر آزاد نہیں ہو سکی۔ انتظامی طریقے، سوچ اور روش، سرگشتہ خمارِ رسوم و قیود ہیں۔ ایک نہایت قلیل لیکن منظم گروہ پیر تسمہ پا کی طرح ہمارے حواس پر سوار ہے۔ اخلاقیات، اعلیٰ انسانی اقدار کو ہم نے طاقِ نسیاں میں ڈال دیا ہے۔ انانیت، فرعونیت میں بدل رہی ہے..... ایک اتنا بڑا گورنر ہاؤس جس میں کئی کالج کھل سکتے ہیں۔ کئی رفاعی ادارے قائم ہو سکتے ہیں، کھیلوں کے میدان بن سکتے ہیں۔ کہتے ہیں گورنر ریاست کا سمبل آف اتھارٹی ہوتا ہے..... کون سی ریاست؟ جہاں لوگ نانِ جویں کو ترستے ہیں۔ بھوک بھنگڑا ڈالتی ہے۔ صوبائی عصبیت کے خارزار میں۔ مذہبی منافرت کے جہنم زار میں آدھا ملک ٹوٹ چکا ہے اور باقی کو توڑنے کی شعوری اور غیر شعوری کوششیں جاری ہیں۔ گورنر کے پاس کام بہت ہوتا ہے! ٹھنڈے کمرے میں گرم کافی پینا ہوتی ہے۔ چائے ساتھ چکن سینڈوچ کھانے ہوتے ہیں۔ ایک پورا ڈیری فارم، باغ، شاپنگ پلازہ، نرسری اور مویشی پال فارم کی دیکھ بھال کرنا ہوتی ہے۔

کیپٹل بلڈنگ، واشنگٹن کے کیپٹل ہلز کی طرز پر بنائی گئی تھی۔ وہی نقشہ، وہی اس قسم کی عمارت تک پہنچنے والی دورویہ سڑک، جس کے درمیان فوارے تھے، رنگ برنگے پھول کھلے تھے اور اردگرد پائین ٹریز کے جھنڈ تھے۔ واشنگٹن کی عمارت نسبتاً اونچی اور کشادہ ہے۔ نام پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ پہاڑی پر بنائی گئی ہو گی۔ پورے شہر میں کوئی پہاڑی نہیں ہے صرف نام کی حد تک ہلز ہے۔ بنیادیں خاصی اونچی ہیں۔ ایک بہت بڑے پلیٹ فارم پر یہ عمارت کھڑی کیگئی ہے۔ پھر پورے شہر کی تعمیر میں یہ شرط رکھی گئی ہے کہ کوئی بھی عمارت پارلیمنٹ کی عمارت سے اونچی نہیں ہوگی۔ مقصد ممبرانِ کانگرس یا سینیٹروں کو خوش کرنا نہیں بلکہ قانون کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔ جس ادارے سے پوری قوم کی قسمت وابستہ ہو اس کا احترام اور عزت بہت

ضروری ہے۔ فیڈریشن کی طرح ریاستوں کی بھی مقننہ ہے۔ گورنر ایک اعتبار سے صدرِ امریکہ کا Miniature ہوتا ہے۔ یہاں بھی Checks & Balances کا اصول رکھا گیا ہے۔ فرانسیسی سیاسی مفکر مانٹسکو (Montasque) نے جمہوریت کے لئے جو بنیادی اصول وضع کیا تھا اس پر پوری دیانتداری کے ساتھ یہاں عمل ہوتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ انتظامیہ، عدلیہ اور مجلس قانون ساز ریاست کے اہم ستون ہیں۔ ان کو الگ الگ رہ کر اپنے فرائض سرانجام دینا چاہئیں۔ اگر فردِ واحد کے ہاتھ میں ایک سے زیادہ اختیارات دے دیئے جائیں تو یہ ظلم ہوگا بلکہ ظلم عظیم ہوگا۔ کیونکہ اقتدار کی اپنی منطق ہے۔ یہ انسان کو کرپٹ کرتا ہے اور اگر وہ کلی اختیارات کا مالک ہو تو پھر کرپشن بھی اس نسبت سے بڑھے گی۔ جو لوگ پیغمبروں کی مثالیں دیتے ہیں وہ حقائق کی دنیا میں نہیں رہنا چاہتے۔ پیغمبروں کی تقلید تو ضروری ہے لیکن پیغمبر بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس میں سوائے رسوائی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ رتبہ بلند صرف منجانب اللہ ہوتا ہے۔ کیپٹل بلڈنگ جانے والے مرکزی بلیوارڈ پر بائیں ہاتھ لائبریری ہے جس کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔

Bring me men to match my mounta

اس فقرے میں پوری قوم کی امیدوں اور امنگوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ پہاڑی، بلندی، سرفرازی، استقامت اور فخر و مباہا کی علامت ہوتے ہیں۔ جس ملک میں پہاڑ نہ ہوں وہ ملک تو ہوتا ہے لیکن عظمت سے محروم ہوتا ہے۔ جس ملک کے عوام بھی پہاڑوں کی طرح بلند حوصلہ اور عالی ظرف ہوں تو پھر وہ قوم ہر اعتبار سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہو جاتی ہے۔ امریکہ کا سب سے اونچا پہاڑ ماؤنٹ وٹنی ہے۔ قریباً سولہ ہزار فٹ بلند۔ انہیں اس پر فخر ہے۔ ہمارے پہاڑ اس سے قریباً دوگنا بلند ہیں۔ ان مواقع پر لاکھ شعوری کوشش کے باوجود یہ کمبخت ذہن وطن عزیز کی طرف ضرور لوٹتا ہے۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ہم امریکہ سے دگنی بلندی پر کھڑے ہیں لیکن وہ انسان کہاں ہیں جو ان کے مقابل آ کھڑے ہوں؟ آدمی قد کاٹھ کی وجہ سے بونا نہیں ہوتا، اخلاقی گراوٹ، مفاد پرستی طمع اور جہالت قوموں کا قد چھوٹا کرتی ہیں۔ بظاہر بڑے طمطراق قد کاٹھ والے لوگ بھی اندر سے بونے ہو سکتے ہیں۔ ان کا ظرف بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

یادش بخیر' کوالالمپور میں سلطان کے محل کے پاس ہمیں گائیڈ بتا رہا تھا۔ ملائشیا میں نو سلطان ہیں۔ آئین کی رو سے ہر خاندان کا سلطان باری باری پانچ سال کے لئے بادشاہ بنتا ہے۔ گویا ہر خاندان کی باری چالیس سال بعد آتی ہے۔ جب وہ یہ لفظ دہرا رہا تھا تو میری نظروں کے سامنے ایک ہیولا ابھرا۔

زہرہ نگا ایران اور پاکستان کا تقابل کرتے ہوئے دھیمے مگر صرف سروں میں گنگنا رہی تھی۔

اگر ہے فرق جو کوئی تو بے ارادہ ہے

کہ میرے شاہوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے

یہاں نو سو سلطان ہیں۔ ہر قسم کے سلطان' حادثاتی سلطان' معجزاتی سلطان اور وارداتی سلطان۔

ہم کیپٹل بلڈنگ میں داخل ہوئے تو جی خوش ہو گیا۔ پرانے اور جدید فن تعمیر کا حسین امتزاج' پرانی عمارت کو ماڈرن فرنیچر سے آراستہ کیا گیا تھا۔ مرکزی دروازے سے پچاس قدم کے فاصلے پر گورنر کا دفتر تھا۔ دائیں ہاتھ کو مڑتی ہوئی سیڑھیاں دوسری منزل پر سینٹ ہال کی طرف کھلتی تھیں۔ دروازے کے ساتھ ہی انفارمیشن ڈیسک تھا جہاں ایک پکی عمر کی عورت نہایت خوشدلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ سیاحوں کے سوالات کا جواب دے رہی تھی اور مختلف سیکٹیر ز کے ساتھ ان کی ملاقات کا وقت طے کر رہی تھی۔ سیکٹیر سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جب ایک دفعہ اس کے انفارمیشن ڈیسک پر کہہ دیا کہ وہ فارغ ہے تو پھر اس سے ملاقات میں کوئی مشکل حائل نہیں تھی۔ ہم مرکزی دروازے میں سے اندر داخل ہو کر سیدھے گورنر آفس پہنچ گئے۔ ہر مرجانسن کے متعلق میرے تصورات نے جو تانے بانے بنے تھے اس کے بعد یہ جاننا ضروری تھا کہ وہ کہاں بیٹھتا؟ کیسے امور ریاست چلاتا؟ گورنر کے دفتر سے ملحقہ چھوٹے سے کمرے میں اس کی سیکرٹری بیٹھی تھی۔ جاتے ہی مون نے اسے بتایا کہ ہم گورنر کو ملنا چاہتے ہیں You are welcome وہ مسکرائی۔ لیکن بدقسمتی سے گورنر ایل اے گیا ہوا ہے۔ آپ چاہیں کل مل سکتے ہیں۔ میں ملاقاتیوں کی فہرست میں نام درج کر لیتی ہوں۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہمارا رکنا مشکل ہے کیونکہ ہمیں لیک طاؤ جانا ہے۔ کافی لوگ بلا روک ٹوک گورنر کے کمرے کے اندر باہر آ جا رہے تھے۔ یہ کس سے ملنے اندر جا رہے ہیں؟ میں اپنا تجسس چھپا نہ سکا۔

کسی سے بھی نہیں۔ صرف گورنر کا کمرہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ بھی چاہیں تو شوق سے اندر جا سکتے ہیں۔
ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو کافی لوگ اندر موجود تھے۔ سکیورٹی کا ایک اہلکار ایک کونے میں کھڑا تھا۔ درمیانے سائز کا کمرہ جسے ہمارے سیکرٹریوں کے کمرے زیادہ کشادہ اور آرام دہ ہوتے ہیں۔ میز پر رکھے ہوئے قلمدان میں دو پین اور پیچھے Non reclining Chair لوگ گورنر کی کرسی پر بیٹھ کر فوٹو کھنچوا رہے تھے۔ یہ دنیا کے سب سے بڑے ملک کی سب سے اہم ریاست کا گورنر تھا۔ جس کا رقبہ پاکستان سے زیادہ ہے۔ بارہ سو میل لمبا ساحل ہے۔ ایک ایک بڑی تجارتی کمپنی کا بجٹ وطن عزیز کے سالانہ بجٹ سے زیادہ ہے لیکن دفتر پھٹیچر سا۔ میرا سر "فخر" سے بلند ہو گیا۔ کوئی تو چیز ہے جس میں اہم امریکیوں سے برتر ہیں۔ اگر کیلیفورنیا کا گورنر لاٹ صاحب کا دفتر دیکھ لے تو نصر بن احمد کی طرح واپس امریکہ جانے کا نام بھی نہ لے۔ یہیں کسی کونے میں کھدرے میں زندگی کے بقیہ دن گزار دے۔
وائٹ ہاؤس ہمارے قصر صدارت کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ 10 ڈاؤننگ سٹریٹ وزیر اعظم کی رہائش گاہ کے آگے آہ کھینچتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سبحان اللہ قومی دولت کا اس سے بہترین مصرف اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہاں وزرائے اعظم نجی دوروں پر بھی قومی خزانے سے نکلوائے ہوئے ہزاروں ڈالر بادشاہوں کے خدام کو ٹپ دے آتے ہیں..... بادشاہوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں..... اگر سکندر یونانی زندہ ہوتا تو بڑی ندامت کے ساتھ پورس کو کہے ہوئے الفاظ واپس لے لیتا۔ مغل شہنشاہ ہمارے روحانی اجداد تھے۔ آخر سنہری روایات بھی تو کوئی چیز ہوتی ہیں۔ حاسد تاریخ کے گھومتے ہوئے پہیے کو نہیں دیکھتے صرف اس سے تعصب برتنا روا رکھتے ہیں۔
سارا پیٹر کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ میں کرسی پر بیٹھتی ہوں تم میرے پیچھے کھڑے ہو کر تصویر بنواؤ۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن تم کیلیفورنیا کے گورنر بن جاؤ گے۔
"گورنر اس نے بننا ہے اور کرسی پر تم بیٹھ رہی ہو؟ میں نے کہا۔
تو کیا تمہاری ملکہ نور جہاں مغل بادشاہ جہانگیر کے ساتھ تخت پر بیٹھ کر اسے سلطنت چلانے کے مشورے نہیں دیتی تھی" اس نے طنز کو میری طرف پلٹ دیا۔

ساتھ بیٹھتی تھی، تخت پر قبضہ تو نہیں کر لیتی تھی۔

بولی، ہاں یہ کرسی چھوٹی لیکن پیٹر کا دل بہت کشادہ ہے۔

کہیں اس میں نہ گم ہو جانا۔ ان راہوں پر نئی نئی چل نکلی ہو۔ کیتھی نے اسے کچوکا دیا۔

میں کلیسا میں داخل ہوئی ہوں جہاں عبادت کی جاتی ہے۔ صحرائے نیواڈا میں نہیں ہوں کہ بھٹک جاؤں گی۔

سبحان اللہ، کیا عارفانہ کلام ہے۔ ساری کائنات وجد کرنے لگی ہے۔ میں نے کیتھی کی بات کو آگے بڑھایا۔

یہ باتیں تم کتاب لکھنے یا پڑھنے والے نہیں سمجھ سکتے۔ بس اک نگاہ کافی ہوتی۔

نگاہ سے زیادہ صراحی کام کر گئی ہے۔ دختر رز اس قدر سریع الاثر ہو سکتی ہے، مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔

مون ان دونوں کی فوٹو لیتے ہوئے بولی۔ دراصل شعلہ پہلے سے موجود تھا صرف ایک لمحے نے اسے وقت کی قید سے آزاد کر دیا ہے۔

مجھ سے لکھوا لو، ایک نہ ایک دن تم نے اس کرسی پر ضرور بیٹھنا ہے۔

تمہاری رفاقت کسی گورنری سے کم نہیں۔ مجھے اب بھی ایسے محسوس ہو رہا ہے کہ میں فرمانروائے کیلیفورنیا ہوں۔ سارا شدت جذبات سے پیٹر کے ساتھ لپٹ گئی اور ہم نے شرما کر یا گھبرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

کافی دیر بلا روک ٹوک کیپٹل بلڈنگ کی سیر کرتے رہے۔ وہ ایک پاس جو مرکزی دروازے پر بیٹھی ہوئی ریسپشنسٹ نے ہمیں دیا تھا کھل جا سم سم کا اثر رکھتا تھا۔ ہر دروازہ کھلتا گیا۔ ہر دربان بچھتا گیا اور ہر دفتر میں ہمیں خوش آمدید کہا گیا۔ سینٹ کا اجلاس جاری تھا۔ ہم اوپر گیلری میں بیٹھے ہوئے تمام کارروائی بخوبی دیکھ اور سن سکتے تھے۔ ہر سیٹ کی ڈیسک کے ساتھ کمپیوٹر، مائیکروفون اور لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اسقاط حمل پر بڑی جاندار بحث ہو رہی تھی۔ ہر فریق اپنے حق میں تاریخ، بائبل اور منطق کا سہارا لے کر دلائل دے رہا تھا۔ کیتھولک فرقے سے تعلق رکھنے والے اسے قتل عمد قرار دے رہے تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ہر انسان اپنی روزی اور قسمت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ قسام ازل اس کی زندگی کا رخ روز اول سے ہی مقدر کر دیتے ہیں۔ اسے کسی قسم کے انسانی سہاروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر بچہ دراصل یہ پیغام لے کر آتا

ہے کہ ابھی تک خدا اپنے بندوں مایوس نہیں ہوا۔ جب اللہ تعالیٰ مایوس نہیں ہوا تو پھر انسان کو تردد اور فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اسقاط نہ صرف تخلیق کے عمل کو روکتا ہے بلکہ تذلیل انسانیت بھی ہے۔ اس میں نہ صرف ایک بلکہ دو انسانی جانوں کے جانے کا خطرہ بھی رہتا ہے۔ اس کے حق میں بھی بھرپور دلائل دیئے جارہے تھے۔ ایک سینیٹر فرط جذبات سے مغلوب ہو کر بولا ''حرامی بچہ حرامی ہی ہوتا ہے جسے یہ منافق' ترقی یافتہ معاشرہ بھی نہیں قبول کرتا۔ لفظ Bastard سے بڑی گالی اور کوئی نہیں ہے۔ بچے کی شخصیت پوری طرح ڈویلپ نہیں ہوسکتی۔ اس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی خلا ضرور رہتا ہے۔ محرومیاں' متحرک شخصیت پیدا نہیں کرسکتیں۔ خاص طور پر اگر اس میں اخلاقی پہلو نکلتا تو ہو۔ پھر ایک اور سنیٹر نے کہا' انسان اگر آزاد پیدا ہوا تھا تو پھر اس کی آزادی پر قدغن لگانے والے ہم کون ہوتے ہیں۔ زندگی میں بعض ایسے فیصلے ہوتے ہیں جو بہر حال اور بہر طور ہمیں خود کرنے پڑتے ہیں۔ چرچ کا یہ کام نہیں ہے کہ لوگوں کے بیڈروم میں گھس جائے.....

ہر فریق ایک دوسرے کا نقطہ نظر تحمل سے سن رہا تھا۔ کوئی غیر ضروری مداخلت نہیں ہو رہی تھی اور نہ ہی آوازے کسے جارہے تھے۔ یہ اسمبلیاں کوئی ربڑ سٹمپ نہیں ہیں جن پر ہماری طرح کے شاطر حکمران پہلے سے ہی مہر لگا دیتے ہیں۔ کوئی آواز ہز ماسٹر وائس نہیں ہوتی۔ کسی سوچ پر پہرہ نہیں بٹھایا جاتا' کسی قسم کی ترغیب وتحریص کام نہیں آتی۔ فضا میں ایک ہی بے نام نعرہ گونجتا رہتا ہے۔ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔ یہ آزادی انہیں اک دن یا ایک سال میں نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے لئے طویل جدوجہد کی گئی۔ آزادی ہم نے بھی مفت میں حاصل نہیں کی تھی۔ ایک قلزم خون تھا جسے عبور کر کے ہم آزادی کی منزل تک پہنچے۔ اس راہ میں ان گنت لوگ سربریدہ ہوئے۔ کتنے جوان جسم خاک اور خون میں غلطیدہ ہوئے۔ کتنے بوڑھے باپوں کی کمریں کمان بنیں۔ کتنی پتھرائی ہوئی بے نور آنکھوں نے اپنے سہاگ لٹتے ہوئے دیکھے۔ آج جب شہداء کی روحیں اس ملک کا طواف کرتی ہوں گی تو وہ ضرور مضطرب اور مضمحل ہوتی ہوں گی۔ اس تھوڑے سے عرصے میں ہم نے وطن عزیز کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ ہر طرف صوبائی عصبیت کے نہنگ جبڑے کھولے کھڑے ہیں۔ چار سو فرقہ واریت آکاس بیل کی طرح پھیل رہی ہے۔ لسانیت کا زہر معاشرے کے رگ و

پے میں سرایت کر گیا ہے۔ معیشت دم توڑتی ہوئی' غربت ہاتھ جوڑتی ہوئی' کاروان حیات تنگناؤں اور مہیب گھاٹیوں سے گزرتا ہوا اور صدائے جرس کارواں کانوں میں زہر گھولتی ہوئی۔ نہ منزل کا پتہ اور نہ نشان منزل.....

جب ہم کیپٹل بلڈنگ سے باہر نکلے تو دن کے دو بج رہے تھے۔ دراصل ماحول اس قدر پر کشش تھا کہ باہر نکلنے کو جی نہ جارہا تھا۔ مون خاص طور پر بہت خوش تھی کیونکہ اپنے خیال کے مطابق وہ مجھے صحیح جگہ پر لے آئی تھی۔

جانی' مجھے بھوک لگی ہے۔ آج پیزا کھایا جائے۔ پنیر' مکھن اور گوشت کا مرکب۔ کیا مزیدار غذا ہے۔ سارا پیٹر کا بازو تھامتے ہوئے بولی۔

کمال ہے! ہمیں علم نہیں تھا کہ دشمن جاں اور رگ جاں میں اس قدر کم فاصلہ ہوسکتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ میں نے اسے چھیڑا۔

مون بولی ''یہ تمہیں عورت نظر آتی ہے۔ یہ چھوٹی سی' پیاری سی منی سی گڑیا ہے۔

"Inflated Doll" کیتھی نے اس کی بات پکڑ لی۔ کم از کم شادی تک تو احتیاط کرو۔ اس قدر چربی والی غذا کھا کر پھول کر کپی بن جاؤ گی اور شاید..... تیسری ناکامی برداشت نہ کر پاؤ۔ اس بے رحم دریا نے کئی جواں جسم الکاہل تک پہنچائے ہیں۔

تو تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔ تمہیں بھی تو آخر کسی سہارے کی ضرورت ہے۔

میں کسی کی اترن نہیں پہنتی۔ تمہیں علم ہے کہ مجھے صاف ستھرا لباس پسند ہے۔

مون! میں آواگون کا قائل نہیں ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ پہلے جنم میں یہ رقیب رہی ہیں.....!

رقیب روسیاہ مون مسکرائی۔

کیتھی بولی ''دراصل مجھے اس کی پریم کہانی سے چڑ سی ہے۔ پہلے بھی میں نے اسے کٹھن راستوں سے گزرتے اور گرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے اعتراض صرف اس ڈرامے پر ہے جو اس نے سان فرانسسکو میں رچایا تھا۔ آخر اس قدر بیزاری چند لمحوں میں پیار میں کیسے بدل سکتی ہے؟

بدل سکتی ہے! میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''محبت عجیب چیز ہے۔ یہ حساب کا سوال نہیں ہے۔ کسی گدائے بے حیا کا کشکول بھی نہیں ہے۔ بس اک نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا۔

وہ لمحہ کسی وقت بھی انسان کی زندگی میں آ سکتا ہے۔

بالکل..... تم نے غور نہیں کیا۔ اس نوک جھونک میں بھی پیار کی خوشبو تھی' ایک سندیسہ تھا' ایک پیغام تھا!

''لیکن ابھی ابھی تو تم حیرانی کا اظہار کر رہے تھے!''

وہ مذاق تھا۔ ایک سخن گسترانہ بات تھی۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ جب دو دل ملتے ہیں۔ تو زندگی رقص کرتی ہے ہوائیں گنگناتی ہیں اور چار سو رنگ اور نور کی بارش ہوتی ہے!

شاہ! یو آر گریٹ..... سارا نے تشکرانہ نظروں سے مجھے دیکھا اور بچوں کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔

پیٹر کہنے لگا'' سارا ڈیئر تمہاری فرمائش کسی اور دن پوری کر دیں گے۔ آج شاہ کو ریلوے سٹیشن سے ملحقہ کسی کھوکھے میں کھانا کھلاتے ہیں۔ جہاں دو سو سال پہلے کا ماحول پیدا کیا گیا ہے۔''

پیٹر کی بات درست تھی۔ جب ہم ریلوے سٹیشن کے باہر پہنچے تو عجیب منظر تھا۔ دو سال پرانا تانگہ جس کے آگے دو گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ سیاحوں کو سیر کرا رہا تھا۔ مشکی رنگ کے گھوڑے' پاؤں دبانے سے ٹن سے بجنے والی گھنٹی' کوچوان کا لمبا چوغہ نما کوٹ' کان کٹی قمیص' کالی بولگائے اور گھٹنوں تک لمبے بوٹ پہنے اسی قسم Alang میں گفتگو کر رہا تھا۔ دو پستول اس کی Hip Pockets سے تانک جھانک کر رہے تھے۔ کانوں میں مندری اور چہرے پر خود رو داڑھی تھی۔ ہم نے فٹن میں کر کچھ دیر سیر کی۔ گو فٹن پرانی تھی اور اس میں گدوں کی بجائے پھٹے لگے ہوئے تھے لیکن گھوڑے بڑے صحتمند اور خوبصورت تھے۔ انسان نے بڑی ترقی کی ہے۔ ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے' چاند اور مریخ پر پہنچ گیا ہے۔ یہ راکٹوں' ہوائی جہازوں اور اڑن طشتروں کا دور ہے لیکن آدمی نے ہنور گھوڑے سے رشتہ ختم نہیں کیا۔ ایک عجیب طرح کا رومانس ہے جہاں ہوائی جہاز کی طاقت کی اکائی بھی ہارس پاور ہے' بی ایم ڈبلیو' مرسیڈیز اور فراری' تیز ترین کاروں کی ریس ہوتی ہے لیکن ہارس ریس سے فرار ممکن نہیں ہو سکا۔ آج بھی جو انڈو پنجر اور مزہ گھڑ دوڑ میں ہے وہ ان مشینی کال پرزوں میں کہاں؟ انسان چاہے رولز رائس ہی کیوں نہ چلا رہا ہو اپنے آپ کو نفسیاتی طور پر ڈرائیور ہی

محسوس کرتا ہے۔ لیکن اسپ تازی پر بیٹھے سوار کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ مغل شہزادوں کی سی سج دھج، انگلش بیرنز (BARONS) کا سا وقار اور عرب جنگجوؤں کا سا طمطراق، فلم وہی گرینجر والی کہلاتی ہے۔ جس میں گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور تلواروں کی جھنکار کے ساتھ طبل جنگ بجتا ہے نا کہ کاروں کی ٹکریں..... جن سے دلوں پر دہشت طاری نہیں ہوتی محض ڈاجم ڈارٹ کا سماں پیدا ہوتا ہے۔

کھوکھانما ہوٹل میں کھانے کے لئے داخل ہوئے تو ایسے لگا جیسے وقت نے بہت پیچھے مڑ کر دیکھا ہو۔ اوک وڈ سے بنا ہوا فرنیچر، میز اور بنچ نما کرسیاں اور دیودار کے ستونوں پر کھڑی ہوئی چھت، پرانی کٹلری، مٹی کے برتن، بار کے پیچھے کھڑا ہوا خشخشی داڑھی اور موٹی توند والا بار ٹینڈر۔ بلامرچ مصالحے کے مختلف اشیاء کا ملغوبہ جسے ''مین ڈش'' کا نام دیا گیا تھا۔ بیئر پینے کے لئے بڑے بڑے مگ جو اگر بھرے ہوئے ہوں تو دونوں ہاتھوں سے اٹھانے پڑیں۔ نیم پختہ دیواروں پر سجی ہوئی سنگل بیرل بندوقیں، ہر بندوق کے نیچے اس کی تاریخ لکھی ہوئی تھی کہ یہ کون سے آبادکار کے تصرف میں رہی اور اس سے کتنے ریڈ انڈین شکار ہوئے! کتنے علاقے مفتوح ہوئے! گویا سفید فام اقوام یہاں بسنے نہیں بلکہ شکار کھیلنے آتی تھیں۔ شکار بھی ایسا جس میں حیوان اور حیوان ناطق میں کوئی تمیز نہیں برتی جاتی۔ ہوسکتا ہے کہ عام جانوروں کے لئے ان کے دل کے کسی کونے کھدر میں جذبہ ترحم پیدا ہوتا لیکن انسانوں کے لئے سوائے نفرت، کدورت، بغض اور عناد کے کچھ نہیں تھا۔ مظہر العجائب! عجب نظام زندگی ہے۔ مشہور فرانسیسی مفکر روسو نے کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن وہ ہر طرف زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے یہ زنجیریں جبر و استبداد کی ہیں۔ ظلم اور زیادتی کی ہیں، انسان ازل سے ہی صید زبون شہریاری رہا ہے۔ انسان کی انسان کو غلام بنانے کی حرص اور ہوس نے کبھی دم نہیں توڑا۔ چشم عبرت نے کھوپڑیوں کے مینار بنتے دیکھے ہیں۔ اس نے اپنے ہی بھائی بندوں کو غلام بنایا ہے۔ اور ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا ہے۔ الغرض ''آدمی کا شیطان آدمی رہا ہے''..... زیرک، چالاک اور پیشہ ور لوگوں کا ایک گروہ تھا جو جذبہ جہاد نگیر لئے یہاں وارد ہوا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے حاکمیت قائم کرلی۔ اخلاقیات کے اپنے ضابطے ہوتے ہیں لیکن تاریخ کا پہیہ اپنی مقرر کردہ راہوں پر چلتا ہے۔ جرم ضعیفی کی سزا ازل سے مگر مفاجات رہی ہے اور شاید ابد تک رہے گی۔ باقی صرف وہ بچے گا جو طاقتور

ہوگا۔آج امریکہ دنیا کی سپر پاور ہے'اپنے آپ کو درست طور پر پولیس مین آف دی ورلڈ سمجھتا ہے ملک کے اندر لاکھ جمہوریت سہی لیکن باہر ان کا رویہ حاکمانہ اور غاصبانہ ہے Statue of Liberty کی روشنی میں سات سمندر پار تک نہیں پہنچ سکتی۔۔ایک اعتبار سے اسے امریکہ میں مقید کر دیا گیا ہے۔روشنی محدود ہوگئی ہے۔ابراہم لنکن نے بڑے فخر سے اعلان کیا تھا کہ آج سے غلام آزاد ہیں.....آج اگر وہ زندہ ہوتا تو دیکھتا کہ آزاد غلام بن گئے ہیں۔تیسری دنیا کی معیشت پابند سلاسل ہے'خارجہ پالیسی محکوم ہے'مقامی حاکم محض کٹھ پتلیاں ہیں۔جن کی ڈور واشنگٹن سے ہلتی ہے۔جہاں بیٹھے لوگ مالک ومختار ہیں۔جسے چاہیں شاہ بنادیں جس سے چاہیں گدا بنادیں۔آج کا حاکم کل کا اسیر'آج کا زردار کل کا فقیر'لٹتے عوام ہیں لیکن دولت ان کے بینکوں میں جمع ہوتی ہے وہ زر جو جمع کروانے والا کبھی نہیں نکلوا پاتا.....صرف ایک جھوٹی نفسیاتی تسکین کے سہارے زندگی کے باقی ماندہ دن ملکی جیلوں یا غریب الوطن ہو کر گزار دیتا ہے۔

آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک والے یہ سوچ کر ہنسی کے مارے دہرے ہو جاتے ہیں کہ ان کے اجداد نے ایمپائر کے جنون میں سفر کی صعوبتیں برداشت کیں'نامہربان موسم کی سختیاں جھلیں'نامناسب خوراک کھائی اور غیر مہذب زبان سے علیک سلیک کی۔سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے چند بھائی بندوں کو مروایا۔آج سب کچھ ان کے بغیر بھی حاصل ہو رہا ہے۔بس ایک اشارہ اور کچے دھاگے سے بندھی آئیں گی سرکاری میر.....

کھانا مزیدار نہیں تھا لیکن جب خیالات ماضی کے دھندلکوں کو چیرتے ہوئے پیچھے دوڑ رہے ہوں تو پھر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی پرواہ نہیں ہوتی۔مون میرے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے بولی'' مجھے پتہ ہے تم کیا سوچ رہے ہو۔

واقعی؟

ہاں'میں تمہاری ذہنی کیفیات کا بخوبی اندازہ کر سکتی ہوں۔

کاش میں بھی ایسا کر سکتا۔

بولی کنارے پر کھڑے کر ہو متلاطم سمندر کا اندازہ نہیں ہوتا۔اس کے لئے اندیشہ ہائے دور دراز سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو موجوں کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔

میں نے کہا کہ کیلیفورنیا کا سمندر بہت گہرا ہے اور میں ٹھہرا ایک اجنبی مسافر' جو نہ تو اس کی گہرائیوں میں اتر سکتا ہے اور نہ اس کی فضاؤں میں پرواز کر سکتا ہے۔

کیا معرفت کیا معرفت کی باتیں شروع ہوگئی ہیں۔ سارا تنک کر بولی۔ چلو جلدی کریں سورج غروب ہونے سے پہلے ہمیں لیک طاہو پہنچنا ہے۔

جو محبت کے بحرالکاہل میں ڈوب جائے اسے چھوٹی موٹی جھیلوں کا خوف نہیں رہتا نادان لڑکی۔

سیکرے مینٹو میں مختصر قیام کے بعد اس کے فاؤنڈنگ فادرز کی بصیرت کی داد دینا پڑی۔ چھوٹا سا پرسکون شہر جو اس وقت محض ایک قصبہ تھا۔ قانون دان بڑی سوچ بچار کے بعد قانون سازی کر سکتے ہیں۔ بڑے شہروں کے پریشر' خرابیاں اور منظم لابیاں یہاں نہیں ہیں۔ ہر چند کہ لابیوں کے کارندے کو یہاں آنے پر کوئی ممانعت نہیں ہے لیکن فاصلے بہر طور پر ہوتے ہیں اور فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہاں جو ایک قسم کی نفسیاتی فضا قائم ہوتی ہے وہ ایل اے سے یقیناً مختلف ہے۔ ویسے بھی بڑے شہروں میں ہزار مصروفیات نکل آتی ہیں Temptations ہوتی ہیں۔ پارٹیاں اور فنکشن ہوتے ہیں۔ رات بھر کا جاگا ہوا شخص صبح یکسوئی کے ساتھ خشک قانونی بحث میں حصہ نہیں لے سکتا۔ اسی لئے Dicey نے ہاؤس آف کامن کے متعلق کہا تھا: جب سیشن بہت طویل ہو جائے' لندن کا موسم خوشگوار ہونے لگے' سارے شہر میں جشن بہاراں ہو اور لوگ ترنگ میں آ کر گھروں کو چھوڑ کر کلبوں' پارکوں اور ساحل سمندر کا رخ کریں تو ممبران پارلیمنٹ بھی آخر انسان ہیں۔ ان کا دل خشک اور بور کر دینے والی طویل قانونی بحثوں میں کیسے لگ سکتا ہے۔ ایل اے تو نسبتاً ایک پرستان ہے۔ بلبلوں' قمریوں اور عندلیبوں کا دبستان ہے۔ پارٹیوں کے شروع ہونے کا وقت تو مقرر ہوتا ہے۔ اختتام کا تعین شرکاء خود کرتے ہیں۔ جب محفل رقص و سرود ہو' ناؤ نوش پانی کی طرح بہتا ہو' رہزنان تمکین و ہوش چار سو پھیلے ہوئے ہوں تو پھر ہر کا غزائیں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولی لگتا ہے۔

شہر سے نکلے تو یوں محسوس ہوا جیسے سارا فرانسسکو لیک طاہو جا رہا ہے۔ کشادہ سڑکیں بھی تنگ لگتی تھیں۔ ویک اینڈ تھا۔ چھٹیاں گزارنے کا اس سے بہتر اور کونسا مقام ہو سکتا تھا۔ امریکہ میں ارتکاز زر نہیں ہو سکتا۔ پیسہ

ہاتھ بدلتا رہتا ہے۔ تنخواہ مہینے اختتام پر بھاپ بن کر اڑ جاتی ہے۔ کیونکہ ہر جگہ لمحہ موجود کی حکمرانی ہے۔

تو چرا باشی بفکر مبتلا کار ساز ما بفکر کار ما

ہر چند یہ الفاظ اہل مشرق کے ہیں لیکن ان پر عمل مغرب میں ہو رہا ہے ہر شخص کو بیسیوں قسم کی اقساط دینی پڑتی ہیں۔ گاڑی کی قسط' ہیلتھ انشورنس' انکم ٹیکس' اسٹیٹ ٹیکس' مکان کی قسط' فرنیچر کی قسط وغیرہ اور اگر کوئی رقم بچ جائے تو ویک اینڈ چرچ ہو جاتی ہے۔ ماحول اور معاشرہ فکر فردا سے آزاد رہتا ہے۔ محو غم دوش' صرف اہل مشرق ہوتے ہیں جنہیں شاید اتنی اپنی فکر نہیں ہوتی۔ جتنا خیال آنے والی نسلوں کا ہوتا ہے۔

گاڑی تیزی سے طاعو کی طرف روانہ تھی۔ سڑک کے دورویہ پائین کے درختوں کا گھنا جنگل شروع ہو گیا تھا جو سبز لباس پہنے سپاہیوں کی طرح کھڑے تھے۔ جب ان میں سے تیز ہوا گزرتی ہے تو عجیب سائیں سائیں کی آوازیں آتی ہیں۔ ہم طاعو سے تیس میل دور تھے کہ اچانک بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ پہلے چند قطرے گرے پھر ہلکی پھوار اور اس کے بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ سارا علاقہ جل تھل ہو گیا۔ ہریالی کے سمندر پس منظر میں بارش بہت بھلی لگتی ہے۔ ہم موسم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک پیٹر کے پاؤں بریک پر جا لگے۔

''خیریت تو ہے!'' ہم نے گھبرا کر پوچھا۔

''کوئی گڑبڑ ہے'' اس نے گاڑی لگے ہوئے راڈار کی طرف اشارہ کیا جس نے کسی پلے کی طرح چوں چوں شروع کر دی تھی۔ آگے پولیس بھاری تعداد میں کھڑی ہے۔

تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ تم کونسا مجھے اغوا کر کے لے جا رہے ہو۔ سارا مسکرائی۔

اور اگر پولیس مجھے پکڑ کر لے گئی تو؟

تو کیا اس ملک میں پیٹروں کی کمی ہے کوئی اور آ جائے گا۔ کیتھی نے گلا صاف کیا۔ کچھ آگے بڑھے تو واقعی پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں جن پر سرخ اور نیلی بتیاں جل رہی تھیں۔

پیٹر تمہیں ہزار بار کہا ہے کہ گاڑی تیز نہ چلایا کرو۔ اب بھگتو'' سارا نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی

ٹریفک پولیس کا سارجنٹ ہمارے قریب آیا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا آپ لوگ آگے نہیں جا سکتے۔

بارش کی وجہ سے لینڈ سلائیڈ ہوگیا ہے۔ پہاڑ سے مٹی کا ایک بہت بڑا تودا گرا ہے جس نے ساری سڑک کو بلاک کر دیا ہے۔

برے پھنسے! پیٹر زیر لب بڑبڑایا! اس کو صاف کرنے میں کتنا وقت لگ جائے گا؟ کم از کم آٹھ گھنٹے۔ بارش کے بعد کام شروع ہوگا۔ سیکرے مینو سے بلڈوزر چل پڑے ہیں۔

تو واپس چلیں! میں نے مایوسی میں مون کی طرف دیکھا۔

کیا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہے! ٹریفک سارجنٹ نقشہ دیکھتے ہوئے بولا۔ لیکن وہ بڑا خطرناک اور نسبتاً طویل ہے۔ یہ گولڈ ویلی سے ہو کر گزرتا ہے۔

پیٹر ہم ضرور جائیں گے۔ مون نے فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ خطروں کا کیا ہے ویسے بھی زندگی کے ہر گام پر کوئی نہ کوئی رسک موجود رہتا ہے۔

پیٹر نے گاڑی موڑی۔ ہم کوئی دس میل پیچھے کی طرف گئے اور پھر وہ اچانک دائیں ہاتھ مڑ گیا۔ جہاں سڑک واقعی تنگ تھی۔ ہوا تیز تھی اور یوں لگتا تھا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہے اور بارش نے آج ہی برسنے کی قسم کھائی ہے۔ پہاڑ سے پانی شوریدہ سر ندیوں کی طرح گھاں گھاں کرتا نیچے بہہ رہا تھا۔ بعض جگہوں پر سڑک بالکل زیر آب آ گئی تھی۔ ہوا کے زور سے درخت جھک کر سڑک کو چھو رہے تھے۔ وقفے وقفے سے بجلی اس زور سے کڑکتی کہ سارا جنگل گونج اٹھتا۔ بائیں ہاتھ گھنا جنگل جس میں چیڑ، دیودار اور دیگر کئی قسم کے درختوں کی بھرمار تھی۔ دائیں ہاتھ اجڑی ہوئی بستیاں جن میں سوائے جنگلی گیدڑوں اور حشرات الارض کے اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔

''کسی زمانے میں یہ بستیاں آباد تھیں۔ پیٹر بتانے لگا ''کان کن، سوداگر، چور اُچکے اور طوائفیں..... یہ سب ''گولڈرش ایرا'' کے باعث یہاں آئے تھے۔ ظاہر ہے جہاں پیسہ ہوگا وہاں یہ طبقات کسی نہ کسی رنگ میں کسی نہ کسی روپ میں ضرور موجود ہوں گے۔ تاجر، جو اشیائے خورد و نوش سونے کے بھاؤ بیچتے تھے۔ ڈاکو، جو موقع پا کر ان گھنے جنگلوں سے نکلتے اور قافلے لوٹ لیتے۔ زنانِ بازاری، جو پیسے کے ساتھ ساتھ نقدِ دل بھی لوٹ لیتیں۔ سونے کی دریافت نے لوگوں کی تقدیر بدل ڈالی۔ جو ڈاکوؤں اور

طوائفوں کی دستبرد سے بچ گئے انہوں نے سان فرانسسکو اور ایل اے میں بڑی بڑی جاگیریں خریدیں یا واپس یورپ جا کر نائیٹ اور بیرن بن گئے۔"

"بڑی حیران کن بات ہے۔ ان دنوں جب مواصلات کا نظام نہ ہونے کے برابر تھا، یہ خبر یورپ کے چپے چپے میں کس طرح پھیلی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

بولا "دولت کی اپنی ایک طاقت اور کشش ہوتی ہے۔ سورج کی ہر شعاع سونے سے ٹکرا کر یہ پیغام کونے کونے میں پہنچاتی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب آسٹریلیا میں سترہویں صدی میں سونا دریافت ہوا تو چینیوں کے علاوہ کابل کے پٹھان بھی اپنے اونٹ لے کر اس نئی دنیا میں پہنچ گئے تھے جنہیں اہل آسٹریلیاں گھان بولتے تھے۔ آج بھی آسٹریلوی ریلوے کی سب سے بڑی ٹرین گھان ایکسپریس ہے۔

بجلی زور سے کڑکی اور جنگل میں گری۔ آواز اس قدر دہشت ناک تھی اور روشنی اتنی تیز کہ سارا ڈر کر پیٹر سے لپٹ گئی۔

"خدا کے لئے آرام سے بیٹھو!" پیٹر نے پہلی مرتبہ اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔ "اگر اپنا نہیں تو مہمانوں کا خیال کرو۔ گاڑی سلپ ہو کر گہری کھائی میں گرنے لگی تھی۔"

"تو روک دو! چلو باہر بارش میں بھیگتے ہیں۔ قسم سے بڑا مزہ آئے گا۔ ایڈونچر۔ ہاہاہا، ہی ہی ہی، ہوہوہو!" اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

کیتھی زچ ہو کر بولی "ہم یہاں ٹھہرتے ہیں تم اور پیٹر جنگل میں جا کر ایڈونچر کر لو۔ مجھے یقین ہے کہ صبح ریاستی انتظامیہ کی کوئی نہ کوئی ہیلی کاپٹر تمہیں زندہ یا مردہ تلاش کر لے گا۔"

"پہلے مجھے شک تھا لیکن اب مجھے یقین ہو چکا ہے کہ تم ہم سے جلنے لگی ہو!"

"احمقوں سے جلا نہیں کرتے ہمدردی کی جاتی ہے۔" میں نے کیتھی کو سمجھایا۔ "محبت دیوانی ہوتی ہے یہ اندیشہ ہائے دور دراز سے بے نیاز ہوتی ہے۔ یہ عمر اور یہ موسم..... ان لمحوں میں عقل نہیں جذبے بولتے ہیں۔"

''کیا خوبصورت کی ہے'' مون تھرماس سے کافی نکالتے ہوئے بولی۔ ''جی کرتا ہے کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔ بس بارش ہوتی رہے، تیز اور مست ہوائیں چلتی رہیں، جنگل گیت گاتا رہے اور کڑکتی ہوئی بجلی کی روشنی ہمارے وجود میں اتر جائے۔''

چلتے چلتے ہم نے کافی پی اور سینڈوچز کھائے۔ وہی سفر جو پہلے بڑا طویل اور کٹھن لگتا تھا ایک بے نام قسم کا سکون دینے لگا۔ ایک دو جگہ پہاڑی نالے اس قدر تیزی کے ساتھ بہہ رہے تھے کہ ہمیں کچھ دیر کے لئے رکنا پڑا۔ بہر حال سفر کٹنا تھا کٹ گیا۔ جب ہم لیک طاہو کے کنارے پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ تیز بارش ہلکی پھوار میں بدل گئی تھی۔ بادل کافی حد تک چھٹ گئے تھے صرف ایک آوارہ ٹکڑی اپنی آخری حسرت نکال رہی تھی.....

گاڑی سے اتر کر میں نے چار سُو دیکھا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو۔ بیس میل کے دائرے میں پھیلی ہوئی جھیل کا پانی اس قدر شفاف تھا کہ اسی فٹ نیچے تک کی ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ گلاس میں پڑا ہوا پانی بھی شاید اس قدر شفاف نہیں ہوتا۔ اس کی تہہ میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ اردگرد پائین سے ڈھکے ہوئے برف پوش پہاڑ تھے۔ پہاڑ اور سڑک کے درمیان خودرو جنگلی پھول کھلے تھے۔ جھیل کے سینے پر بے شمار بادبانی کشتیاں ڈول رہی تھیں۔ کناروں کے قریب اٹھکیلیاں کرتے ہوئے راج ہنس سیاحوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں کوئی ڈر نہیں تھا۔ خوف سے پانی میں ڈبکی نہیں لگاتے تھے۔ ٹورسٹ چپس اور ٹافیوں سے ان کی تواضع کر رہے تھے۔ آلو کا ایک قتلہ فضا میں بلند ہوتا اور ٹپ میں پانی میں جا گرتا۔ پرندے ایک ڈبکی لگاتے اور اسے اپنی چونچ میں دبائے سطح آب پر آ کر خوشی سے قیں قیں شروع کر دیتے۔ اس پر سیاح مسکراتے اور بچے تالیاں بجاتے۔ جھیل کے ساتھ جنگلہ لگا ہوا تھا۔ لائف گارڈ احتیاطاً قریب ہی کھڑے تھے۔ بچے بچے ہوتے ہیں، بے خیالی میں پاؤں پھسل سکتا ہے۔ ہر چند کہ مچھلی کی طرح یورپین لوگوں کے بچے بھی جماندرو تیرک ہوتے ہیں لیکن احتیاط لازم ہے۔ بعض اوقات خوف کی وجہ سے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور جس طرح ہرن چوکڑی بھول جاتا ہے، تیراکی بھی نہیں ہو سکتی۔ موسم میں خنکی تھی، ہوا تیز تھی لیکن وہاں کھڑے کھڑے بڑا سکون اور مسرت محسوس ہو رہی

تھی۔ مون بتانے لگی "یہاں نیواڈا اور کیلیفورنیا بغلگیر ہوتے ہیں۔ یہ جو دائیں ہاتھ سڑک دیکھ رہے ہو، یہ حدِ فاصل ہے۔ دائیں طرف نیواڈا اور بائیں جانب کیلیفورنیا..... جھیل بھی اس اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہوگئی ہے..... صحرائے نیواڈا کو دیکھ کر جن لوگوں کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں انہیں یہاں بھی آنا چاہئے وہ خاصی تراوٹ محسوس کریں گے۔"

"ہاں صحبت کا اثر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کل کلاں میں بھی رختِ سفر باندھوں اور ساری دنیا گھوم ڈالوں!"

"پاکستان تمہارا انتظار کرے گا!"

"وہ میں کیسے بھول سکتی ہوں..... بھولے.....!" وہ مسکرائی۔

مون نے درست کہا تھا۔ ہر چند کہ نظارے ایک جیسے تھے، ماحول یکساں تھا، جھیل بھی دونوں ریاستوں کے ساتھ فلرٹ کر رہی تھی لیکن اس کے باوجود ان کے مزاج میں بڑا فرق تھا..... ایک زاہد خشک دوسرا عنبر و مشک، ایک میں قمار بازی قانوناً منع تھی اور دوسرا اس کے فروغ کے لئے نئے نئے قانون بنا رہا تھا۔ پیسہ کمایا ایک حصے میں جاتا تھا اور لٹایا دوسرے میں..... ایک روایات کا غلام، دوسرا اسپ بے لگام..... نیواڈا والے حصے میں کیسینوز اور بلند و بانگ عمارات کی بھرمار تھی اور کیلیفورنیا میں خاموشی کا طلسم چھایا ہوا تھا۔ پہاڑ برف کی چادر اوڑھ کر سو گیا تھا۔ پائین غنودگی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے اکثر سیاح حیران ہوتے ہیں کہ کیلیفورنیا اپنے کیسینو کیوں نہیں کھول لیتا۔ یہاں بھی مافیا کا خوف، ان کی طاقت اور اثر و رسوخ مانع ہیں۔ الیکشن کے افراد اور پارٹیوں کو پیسہ چاہئے اور اتنی کثیر رقم صرف بگ بزنس دے سکتی ہے اور یہ تو مسلمہ امر ہے کہ He who pays the piper has also the right to call for the tun پچاس ارب ڈالر کی سرمایہ کاری مدمقابل برداشت نہیں کرسکتی۔ ویسے بھی ایک بندوق کی گولی پانچ ڈالر کی ہوتی ہے اور جب یہ بندوق کے بیرل سے نکلتی ہے تو پھر ظالم کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔ حادثہ میں ہٹن کے کسی فلیٹ یا شاہراہ پر ہوتا ہے اور جشن شکاگو یا ویگاس کے کسی خفیہ اڈے پر منایا جاتا ہے۔ متوفی کے لئے جو سب سے پہلے دستِ دعا اٹھتا ہے وہ اکثر قاتل

کا ہوتا ہے۔ مافیاز میں ایک انڈر سٹینڈنگ ہوتی ہے۔ کچھ رولز آف دی گیم ہوتے ہیں۔ بنارسی ٹھگوں کی طرح انہوں نے بھی علاقے اور شعبہ ہائے تجارت بانٹ رکھے ہوئے ہیں۔ بدقسمتی سے کوئی اجنبی درمیان میں حائل ہو گیا تو گھائل کر دیا گیا۔ ضابطے اور اصول اس قدر سخت ہیں کہ ہر کام بروقت تکمیل پاتا ہے۔ غفلت اور سستی ناقابل معافی جرم ہیں۔ ان کی پاداش میں وارنٹ گرفتاری جاری نہیں ہوتا، بلیک وارنٹ آجاتا ہے۔ بمبئی میں اسے سپاری کہتے ہیں تلمیحاً ہم اسے نہاری کہہ سکتے ہیں۔ ناشتہ کرنے کے اپنے اپنے طریقے ہیں۔ کب اور کس چیز سے کیا جاتا ہے! کبھی کبھی یہ آپس میں بھی ٹکرا جاتے ہیں۔ مفادات کی جنگ بڑی ہولناک ہوتی ہے۔ ڈان مر جائے تو دوسرا ڈان تیار ہوتا ہے۔ جانشینی پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے۔ لیڈر شپ بعض اوقات اجتماعی بھی ہوتی ہے۔ پولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ان کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔ اربابِ حکومت، ممتاز قانون دان ان کے پے لسٹ پر ہوتے ہیں۔ اب اسے اتفاق کہیں یا حکمتِ عملی کہ 'پے لسٹ' اور 'ہٹ لسٹ' میں بال برابر فاصلہ ہوتا ہے۔ اربابِ بست وکشاد جب تک ان کے اشاروں پر چلتے رہتے ہیں تو محفوظ رہتے ہیں اور کبھی بالفرض ضمیر جھنجھوڑ بیٹھے تو پھر آناً فاناً فانی ہو جاتے ہیں۔

مرکزی سڑک کے ساتھ ہی سب سے بڑا کیسینو حارا (HARAS) ہے جو اتفاقاً اسم بامسمّی ہے یعنی جو بھی گیا وہ ہارا..... اٹلانٹک سٹی کے برعکس اس کی پارکنگ لاٹ گراؤنڈ پر ہے، سات منزلہ نہیں۔ پارکنگ کا رقبہ، کیسینو سے چار گنا بڑا ہے۔ گاڑی پارک کر کے مرکزی عمارت تک آتے آتے ٹانگیں تھک جاتی ہیں۔ مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوں تو دائیں ہاتھ انڈر گراؤنڈ 'جوائے لینڈ' ہے۔ چونکہ بچے کیسینو میں نہیں جا سکتے اس لئے قیمتی اشیاء کی طرح انہیں بھی والدین وہاں 'ڈیپازٹ' کرا دیتے ہیں۔ وہاں ان کی سکیورٹی کا مناسب انتظام ہے۔ کوئی بچہ نہ تو گم ہو سکتا ہے اور نہ اجازت کے بغیر باہر آ سکتا ہے۔ ماحول اس قدر اعلیٰ ہے اور مشینوں کی اس قدر بہتات کہ والدین آ بھی جائے تو وہ مزید کھیلنے کیھد کرتے ہیں اور ان کو بہلا پھسلا کر اس معصوم طلسم ہوشربا سے باہر نکالنا پڑتا ہے۔

کیسینو کے اندر ایک دنیا آباد تھی۔ ایک طویل راہداری جس کے دونوں اطراف صوفے بچھے تھے۔ دیوار تا دیوار قالین، دیواروں پر پڑی قیمتی تصویریں، جگہ جگہ پھولوں کے گملے دھرے ہوئے تھے.....

ویک اینڈ کی وجہ سے بڑا رش تھا۔ چودہ منزلہ کیسینو پورا بک ہو چکا تھا۔ ہمیں کوئی دشواری پیش نہ آئی کیونکہ پیٹر نے پہلے ہی بکنگ کروالی تھی۔ امریکہ میں بہتر طریقہ بھی یہی ہے کہ ایڈوانس ریزرویشن کروالی جائے۔ کریڈٹ کارڈ کا نمبر دینے سے کرائے کی رقم خود بخود اکاؤنٹ سے نکل جاتی ہے۔ کرایہ عام طور پر فکس نہیں ہوتا۔ ریٹ بدلتے رہتے ہیں۔ ویک ایڈ پر عموماً دگنا ہو جاتا ہے۔ دراصل ساری معیشت سپلائی اینڈ ڈیمانڈ کے اصول پر چلتی ہے۔ وہی چیز جو عام طور پر سو ڈالر کی ملتی ہے، سیزن ختم ہونے پر آدھی قیمت میں سیل کی صورت میں دستیاب ہو جاتی ہے..... وہی کیسینو جو ہفتے کے ورکنگ ڈیز میں آپ کو 'جی آیا نوں' کہتے نہیں تھکتے چھٹی کے دنوں میں آنکھیں پھیر لیتے ہیں اور الٹا گاہکوں سے منت سماجت کرواتے ہیں۔

کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے ریسپشنسٹ نے ہمیں قدرے حیرت سے دیکھا۔

''ہمیں تین کمرے چاہئیں۔ ایڈوانس بکنگ ہو چکی ہے۔'' پیٹر اس کی بوکھلاہٹ سے حظ اٹھاتے ہوئے بولا..... اس نے کریڈٹ کارڈ کمپیوٹر میں ڈالا، ''مشین تائید کر رہی ہے، میرے خیال میں آپ پہلی مرتبہ یہاں آئی ہیں؟'' وہ براہ راست مون سے مخاطب ہوا۔

''شاید! لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ ہم یقیناً ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔''

''کیا یہ بتانا ضروری ہے؟'' وہ مسکرایا۔ ''ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اپنی آمد کا خود پتہ دیتے ہیں۔''

''میں سمجھی نہیں.....؟'' مون بدستور حیران تھی۔

''تو آج جھیل کی سیر ضرور کرنا۔''

''کیا تمہاری کمرشل کتاب کا یہ پہلا درس ہے؟''

''کوئی تحریر اس قدر شفاف نہیں ہو سکتی۔ ویسے بھی کچھ تحریریں سوچ کر نہیں لکھی جاتیں، لفظ خود بخود وجدان پر اترتے ہیں۔'' اس نے کمپیوٹر پر ہمارے نام درج کئے اور چابیاں پیٹر کو دیتے ہوئے بولا ''ہیوائے نائیس ٹائم! میں نے آپ کو بہترین کمرے دیئے ہیں۔ ان کی کھڑکیاں جھیل کی طرف کھلتی ہیں جہاں سے پوری رات کا چاند صاف نظر آتا ہے۔ برف پوش چوٹیوں سے اترتی ہوئی ہوائیں اپنے ساتھ کئی

سندیسے لاتی ہیں۔"

کمرے اب بھی تین ہی تھے لیکن مکینوں کی ترتیب بدل گئی تھی۔ ایک کمرہ مجھے ملا تھا دوسرے میں مون اور کیتھی تھیں، تیسرا جو نسبتاً کشادہ اور زیادہ سجا ہوا تھا، پیٹر اور سارا کے حصے میں آیا تھا۔

"یہ بڑی زیادتی ہے" کیتھی نے احتجاج کیا، "کل تک یہ ہمارے ساتھ زمین پر چلتی تھی آج تم نے اسے آسمان پر بٹھا دیا ہے۔ یہ تو مجھے برائیڈل سوئیٹ لگتا ہے۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔ ہم کل شادی کر رہے ہیں!"

"کیا واقعی.....؟" ہم تینوں کی زبان سے بیک وقت نکلا۔ "آخر جلدی کیا ہے؟ سارا کے والدین کو تو اطلاع دی ہوتی!"

"وہ کل صبح پہنچ رہے ہیں۔ ہم نے رسمی اجازت لے لی ہے۔"

"لیکن برائیڈل ڈریس اور دیگر انتظامات کرنے ہوں گے!" مون نے پوچھا۔

"سب انتظامات مکمل ہیں۔" پیٹر بولا، "امریکہ میں اگر ہاتھ میں موبائل فون ہو اور جیب میں پیسے تو سارے کام خود بخود ہو جاتے ہیں..... سارا کا ماپ ہوا کے راستے ٹیلر ماسٹر تک پہنچ چکا ہے، ہیرے کی انگوٹھی اور جیولری کیسینو کی شاپ سے مل جائے گی کیونکہ ان کے لئے یہ روزمرہ کا معمول ہے۔"

"آخر اتنی جلدی کیا تھی؟" کیتھی کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تاخیر کی بھی کوئی وجہ ہونی چاہئے۔ جس کام نے بالآخر ہونا ہے اس میں جلد یا بدیر کا کوئی فرق نہیں پڑتا" پیٹر مسکرایا۔ "پھر یہ متلون مزاج لڑکی ہے کیا پتہ کل کلاں پھسل جائے یا روٹھ جائے۔"

"یا پھر کوئی قینچی اس ڈور کو کاٹ ڈالے؟" سارا اس ہیئر ڈریسر کو ابھی تک نہیں بھولی تھی۔

"لیکن لڑائی جھگڑا تو شادی کے بعد بھی ہو سکتا ہے بلکہ اکثر ہوتا ہے....." میں نے کہا۔

"اس میں اور اس میں بڑا فرق ہے!" پیٹر نے وزاحت کی۔ "ازدواجی جھگڑے دودھ میں ابال کی طرح ہوتے ہیں۔ غصہ آیا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ شام کو میاں بیوی نے ایک ہی گھر جانا ہوتا ہے، ایک ہی کمرے میں سونا ہوتا ہے..... لیکن افیئر کے دوران ناراضگی ہو جائے تو پھر کوئی ایل اے چلا جاتا ہے اور کوئی

سان فرانسسکو میں آہیں بھرتا ہے۔"

"ایک رات نے تمہیں فلاسفر بنا دیا ہے۔ کیسی پختہ باتیں کر رہے ہو۔ ہنی مون منانے کا کہاں ارادہ ہے؟" کیتھی متاثر لگتی تھی۔

"ہوائی.....!" دونوں بیک زبان بولے۔ "ہم نے سوچ سمجھ کر اس جزیرے کا انتخاب کیا ہے۔"

"امریکہ میں اور بھی خوبصورت مقامات ہیں۔ چاہو تو ساری زندگی جھیل کے کنارے گزار سکتے ہو۔ پھر اتنی دور جانے میں کیا مصلحت ہے؟"

"دراصل ہم ایک اعتبار سے شاہ کے ممنون ہیں۔ اگر یہ سان فرانسسکو نہ آتا تو پھر شاید یہ دو دل اس طرح کبھی نہ ملتے۔ لہٰذا ہم نے پروگرام بنایا ہے کہ اس کو ہوائی میں خدا حافظ کہا جائے کیونکہ اس نے ہانگ کانگ ہوائی سے ہو کر جانا ہے۔"

"ایک پنتھ دو کاج!" سارا بے ساختہ بول اٹھی۔

"تو وہ بھی بتا دو۔ کون سا تمہیں اپنی زبان پہ اختیار ہے!"

"بعض راز ایسے ہوتے ہیں جو بتائے نہیں جا سکتے۔ اِٹ۔ اِز۔ اے۔ اسٹیٹ سیکرٹ" وہ عمداً اٹک اٹک کر بولی۔

"وہ اسٹیٹ سیکرٹ والا لطیفہ سنا ہوا ہے؟" پیٹر نے پوچھا۔

"نہیں تو!"

بولا "ہر چند پرانا ہے لیکن اس کی تازگی ختم نہیں ہوئی اور اس کا اطلاق آسانی سے اکثر سربراہان حکومت پر کیا جا سکتا ہے".....

"اب سناؤ گے بھی یا بجھارتیں ہی بجھواتے رہو گے" کیتھی نے اسے ٹوکا۔

"روس میں کسی شخص نے ترنگ میں آ کر کہہ دیا کہ خروشیف ایڈیٹ ہے۔ بس پھر کیا تھا فوراً دھر لیا گیا۔ مقدمہ چلا اور فاضل جج نے اسے پچیس سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ تاریخی فیصلے میں اس نے لکھا

Five years for insulting a state official and twenty years

divulging a state secre (پانچ سال ایک سرکاری اہلکار کی توہین کرنے کے جرم میں اور بیس سال ایک بہت بڑا ریاستی راز افشا کرنے کی پاداش میں)۔

''دراصل اس لطیفے کے پس پردہ بھی وہ گہری نفرت چھپی ہوئی ہے جو امریکیوں نے روس کے لئے پال رکھی ہے۔ نکسن نے اپنی کتاب میں اس کو اخلاقیات سے گرا ہوا ایک ایسا جاہل، گنوار، اجڈ اور غیر مہذب شخص گردانا ہے جو صرف طاقت کی زبان سمجھتا ہے۔ جس کی حس مزاح سے خنزیر کی پگھلی ہوئی چربی کی بو آتی ہے، جو صرف گفتار کا غازی ہے، کردار کا لفظ اسے چھو کر بھی نہیں گزرا۔''

کہنے لگا ''واقعی حیرانی ہوتی ہے کہ ایسا شخص اتنی بڑی سپر پاور کا سربراہ کیسے بن گیا۔ جس ملک نے لینن اور اسٹالن جیسے تاریخ ساز حکمران پیدا کئے ہوں اور وہاں ایسے مسخرے کا اقتدار سنبھالنا قسمت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے.....''

''ایسی بات نہیں'' میں نے اختلاف کیا۔ ''اس کے پاس کوئی الہ دین کا چراغ نہیں تھا۔ بخت نصر کی طرح وہ ایک جست لگا کر بھی ایوانِ اقتدار میں نہیں پہنچا تھا۔ وہ ایک نہایت زیرک، چالاک اور دور اندیش انسان تھا جس نے بتدریج اور بمراحل وزارتِ عظمیٰ حاصل کی۔ وہ اسٹالن کا دستِ راست تھا لیکن دست درازی کا انجام جانتا تھا۔ ایک دفعہ جب وہ کسی تقریب میں اسٹالن کے مظالم کا ذکر کر رہا تھا تو ایک چٹ ہاتھ بدلتی ہوئی اس تک پہنچی۔ اس پر لکھا تھا..... اس وقت تم کہاں تھے؟ ''یہ چٹ کس نے لکھی ہے؟'' وہ غصے سے دھاڑا۔ مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ ''میں پوچھتا ہوں یہ چٹ کس نے لکھی ہے، وہ کھڑا ہو جائے۔'' لوگ بدستور خاموش رہے..... اس پر خروشیف نے ایک زبردست قہقہہ لگایا..... ''برخوردار.....'' وہ چٹ لکھنے والے گمنام شخص سے مخاطب ہوا ''میں اس وقت وہاں تھا جہاں اس وقت تم کھڑے ہو۔'' تمام محفل کشت زعفران بن گئی۔

''آخر تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو؟'' پیٹر بات ختم کرنا چاہتا تھا۔

''جو تم نہیں کر پائے۔ اگر خروشیف کی جگہ اسٹالن ہوتا تو کیوبا کرائسس کے بعد دونوں ملکوں کے قصے تاریخ کے مدفن میں ملتے۔ اس نے دنیا کو ایک بہت بڑی تباہی سے بچا لیا۔ اپنی غلطی کا اعتراف بھی

تو ایک قسم کا بڑا پن ہے۔ انانیت اکثر اچھے خاصے سیانوں کو بھی پاگل بنا دیتی ہے۔"

"پیٹر ڈیئر! شاہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" سارا معصومیت سے بولی، "اگر ایٹمی جنگ چھڑ جاتی تو آج یہ خوبصورت جھیل گرنیڈ کینیون بن جاتی۔ پہاڑوں کی سفید برف بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو جاتی۔ جزائر ہوائی بھک سے اڑ جاتے۔ پھر ہم ہنی مون کہاں مناتے؟"

"ہاں جانی، اس نے ہم پہ ذاتی احسان کیا ہے۔ واقعی بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ آج اگر آنجہانی زندہ ہوتے تو ہم اپنی شادی کا کارڈ بھیجتے، ریٹرن ہوائی ٹکٹ ارسال کرتے اور عین ممکن ہے کہ وہ یہاں قدم رنجہ فرماتے کیونکہ معزولی کے بعد انہیں امریکہ آ کر میکڈونلڈ کا برگر کھانے اور جن پینے کی بڑی حسرت تھی....." پیٹر سارا کی سادگی سے حظ اٹھاتے ہوئے مسکرایا۔

"کیا پھولوں کی سیج پر بارود کی راکھ بکھیرنا ضروری ہے اس طرح تو سارا رومانس ختم ہو جائے گا" وہ پیٹر کی بانہوں میں جھول گئی۔

"اگر لکھاریوں کے ساتھ دوستی کرو گی تو پھر یہ ناگوار سوال کسی نہ کسی رنگ میں اٹھتے رہیں گے۔" پیٹر نے اسے تھپتھپایا۔

"سب قصور تمہارا ہے.....!" سارا نے اسے جھاڑ پلائی۔ "نہ تم یہ پرانا دقیانوسی لطیفہ سناتے اور نہ بحث چھڑتی۔ میں نے تمہیں کئی بار مشورہ دیا ہے کہ One thousnad insults والی کتاب خرید لو اس میں بڑے تازہ اور جوان لطیفے ہوتے ہیں۔"

"ہزار میں سے اب تو پانچ سو رہ گئے ہوں گے....."

"وہ کیسے؟" ..... سان فرانسسکو سے لے کر لیک طاہو تک آدھے تو بھگت چکا ہوں۔"

"It is a joke of the day" مون بے اختیار مسکرا دی۔ "باقی شادی کے بعد سن لو گے۔ انشاء اللہ کتاب پڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔"

"یہ بھی تو کسی کتاب سے کم نہیں۔ جسے بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔"

"یعنی سرورق دیدہ زیب ہے، اندر مواد کچھ نہیں....." کیتھی نے سارا کے سر کی طرف اشارہ کیا۔

''اکثر خوبصورت عورتیں عقل کی کوری ہوتی ہیں'' میں نے کہا۔

''تو مون کے متعلق کیا خیال ہے۔'' سارا چہکی۔

''مستثنیات Exceptions قاعدے کی نفی نہیں کرتیں اس کا ثبوت ہوتی ہیں۔''

پیٹر کہنے لگا ''تم لوگ واش کرلو اور تھوڑی دیر آرام بھی کر سکتے ہو مجھے شادی کے سلسلے میں کافی کام کرنا ہیں۔ دوست احباب کو سان فرانسسکو سے بلانا ہے، ان کی رہائش کا بندوبست کرنا ہے۔ شادی کے سلسلے میں چند قانونی تقاضوں کو بھی پورا کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ہم بھی اپنے اپنے کمروں میں آ گئے۔ میں نے جب جھیل کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولی تو تازہ ہوا کا جھونکا بڑی تیزی کے ساتھ اندر آیا اور سارے وجود کو سرشار کر گیا۔ سامنے حدِ نگاہ تک جھیل پھیلی ہوئی تھی۔ کنارے پر کھڑے ہوئے درختوں نے شفاف پانی کا رنگ ہلکا سبزی مائل کر دیا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں جھیل کا الوداعی بوسہ لے رہی تھیں۔ پہاڑ پر ایسے لگتا تھا جیسے برف نہیں بلکہ سونے کی دبیز تہہ جم گئی ہو..... کس قدر خوش قسمت لوگ ہیں جو یہاں چھٹیاں گزارنے آتے ہیں..... میں نے سوچا..... یہ کائنات بیک وقت کس قدر خوبصورت اور بدہیئت ہے۔ غالباً یہ زندگی کے دو رخ ہیں۔ دن اور رات۔ روشنیوں کے اس پُر رونق شہر میں رات کو بھی دن کا سماں ہوتا ہے..... میں نے مڑ کر زندگی کے دوسرے رخ پر نظر ڈالی..... سوز و ساز، درد و داغ و جستجو و آرزو۔ اس قسم کی باتیں کرنے والے کو یہاں کمیونسٹ کہا جاتا ہے یا سمجھا جاتا ہے اور وطن عزیز میں منافق اور سنکی۔ شاید یہ ایک اعتبار سے درست بھی ہے جنہیں زندگی کی ناجوازیوں اور زیادتیوں کا گلہ کرنا چاہئے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ محنت کرتے کرتے صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ رہن ستم ہائے روزگار لوگ بھلا اس قسم کی باغیانہ سوچ کیسے رکھ سکتے ہیں۔

میں نے سگار سلگایا، فریج سے منرل واٹر کی بوتل نکال کر گلاس میں پانی ڈالا اور کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ میں جب بھی سگار کا کش لیتا ہوں تو نہ جانے کیوں چرچل کا ہیولا میرے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے..... دراصل سگار اس کی شخصیت کا جزو بن گیا تھا۔ جو لوگ سگار کے رسیا ہیں وہ اس کے ناقدین کا منہ چرچل کی مثال دے کر بند کراتے ہیں۔ نیک بخت نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ نہ کبھی بیمار ہوا نہ ہسپتال گیا۔ چمنی کی

طرح تمباکو نوشی کرتا تھا، مچھلی کی طرح شراب پیتا تھا اور گدھے کی طرح کام کرتا تھا۔ گدھا سوچ سے عاری ہوتا ہے اور وہ شخص سوفلا سفروں پر بھاری تھا۔ اس نے سوچ کر سائنس بنا دیا۔ نکسن لکھتا ہے کہ آخری مرتبہ جب وہ اسے ملنے گیا تو وہ بستر مرگ پر تھا۔ عمر نے اس کے اعضا کو شل کر دیا تھا۔ اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ سینے کی دھونکنی سے نکلتا ہوا کوئی ہوا کا جھونکا چراغ زیست کو سرد کر سکتا ہے۔ بایں ہمہ اس نے برانڈی کے دو پیگ پیے، وٹامن کی پوری شیشی حلق کے اندر انڈیلی اور کرسی کے بازوؤں پر اپنے نحیف ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر کے یوں بیٹھا جیسے کسی امریکی نائب صدر سے نہیں بلکہ تاریخ سے ملاقات کر رہا ہو۔ زبان میں لکنت تھی مگر خیالات آئینے کی مانند صاف اور شفاف تھے۔ خود اعتمادی اور تیقن کا یہ عالم تھا جیسے عصر حاضر کے بہت بڑے مدبر کو نہیں بلکہ کسی طالب علم کو تاریخ، فلسفے اور حالاتِ حاضرہ سے روشناس کرا رہا ہو۔

دستک ہوئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ میرے بس کہنے پر وہ تینوں سنگل کالم میں اندر آئیں۔ مجھے کرسیں پر نیم دراز دیکھ کر مون پوچھنے لگی ''ایک گھنٹہ گزر گیا ہے تم تیار نہیں ہوئے۔ کیا کر رہے تھے.....؟''

''سفر کر رہا تھا.....!''

''کمرے کے اندر سفر.....؟'' سارا حیران ہو کر بولی ''کہیں غلطی سے کچھ چڑھا تو نہیں گئے۔ فریج میں رکھے ہوئے مشروبات میں بعض اوقات تمیز برتنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''تمہارا قصور نہیں۔ تمہیں سارا وقت تمام کائنات خمار آلود محسوس ہو رہی ہے کل کو پیا ملن جو ہے۔''

''تو پھر یہ کیسا سفر تھا.....؟''

''ایک سفر انسان اپنے اندر بھی کرتا ہے۔ پھر تاریخ کا سفر خاصا دلچسپ ہوتا ہے۔ تم جب ذرا بڑی ہو جاؤ گی تو ان باتوں کو سمجھنے لگو گی!''

''مجھے سمکہ نہ لگاؤ۔ میں اتنی ناسمجھ بھی نہیں ہوں کہ لفظوں کے پوشیدہ معانی بھی نہ سمجھ پاؤں۔ اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ دیکھتے نہیں رات جوان ہے، موسم مہربان ہے اور حارا کی کروپیرز ہماری جیبوں اور تمہارے دل پر نظریں لگائے بیٹھی ہیں۔ اگر ہر شخص کمرے میں آ کر بیٹھ جائے تو کیسینو یتیم ہو جائے

گا.....“(وہ نوجوان اور حسین لڑکیاں جو تاش کے پتے بانٹتی ہیں۔)

جب ہم کیسینو کے اندر پہنچے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہاں ہمارے ملک کی طرح سورج جلد غروب نہیں ہوتا۔ نو بجے رات کو بھی اندھیرا نہیں چھاتا۔ شفق کی سرخی کہیں نہ کہیں سے پھوٹتی رہتی ہے۔ کیسینو کی روشنیاں جگ مگ کر رہی تھیں۔ دراصل یہ وہ چراغ ہیں جو کبھی نہیں سوتے ہر وقت جاگتے رہتے ہیں۔ کوئی پروانہ بھی ان کے نزدیک نہیں پھٹکتا۔ انہیں پھانسنے کے لئے انتظامیہ نے الگ نیلی روشنیوں والے پنجرے لگائے ہوئے ہیں۔ ان دلکش اور پرکشش روشنیوں میں ایک سندیسہ ہے۔ ایک ہی جھٹکے میں فنا ہو جانا۔ بجلی کے تاروں میں کرنٹ دوڑ رہتا ہے۔ اس طرح پروانوں کو سسک سسک کر مرنے اور شائقین کو کیڑوں مکوڑوں سے نجات مل جاتی ہے۔

ہر بڑے کیسینو کا اندرونی ماحول قریباً ایک جیسا ہوتا ہے۔ سلاٹ مشینوں کے حصار میں رولیٹ، باکرا، بلیک جیک، پانٹو بانکو اور پوکر کے ٹیبل۔ دشمن ایمان و آگہی کروپیرز۔ قدم قدم پر شراب بانٹتی ہوئی بالکیاں۔ گدھوں کی طرح گھورنے اور تاڑنے والے گنجے سپروائزر۔ جگہ جگہ دیواروں پر نصب شدہ کیمرے، جو سارے ہال کا آنکھوں دیکھا حال 'بگ باس' تک پہنچاتے ہیں اور ناپسندیدہ عناصر پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ مشین نے انسانوں کے فرائض سنبھال لئے ہیں۔ ایک روز ایسا بھی آئے گا جب شاید بچے بھی مشین پیدا کرے گی۔

البتہ ہارا اور دیگر کیسینوز میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اور وہ اس کی لوکیشن ہے۔ لاس ویگاس میں بہت بڑے کیسینو ہیں لیکن وہ صحرا کی گود میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔ ٹھنڈی ہوائیں وہاں بھی چلتی ہیں لیکن وہ برف پوش چوٹیوں کو چوم کر نہیں آتیں بلکہ ایئر کنڈیشنڈ مشینوں کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں اور صرف چار دیواری تک محدود ہوتی ہیں..... سوئمنگ پولز تو ہیں لیکن طاہو جیسی وسیع و عریض جھیل نہیں۔ اٹلانٹک سٹی اور میکاؤ میں ساحل سمندر تو ہے، پہاڑ اور مرغزار نہیں ہیں..... مانٹی کارلو میں پہاڑ بھی ہے اور بہت نیچے وسیع و عریض سمندر بھی ہے لیکن وہ مولوی مدن والی بات نہیں ہے۔ اساعتبار اور اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہارا نہ تو کسی سے پیچھے ہے اور نہ کسی کے نیچے۔ بڑے خوبصورت بار ہیں، بہت مزیدار کھانے ہیں، کافی پارلر،

کنسرٹ ہا، ہیلتھ کلب ہیں۔ بڑی بڑی بزنس کمپنیاں یہاں کنونشن کرتی ہیں۔ ہم خرما وہم ثواب یعنی کام بھی کر لیا اور دل پشوری بھی ہو گیا۔ اسے تجارتی اصطلاح میں Mixing business with pleasure کہتے ہیں۔

ہم چلتے چلتے رولے ٹیبل پر آ گئے۔ دیگر ریاستوں اور ریاست کے شہروں سے کافی لوگ آئے تھے۔ ہر چہرے پر امید و بیم کی جھلک تھی۔ خوشی کی رمق تھی۔ پانچ دن کی سخت محنت کے بعد فرصت کے لمحات بڑے کیف آور ہوتے ہیں۔ لوگ ہر فکر اور تشویش کو دفتر میں چھوڑ آتے ہیں، حرزِ نہیں بناتے۔ اپنے کندھوں پر اس کا بوجھ نہیں لادتے۔

''رولے کھیلو گے؟'' مون خرید شدہ ٹوکن میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

''میرا موڈ نہیں ہے، تم لوگ کھیلو۔ میں چل پھر کر رونق میلہ دیکھتا ہوں۔''

''تو ہم بھی نہیں کھیلتے۔ یہ کون سی عبادت ہے۔ کھیلے، کھیلے ناں کھیلے تو نہ کھیلے!''

''نہیں، میرے لئے اپنا وقت کھوٹا نہ کرو۔ سارا کی شکل نہیں دیکھی اگر یہ نہ کھیلی تو رات بھر اسے نیند نہیں آئے گی۔''

''وہ تو ویسے بھی نہیں آئے گی کل شادی جو ہے۔ دیکھتے نہیں ابھی سے من میں لڈو پھوٹ رہے ہیں۔'' کیتھی نے اس کی چٹکی لی۔

''فکر نہ کرو ایک دن یوسو مسیح تمہاری مشکل بھی آسان کر دے گا۔'' سارا نے بھی کیتھی کو نویدِ مسرت سنادی۔

''اللہ کرے میری مشکل ایک ہی دفعہ آسان ہو جائے.....!''

''Cathy you are being rude & unkind'' مون نے پہلی مرتبہ کیتھی کو جھاڑ پلائی..... ''یہ موقع طنز و تشنیع کا نہیں ہے ہمیں اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔''

''آئی ایم سوری'' کہہ کر کیتھی نے سارا سے معذرت کر لی۔

انہیں رولے ٹیبل پر چھوڑ کر میں کیسینو میں بے مقصد گھومنے لگا۔ چلتے چلتے بلیک جیک کے ٹیبل پر

میرے قدم خود بخود رک گئے۔ ایک سردار جی اپنی دھرم پتنی کے ساتھ اس طرح جواء کھیل رہے تھے جیسے ماجھے کے سکھ رم پیتے ہیں۔ یعنی بغیر سوچے سمجھے داؤ پر داؤ لگا رہے تھے۔ کھیل کے بنیادی اصولوں سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے غلط پتا مانگتے، جس سے ان کے اپنے نقصان کے علاوہ دوسروں کا بھی بیڑہ ہو جاتا۔ ہر داؤ پر ان کی دھرم پتنی کے لب ہلتے، غالباً واہگورو سے ان کے جیتنے کی پرارتھنا کر رہی تھیں۔ اس بیچاری کو کیا علم تھا کہ واہگورو ایسی گندی جگہوں پر نہیں پدھارتے۔ ویسے بھی ابلیس لعین نے ہر دروازے پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ چار سُو بڑے بڑے بورڈ آویزاں تھے جن پر جلی حروف میں لکھا تھا یہاں نیک ہستیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ چنانچہ وہی ہوا۔ سردارنی کی دعائیں صدا بلصحرا ثابت ہوئیں۔ سردار جی جذباتی اشتعال کے ساتھ داؤ کی رقم دگنی کرتے گئے..... ہزار، دو ہزار، چار ہزار، آٹھ، سولہ..... اس کے بعد ان کا ہاتھ رک گیا..... PLace your bet کارڈ ڈیلر نے ان کی طف دیکھا۔ شرط کہاں سے بدتی.....! وہ خود ہی بدک گئے تھے۔ ان کا سر بیمار مرغ کی طرح ایک طرف ڈھلک گیا اور کرسی سے دھڑام سے نیچے گر پڑے۔ سردارنی نے 'ہائے' کے ساتھ سینے پر دو ہتڑ مارا..... کیسینو کی ایمرجنسی میڈیکل ٹیم فوراً پہنچ گئی اور انہیں سٹریچر پر لٹا کر ہسپتال لے گئی۔ سارے امریکہ میں کیسینو کی ایمرجنسی میڈیکل ٹیم فوراً پہنچ گئی اور انہیں سٹریچر پر لٹا کر ہسپتال لے گئی۔ سارے امریکہ میں کیسینو غالباً واحد ادارے ہیں جہاں دل کے دوروں کا مفت علاج ہوتا ہے..... کہ جس نے درد دیا ہے وہیں دوا دے گا۔

اگر میں تاریخ سے عدم واقفیت رکھتا تو شاید مجھے زیادہ افسوس ہوتا۔ اس کھیل میں تو لوگ سلطنتیں ہار گئے۔ فاتح، مفتوح علاقوں سے دستبردار ہو کر بے نیل و مرام گھر چلے گئے۔ کانوں کی لویں لرز کر بدن سے الگ ہو گئیں دنیا کے عظیم ادیبوں کو بے ادبی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ تو ایک معمر سردار کا گھسا ہوا دل تھا جو چوبیس ہزار ڈالر کا جھٹکا برداشت نہ کر پایا تھا..... ویسے بھی مجھے یقین تھا کہ ابلیس ملعون کی ریاست سے نکلتے ہی واہگورو کرپا کریں گے اور ایک دفعہ پھر سردارنی کے چمن میں بہار آ جائے گی۔

قمار بازی کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ آدمی اپنی حیثیت سے بڑھ کر کھیلنا چاہتا ہے۔ کم رقم داؤ پر لگانے سے تھرل پیدا نہیں ہوتا، دل کی دھڑکن تیز نہیں ہوتی، خون اسپ تازی کی طرح رگوں میں نہیں

دوڑتا۔ اس کے رسیا عجیب طرح کے جواز پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ زندگی بھی تو ایک جوا، ہے، کون جانے کب بساط الٹ جائے۔ ہارنے والا بھیگے ہوئے مگڑ کی طرح سر نیوڑا کر بھاری دل اور بوجھل قدموں سے باہر نکل جاتا ہے۔ کبھی کبھار جیت جائے تو پھر اس کے ناز نخرے اور شرغمزے دیکھنے والے ہوتے ہیں۔ رقم اس طرح خرچ کرتا ہے جیسے پیسہ نہ ہو ہاتھ کی میل ہو زندگی بڑی رنگین لگتی ہے۔ من موجی عجیب باتیں سوچتا ہے۔ وقتی طور پر ہی سہی شوم بھی سخی سرور بن جاتا ہے۔ ایک پنجابی کہاوت ہے "جواریا آوے جت منجیاں چار جواریا ہک، جواریا آوے ہار منجی ہک جواریے چار" (اگر جواری جیت جائے تو پھر چار چارپائیوں پر بھی پھولے نہیں سماتا اور ہارنے کی صورت میں چار کے لئے ایک اٹوانٹی کھٹوانٹی کافی ہوتی ہے)۔

میں کافی دیر گھومتا رہا۔ غالب مرحوم فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہل کرم دیکھتے تھے میں بغیر بھیس بدلے ہی لوگوں کو فقیر بنتے دیکھتا رہا۔ بعض اوقات حیرانی ہوتی ہے کہ اگر یہی رقم فلاحی کاموں پر لگائی جائے تو صحراؤں کو گلزار بنایا جاسکتا ہے۔ مفلس اور نادار بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جاسکتا ہے۔ افریقہ کی بھوک ختم ہوسکتی ہے۔ یا پھر کھلاڑی اپنے اپنے مستقبل کے لئے پس انداز کرسکتے ہیں..... لیکنیہ محض سوچ ہے اور ہر شخص کے سوچنے کا اپنا انداز ہے، نقطۂ نظر ہے۔ ایک شخص اپنے تمباکو نوش دوست کو سرزنش کرتے ہوئے بولا "تم تین ڈبیاں تیس سال پیتے رہے ہو۔ اگر یہی رقم نذر آتش کرنے کی بجائے جمع کرتے تو آج ایک شاندار محل کھڑا کرسکتے تھے"..... درست فرمایا آپ نے" وہ دھوئیں کا مرغولہ اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولا، "جناب سگریٹ نہیں پیتے ان تیس سالوں میں آپ نے کون سا عشرت کدہ تعمیر کرلیا ہے؟"

وقت بہت قیمتی چیز ہے۔ گزرا ہوا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ یہ راہوار فراٹے بھرتا ہوا گزر جاتا ہے اور پیدل انسان اس کی گرد تک نہیں چھوسکتا۔ یہ باتیں اکثر سیانے کہتے آئے ہیں۔ دانائے راز جن کے تجربے اور مشاہدے نے زندگی کا نچوڑ نکالا۔ لیکن یہی وقت اکثر سوہانِ روح بھی بن جاتا ہے اور کاٹے نہیں کٹتا۔ ہر لمحہ گھنٹوں پر محیط ہوتا ہے۔ گھڑی کی سوئیاں چلتی نہیں رینگتی ہیں۔ ان لوگوں کے لئے یہ بہترین 'پاس ٹائم' ہے۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ہارنے والا جیتنے کی امید میں وقت گزارتا ہے اور جیتنے والا

نانوے کے پھیر میں پھنس جاتا ہے۔ اگر میکدہ سکون آور جگہ ہے تو اس کا تشبہی افیون کے نشے سے کم نہیں۔ انسان ہار کر بھی سبق نہیں سیکھتا۔ جب بھی جیب میں چار پیسے آ جائیں، دل پھر طواف کوئے ملامت کو جاتے ہیں۔ پندار کا صنم کدہ اس لئے ویران نہیں ہوتا کہ اس اقلیم میں اس نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔

مون، سارا اور کیتھی کھیل میں اس قدر منہمک تھیں کہ انہیں احساس نہ ہوا کہ میں ان کے قریب سے گزر گیا ہوں۔ میں نے بھی انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ استقبالیہ ڈیسک کے بالکل پیچھے بازار اور ریسٹورنٹ تھے۔ مجھے کوئی خاص بھوک تو نہیں تھی لیکن وقت تو بہر طور گزارنا تھا۔ میں نے ریسٹورنٹ سے ایک چیز برگر خریدا اور چپس کا پیکٹ لے کر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ کھانے کے ساتھ پانی کوئی نہیں پیتا۔ پہلے بیئر اور دوران کوکا کولا یا پیپسی! یہ بھی عجیب ڈرنگ ہیں۔ جس بہتات سے یہ دنیا میں استعمال ہوتے ہیں اگر ان کو بیک وقت بہایا جائے تو امریکہ میں ایک اور دریائے مسسپی رواں ہو سکتا ہے۔ کھانا کھا کر میں کمرے میں آ گیا۔ دب بہت مصروف گزرا تھا، گزشتہ رات بھی ٹھیک طرح سے سونہ پایا تھا۔ آٹھویں منزل کے اس کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ کیسینو کا شور و غوغا اور سلاٹ مشینوں سے چھن چھن کر کے نکلتی ہوئی اشرفیوں کی آواز وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں نے کپڑے بدلے اور بستر پر لیٹتے ہی سو گیا..... گہری نیند، تھکن خود اعصاب کو لوریاں دیتی ہے اور تھپتھپاتی ہے۔

O

صبح اگر فون کی گھنٹی ایک تسلسل کے ساتھ نہ بجتی تو شاید میں سارا دن سویا رہتا۔ حسب توقع مون بول رہی تھی..... ''ہم آ رہے ہیں'' اس نے اتنا کہا اور فون بند کر دیا..... میں ابھی صحیح طرح سے منہ بھی نہ دھو پایا تھا کہ وہ تینوں مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

مون کہنے لگی ''شاہ! لگتا ہے تم بہت گہری نیند سوئے ہو۔ اس بارے میں وہ کیا بھلا سا محاورہ تھا جو تم نے بتایا تھا..... ہاں یاد آ گیا گھوڑے بیچ کر سونا۔ سچ سچ بتاؤ رات کتنے بیچے ہیں؟''

''اتنی قیمتی چیز کی خرید و فروخت میرے بس کی بات نہیں!''

''تو کیا ریس کے گھوڑوں کی بات کر رہے ہو؟'' سارا کے لہجے میں شرارت تھی۔

''وہ تو تم نے چن لیا ہے۔ بارہ فرلانگ کا گھوڑا۔ مجھے یقین ہے کہ ازدواجی ٹریک پر بھی وہ سرپٹ دوڑے گا۔''

بولی ''جب ہنٹر اور لگام میرے ہاتھ میں ہوں گے تو پھر میری مرضی سے ہی دوڑے گا۔ میں نے اسے بے دام خریدا ہے۔''

''خیال کرنا کہیں دولتی نہ چھاڑ دے۔'' کیتھی سے چپ نہ رہا گیا۔

''ایسا اڑیل گھوڑا تمہارے نصیب میں ہوگا.....''

''کیا تم نے گھوڑوں کی کہاوت نہیں سنی؟'' میں نے اس نامناسب جملہ بازی کو روکنے کی غرض سے کہا.....

''نہیں تو۔ ذرا ہو جائے ضرور کوئی لطیفہ ہوگا۔'' سارا نے خوشی سے تالی بجائی۔

''ہوسکتا ہے لیکن ہمارے ملک میں اسے بہت سنجیدگی کے ساتھ سنا جاتا ہے۔''

''اب کچھ بتاؤ گے بھی یا پہیلیاں ہی بجھواؤ گے؟'' اس نے احتجاج کیا۔

''قدرے طویل ہے۔ جب لطیفہ لمبا ہو جائے تو لطف باقی نہیں رہتا۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں رات پیٹر کو سناؤں گی؟''

''وہ بے چارہ سر پیٹ لے گا۔ سہاگ رات صرف اعضا بولتے ہیں اور کوئی نہ کوئی لطیفہ بھی انہیں سے سرزد ہوتا ہے۔''

''شاہ سنا دو۔ یہ حسین بھڑ تمہیں زچ کرتی رہے گی۔'' مون نے مشورہ دیا۔

''کہتے ہیں ایک بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا کہ وہ سلطنت کے بے وقوف لوگوں کی فہرست مرتب کرے۔ دوسرے دن جب وزیر نے فہرست پیش کی تو سرفہرست بادشاہ کا نام تھا۔ اس پر وہ بڑا جز بز ہوا اور خفگی سے بولا..... تم نے میرا نام کیسے لکھ دیا ہے؟ وزیر نے کہا، حضور جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں!

''کیا سچ بولنے پر جان کی امان طلب کرنا ضروری تھا؟'' سارا نے پوچھا۔

''ہاں، اس کا دارومدار بادشاہ سلامت کے موڈ پر ہوتا تھا۔ کبھی تو سلام کرنے پر ناراض ہو جایا کرتے تھے اور کبھی دشنام پر خلعت عطا کرتے تھے۔''

''ناراضگی کی صورت میں کیا ہوتا تھا؟'' مون کی دلچسپی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

''وزیر کا حشر بھی اس وزیر باتدبیر کی طرح ہوتا تھا جس کا ذکر تھیکرے نے اپنی پیروڈی، سلطان اسٹورک میں کیا ہے۔''

''اس نے کیا لکھا ہے؟''

لکھتا ہے

Thoug almost all of his teeth hand been knocked out, yet wisdom a persuation hung on lips, though on of eyes in the fit of Royal indignation had been closed for e yet no other eye in the entire universe, was as keen as remaining bal

طنز کی اس سے زیادہ تشریح نہیں ہو سکتی۔ جب فردِ واحد اقتدار پر قابض ہو تو اس قسم کی باتیں انہونی نہیں ہوتیں۔''

''پھر کیا ہوا.....؟'' اب کے تینوں ایک ساتھ بول پڑیں۔

''خیر جب اسے امان ملی تو اس نے دست بستہ عرض کیا ''عالم پناہ! کل ایک اجنبی ملک سے اجنبی سوداگر آیا ہے۔ اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر آپ نے اسے ایک کثیر رقم پیشگی دے دی ہے کہ وہ آپ کے لئے اگلے سال ایک ہزار گھوڑے خرید کر لائے۔ نہ آپ اس ملک کو جانتے ہیں اور نہ اس سوداگر سے شناسا ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت کی بات ہو سکتی ہے!''

''بالفرض وہ لے آیا تو.....؟''

''تو پھر میں آپ کا نام کاٹ کر اس کا لکھ دوں گا۔''

''بہت دلچسپ ہے۔ گھوڑے سوچ سمجھ کر خریدنے چاہئیں!'' کیتھی نے سارا کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔ یہ شروع سے ہی شغل شاہی رہا ہے۔ اگر فرق پڑا ہے تو صرف اتنا کہ اب سودا گر ختم ہو گئے ہیں اور گھوڑوں نے خود بولنا شروع کر دیا ہے۔''

مون کہنے لگی ''ہمارے ہاں بھی ہارس ٹریڈنگ ہوتی ہے لیکن گھوڑوں کو اپنا تعارف نہیں کروانا پڑتا۔ ان کی قدر و قیمت اور پیڈیگری خریداروں کو معلوم ہوتی ہے۔ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ اس کی نسل کیا ہے، کتنے فرلانگ دوڑ سکتا ہے، کس قدر بوجھ اٹھا سکتا ہے اور کون سے ٹریک پر چلنا پسند کرتا ہے۔ کیلیفورنیا کی ریلوے کمپنی کو ایک طویل عرصہ تک یہی سیاسی گھوڑے کھینچتے رہے۔''

''ہاں.....! دانا دنکا بروقت اور صحیح ملتا رہے تو یہ کمبخت تھکتا بھی نہیں۔''

شادی دن کے بارہ بجے طے پائی تھی۔ ہمارے ہاں اس سے کوئی تقریب نہیں رکھی جاتی کیونکہ یہ گھڑی سرداروں سے منسوب ہوتی ہے..... یعنی ایسا وقت جب کوئی نہ کوئی بدحواسی یا بوالعجبی ضرور سرزد ہو جاتی ہے۔ ہر چند کہ تقسیم کے بعد خالصے مشرقی پنجاب ہجرت کر گئے لیکن اپنی Legacy پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئیں کیونکہ سارا کو بیوٹی پارلر جانا تھا جہاں ماڈرن مشاطہ نے اس کو بارہ سنگھاروں سے آراستہ کرنا تھا۔ بالوں کو ایک خاص سٹائل سے سر پر سجانا تھا۔ بدن پر خوشبوؤں کا مساج کرنا تھا۔ مہندی، ہلدی کا ابٹن، وٹنا، اگنی کے گرد پھیرے، ایجاب وقبول، موجل غیر موجل، نکاح خواں، سول میرج..... تو من شدی، من تو شدی..... ہر کس بہ رسم و راہے، دین وقبلہ گاہے..... ایک ہی بات۔ طور طریقے مختلف حلال اور حرام میں بال برابر فرق ہے..... لیکن ہے تو سہی.....!

میں نے کپڑے بدلے اور سارا کے لئے تحفہ خریدنے گفٹ شاپ چلا گیا۔ دکان پر ایک سے ایک قیمتی چیز پڑی تھی۔ جیولری، یرے، زمرد، کرسٹل، کلون، ملبوسات۔ قیمتیں یہاں بھی آسمان کو چھوتی ہوئیں۔ خواہشات اور وسائل میں جو طویل فاصلہ ہوتا ہے وہ ایک جست میں طے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بڑا کٹھن سفر ہوتا ہے۔ دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ لیکن جب آدمی کے پاؤں زمین پر ہوں تو پھر آسمان کو زیادہ دیر تک نہیں دیکھنا چاہئے۔ میں نے اٹالین کرسٹل کا بنا ہوا ایک گلدان خریدا اور سیلز گرل کو کہا کہ اسے پیک کر

دے۔

''پوچھنے لگی'' کون سی پیکنگ پسند کرو گے!''.....

''گفٹ پیک''.....

''کس قسم کا گفٹ دینا چاہتے ہو؟'' اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

''کیا گفٹ کی بھی قسمیں ہوتی ہیں.....؟''

بولی ''ہاں۔ شادی کے گفٹ پیک کا رنگ گلابی ہوتا ہے۔ سالگرہ پر ہم عنابی رنگ استعمال کرتے ہیں۔ بچے کی پیدائش پر سرخ و سفید رنگوں کو ترجیح دی جاتی ہے''.....

بزنس بھی اب واقعی سائنس بن گئی ہے۔ گائیوں کا دودھ زیادہ کرنے کے لئے انہیں باقاعدہ موسیقی سنائی جاتی ہے۔ مچھلیوں کو موٹا کرنے کے لئے رنگ برنگی خوراک کھلائی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے مرغیوں کی دلجوئی کے لئے کسی دن مرغوں کے ساتھ ساتھ مؤذن کی خدمات بھی مستعار لی جائیں..... امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے جہاں ہر چیز پر ریسرچ ہو رہی ہے۔ پیداوار میں اضافہ، بیماریوں کا تدارک، درس و تدریس کے نئے نئے طریقے۔ اس کے لئے جو لوازمات چاہئیں سب مہیا کئے گئے ہیں۔ پیسہ، وقت اور لگن..... جو لوگ آج سے اُنداتا اور پولیس مین آف دی ورلڈ کہتے نہیں تھکتے، اُنہیں ایک بار اپنے اندر بھی جھانک لینا چاہئے۔ زندگی کی یہ وہ حقیقتیں ہیں جن سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ بین الاقوامی تعلقات میں جو چیز اہم ہے وہ قومی مفاد ہے۔ نہ کوئی مستقل دوست ہوتا ہے اور نہ کوئی ازلی دشمن..... قربانی، ایثار، خلوص اور محبت..... ان کی ڈپلومیسی میں کوئی حیثیت نہیں ہے..... 'ایماندار ڈپلومیسی، ایسے ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ یہ لوہا لکڑی کا بنا ہوا ہے یا یہ خشک پانی ہے..... میکاولی پر ایک طویل عرصہ تک لعن طعن ہوتی رہی۔ اس نے حکمرانوں کو اخلاقیات کا درس نہیں دیا بلکہ یہ بتایا ہے کہ ریاست کو کیسے مضبوط اور مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مخالفین کی اکثریت منافقین پر مشتمل تھی۔ یعنی کہتے کچھ تھے اور کرتے ہی تھے جس کا پرچار اس نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ہمارے حکمران سونے سے قبل ''پرنس'' کا ایک آدھ باب نہ پڑھ لیں تو انہیں ٹھیک طرح سے نیند نہیں آتی..... بلکہ اکثر تو اس کو تکیے کے نیچے رکھ کر

سوتے ہیں۔

O

شادی کی تقریب سادہ مگر پروقار تھی۔ سارا دلہن کے روپ میں واقعی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ کوئی خاص شرما تو نہیں رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر حیا کی ہلکی سی سرخی ضرور تھی۔ اس کی ممی اور پاپا بھی پہنچ گئے تھے۔ پیٹر کے عزیز و اقارب اور احباب بھی آ چکے تھے۔ میرج پارٹی پچیس افراد پر مشتمل تھی۔ دولہا دلہن سٹیج پر بیٹھے تھے۔ سارا کی کرسی کے پیچھے مون اور کیتھی کھڑی تھیں۔ باقی لوگ بھی کرسیوں پر براجمان تھے۔ دلہن نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اس روایتی لمبے لباس کو سنبھالنے کے لئے شہہ بالیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور دو مضبوط ہاتھ، جن کی مدد سے دولہا میاں اسے اٹھا کر حجلہ عروسی تک لے جاتے ہیں..... ہمارے ہاں شادی بیاہ کے موقع پر دلہن سرخ لباس پہنتی ہے اس کے برعکس وہاں سفید لباس پسند کیا جاتا ہے جو برصغیر میں سوگ کی علامت ہے۔ جب رسمی کارروائی کے بعد نکاح رجسٹرار نے اعلان کیا کہ آج سے تم بطور میاں بیوی زندگی گزار سکتے ہو تو ہر طرف سے مبارکباد کا شور بلند ہوا۔ ممی اور پاپا نے اٹھ کر دلہن کا منہ چوما۔ من نے اس کے گالوں پر ایک طویل بوسہ دیا۔ کیتھی نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس کے بعد سب نے پیٹر سے باری باری ہاتھ ملایا اور قریب رکھے ہوئے میز پر تحفوں کا انبار لگ گیا۔

ایک بجے اعلان ہوا کہ ملحقہ ہال میں مشروبات اور ماکولات کا اہتمام کیا گیا ہے۔ سب کو دعوت دی جاتی ہے۔ مہمان تھے ہی کتنے! ہم سب اٹھ کر ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ کھانا بڑا مزیدار تھا۔ اس میں وہ سبڈشیں شامل تھیں جو بوفے ڈنر میں ہوتی ہیں..... جب سب لوگ پہنچ گئے تو پیٹر نے چمپین کی بہت بڑی بوتل کا کارک کھولا..... غالباً شمپین پینے میں اتنا مزہ نہیں آتا ہوگا جتنا بوتل کھولنے میں آتا ہے۔ کارک بھک سے اڑ کر دور جا گرتا ہے۔ سفید جاگ کا ایک فوارہ فضا میں بلند ہوتا ہے اور پھر نہایت ہلکے سبز رنگ کی خاص طریقے سے کشید کی ہوئی انگور کی بیٹی، گلاسوں میں انڈیل دی جاتی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی کھٹے میٹھے انگوروں کا رس پی رہا ہو۔ ''لیڈیز ڈرنک!'' ہم نے اکثر احباب کو وسکی کا پٹیالہ پیتے ہوئے سنا ہے۔ انگریز ہمیں جو تحفے دے گیا اس میں یہ خانہ خراب بھی شامل ہے۔ ساری دنیا میں لوگ وسکی سے بدکتے ہیں

اور مچھیئر اور وائین پر اکتفا کرتے ہیں لیکن برِ صغیر میں اس کو وہ مقام حاصل ہے جو منظوم مثنویوں میں پریوں کو ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی شخص نے اپنے پٹھان دوست کو کھانے پر مدعو کیا۔

''کانا ہے یا خیرات.....؟'' خان صاحب نے احتیاطاً پوچھ لیا۔

''کیا مطلب.....؟'' میزبان نے سبکی محسوس کی۔ ''قورمہ، کباب، مرغ مسلم، مچھلی اور بریانی سے آپ کی تواضع کی جائے گی۔''

''کچھ یارا، وسکی مسکی بھی ہے؟'' خان صاحب رازدارانہ لہجے میں بولے۔

''اس کا بندوبست نہیں ہوسکا۔'' میزبان نے وضاحت کی۔

''تو پر خیرات بولونا۔ خانہ خراب.....!'' خان صاحب غرائے۔

یونیورسٹی آف نیوساؤتھ ویلز کے برطانوی پروفیسر جان بلیک سے جب میں نے پوچھا کہ وہ وسکی کیوں نہیں پیتا تو اس نے فوراً جواب دیا It is too strong۔ ہمارے ہاں اکثر مے نوشی سرور لانے کے لئے نہیں، مت مارنے کے لئے کی جاتی ہے۔ 'مت مارنے' اور ایک گونہ بیخودی میں جو نازک سا فرق ہے اسے بہتر طور پر تو غالب ہی بتلا سکتے تھے لیکن ان نیک بختوں کو کون سمجھائے کہ جس شخص کی مت پہلے ہی مری ہوئی ہو اسے خارجی سہاروں کی کیا ضرورت ہے۔

تین بجے کے قریب اعلان ہوا کہ اب معزز مہمان رخصت ہو سکتے ہیں کیونکہ دولہا اور دلہن حجلہ عروسی میں آرام فرمانے جا رہے ہیں۔ سب مہمانوں نے ایک بار پھر الوداعی معانقہ کیا اور ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ مون کہنے لگی ''چلو سارا کو 'برائیڈل سویٹ' تک پہنچا آئیں۔ اسے خصوصی طور پر سجایا گیا ہے''..... سارا کو پیٹر نے بانہوں میں اس طرح اٹھایا جیسے وہ گوشت پوست کی بنی ہوئی دلہن نہیں بلکہ کوئی چینی گڑیا ہو۔ ہم سب سنگل کالم میں ان کے پیچھے چل پڑے..... پیٹر نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور شرارت بھرے لہجے میں بولا ''اگر آپ لوگ چاہیں تو واپس جا سکتے ہیں۔ مجھے اپنے کمرے کا راستہ معلوم ہے۔''

''ابھی سے اتنا نہ اتراؤ۔ ہو سکتا ہے کسی وقت تمہیں ہماری مدد یا مشوروں کی ضرورت پڑ جائے.....'' کیتھی نے سرزنش کی۔

''کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ہر امکان کو مدِ نظر رکھنا چاہئے۔ محرم ارمحرم میں تھوڑا سا فاصلہ ہوتا ہے۔ ہیرو کو نیرو یا زیرو ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔''

''تم کیتھی کے ہمنوا کب سے بن گئے ہو.....'' سارا پیٹر کی بانہوں میں کسمسائی۔

''جب سے ہمارے راستے الگ ہوئے ہیں۔'' میں مسکرا دیا۔

''ہمارے راستے جدا نہیں ہو سکتے۔ تمہاری خاطر ہم ہونا لولو جا رہے ہیں.....''

''نہیں تو.....نہیں تو.....'' سارا نے پیٹر کی طرف دیکھا۔

''وگرنہ ماؤنٹ وٹنی کی برف پوش چوٹیں پر بھی ہنی مون منایا جا سکتا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے پیٹر نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

ہر فائیو سٹار ہوٹل میں 'برائیڈل سویٹ' ہوتا ہے جو دیگر کمروں سے زیادہ کشادہ اور سجا ہوا ہوتا ہے۔ ہوٹل انتظامیہ چاہتی ہے کہ نو بیاہتا جوڑا ایک اچھا تاثر اور خوشگوار یادیں لے کر رخصت ہو۔ بزنس کے نقطۂ نظر سے بھی یہ کام خاصا نفع بخش ہے۔ نیواڈا کے کیسینوز نے اس میں خاص جدت پیدا کی ہے۔ ایک تو یہاں شادیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ دولہا، دلہن کے عزیز و اقارب اور دوست احباب دور دور سے آتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کیسینو میں قیام کرتے ہیں۔ پھر جب شادی شدہ جوڑا اپنے عشت کدے میں خوشیوں کا امرت پی رہا ہوتا ہے تو یہ نیچے روولے ٹیبل یا سلاٹ مشینوں پر اپنی لٹیا ڈبوتے ہیں۔ اکثر کو یہ کہتے سنا گیا ہے.....کم بختوں کو آج ہی شادی کرنا تھی آج تو بڑا منحوس دن ثابت ہوا ہے۔

بہت بڑا کمرہ تھا۔ اخروٹ کی لکڑی سے بنا ہوا منقش، کشادہ، سپرنگ دار پلنگ جس پر سونے کے علاوہ پنگ پانگ بھی کھیلی جا سکتی تھی۔ ہر طرف گلاب اور ٹیولپ کے گلدستے رکھے تھے۔ بڑے میز پر فروٹ باسکٹ، شمپین کی بوتل، ڈرائی فروٹ اور چاکلیٹیں پڑی تھیں۔ میز پر کھانے پینے کی قریباً سب اشیاء رکھی تھیں، صرف دودھ کا گلاس نہیں تھا۔ اگر ہمارے ہاں کے دولہا میاں شومئی قسمت سے وہاں پہنچ جاتے تو تمام چیزوں کو غصے سے زمین پر پٹخ کر دھاڑتے.....''اُوئے دودھ دا گلاس کتھے اے۔'' یہاں بھی دیواروں

پرنامور مصوروں کی پینٹنگز تھیں جن میں قیمت بلا مبالغہ لاکھوں ڈالر تھی۔ زیادہ تر تصویریں تجریدی آرٹ کا شاہکار تھیں۔ اس آرٹ کے متعلق ضرور کچھ اظہار خیال کرتا اگر میں نے سید محمد جعفری کا یہ شعر نہ پڑھا ہوتا۔

نقش محبوب مصور نے سجا رکھا تھا
میں نے سمجھا کہ صراحی پہ گھڑا رکھا تھا

یہ سب بڑے لوگ تھے۔ ان کا نام تکریم سے لیا جاتا ہے۔ جس گھر، ادارے یا کمرشل سنٹر پر نہ ہوں اسے سماجی رتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ دنیا میں ان کے فن پر سیمینار اور سمپوزیم منعقد ہوتے ہیں، فنی باریکیوں پر مقالے پڑھے جاتے ہیں اور کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ان کی جنم بھومی فخر سے پھولے نہیں سماتی شہری سینہ تان کر چلتے ہیں کیونکہ ان لوگوں نے ان کی 'مان منیادہ' کو بڑھایا ہے۔ نسل کے ساتھ کلچرل برتری کا احساس بھی بڑی چیز ہے۔ ہٹلر نے کہا تھا We are the salt of the Earth۔ یہ نمک جب خون میں رچ بس جائے تو پھر فرد ہو یا قومیں ان کا بلڈ پریشر تیز ہو جاتا ہے۔ لب ولہجہ بدل جاتا ہے۔ روشن تحکمانہ ہو جاتی ہے۔ ہر شخص پر وہ اس طرح نگاہ ڈالتے ہیں جیسے وہ تحت الثریٰ میں دھنسا ہوا ہو اور یہ ساتویں آسمان سے تک رہے ہوں۔ بہر حال ایسے بڑے لوگوں پر قوموں کا تفاخر کسی حد تک بجا ہے۔ ستم ظریفی کی بات صرف یہ ہے کہ اپنے وقت میں یہ بیات وگوشہ گمنامی میں رہے یا پھر قعر مذلت میں ڈوبے رہے۔ ان کے فن کو نہ تو پوری طرح سمجھا گیا اور نہ ٹھیک طرح سے پرکھا گیا۔ اکثر نانِ جویں کو ترستے رہے۔ کوئی اپنی ولدیت تلاش کرتا رہا تو کسی نے اپنے لرزتے ہوئے نحیف ہاتھوں میں زہر کا پیالہ تھام لیا۔ کوئی ہاتھ سرہانے دھرے دھرے سو گیا تو کسی پر پھبتیاں کسی گئیں کہ ان کا لکھا یا یہ خود سمجھیں یا خدا سمجھے۔ امیر تیمور لنگ نے جب حیرت سے حافظ شیراز سے کہا کہ میں نے بڑی جنگ وجدل اور خونریزی کے بعد سمرقند و بخارا فتح کیے ہیں تم نے انہیں محض محبوب کے تل کی سیاہی کے بدلے بخش دیا ہے تو وہ بوریا نشین بولا..... اگر سخاوت کا یہ عالم نہ ہوتا تو آج اس حال تک کیسے پہنچتا۔ یہ عجیب دنیا ہے، یہ کیسا نظام ہستی ہے جہاں سینکڑوں خورشید وقت کی گرد میں ڈوب جاتے ہیں۔ جن کی شناخت ان کے گزرنے کے بعد ہوتی ہے۔ جہاں قاتلوں کا گروہ ہی سب سے پہلے ماتم کناں ہوتا ہے.....

''کیا سوچ رہے ہو؟ مون نے مجھے جھنجھوڑا ''یہ یقیناً عظیم فنکار تھے۔ کاش اگر آج لیونارڈو، ڈی ونچی زندہ ہوتا تو میں اسے ملتی اور پوچھتی کہ مونالیزا کی تخلیق کا اصل محرک کون تھا؟

''آج اگر وہ زندہ ہوتا تو بیورلے ہلز تک کبھی بھی نہ پہنچ پاتا۔ وہیں وینس کی گلیوں میں کسی گوشہ گمنامی میں دفن ہو جاتا۔ پھر تمہارے بچوں کے بچے اسے تاریخ کے مدفن سے نکالتے..... باقی رہا سوال مونالیزا کے محرکات کا تو..... اب میری بات مت کاٹنا..... کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ وہ مونالیزا ہی تخلیق کرتا.....''

''چلو قصہ ہی ختم ہوا..... نہ جانے اتنے گنجلک سوالوں کا اس قدر آسان جواب کیسے ڈھونڈ لیتے ہو؟''

''کچھ سوالوں کے جواب بھی سوالوں میں ملتے ہیں!''

میرے خیال میں یہ تھک گئے ہیں' انہیں آرام کرنے دیا جائے۔ سارا کی ممی نے ہماری طرف دیکھا..... اور اس کا الوداعی بوسہ لیا۔ پھر کیتھی اور مون نے اس کے گال اور ماتھا چوما۔

''کیا تم ہماری تقلید نہیں کرو گے؟'' کیتھی نے میری طرف دیکھا۔

''اس کام کے لئے میں پیٹر کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''

ہم کمرے سے باہر آ گئے..... مون کہنے لگی ''رات کو جھیل کی سیر کرنی ہے اگر تم چاہو تو تھوڑی دیر آرام کر سکتے ہو۔ میں لفٹ میں بیٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور لباس تبدیل کر کے سو گیا۔''

آٹھ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ میں تیار ہو کر جب نیچے لابی میں آیا تو مون انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی تم نے جیکٹ نہیں پہنی۔ باہر خاصی ٹھنڈ ہے' کمرے میں جا کر لے آؤ۔ اس نے سفید جین اور کالے رنگ کے پورے بازوؤں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ اٹالین لیدر کا بنا ہوا نسواری رنگ کا جیکٹ اس نے ہاتھوں میں تہہ کر کے اٹھا رکھا تھا۔ ''کیتھی کہاں ہے؟'' میں نے ادھر ادھر دیکھا..... اس کی طبعیت ٹھیک نہیں۔ کمرے میں آرام کر رہی ہے۔

کہیں سارا سے بچھڑنے کا غم تو نہیں ستا رہا؟

''ہو سکتا ہے! نوک جھونک کے باوصف یہ بھی بچپن کی سہلیاں ہیں۔ اتنی طویل رفاقت اس قدر قلیل مدت میں ٹوٹ جائے تو افسوس بہر حال ہوتا ہی ہے۔''

ہم باتیں کرتے کرتے باہر نکل آئے۔ پہاڑ سے اترتی ہوئی برفیلی ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔ مون ایک لمحے کیلئے کپکپائی اور اس نے جھٹ سے اپنا لیدر جیکٹ پہن لیا۔

''بہت ٹھنڈی ہوا ہے'' مون کہنے لگی ''سارا دن یہ پہاڑوں میں آرام کرتی ہے اور شام کو سیر کرنے جھیل کی طرف نکل آتی ہے۔ یہ جو فضا میں ہر طرف پھولوں کی مہک ہے یہ اسی کی بدولت ہے..... پھولوں نے بھی کیا قسمت پائی ہے۔ دن کو بھنورے ان کا رس چوستے ہیں اور شام کو یہ ان کی خوشبو چراتی ہے۔''

''چلو کچھ مصرف تو ہوا۔ جانتی ہوں جو پھول ان کی یلغار سے بچ جاتے ہیں ان کا کیا انجام ہوتا ہے؟''

''سوکھ جاتے ہیں' گلدانوں میں قید کر دیئے جاتے ہیں یا پھر کسی سیج پر مسل دیئے جاتے ہیں۔''

''تو پھر یہ ہوا ان کی محسن ہوئی نا.....! یہ ان کی خوشبو چار سو بکھیرتی ہے جس سے ہر کوئی فیض یاب ہوتا ہے..... بھنوروں اور شہد کی مکھیوں کی چاہت میں ایک غرض چھپی ہوتی ہے ایک لالچ ہے لیکن اس کے چاہت میں کوئی طمع نہیں ہے۔ اس کی الفت بے لوث ہے۔ یہ دراصل ان کی شناخت ہے۔''

ہم باتیں کرتے کرتے بہت دور نکل گئے۔ حارا کے دائیں جانب اور بھی کئی کیسینو تھے لیکن ہم نے اندر داخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور ان کے قریب سے گزر گئے۔ پوری رات کا چاند تھا۔ نیلا آسمان گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے چاند ستاروں کی معیت میں غسل کرنے جھیل میں اتر گیا ہو۔ اس کی کرنیں برف پوش چوٹیوں پر بھی پڑ رہی تھیں۔ وہی پربت جو دن کو برف کی سفید چادر اوڑھتا تھا اب سنہری شال لپیٹے کھڑا تھا۔ پہاڑ کی ڈھلان سے لے کر جھیل تک دیودار اور یوکلپٹس کے درخت تھے۔ ان کے پس منظر میں حد نگاہ تک جھیل پھیلی ہوئی تھی..... اس کے سینے پر دور کچھ مدھم چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ غالباً بادبانی کشتیاں تھیں..... ماحول میں اس قدر تضاد..... میں نے سوچا فاصلے پر بلند و بالا عمارت' اندر دنیا کی تمام رنگینیاں اور خرافات اور باہر اس قدر سکوت! اتنی تنہائی کہ میلوں تک کوئی ذی روح دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہر طرف خامشی کا ایک طلسم ہوشربا تھا۔ چلتے چلتے جب ہم جھیل کے مشرقی کنارے پر پہنچے تو مون نے میری طرف دیکھا..... کیا سوچ رہے ہو؟ چلو آج پہاڑ کی چوٹی سر کرتے ہیں۔ کچھ زیادہ اونچا نہیں ہے۔ بڑا مزا آئے گا۔

''مزہ تو صبح آئے گا جب ہیلی کاپٹر برف پوش چوٹیوں میں ہماری تلاش کریں گے۔''

''تو صاف کیوں نہیں کہتے کہ خائف ہو!''

یہ خوف بھی تمہارا پیدا کیا ہے۔ نہیں تو میں جہاں گردہوں' کہساروں اور قلزموں سے نہیں ڈرتا.....!

اپنے آپ سے تو ڈرتے ہو!

اپنے آپ سے ہمیشہ ڈرنا چاہئے۔ انسان کے اندر کئی آتش فشاں ہوتے ہیں۔

''تو پھر جھیل کی سیر ہو جائے۔ چاندرات کو اس سے بڑی تفریح اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ پھر محفوظ بھی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

''تم نے لفظ میرے منہ سے چھین لئے ہیں۔ آج اس جھیل کا جی بھر کر نظارہ کرنے کو دل کرتا ہے۔ کون جانے زندگی میں ایسی رات نصیب ہو نہ ہو۔''

بوٹ ہاؤس کا انچارج کہنے لگا'' مجھے افسوس ہے آپ نے دیر کر دی۔ سب کشتیاں کرایہ پر لگ چکی ہیں۔ آپ ایڈوانس بکنگ کرالیں۔ کل آپ کو اچھی کشتی دے دوں گا۔''

''لیکن جھیل تو بالکل خالی لگ رہی ہے کیا کشتیاں اس کی تہہ میں چلی گئی ہیں؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

بولا'' اجنبی لگتے ہو' اس لئے بات کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے۔ یہاں اکثر لوگ کشتیاں سیر کرنے کیلئے نہیں رات گزارنے کیلئے لیتے ہیں۔ اتنی وسیع و عریض جھیل ہے' میلوں تک پھیلی ہوئی۔ لوگوں نے سپاٹ چن رکھے ہیں' اشیائے خورد و نوش' ڈرنکس' میوزک' فشنگ ہکس..... کیا تم نے کبھی مچھلی کا شکار کیا ہے؟'' اس نے بے حیائی سے اپنی دائیں آنکھ میچی۔

''نہیں۔ لیکن مجھے تمہاری باتوں سے مچھلی کی نگوار بو آ رہی ہے۔''

وہ جو سامنے کشتی کھڑی ہے وہ کیوں نہیں دیتے؟ مون نے ایک خوبصورت بجرے کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ بڑی پارٹیوں کیلئے ہے..... ڈیلکس بوٹ' جانتی ہو اس کا کرایہ کتنا ہے؟'' وہ ہماری کم علمی سے حظ اٹھاتے ہوئے بولا۔

''کرایہ نہیں' اس کی قیمت بتاؤ۔ میں اسے ابھی اسی وقت خریدنا چاہتی ہوں۔'' غصے سے مون کی آواز بھرا گئی۔

''کیا تم سنجیدہ ہو.....؟'' وہ ہکلایا۔

''تمہیں کیا نظر آتا ہے! تمہارا مالک کدھر ہے؟''

''او کے' او کے' آئی ایم سوری' آئی ایم ریلی ویری سوری'' اس کے لہجے میں ندامت تھی۔ آپ بوٹ میں بیٹھیں میں کریو کو بلاتا ہوں۔

وہ صحیح معنوں میں لگژری بوٹ تھی۔ ڈرائینگ روم' بیڈروم' فریج' ٹی وی' خوشنما پھولدار کرٹن اور فوم کشن کے نہایت آرام دہ صوفہ سیٹ..... یہ تو بالکل فائیو سٹار ہوٹل یا کیسینوں کا کمرہ لگتا ہے..... میری حیرت اور خوشی یکجا ہو رہی تھیں۔

کہنے لگی ''اب تو بوٹس میں بھی کیسینو کھل گئے ہیں۔ میسا چوسٹ کی ریاست سمندر میں کیسینو کھول رہی ہے۔ جہاز سمندر میں تیرتے رہیں گے اور اندر گیمبلنگ ہو گی..... کیا تم نے کبھی لگژری لائیز کوئین الزبتھ میں لندن سے نیویارک تک سفر کیا ہے؟''

میں نے صرف ملکہ کی تصویر دیکھی ہے جواب خاصی بوڑھی ہو چکی ہے۔

''لیکن جہاز جوان ہے.....'' مون مسکرائی ملکہ کو بوڑھا کرنے میں عمر کے علاوہ اس کی اولاد کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

ہاں' جب اس قسم کی نیک اور فرمانبردار اولاد ہو تو پھر فخر سے سینہ پھولتا نہیں بلکہ ندامت سے سر جھک جاتا ہے۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ لوگ اظہار عقیدت کے طور پر ابھی تک اس Institution کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ٹیکس گزار اپنا پیٹ کاٹ کر رائلٹی کا وقار بڑھاتے ہیں۔ مصر کے معزول کنگ فاروق نے کہا تھا کہ دنیا سے بادشاہت ختم ہو جائے گی صرف پانچ بادشاہ رہ جائیں گے۔ چار تاش کے اور ایک تاج برطانیہ۔ ہاؤس آف لارڈز کے رکن لارڈ آلٹرنچم نے جب ایک مرتبہ ریڈیو پر شاہی خاندان پر تنقید کی تو باہر نکلتے ہی ایک زنانے دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا This is for insulting the queen۔ حملہ آور نے وجہ بتائی۔

کشتی جھیل کے سینے پر تیر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ پہاڑ اور کیسینو ہماری نظروں سے دور ہو رہے تھے۔ میں

نے فریج کھولا اور پائین ایپل جوس کی بوتل نکال کر میز پر رکھ دی۔

''تمہارے لئے بلڈی میری بناؤں؟'' اسے بار بار چھیڑنے کو جی کرتا تھا۔

''نہیں! بلڈی کو میں ویگاس کے سانتا فے بار میں چھوڑ آئی ہوں اب میری نگاہوں کے سامنے صرف میری ہے۔''

ہم کچھ دیر نیچے بیٹھے اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر بوٹ کی چھت پر آ گئے۔ چھت پر بھی ایک میز کے گرد چار کرسیاں بچھی تھیں۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے اور جوس سپ کرنے لگے۔

''بہت شفاف پانی ہے'' میں نے کہا۔ ''ذرا نیچے دیکھو! یوں لگتا ہے جیسے چاند اور تارے آئینہ دیکھ رہے ہوں یا جیسے گہری نیلی مخمل پر ہیرے لگے ہوں۔''

یہ درست ہے۔ بعض جگہوں پر اس کی گہرائی اسی فٹ تک چلی گئی ہے۔ دن کے وقت اگر سکہ بھی ڈالیں تو تہہ تک اترتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اب یہ بھی' کسی حد تک ماحولیاتی آلودگی کا شکار ہو رہی ہے۔

''اس کی وجہ کیا ہے.....؟''

''ایک تو جنگل آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے' ٹمبر کو کمرشل بنیادوں پر کاٹا جا رہا ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو اپنے ساتھ پہاڑوں کی بہت سی مٹی بھی لے آتی ہے..... پھر جنگل فائر..... او مائی گاڈ! انسان جیتے جی دوزخ کی جھلک دیکھ لیتا ہے..... دھواں' راکھ' تپش' درخت یوں کڑکڑ کر کے گرتے ہیں جیسے سینکڑوں آریوں سے کاٹے جا رہے ہوں۔ جنگلی حیات' جانور' پھول' پودے سب کچھ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ سارے امریکہ کی قوم بھی اکٹھی کر لی جائے تو یہ آگ فوراً نہیں بجھ سکتی۔ البتہ کوشش ضرور کی جاتی ہے۔ ریاست کے جہاز اس پر پانی اور کیمیکل جھاگ کی برسات کرتے ہیں۔ اکثر بارش ہو جاتی ہے جو بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے لیکن یہ اپنا عمل ضرور پورا کرتی ہے۔ جب بجھتی ہے تو اپنے پیچھے کئی نشانیاں چھوڑ جاتی ہے۔ ان گنت درختوں کے جلے ہوئے تنے' کالے بجھنگ' بالکل نیگرو لگتے ہیں..... اب یہ نہ کہنا کہ میں ریشسٹ ہوں.....'' وہ مسکرائی۔ تمہاری صحبت کی وجہ سے چند تشبیہات اور استعارے یاد ہو گئے ہیں۔

''بڑی عجیب بات ہے اس کے نقصانات بھی بہت ہیں اور اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال ہے۔ آخر

سورج بھی تو آگ کا ایک گولہ ہی ہے تمام حیات کی مرہون منت ہے لیکن اس کی وجہ سے زندگیاں ختم بھی ہو سکتی ہیں.....''

''کیا تمہارے ملک میں بھی ایسی خوبصورت جھیلیں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''کاش تم نے جھیل سیف الملوک دیکھی ہوتی! تم نے ابھی ابھی تشبیہات کی بات کی ہے دنیا کی کوئی ایسی تشبیہ یا استعارہ نہیں ہے جو اس کا حسن بیان کر سکے۔ انسان اسے دیکھتے ہی اپنے آپ میں گم ہو جاتا ہے۔ وقت کی رفتار تھم جاتی ہے ملکوتی ماحول' سرحرانہ سکوت' ایک عجیب شان بے نیازی' گہرا نیلا پانی' ہر قسم کی آلودگی سے پاک کنواری برف' تقدیس آمیز پس منظر میں سر بفلک پہاڑ جن کا سلسلہ ہمالہ سے جا ملتا ہے۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں تاریخ و جغرافیہ یکجا ہوتے ہیں۔ دیو مالائیں اپنے ہی گلے میں ہیروں کی مالا ڈالتی ہیں.....''

''کیا اس سے کوئی قصہ کہانی منسوب ہے؟'' اس کی دلچسپی بڑھنے لگی۔

''ہاں! یہ ایک پری کا مسکن تھا جو ایک دن سیر زمین کیلئے آئی اور شہزادے کو اٹھا کر لے گئی۔ سیف الملوک جس کو دیکھتے ہی وہ ہزار جان سے اس پر فدا ہو گئی.....!''

''کیا پریاں پرستان چھوڑ کر زمین کی سیر بھی کرتی ہیں؟''

''ہاں! بعض نے تو زمین پر رہائش بھی رکھی ہوئی ہے!''

''وہ یقیناً بیور لے ہلز نہیں.....'' وہ میرے کی شرارت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

''کیا بیور لے ہلز میں آئینے نہیں ہوتے؟''

''تو کیا شہزادے کو وہاں سردی نہیں لگتی تھی؟'' اس نے بھولپن سے پوچھا۔

''وہ بڑا نازک مزاج شہزادہ تھا۔ جب بھی وہ کپکپاتا پری اسے اپنے پروں میں لپیٹ لیتی۔''

''تو کیا اس طرح اسے سردی لگنی بند ہو جاتی تھی؟''

''فوراً..... الٹا پری کو پسینہ آ جاتا۔''

''اس کی ممی' ڈیڈی تو بڑے پریشان ہوئے ہوں گے؟''

''ماں کا پریشان ہونا تو قدرتی بات ہے۔ڈیڈی البتہ زیادہ متفکر نہیں تھے۔''

وہ کیوں.....؟

کیونکہ شب و روز وہ خود بھی پریوں کے نرغے میں رہتے!

پریاں انہیں لے کر اڑ کیوں نہیں جاتی تھیں؟

''ظل سبحانی نے ان کے پر کاٹ دیئے تھے۔شہزادہ چونکہ کم سن تھا اس لئے حضور والا کے تجربات سے بالمشافہ استفادہ نہیں کر سکتا تھا۔''

''کیا اب بھی تمہارے ہاں پریاں اور بادشاہ ہیں؟''

''پریاں کم ہیں اور شاہ زیادہ.....''

''عجیب بات ہے'' مون پائین اپیل کا سپ لیتے ہوئے بولی۔ ہر جھیل سے کوئی نہ کوئی داستان وابستہ ہے۔یہاں بھی ایک قصہ مشہور ہے!

غالباً کوئی پری کسی غریب انسان کو لے کر آئی ہوگی؟

''''شاہ تم شرارتوں سے باز نہیں آؤ گے.....!ایک عجیب سی چمک اس کی آنکھوں میں عود کر آئی۔''اس جھیل میں کوئی پری یا شاہزادہ نہیں رہتا تھا البتہ ایک غریب آدمی کا قصہ مشہور ہے جس نے اپنی ہمت اور فراست سے لوگوں کو ایک بہت بڑی بلا سے نجات دلائی تھی۔''

''پھر تو میں ضرور سننا چاہوں گا.....''

کہتے ہیں کہ اگلے وقتوں میں جھیل کے کنارے ایک بہت بڑا اور بوڑھا برگد کا درخت تھا۔ درخت کی شاخیں پھیل کر جھیل کے پانیوں کو چھو رہی تھی۔اس پر ایک خونخوار پرندے کا مسکن تھا وہ گوشت خور تھا۔اس کا شکار جھیل میں سفر کرتے ہوئے بھولے بھٹکے مسافر تھے۔جب بھی وہ دیو ہیکل آدم خور کسی مسافر کو اکیلے دیکھتا تو حلق سے ایک خوفناک آواز نکالتا۔مسافر ڈر کر بے ہوش ہو جاتا اور وہ اسے اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ کر اس درخت پر لے آتا اور پھر آہستہ آہستہ اپنی نوکیلی چونچ سے اس کا بدن نوچ ڈالتا۔علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔لوگوں نے سفر کرنا بند کر دیا۔آخر ایک باہمت انسان اسے ختم کرنے کا ارادہ کر کے گھر سے

نکلا۔ اس نے زہریلے تیروں کا ایک گٹھا اپنے فتراک میں رکھ لیا اور منہ پر باریک سوراخوں والا چمڑے کا خول چڑھایا۔ جب اس کی کشتی برگد کے درخت کے قریب سے گزری تو خونی پرندے نے اسے دیکھ کر خوشی سے ایک ایسی آواز نکالی جس سے سارا جنگل لرز اٹھا۔ پھر ایک ہی اڑان میں پر مار کر کشتی الٹ دی اور اپنے شکار کو پنجوں میں دبوچ لیا۔ درخت پر لا کر جب اس نے پنجوں سے اس کا گوشت نوچنا شروع کیا تو اس شخص نے فتراک سے تیر نکالے اور منہ پر پڑے ہوئے چمڑے کے خول کے سوراخوں سے اسے دیکھنا شروع کیا۔ جب بھی وہ خونی بلا اس کا گوشت نوچنے کیلئے اپنی چونچ کھولتی تو یہ اپنے جسم کی تمام توانائیوں کو یکجا کر کے زہریلا تیر اس کے حلق میں اتار دیتا۔ دس بارہ بار یہ عمل جاری رہا ہر چند کے اس بہادر شخص کا جسم لہولہان ہو گیا لیکن زہر نے بھی اپنی اثر دکھانا شروع کر دیا۔ آخری تیر جب اس کے جسم میں پیوست ہوا تو پرندے نے ایک بار پھر خوفناک چیخ ماری لیکن اس میں مسرت کی کوئی رمق نہ تھی..... درد کا سمندر تھا۔ چار سو آندھی چلنے لگی سارا جنگل لرزہ براندام ہو گیا۔ پہاڑ پر برف پگھلنا شروع ہو گئی اور وہ خونی بلا چکرا کر جھیل میں گر گئی۔ جھیل کے پاک پانی نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ایک لہر کی صورت میں اسے کنارے پر اچھال دیا۔ اس دن بستی کے آواروں کتوں نے ایک دوسرے کی دعوت کا اہتمام کیا جس میں بن بلائے ہوئے مہمان Vultures بھی خاصی تعداد میں شریک ہوئے۔

''تم نے فن داستان گوئی کہاں سے سیکھا ہے؟''

یہ داستان بہت پرانی ہے جو سینہ بہ سینہ' نسل در نسل اور حرف بہ حرف اہل کیلیفورنیا سنتے آئے ہیں..... اس میں میرا کوئی کمال نہیں.....

یہ داستانیں لوگوں کی اجتماعی سوچ' فکر' ڈر خوف' رسم و رواج اور کلچر کی غماز ہیں..... سیف الملوک اور خونی پرندے کی داستان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ہمارے لوگ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں جبھی تو انہوں نے اپنے اردگرد حسین تصوراتی حصار کھڑے کر رکھے ہیں۔ زندگی کے بارے میں تم لوگوں کا نقطہ نظر زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔ تلخ حقائق کا ادراک اور ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت و حوصلہ' غالباً اسی وجہ سے امریکہ نے بہت پہلے سامراج کا طوق گلے سے اتار دیا اور

ہم تساہل، بے عملی اور توہمات کے اسیر رہے۔

''تمہاری بات درست ہے.....'' مون کہنے لگی' امریکیوں کو بہت پہلے احساس ہو گیا تھا کہ آدمی زیادہ دیر تک آدمی کا غلام نہیں رہ سکتا۔ بوسٹن ٹی پارٹی آخری دعوت دی تھی۔ اس چائے کا تلخ گھونٹ آقاؤں کے حلق سے اترتا نہیں تھا.....

خیر چھوڑو ان تلخ تاریخی حقائق کو۔ کوئی رومانوی داستان بھی اس سے وابستہ ہے کہ نہیں.....؟

رومانوی داستان تو کوئی نہیں' البتہ رومانس تم چار سو دیکھ سکتے ہو! اس نے ان کشتیوں کی طرف اشارہ کیا جن میں بیٹھے جوڑے دنیا و مافیا سے بے نیاز ایک دوسرے میں گم تھے۔

''یہاں سینکڑوں پریاں اپنے سیف الملوکوں کے ساتھ وارد ہوتی ہیں اور کشتی وجود کو اس بدبخت سپروائزر کی چوبی کشتی میں ڈال دیتے ہیں۔ جب رات جوان ہو' موسم مہربان ہو اور مئے ناب کے خم ہوں تو پھر ایک نہیں کئی داستانیں جنم لیتی ہیں.....''

''وہ واٹر بے بیز Water Babies والا قصہ کیا ہے؟''

کہنے لگی ''یہ داستان نہیں بلکہ توہمات ہیں۔ لوگ سفر کرنے سے پہلے دعائیں مانگتے تھے' اپنے ساتھ وافر مقدار میں پکے ہوئے کھانے اور پھل رکھ لیتے تھے' خوراک کو وقفے وقفے کے ساتھ جھیل میں ڈالتے جاتے' ان کا عقیدہ تھا کہ جھیل میں شرارتی بچے رہتے ہیں جو کشتی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ کھانا انہیں اس قسم کی خطرناک شرارتوں سے باز رکھتا ہے''..... وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی ''اگر اجازت دو تو میں بھی کچھ کھانا شریر بچوں کی نذر کروں۔ انہیں کیا خبر ہے کہ ایک اجنبی مسافر بھی کشتی پر سوار ہے۔''

''ہاں بڑا مزا آئے گا جب بچے' بچوں کی تواضع کریں گے۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا.....!''

''کس بات کا.....؟''

''تمہارا عکس جھیل میں نہ پڑنے پائے۔ یہ نہ ہو کہ سارے بچے جوان ہو جائیں اور آنکھ مچولی کھیلنے باہر نکل آئیں.....''

''بالفرض وہ باہر نکل آئے تو تم کیا کرو گے؟''

میں جھیل میں کود جاؤں گا.....

''وہ کیوں.....؟''

''آخر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے.....'' ہم دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

کشتی جھیل کا پورا چکر کاٹ کر واپس مڑ رہی تھی۔ چاند بھی اب بادلوں کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ LOVE BOATS کے پردے گر چکے تھے۔ ہر طرف مکمل سکوت تھا..... محسوس ہوتا تھا جیسے ہم نے جھیل میں چند گھنٹے نہیں گزارے، چند باتیں کی ہیں..... دیوملاؤں کے جھروکے میں صرف جھانکا ہے۔ انناس کا ترش اور شیریں شراب حلق سے نیچے اتارا ہے۔ وسیع و عریض جھیل، دلہن کی طرح سجی ہوئی کشتی، نیم خوابیدہ ملاح اور دو مسافر..... فیصلوں اور فاصلوں میں بال برابر فرق ہوتا ہے۔ فیصلے اگر بروقت نہ ہوں تو پھر فاصلے سات سمندروں تک پھیل سکتے ہیں..... مجھے بہرطور واپس جانا ہے..... میں نے سوچا..... ایک طویل خامشی، جیسے ہم جھیل کا حصہ ہوں..... کشتی کنارے پر لگی مون نے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے بل ادا کیا اور ہم واپس اپنے کمروں کو چل دیئے۔

پیٹر اور سارا کا ''برائیڈل سویٹ'' دوست احباب سے بھرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے حجلہ عروسی نہیں بلکہ پھولوں کی نرسری یا پھر گفٹ شاپ ہے۔ پھولوں کے گلدستے مبارکباد دینے والوں نے پیش کیے تھے۔ کیسینو کی فلورل شاپ، اگر ساری نہیں تو آدھی ضرور خالی ہوگئی ہوگی۔ مصروفیت کی وجہ سے وہ گفٹ پیک کھول نہیں سکے تھے۔ جب پیار کی صورت میں زندگی کا سب سے بڑا تحفہ مل جائے تو پھر مادی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ سارا کا رنگ سونے کی طرح دمک رہا تھا۔ مسرت اور شادمانی نے اس کے سارے وجود کو سرشار کر دیا تھا۔ مون اور کیتھی منکر نکیر کی طرح اس کے دائیں بائیں موجود تھیں۔ وہ وقفے وقفے سے اس کے کان میں سرگوشی کرتیں جس سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی اور کانوں کی لویں سرخ ہو جاتیں۔ پیٹر کے چہرے پر بھی طمانیت نمایاں تھی..... مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور بے اختیار مجھ سے لپٹ گئے..... کہاں تھے تم؟ ہم کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

''مون نے بتایا نہیں رات ہم نے جنگل پہاڑ گھوم ڈالے ہیں اور شب مہتاب میں جھیل کی سیر کی ہے!''

''جبھی تو کہوں کہ رتجگے نے آنکھوں میں سرخ ڈورے ڈال دیئے ہیں!'' سارا نے شرارت بھری نظروں سے ہمیں دیکھا۔

''بڑی چالاک ہو! جو بات ہم کرنے والے تھے وہ تم نے الٹا ہمیں سنادی ہے۔''

Offense is the best part of defence ہے نا' پیٹر جانی.....؟ اس نے پیٹر سے تائید چاہی۔

''بالکل ہے نا جانی.....'' پیٹر نے اس کی نقل اتارتے ہوئے وہی الفاظ دہرائے۔

میں نے کہا دوست! ابھی سے ہتھیار پھینک بیٹھے ہو' آگے چل کر کیا ہوگا؟

Complet surender - Total Submissio وہ مسکرایا۔ ''پراپرٹی ڈیلر میں ہوں لیکن الٹا خریدا اس نے مجھے لیا ہے! ویسے بھی کامیاب ازدواجی زندگی کی یہ شرط اولین ہے۔''

پتہ چلتا ہے رات کو کافی' کرٹن لیکچر ملے ہیں! کیتھی سے چپ نہ رہا گیا۔

''رات کس کمبخت کو ہوش تھا۔ پریم رس پی کر آدمی مدہوش ہو جاتا ہے۔ پیار میں کچھ کہا نہیں جاتا' انگ انگ بولتا ہے۔ ہر سانس ایک سندیسہ ہوتی ہے اور دل کی ہر دھڑکن ایک پیغام..... کیوں ہے نہ سارا جانی..... پیٹر مسکرایا۔''

''کیا ہر بات اس کو بتاؤ گے بالکل بچے ہو.....''

''اسے ڈانٹ رہی ہو یا یہ بھی پیار کا کوئی انداز ہے باتوں باتوں میں اس کی عمر کے کئی سال گول کر گئی ہو.....!'' کیتھی انہیں معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''چلو اب تیاری کریں۔ باتیں تو راستے میں بھی ہوتی رہیں گی۔ شام تک ہمیں سان فرانسسکو پہنچنا ہے۔'' مون اٹھ کھڑی ہوئی۔

واپسی پر صرف ایک نہیں بلکہ کاروں کا پورا کارواں تھا۔ سب سے آگے سارا اور پیٹر کی گاڑی تھی جس کی پیشانی پر بورڈ لگا تھا ''NEWLY WEDS'' یہ صرف نوید مسرت نہ تھی بلکہ سامنے سے آنے والی گاڑیوں کیلئے ایک وارننگ بھی تھی..... مسافر اپنی حفاظت خود کریں۔ ہوسکتا ہے نو بیاہتا جوڑا باہر کے ماحول

سے بے نیاز ہو۔ ہم پیٹر کے دوست باب کی کار میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے چند بار بے دلی سے کہا بھی کہ واپسی کا سفر اکٹھے کیا جائے لیکن ہم رنگ میں بھنگ ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمارا فیصلہ درست تھا۔ شادی کے کچھ روز ایسے ہوتے ہیں جب کائنات بہت رنگین لگتی ہے اور زندگی ایک شیریں بوسہ۔ شادی شدہ جوڑے کا جی چاہتا ہے کہ وہ صرف ایک دوسرے سے باتیں کریں' ایک دوجے کو دیکھیں..... اور..... اور.....!

اب کے ہمیں لمبا چکر کاٹنے کی نوبت نہ آئی۔ ٹریفک کے مستعد عملے نے تمام لینڈ سلائیڈ ہٹا دیئے تھے۔ بارش نے بھی جس قدر برسنا تھا برس چکی تھی۔ بادلوں نے تھک کر پہاڑ کی چوٹیوں میں پناہ لے لی تھی۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا لیکن اس کی کرنوں میں کاٹ نہیں تھی۔ بالکل نرم اور گداز تھیں۔ جب یہ سبز درختوں کے نم آلود پتوں پر پڑتیں تو ان پر زمرد اور سونے کی آمیزش کا گمان ہوتا۔ شبنم کے قطرے ان پر ہیروں کی طرح جگمگاتے۔ سڑک کشادہ بھی تھی اور کافی حد تک سیدھی بنائی گئی تھی۔ اگر کہیں موڑ تھا تو اسے بھی بڑی مہارت کے ساتھ کاٹا گیا تھا۔ پتہ ہی نہ چلتا کہ کس سمت مڑے ہیں یا چڑھائی چڑھ رہے ہیں۔ راستے میں ہم کہیں بھی نہ رکے اور چار گھنٹے کے آرام دہ سفر کے بعد سان فرانسسکو پہنچ گئے۔ پیٹر اور سارا نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی۔ ہمیں رسماً بھی خدا حافظ نہ کیا اور جھٹ سے اپنے بیڈ روم میں گھس گئے..... غالباً وہ تھکے ہوئے تھے یا مزید تھکنا چاہتے تھے.....!

ہم بھی کسی حد تک تھک گئے تھے۔ سڑک چاہے کتنی ہی ہموار کیوں نہ ہو گاڑی آرام دہ ہو لیکن سفر' سفر ہی ہوتا ہے۔ راستے میں اگر اتر کر ٹانگیں سیدھی کر لی جائیں۔ تھوڑا سا پیدا چلا جائے اور ایک آدھ کپ کافی پی لی جائے تو تھکن کم ہوتی ہے۔ یکمشت سفر کے اثرات جلد یا بدیر جسم پر ضرور مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ساری رات ہم بھی خواب خرگوش کے مزے لوٹتے رہے۔ سونے کے باب میں نہ جانے کس جانور دوست نے یہ اصطلاحیں وضع کی ہیں کیونکہ سب کی سب جانوروں سے منسوب ہیں..... گھوڑے بیچ کر سونا' خواب خرگوش' شیر کی نیند سونا..... علیٰ ہذا القیاس۔

ہم سب صبح خاصی دیر سے اٹھے لیکن پیٹر اور سارا ہنوز مورچہ بند تھے۔ ہم نے فوری طور پر انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا اور باورچی خانے میں جا کر ناشتہ تیار کرنے لگے۔ اپنا' اپنا۔ مون کا ناشتہ کافی کے کپ اور

کارن فلیکس تک محدود تھا۔ کیتھی انڈوں کی شوقین تھی۔ اسے کانٹی نینٹل بریک فاسٹ سے بڑی چڑ تھی.....
ناشتے کو یار لوگوں نے کئی حصوں میں تقسیم کر ڈالا۔ امریکن بریک فاسٹ میں انڈوں کی اضافت ہوتی ہے۔ کانٹی نینٹل بریک فاسٹ میں انڈے سرو کرنا گناہ کبیرہ نہیں تو صغیرہ تو ضرور سمجھا جاتا ہے۔ روایتی بریک فاسٹ علاقے کے کلچر کا ترجمان ہوتا ہے۔..... اصلی ناشتہ تو ہم لوگوں کا ہوتا ہے یہ انگریز تو محض جھک مارتے ہیں..... صبح بھاٹی یا لوہاری نکل جایئے' پہلوان یا پہلوان نما لوگ ران پہ ران چڑھائے حلوائی کی دکان کے باہر پڑے ہوئے بنچ پر آ بیٹھتے ہیں۔ آرڈر ایسے دیتے ہیں جیسے لسی نہیں منگوا رہے کشتی کا چیلنج کر رہے ہیں۔ سخت' کرخت اور کڑاکے دار زبان میں جب سیر دودھ' سیر بھر دہی' آدھا کلو پیڑے' پیالہ بھر ملائی اور درجن انڈوں کا آرڈر دیتے ہیں تو دکاندار کے علاوہ باقی حاضرین بھی عش عش کر اٹھتے ہیں..... اس ملغوبے کو مزید مزیدار بنانے کیلئے اس میں بادام اور پستے کا تڑکہ لگواتے ہیں اور پھر ایک دھماکہ خیز ڈکار کے بعد ڈھول نما توند پر ہاتھ پھیر کر جب' سبحان تیری قدرت کہتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے تمام ماحول تسبیح پڑھ رہا ہو۔

ہم ناشتہ کر کے کچھ دیر باورچی خانے میں ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ خیال تھا کہ وہ دونوں اچانک ہی ایک معذرت آمیز تبسم کے ساتھ کمرے میں داخل ہونگے اور ہم انہیں ہلکی پھلکی ڈانٹ پلائیں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ جب دو گیارہ بجے تک کمرہ سے باہر نہ نکلے تو ہمیں تشویش لاحق ہوئی۔ تین بجے جہاز نے چلنا تھا اور ہمیں تیاری کیلئے بھی کچھ وقت درکار تھا..... مون نے مشورہ دیا کہ انہیں جگا دیا جائے کیونکہ روانگی سے ایک گھنٹہ قبل ایئرپورٹ پہنچنا ضروری ہے۔ میرا خیال تھا کہ انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ ایسی گہری اور میٹھی نیند زندگی میں بار بار کہاں نصیب ہوتی ہے اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ انہوں نے ہونالولو جانے کا پروگرام بدل ڈالا ہو..... مون کہنے لگی تم پیٹر کو نہیں جانتے اس کی بات پتھر پہ لکیر ہوتی ہے۔ پھر کونسا ہم ان پہ بوجھ بن رہے ہیں۔ تمہارے پاس Around the World ٹکٹ ہے۔ کیتھی کا ٹکٹ میں نے خرید لیا ہے۔ انہیں تو بہر حال ہنی مون کیلئے کہیں نہ کہیں جانا ہے۔ ہوائی نہ گئے تو الاسکا یا پھر بہاماز..... کیا تم نے الاسکا دیکھا ہے؟ ہوائی کی طرح یہ بھی امریکہ سے ہزاروں میل دور ہے..... برفانی علاقہ..... جہاں روس اور

امریکہ کی سرحدی ملتی ہیں۔ایک برفانی پٹی بیرنگ اسٹریٹ ان کو الگ کرتی ہے وہ بھی سارا سال منجمد رہتی ہے۔تم اسے برفیلی زمین یا زمین نما برف کہہ سکتے ہو۔

پھر تو انہیں ہنی مون وہاں منانا چاہئے تھا۔میں نے کہا۔

ان کی نسبت تم وہاں جاؤ تو زیادہ لطف اندوز ہوگے۔اس کے لہجے میں شرارت تھی۔وہاں کے اسکیموز بڑے مہمان نواز ہیں۔گھر آئے مہمان کیلئے دیدہ ودل فرش راہ کرتے ہیں اور اپنے خیمے میں پڑی ہوئی ہر چیز اسے پیش کرتے ہیں۔

پھر تو مجھے بھی الاسکا جانا چاہئے!

تم انہیں بھی مایوس کروگے.....!کیتھی نے بات پکڑ لی۔

کیتھی تم ہمت کرو اور انہیں جگاؤ۔ایسے لگتا ہے کہ رات کو سلیپنگ پلز کھا کر سوئے ہیں.....میں نے مشورہ دیا۔

بولی' پیار کی پلز کھا کر سوئے ہیں ان خوبصورت اور جوان لمحوں میں دوائیں کون استعمال کرتا ہے۔میں نے ایک دوبار کوشش کر لی ہے۔یہ دیکھو میری ہتھیلیاں! دستک دیتے دیتے ان میں خون جم گیا ہے۔اب تو تمہیں ہی محنت کرنا پڑے گی!

ہمت بہر طور مجھے ہی کرنا تھی کیونکہ میرا ہونا لولو جانا ضروری تھا۔تین دن کے قیام کے بعد وہاں سے ہانگ کانگ کیلئے میری سیٹ کنفرم تھی۔اگر فلائٹ مس ہو جاتی تو پھر میرے لئے اس خوابوں کے جزیرے کو دیکھنا ممکن نہ ہوتا۔پہلے تو میں نے دروازے پر انگلیوں سے جلترنگ بجائی کہ کسی نئے نویلے شادی شدہ جوڑے کو اٹھانے کا یہی موزوں طریقہ تھا۔جب موسیقی بے اثر ثابت ہوئی تو پطرس کے برہمچاری کی طرح میں نے دروازے پر تابڑ توڑ حملہ کر دیا۔دستک کی آواز سارے مکان میں گونجنے لگی۔چوبی دیواروں نے لرزنا شروع کر دیا۔ساگوان کی لکڑی کا بنا ہوا چوبی دروازہ گرنے ہی والا تھا کہ پیٹر نے اسے کھول دیا۔اس نے سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔

ایسے لگتا ہے کہ اس کائنات میں تم لوگوں نے ہی پہلی مرتبہ شادی کی ہے۔سستی اور غیر ذمہ داری کی بھی

آخر کوئی حد ہوتی ہے.....! مون نے انہیں ڈانٹا۔

آئی ایم سوری' آئی ایم ریلی ویری ویری سوری..... وہ دراصل بات یہ ہے..... بات یہ ہے کہ.....! وہ ہکلایا۔

دراصل بات کچھ بھی نہیں ہے.....! کیتھی اس کی نقل اتارتے ہوئے بولی "ہمارا نہیں تو کم از کم مہمان کا خیال کرو۔ اسے آج ہر حالت میں ہونالولو پہنچنا ہے....."

"اس کیلئے ہی تو ہم وہاں جا رہے ہیں۔ نہیں تو سارا کا کیا ہے۔ بڑی بھولی لڑکی ہے۔ اسے تو میں اگر ایلکٹر از بھی لے جاؤں تو شاید وہاں بھی خوش رہے۔" اس نے سارا کو تھپکی دی جو سیامی بلی کی طرح اس کے بازوؤں کے حصار میں آ گئی تھی۔

مون بولی "باتیں چھوڑ دو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ناشتہ ایئر پورٹ پر کر لینا"

اس کی ضرورت نہیں۔ صبح کا ناشتہ ہم نے احتیاطاً کل شام ہی کر لیا تھا۔ وہ سارا کے کھلے بالوں میں اپنے ہاتھوں سے کنگھی کرتے ہوئے بولا۔

سبحان اللہ۔ ایسے دور اندیش انسان فی زمانہ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ باقی سب کام بھی پیشگی ہی کر ڈالو..... کیتھی نے مشورہ دیا۔

تم تو بال کی کھال اتارتی ہو..... مون نے سرزنش کی۔ اب انہیں تیار ہو لینے دو وقت نکلتا جا رہا ہے۔"

چوتھا باب

جب ہم سان فرانسسکو ایئرپورٹ پر پہنچے تو پتہ چلا کہ فلائٹ ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ یورپ اور امریکہ میں عام طور پر پروازیں تاخیر سے نہیں چلتیں۔ کمپنیوں کو اپنی ساکھ کی فکر ہوتی ہے پھر سول ایوی ایشن اتھارٹی جرمانہ وصول کرتی ہے اور کسٹمر بھی ایسی ایئرلائن پر سفر کرنے سے اجتناب برتتے ہیں۔ لیکن مشین بھی انسان کی طرح ہر وقت تندرست نہیں رہ سکتی۔ جس طرح بیماری زندگی کا ایک حصہ ہے اسی طرح فنی خرابی کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارے اور ان کے درمیان اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ وہاں فنی خرابی واقعی ہوتی ہے اور ادھر مشین سے زیادہ دماغ میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر کسی امیر' وزیر یا دوست رشتہ دار نے تاخیر سے پہنچنا ہو تو اسی بہانے کا سہارا لیا جاتا ہے اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ پائلٹ کسی زلف گرہ گیر کا کچھ زیادہ اسیر ہو گیا تو تب بھی فرض کو رومانس کی ٹوکری میں ڈال دیا..... Who Cares? یہ چھوٹا سا انگریزی زبان کا لفظ ہماری قومی زندگی کا سکہ رائج الوقت بن گیا ہے۔ اوقات کار کی پابندی کرنیوالوں کا تمسخر تو اڑایا جا سکتا ہے پروا نہیں کی جاتی۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟

دیگر مسافروں کے جذبات کا علم تو نہ ہو سکا لیکن ہم نے اس تاخیر کا برا نہ منایا اور نہ باعث تاخیر جاننے کی کوشش کی۔ لاشعوری طور پر ہم نے تھینک یو کیتھی کہا۔ اس شکریے کی سزاوار ہماری ہمسفر اور مون کی ہجولی نہیں تھی بلکہ ہانگ کانگ کی قومی ایئرلائن کیتھی پیسفک تھی جو دنیائے پرواز میں اپنا مقام بھیر کھتی ہے اور ہانگ کانگ کی شناخت بھی ہے۔ بورڈنگ کارڈ بنوا کر ہم کلب کلاس کے CIP لاؤنج میں آ گئے۔ بڑا خوبصورت لاؤنج تھا۔ ہر قسم کے مشروبات رکھے تھے۔ چار پانچ قسم کے جوس' آٹھ دس قسم کی وسکی' سرخ اور سبز شرابوں کی سیل اور من موجی ڈرافٹ بیئر کا ڈرم۔ دوسری طرف ماکولات کا پہاڑ کھڑا تھا اور پکار رہا تھا' یالیھا الناس چلو کو ہندا کی جانب۔ سوائے ہمارے کسی نے اس آواز پہ کان نہ دھرا۔ سب قدم دختر رز اور جو کی بھتیجی کی طرف لپک رہے تھے۔ چہرے ستے ہوئے' کبوتر کی طرح سرخ آنکھیں' مونچھوں اور ہونٹوں پر بحرالکاہل کی موجوں کی طرح اٹھتی ہوئی سفید جھاگ..... ہم نے چکن سینڈوچ اور کافی کا کپ بنایا اور ہلکے

گلابی رنگ کے آرام دہ صوفوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

اہل مغرب مساوات کے قائل ہیں اس لئے عزت افزائی صرف ان کی ہوتی ہے جو اس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ کلب اور فرسٹ کلاس کے مسافر چونکہ زیادہ رقم دے کر ٹکٹ خریدتے ہیں اسلئے انہیں اکانومی کلاس سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ کھانے پینے کا مفت بندوبست ہوتا ہے۔ لاؤنجز میں سونے کیلئے بھی چند کمرے مختص ہوتے ہیں۔ ہر ملک کی ایئر لائن ان لاؤنجز میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس وقت سنگاپور پہلے نمبر پر ہے۔ اس کے لاؤنجز اپنی مثال آپ ہیں۔ کھلی' کشادہ فن تعمیر کا شاہکار۔ اشیائے خورد و نوش بہترین باورچیوں کی تیار کردہ مشروبات کا پورا سوئمنگ پول' جی کرتا ہے کہ آدمی فلائٹ مس کر دے اور ٹکٹ جیب سے نکال کر رائیل سلیوٹ میں بھگوتا ہوا زیر لب گنگنائے۔ ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ.....

ہم اٹھ کر ایک بار پھر سروس کاؤنٹر پر آ گئے۔ ایک بڑی سی طشتری میں تلے ہوئے پرانز اور رہم کے قتلے پڑے تھے۔ الگ الگ۔ پرانز پلپلے سے تھے اور ان کا عجیب ذائقہ تھا۔ میں نے چکھ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ پرانز میں شوق سے کھاتا ہوں ویسے بھی کوئی چینی کھانا ان کے بغیر مکمل تصور نہیں ہوتا۔ لیکن ہر ملک میں انہیں پکانے کا طریقہ الگ الگ ہے۔ ہم نے ان کو بارہ مصالحوں کی ایسی جاٹ لگائی ہے کہ اب لفظ چینی اضافت معلوم ہوتا ہے اور باقی صرف چٹ پٹے مصالحے دار کھانے رہ جاتے ہیں۔ امریکہ میں بہت اچھے اور ہر سائز کے پرانز ملتے ہیں۔ بالشت بھر..... بالکل چھوٹی مچھلی لگتے ہیں۔ یہ جمبو پرانز کے بھی جمبو ہوتے ہیں اور اونچے ریسٹورنٹوں میں سرو ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں لاؤنج والے پانز کا ذائقہ کیوں خراب تھا۔ ہوسکتا ہے کہ صحبت یا ہمسائیگی کا اثر ہو کیونکہ ان کے بالکل قریب پورک رکھا ہوا تھا۔

پیٹر اور سارا نے جی بھر کر ناشتہ کیا۔ پرانز اور لحم خنزیر پر بھی ہاتھ صاف کر گئے۔ جب پیٹر دوسری مرتبہ پلیٹ بھر کر لایا تو کیتھی نے اسے ٹوکا کیا اب اگلی صبح کا ناشتہ ایڈوانس کر رہے ہو؟

بولا نہیں یہ آج کا ہی ہے۔ تم اسے ڈبل ناشتہ کہہ سکتی ہو۔ پیسے خرچ کئے ہیں کوئی خیرات تو نہیں کھا رہے.....!

مال پرایا ہے مگر پیٹ تو اپنا ہے.....!

کیتھی کا مذاق اپنی جگہ' مگر پیٹر ایک اعتبار سے درست بات کہہ رہا تھا جب بھی مسافر ہوائی سفر کرتا ہے تو Paid Dinne کھاتا ہے۔ وہ کھانا پینا ایک عجیب نفسیاتی کیفیت میں ہوتا ہے۔ جس ادارے نے پیسے بٹورے ہیں۔ اس سے آخر بدلہ بھی تو لینا ہے۔ پھر سفر گزارنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جب پرواز طویل ہو اور آدمی کو دس بارہ گھنٹے ایک سیٹ پر بیٹھنا پڑے تو وہ کھائے پیئے گا نہیں تو اور کیا کرے گا۔ رسالہ یا کتاب کب تک پڑھا یا جا سکتا ہے۔ آدھے گھنٹے میں ہی سر میں درد ہونے لگتا ہے اور آنکھوں پر بوجھ محسوس ہوتا ہے ٹی وی سکرین پر مسافروں کیلئے سگنل آنا شروع ہو گئے۔ پیٹر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ہری اپ گیٹ نمبر 39 ایک کلومیٹر دور ہے۔

اتنی جلدی کیا ہے۔ ایک آدھ مزید پلیٹ پر ہاتھ صاف کیا جا سکتا ہے۔ کیتھی نے پھر رائے دی۔

Don't be rude with my husband سارا نے اسے ڈانٹا۔

او مائی گاڈ..... کیتھی چلائی..... یہ حادثہ بھی اسی زندگی میں ہونا تھا۔

کیتھی پیسفک کا جمبو گیٹ نمبر 39 پر منہ بسورے کھڑا تھا۔ جہاز دو تہائی خالی تھا۔ اسے ہانگ کانگ جانا تھا۔ ہوائی اس کی منزل نہیں بلکہ نشان منزل تھا۔ اتنی کم سواریوں سے تو جہاز کا خرچہ بھی نہیں نکلتا۔ دنیا کی اکثر ہوائی کمپنیاں نقصان میں جا رہی ہیں' مسافر کم ہو رہے ہیں اور ایندھن کی قیمت میں ہوشربا اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن امریکہ کو چھوڑ کر دیگر ایئر لائنز اپنا کاروبار بند نہیں کرتیں کیونکہ ان کے ساتھ قومی وقار جڑا ہوتا ہے۔ ایئر لائن بیچنا ملک فرخندہ کے مترادف ہوتا ہے۔ ویسے کیتھی کا شمار دنیا کی کامیاب اور بہترین ایئر لائنز میں ہوتا ہے..... اتنے چھوٹے ملک کی اس قدر بڑی ایئر لائنز..... حیرت ہوتی ہے اگر اس کے سارے جہاز ایک قطار میں کھڑے کر دیئے جائیں تو محاورتاً ہی سہی ان میں ہانگ کانگ کی سب آبادی سما سکتی ہے۔

کلب کلاس کا بندوبست بالائی منزل پر تھا۔ جمبو 747 دنیا کا واحد جہاز ہے جو ڈبل ڈیکر ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے بالائی منزل GARROT پر رہنے کے فوائد گنوائے تھے۔ اس کا کمال ہی یہی تھا کہ کتنا ہی ہلکا پھلکا مضمون ہوتا اسے بڑی سنجیدگی سے لیتا اور پھر زور قلم سے پست کو بالا کر دیتا۔ آج اگر وہ زندہ ہوتا تو

ہوائی کمپنیوں سے اپنے استدلال کی داد وصول کرتا اور ہوسکتا ہے کمپلیمنٹری ٹکٹ پر گیرٹ میں بیٹھ کر دنیا کو حیرت سے دیکھتا۔ اوپر بیس کے قریب سیٹیں تھیں لیکن کل دس مسافر تھے جن میں پانچ تو ہم خود تھے۔ ایک بوڑھا چینی اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ایک یورپین تھا جو کسی تجارتی کمپنی کا ایگزیکٹو لگتا تھا کیونکہ اس نے نفیس پن سٹرائپ سوٹ پہنا ہوا تھا اور ٹائی باندھ رکھی تھی۔ ایک نوجوان جوڑا جو شادی شدہ تو نہ لگتا تھا لیکن ان کی حرکات وسکنات سے محسوس ہوتا تھا کہ تمام مراحل پہلے ہی طے کر چکے ہیں۔ رن وے پر دوڑتا ہوا جمبو یوں اچانک فضا میں بلند ہوا جیسے کوئی بچہ پھونک مار کر کاغذ کو ہوا میں اچھالتا ہے..... میں اکثر سوچتا ہوں کہ جہاز میں سوار مسافروں کی اکثریت متوسط طبقے سے ہوتی ہے۔ کام کرنیوالے آدمی' مزدور پیشہ لوگ جو سال دو سال کے بعد چھٹی لیکر وطن واپس جاتے ہیں یا چھٹیاں منانے صحت افزا مقامات کی طرف نکل جاتے ہیں۔ آج اگر مغل اعظم زندہ ہوتا' کنشک واشوک اپنی راکھ جھاڑ کر شمشان سے باہر نکلتے' سکندر مقدونی' ہنری لوئی اور زار واپس لوٹتے تو زار و قطار روتے کہ انہیں کس غلط وقت میں پیدا کیا گیا۔ ایسا دور جب زیادہ وقت ہاتھیوں اور گھوڑوں کی لید سونگھنے میں گزرتا۔ بادصرصر اور بادسموم کے جہنم زار میں جھلستے رہے..... وہ ہارون رشید جو پانی کے ایک گلاس کے بدلے اپنی تمام سلطنت دینے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ ایک جمبو کے عوض نہ جانے کیا کچھ دے ڈالتا۔ سکندر مقدونی اپنے مقدر پر کف افسوس ملتا۔ صحرائے مکران کو سسک سسک کر عبور نہ کرتا بلکہ اس پر چشم زدن میں فر سے اڑ جاتا۔ مغل اعظم انارکلی کو دیوار میں نہ چنواتا بلکہ بتیس ہزار فٹ کی اونچائی سے اڑن کھٹولے سے نیچے پھنکوا دیتا۔ دنیا کس قدر بدل گئی ہے! آج اگر ایک کتا بھی زخمی ہوتا ہے تو اس کی چوں چوں تمام دنیا سنتی ہے۔ قحط یا زلزلوں کی صورت میں تمام دنیا سے امداد آنی شروع ہو جاتی ہے۔ جذبہ جہانگیری آج بھی زندہ ہے۔ شاید یہ انسان کی سرشت میں ودیعت کر دیا گیا ہے لیکن اس کیلئے کشتوں کے پشتے نہیں لگائے جاتے۔ صرف سوچ مسدود یا مصلوب کر دی جاتی ہے۔ بارہ ہزار میل دور سے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبتا ہے اور کٹھ پتلیوں کا ناچ شروع ہو جاتا ہے۔ مشعلیں خود بخود آتی ہے ہوا کی جانب۔

جب جہاز اپنی مقررہ اونچائی پر پہنچ گیا تو وارننگ لائٹس بجھ گئیں۔ سب نے حفاظتی بیلٹ کھول دیں۔ میں

نے کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا ہر طرف پانی کی حکمرانی دکھائی دی۔ وہ سمندری جہاز جو پہلے کھلونوں کی طرح نظر آرہے تھے غائب ہوگئے۔ ایئر ہوسٹس جس نے چائنیز سلک کا خوبصورت لباس پہن رکھا تھا پھولوں کا گلدستہ لئے ہمارے پاس آئی۔ کورنش بجالا نے کے انداز میں اس نے اپنی پتلی کمر کو ہلکا سا خم دیا اور سارا کو گلدستہ پیش کیا۔ ہوائی کمپنی آپ کیلئے ایک کامیاب ازدواجی زندگی کیلئے دعا کرتی ہے۔ اس نے مسکرا کر اپنے خوبصورت سفید دانتوں کی نمائش کی۔

کمپنی کو کیسے پتہ چل گیا کہ یہ خیر سے نو بیاہتا ہے؟ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

اٹ از اے ٹریڈ سیکرٹ! اس نے ایک بار پھر موتیوں کی نمائش کی۔

پھر بھی..... میرا تجسس بڑھ رہا ہے.....؟

باڈی لینگویج۔ لباس' چال ڈھال' بول چال سب پتہ دیتے ہیں۔ اس نے وضاحت کی نئی نویلی دلہن کا انگ انگ بولتا ہے رواں رواں گنگناتا ہے لب ولہجہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ تم نے اس کے بازوؤں کا حصار دیکھا ہے.....! اس نے پیٹر کی طرف اشارہ کیا۔ A possessive husband. A proud husband

اس نے شکی مزاج ہونے کا تاثر بھی تو لیا جاسکتا ہے کیتھی نے رائے دی اتنی جلد نہیں ایسا وقت اور منزلیں بعد میں آتی ہیں۔ جب جوڑے پریم نگر سے نکل کر حقائق کی دنیا میں آتے ہیں!

ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔ سارا نے پیٹر کا بوسہ لیا For all times & climes he is mine.

اللہ کرے ایسا ہی ہو! اس کی دعا میں بھی تشکیک تھی۔

سان فرانسسکو سے ہوائی پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔ لیکن ہمیں سفر کی طوالت کا قطعاً احساس نہ ہوا۔ ہوائی کمپنی نے تہیہ کر رکھا تھا کہ مسافروں کو فارغ نہیں بیٹھنے دینا۔ ڈرنکس کے بعد کھانا پیش کیا گیا۔ کھانے کے بعد آفٹر ڈنر ڈرنکس کا سلسلہ چل نکلا۔ میں خود جوس کے گلاس کے ساتھ بادام کی گریوں کی تین پلیٹوں پر ہاتھ صاف کر گیا۔ ہر چند کہ پلیٹ میں گنتی کی گریاں ہوتی تھیں لیکن سپلائی جاری رہتی ہے۔ ہر ہوائی کمپنی کی خواہش

ہوتی ہے کہ وہ اپنی سروس کو خوب سے خوب تر بنائے۔ کوئی جدت پیدا کرے۔ کٹ تھروٹ مقابلے کی وجہ سے یہ ضروری بھی ہے۔ مسافروں کو لبھانے کے لئے کوئی نہ کوئی اضافی سہولت دی جاتی ہے۔ ان سب کا لیڈر برطانوی نائیکون رچرڈ برنسن ہے جس کی ورجن اٹلانٹک ایئرلائن دنیا کی سہولتوں اور تعیش کے اعتبار سے لیڈر رہے۔ یہ غالباً دنیا کی واحد ایئرلائن ہے جس کے جہاز سیٹ تا سیٹ بھرے ہوتے ہیں۔ جہاز کے اپر ڈیک میں مساج پارلر ہے' ایک پوری بار ہے' کاؤنٹر کے ساتھ رکھے ہوئے سٹول اور پیچھے بارٹینڈر کھڑا ہوتا ہے۔ بالکل برطانوی پب PUB کا ماحول پیدا کیا گیا ہے۔ سیٹوں اور بار کے درمیان ایک صوفہ بچھا ہے جس پر لیٹ کر مسافر اپنی کمر سیدھی کرتے ہیں۔ کھانوں کی ایک طویل فہرست ہے جس کو پڑھتے پڑھتے آدمی تھک جاتا ہے اور جن کو کھاتے ہوئے اشتہا مزید تیز ہوتی ہے مسافروں کے تاثرات جاننے کیلئے ایک رجسٹر رکھا گیا ہے اس ایئرلائن کو خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہے۔ حیران کن اور خوشگوار مرحلہ اس وقت آتا ہے جب کوئی شخص ڈرنکس کی ٹرے لئے آپ کے کندھے پر اچانک مشفقانہ ہاتھ رکھتا ہے مسافر حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتا ہے وہ اپنا تعارف کچھ اس طرح کراتا ہے میرا نام رچرڈ برنس ہے میں اس ہوائی کمپنی کا مالک اور آپ کا خادم ہوں۔ کیا آپ میرے ہاتھ سے ایک جام لینا پسند فرمائیں گے وہ جام دہ آتشہ ہو جاتا ہے۔ مساج کرنیوالی لڑکیاں بڑی نازک اور حسین ہوتی ہیں۔ اکثر مسافر سوچتے ہیں کہ ان نازک ہاتھوں اور مخروطی انگلیوں کو تھکانا گناہ کبیرہ سے کم نہیں۔ لیکن یہ ان کی بھول ہوتی ہے جب وہی ہاتھ جسم پر پڑتا ہے تو خاصا سخت ہوتا ہے۔ ٹرینڈ اور اپنے فن میں ماہر..... ایئرپورٹ پر مفت لیموزین سروس کا بندوبست ہوتا ہے۔ اسی میل کے ریڈیئس میں جہاں چاہیں مفت آ جا سکتے ہیں۔ ہم خوشگپیوں میں مصروف تھے کہ اعلان ہوا جہاز ٹھیک نصف گھنٹہ بعد ہوائی لینڈ کر جائیگا۔ آخر امریکہ کو اتنی دور یہ چھوٹا سا علاقہ ہتھیانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے سوال کیا مون کہنے لگی تم نے ضرور مجھے زچ کرنا ہے یہ سوال پیٹر سے بھی پوچھا جا سکتا تھا.....! دیکھتی نہیں ہو کس طرح اک دوجے میں گم ہیں۔

میں استامد ہوش بھی نہیں ہوں.....! پیٹر سارا کا سر اپنی گود سے ہٹاتے ہوئے بولا تمہارے سوال کا آسان کا جواب تو یہ ہے کہ ہم نے ان پر مہربانی کی ہے احسان کیا ہے جب قطرہ قلزم میں ملتا ہے تو سمندر جتنی

وسعت اور قوت اس میں بھی آ جاتی ہے۔ اب یہ ہماری کالونی نہیں ہے ہمارے جسم کا ایک حصہ ہے۔ کہاں جنوبی بحرالکاہل کے بے نوا مچھیرے اور کہاں ایک سپر طاقت کی چھتری تلے کھڑے ہوئے یہ لوگ شاہ یقین کرو اگر ہم چاہیں تو آدھی دنیا ہمارے جھنڈے تلے آنے کیلئے تیار ہے بلکہ بے قرار ہے!

ویسے اب بھی آدھی دنیا اگر تمہارے جھنڈے تلے نہیں ہے تو ڈنڈے تلے ضرور رکھی ہے یہ جو مجبور ایران ہے یہ جو مقہور عراق ہے یہ جو معصوم کویت ہے یہ جو قارون سعودی ہیں سب تمہاری سوچ کے اسیر ہیں۔ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ تم کرتے ہو سمندروں میں طغیانیاں تمہاری جولانی طبع سے آتی ہیں۔ تمہیں کیا ضرورت ہے ان کمزور لوگوں کو اپنا ہم پلہ بنانے کی!

تم نے بات بہت بڑھا دی ہے میرا مطلب یہ ہے کہ چراغ وہی جلتا ہے جس میں تیل ہو۔ طاقت کی اپنی منطق ہوتی ہے یہ اپنا جواز خود پیدا کرتی ہے آج ہمیں پولیس مین آف دی ورلڈ کہا جاتا ہے تم ہی کہو کہ کیا اس دنیا کو ایک پولیس مین کی ضرورت نہیں ہے! کیا دنیا میں ظلم اور زیادتی ختم ہو گئی ہے کیا طاقتور کمزور کا گلا نہیں کاٹتا کیا ہر طرف انصاف' عدل گستری اور تکریم انسانیت ہے وہ ایک لمحے کیلئے رکا پھر کہنے لگا ذرا سوچو اگر تم سپر پاور ہوتے تو کیا کرتے۔ ہندوؤں کو کہتے مہاراج آدھا کشمیر آپ کے پاس ہے باقی بھی رکھ لیجئے ہم کمزور پر ہاتھ اٹھانا گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے خون سے وہاں ہولی کھیلی جاتی ہے تم منہ دوسری طرف پھیر لیتے یا کانوں میں روئی ٹھونس لیتے کہ یہ دوسرے ملک کا اندرونی معاملہ ہے۔ ایک بہت بڑی طاقتور قوم کو کمزور قوم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے۔ اس درندے صدام کو کھل کھیلنے کا موقع دیتے جس کے مظالم دیکھ کر آج حجاج بن یوسف بھی اپنی قبر میں پانی پانی ہو رہا ہو گا۔ بوسنیا کے آخری مسلمان کے قتل ہونے تک اخلاق' اخلاق اور ظلم' ظلم کا ورد کرتے ہوئے؟"

"کیا تم جانتے ہو اس خون آشام بھیڑیئے کا محسن و مربی کون ہے کس نے بالواسطہ اور بلاواسطہ اسے کویت اور ایران پر حملہ کرنے کی شہ دی۔ صرف ایران عراق جنگ میں بیس لاکھ لوگ مارے گئے 345 بلین ڈالر ضائع ہوئے' مفلوج اور اپاہج لوگوں کی ایک فوج کھڑی ہو گئی' نتیجتاً تیل کی ساری

کمائی بارود کی نذر ہوگئی..... یہ تو تمہیں علم ہی ہے کہ یہ بارود کہاں سے آتا ہے!''

پھر پرانی بحث.....''مون نے مداخلت کی' چلو مان لیا ہم سے زیادتیاں ہوئی ہیں۔ ہمیں شاید اتنی دور تک نہیں آنا چاہئے تھا' لیکن اب آ جو گئے ہیں دنیا کے معاملات میں اس قدر مداخلت نہیں کرنی چاہئے تھی لیکن اب چھا جو گئے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست کی ایک اصطلاح ہے fait accompli ایک حقیقت جس سے کسی طور صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اب یہ لاحاصل بحث چھوڑو اور دائیں ہاتھ دیکھو' ہوائی کا شہر کیپٹن جیمز کک کے سفینے کی طرح سمندر کے سینے پر ڈول رہا ہے.....

ساحلی شہروں کی لینڈنگ بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے پائلٹ راستہ بھول گیا ہے اور غلطی سے سمندر میں اتر جائے گا لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے رن وے کی پٹی یا تو سمندر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے یا پھر سمندر کے اندر مٹی اور پتھر ڈال کر بنائی جاتی ہے..... جب جہاز رکا تو ایرڈیک سے صرف ہم پانچ مسافر اترے باقی ہانگ کانگ جا رہے تھے۔ ہوائی سے جہاز کو سیدھا ہانگ کانگ جانا تھا درمیان میں دیگر کوئی سٹاپ نہ تھا نو گھنٹے کی مسلسل تھکا دینے والی پرواز! جہاز کسی وجہ سے ایئر پورٹ بلڈنگ کے ساتھ نہ لگا تھا بلکہ ہمیں کافی دور کھلی جگہ اتارا گیا مجھے لاہور یاد آ گیا وہاں بھی ایسا ہوتا ہے بلکہ ایسا ہی ہوتا ہے ایک لمبی آرام دہ بس ہمیں ایئر پورٹ بلڈنگ کے برآمدے تک لے آئی' سیڑھیاں چڑھ کر جب اوپر پہنچے تو ایک اور بس ہماری منتظر تھی وہ چھت پر چلتی ہوئی ہمیں مین بلڈنگ تک لے آئی ہوائی ایئر پورٹ خاصا خوبصورت تھا ہر چند کہ باقی امریکن ایئر پورٹس کی طرح بہت بڑا نہ تھا۔ عمارت کی تعمیر میں کہیں کہیں لوکل ٹچ دیا گیا تھا ہمارے پہنچنے تک سامان بھی آ گیا ہم نے سوٹ کیسوں کو ٹرالیوں پر رکھا اور باہر نکل آئے ایک دیوہیکل نیگرو لڑکی نے ہمیں الوہا کہہ کر خوش آمدید کہا۔ اس کا قد چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہی ہوگا جتنی لمبی تھی اسی قدر پھیلی ہوئی بھی تھی گمان ہوتا تھا کہ کسی باکسر کی اولاد ہے یا کسی طور اسے پیشے سے تعلق ضرور رہا ہے..... بازو کی چھلیاں صرف پھڑ پھڑا نہیں رہی تھیں بلکہ ڈرا بھی رہی تھیں..... اس نے بتایا کہ قانون کے مطابق پانچ آدمی ایک کیب میں نہیں بیٹھ سکتے پھر خود ہی مشورہ دیا کہ بڑی آرام دہ لگژری کوچز چلتی ہیں ان میں بکنگ کروالی جائے

ہمیں مشورے سے زیادہ حکم لگا ہماری خاموشی کو نیم رضا سمجھتے ہوئے بولی ''ہماری کمپنی ہوائی کی سب سے بہتر کمپنی ہے آدمی کوچ میں بیٹھ جائے تو اترنے کو دل نہیں کرتا۔ بالکل نئی نویلی.....دلہن کی طرح .....!

''اس کو بھی پتہ چل گیا ہے.....!'' کیتھی نے سارا کو چھیڑا۔

میں نے مون سے پوچھا ''اس نے بڑا عجیب سا لفظ بولا ہے' الوہا.....اس کا مطلب کیا ہے؟''

اس کے معنی ہیں محبت.....! یہ مقامی لفظ ہے!''

''ایک بار پھر کہو میں سمجھا نہیں.....!''

کتنی بار تو کہہ چکی ہوں! تم سمجھتے ہی نہیں!' وہ مسکرائی۔

میرے کانوں میں ایک مشہور قوام کے بول گونجنے لگے

سمجھ' سمجھ کے بھی جو نہ سمجھے

میری سمجھ میں وہ نا سمجھ ہے

پیٹر کہنے لگا یہ لڑکی درست کہہ رہی ہے کوچ سے جانا بہتر ہوگا۔ ہم نصف گھنٹے میں ہوٹل پہنچ جائیں گے بکنگ ہو چکی ہے میں سامان رکھواتا ہوں آپ لوگ ماحول اور موسم کا مزہ لیں۔

ہم باتیں کرتے کرتے برآمدے سے باہر نکل آئے.....میں نے چار سو دیکھا مشرق اور مغرب کا حسین سنگم' ہر طرف اناس اور پپیتے کی خوشبو پھیلی ہوئی اوپر صاف نیلا آسمان' حد نگاہ تک پھیلا ہوا سمندر.....اردگرد پھرتی ہوئی خوبصورت' جوان لڑکیاں 'ہوائی کی بیٹیاں.....رنگت ایسی ملیح جیسے کسی نے دودھ میں گنے کا تازہ رس ملا دیا ہو۔ تیز پرنم ہوا' اتراتا ہوا موسم' جیسے کہہ رہا ہو اس جزیرے میں جس قدر رعنائی اور توانائی ہے وہ میں نے بخشی ہے میری چاہت میں لوگ دیوانہ وار آتے ہیں جہاں درجہ حرارت 75 اور 60 فارن ہائیٹ کے درمیان چہل قدمی کرتا ہوا سے ہمارے ہاں بہار کہتے ہیں جو سال میں صرف ایک بار آتی ہے اکثر پتہ ہی نہیں چلتا کہ آئی کب تھی اور گزری کس طرح ہے۔

''عجیب لڑکیاں ہیں!'' میں نے تعجب کا اظہار کیا' دور کس شان بے نیازی کے ساتھ کھڑی ہیں

کوئی آ کر گلے میں پھولوں کی مالا نہیں ڈالتی کیا ہم کیپٹن کک کے یرقان زدہ ملاحوں سے بھی گئے گزرے ہیں! الوہا' بھی کہلوایا تو ایک کالی کلوٹی سے جو یقیناً مقامی نہیں ہے بلکہ نیویارک یا شکاگو سے درآمد کی گئی ہے!''

''تمہیں کس نے کہا ہے کہ یہ اجنبیوں کے گلے میں ہار ڈالتی ہیں؟ مون لفظوں کے لوچ سے حظ اٹھاتے ہوئے بولی۔

ساری کتابوں میں لکھا ہے بے شمار قصے کہانیاں اتنی تھیں۔ کیپٹن کک کے سپاہیوں کو ہار پہناتے یہ خود بھی ان کے گلے کا ہار بن جاتی تھیں!''

کس زمانے کی بات کرتے ہو ان بدبختوں نے انہیں دیا ہی کیا تھا سوائے جنسی بیماریوں اور حرامی بچوں کے!''

''باایں ہمہ ان کے حسن میں آج بھی ایک جادو ہے میں نے زندگی میں شکر اور نمک کا اس قدر حسین امتزاج آج تک نہیں دیکھا''

تو کوئی ایک آدھ چن لو۔ مہم جو کک کے بعد بھی آتے رہے ہیں!'' سارا سے چپ نہ رہا گیا۔ شکر ہے یہ بھی بولی ہے'' کیتھی نے آسمان کی طرف دیکھا میں تو سمجھی تھی شادی نے اسے گونگا کر دیا ہے۔

اب یہ کس سے بول بچن کرے گی وہ نیک بخت تو آناً فاناً ہی گھائل ہو گیا''۔ میں نے کیتھی کو سمجھایا

۔

ہنس کر بولی'' گھائل تو سبھی ہیں' جرات اظہار کسی کسی میں ہوتی ہے''

''سو فیصد درست!'' مون نے اس کی کمر کو تھپتھپایا' کبھی کبھی تو تم بڑے مزے کی بات کرتی ہے

''.....

بات تو میں ہمیشہ پتے کی کرتی ہوں شاید اس نے تمہیں زیادہ اپیل کیا ہے''

مون کے جواب دینے سے پہلے ہی پیٹر آ گیا۔ دونوں ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے سارا کو کہنے لگا

Your highness every thing is read

وہ بھی نہیں بتا سکتا.....!وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

کوچ کیپٹن شہر کے خال وخد بتا رہا تھا۔ ہمارے دائیں طرف سمندر تھا اور بائیں ہاتھ ہونالولو کی خوبصورت عمارات' مارکیٹیں اور سرسبز پہاڑی کی ڈھلوان پر ہنستا مسکراتا ہوا شہر۔ کوچ ہوٹل کے پورچ میں جا کر رکی۔ وائے کیکی WAIKIKI بیچ کے عین مرکز میں ہوٹل شیرٹین ہے۔ بیچ پر ویسے تو بے شمار ہوٹل ہیں لیکن یہ ان کا سرخیل ہے اس کی بین الاقوامی شہرت اپنی جگہ لیکن ہوائی میں اس کو بڑی محنت سے بنایا گیا ہے ہوٹل کے اکثر کمروں کی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی ہیں ان کمروں کا کرایہ بھی دیگر کمروں کی نسبت زیادہ ہے ہوٹل کے باہر ایک بہت پرانا اور تاریخی اہمیت کا درخت ہے BUNYAN TREE جس کے متعلق کئی روایات مشہور ہیں ایک روایت یہ بھی ہے کہ رات کے پچھلے پہر اس کے نیچے کھڑے ہو کر خلوص نیت سے کوئی دعا مانگی جائے تو قبول ہو جاتی ہے جن کی مرادیں پوری نہیں ہوتیں وہ بھی درخت کی مورد الزام نہیں ٹھہراتے بلکہ اپنے آپ کو کوستے ہیں کہ ان کے خلوص میں کوئی کمی تھی۔

ہوٹل شیرٹین ہو' ساحل وائی کیکی ہو اور شہر ہونالولو تو تفریح کا مفہوم بدل جاتا ہے یعنی تفریح بڑے ناز اور کروفر کے ساتھ تعیش کے زمرے میں داخل ہو جاتی ہے میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی تو نم آلود ہوا کا جھونکا دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ ناراض' ناراض سا۔ جیسے مجھ سے گلہ کر رہا ہو کہ کیوں اب تک اپنے آپ کو اس لطافت سے محروم رکھا.....اب میں اسے کیا بتایا کہ لطف وکرم کی بارشوں میں بھی میرا دامن خشک رہا جو باوجود شدید خواہش کے بھی تر نہ ہو سکا خواہش اور عمل میں جو نازک سا فاصلہ ہوتا ہے میں اسے کبھی بھی پار نہ کر سکا شاید اس میں میری کم حوصلگی کو بھی عمل دخل ہو.....مرزا غالب نے اس قسم کے ایڈونچر کیلئے دو پیشگی شرائط رکھی تھیں۔

شوق فضول اور جرات رندانہ.....وہ لوگ جو عقل کو کنارے پر رکھ کر سمندر میں کود جاتے ہیں ہم انہیں بظاہر تو مطعون کرتے ہیں لیکن بباطن اپنی حسرتوں کا شمار کیے بن بھی نہیں رہا جاتا۔

بڑا خوبصورت منظر تھا۔ حد نگاہ تک پھیلا ہوا وسیع سمندر ہوٹل سے جڑی ہوئی بیچ جہاں ہر روز

ہزاروں نیم برہنہ حسینائیں اس سے گلے ملتی ہیں سمندر کی سرکش موجوں کا ترنم اور روانی دراصل اسی ملاپ کا نتیجہ ہے اگر عکس جمال یار سے آئینے قمریوں کی طرح بول سکتے ہیں تو وصال یار سے سرد پانیوں میں بھی ابال آ سکتا ہے..... میں نے سڈنی کے متعلق لکھا تھا اس کا سمندر ڈان حوان ہے ہوائی کا سمندر بھی کسی ڈان حوان یا کیسانووے سے کم نہیں دنیا میں حسین لوگوں کی کمی نہیں ہے دلکش مناظر بھی ان گنت ہوں گے موسم مہربان ہوگا۔ لیکن ساحلوں میں تین ساحل خوبصورتی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ کانز کا دس میل لمبا ساحل جہاں سفید ریت اور سرخ وسفید جسموں نے اسے منفرد بنا دیا ہے سڈنی کی بانڈے بیچ جس کا ذکر ابھی ہوا ہے اور وائے کیکی بیچ جو بالکل میرے سامنے تھی جتنی خوبصورت بیچ ہوگی اتنے ہی اعلیٰ ہوٹل اس کے کنارے پر بنائے جائیں گے خوبصورت لوگ اکثر تیراکی کا لباس پہن کر ہوٹل کے کمرے سے نکلتے ہیں اور سیدھے بیچ پر چلے جاتے ہیں راستے میں کوئی چیز بھی حائل نہیں ہوتی۔

شام ہو چلی تھی اس لئے بیچ پر چند سرپھرے جوڑوں کے ہیولوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا تھا۔ سمندر کا نیلا پانی بھی تاریکی کی وجہ سے گہرا سانولا ہو گیا البتہ ہوٹل کی روشنیوں کا عکس جہاں جہاں پڑتا وہاں اس کا رنگ سبزی مائل نظر آتا..... دور چند جہاز نامعلوم منزلوں کو روانہ تھے ان کی زرد کپکپاتی ہوئی روشنیاں تاروں کی طرح ٹمٹما رہی تھیں..... کچھ دیر میں اس نظارے سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر نہا کر کپڑے بدلے اور نیچے لابی میں آ گیا..... زیادہ رش نہیں تھا۔ غالباً لوگ دن بھر کی تھکن اتارنے اور شب کی تیاری کیلئے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے پارٹی کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور باہر نکل آیا..... سمندر اور دکانوں کے درمیان سڑک ہے اکثر ہوٹل سڑک اور سمندر کے درمیان ہیں ان کے آدھے دروازے سمندر کی طرف کھلتے اور باقی سڑک کی جانب سڑک کے پار بے شمار دکانیں ہیں لیکن اصل بازار ذرا ہٹ کر ہے ساحل سڑک کے متوازی دوسری سڑک ہے جہاں بڑے بڑے شاپنگ سنٹر ہیں اور دوسرے درجے کے بے شمار ہوٹل ہیں یہ سڑک عملاً ائیر پورٹ تک چلی گئی ہے۔

بازار میں بڑی جہل پہل تھی یوں لگتا تھا جیسے سارا امریکہ چھٹیاں منانے ہوائی چلا آیا ہو۔ دنیا کے دیگر ممالک سے آئے ہوئے سیاح بھی بڑی حیرت اور حسرت سے ہر چیز کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اور دھڑا دھڑ مقامی اشیاء کی خریداری کر رہے تھے انسانوں کے اس انبوہ میں ہوائی کے اصل باشندے بہت کم نظر آئے اس کی ایک وجہ تو غالباً یہ تھی کہ ہوائی کیکی ٹورسٹ پیراڈائیز کہلاتی ہے اس کی کشش اور حسن دنیا بھر کے سیاحوں کو یہاں کھینچ لاتا ہے پھر سب شاپنگ سنٹر امیر امریکنوں کے ہیں جو ظاہر ہے کہ بڑی ریاستوں سے یہاں آتے ہیں غریب غربے کا اس امیر علاقے میں نہ تو کوئی کام ہے اور نہ مقام! میں نے حسب عادت سارے بازار کا چکر لگایا دائیں ہاتھ چلتے چلتے میں بازار سے باہر نکل آیا سامنے ایک بہت بڑا پارک تھا جو اس وقت قریباً خالی تھا۔ پہلے تو جی چاہا کہ لگے ہاتھوں پارک کی بھی سیر کر لی جائے لیکن پھر ایک عجیب سا خوف میرے ذہن پر سوار ہو گیا کیا شریف وحشی اتنا مہذب ہو گیا ہے کہ اب اس نے لکڑی کے بلم اور چوری شدہ خنجر کا استعمال بند کر دیا ہے اس قدر پر رونق علاقے سے ملحقہ اتنی ویرانی حیران کن تھی میں بائیں ہاتھ مڑ گیا اور چلتے چلتے نہر تک پہنچ گیا نہر پرانے شہر کو نئی آبادی سے الگ کرتی ہے ہونالولو کے تین اطراف پہاڑیاں ہیں جن پر مکان بنے ہوئے ہیں چوتھی سمت سمندر ہے میں نہر کے کنارے کافی دیر گھومتا رہا یہاں بس اکا دکا لوگ نظر آئے

.....

گھومتے گھومتے میں نے گھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے یہ ڈنر ٹائم تھا میں نے جلدی جلدی قدم اٹھانے شروع کیے اور متبادل راستے سے پھر بازار داخل ہو گیا کتابوں کی دکان دیکھ کر میرے قدم رک گئے اور بے ارادہ دکان میں داخل ہو گیا دکان کوئی خاص بڑی نہیں تھی کتابیں بھی زیادہ نہ تھیں لیکن ہوائی پر لکھی ہوئی کتابوں کا انبار لگا تھا فکشن اور فکشن، حقائق اور ذہنی اختراع ان جزیروں نے ایک طویل عرصے تک انسانی سوچ کو متاثر کیا ہے تاریخ کے علاوہ قصے کہانیاں بھی گھڑی گئیں سرد راتوں میں گرم قصے بڑا لطف دیتے ہیں زیادہ دیر تک کتابوں کی الٹ پلٹ کا وقت نہ تھا میں نے چند کتابیں پسند کیں اور انہیں پیک کروا کر ہوٹل میں چلا آیا ڈائننگ روم میں جانے سے پہلے میں انفارمیشن

ڈیسک پر گیا وہاں ایک چھوٹی سی میز کے پیچھے ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا میں نے اس سے کنڈیکٹڈ tour کے متعلق پوچھا ..... ''وٹ .....؟'' اس کی سمجھ میں میری بات نہیں آ رہی تھی conducted میں الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا ..... جب اس نے دوسری بات وٹ کہا تو جھلاہٹ محسوس ہوئی کیا کند ذہن شخص ہے سیدھی سی بات نہیں سمجھتا ہم کل ہوائی کی سیر کرنا چاہتے ہیں کیا تم ہماری رہنمائی کر سکتے ہو؟

OH, I SEE YOU MAN OUTDOOR ACTIVITY''ہاں ایسا ہی سمجھو.....!.....بالکل' بالکل.....46.81ڈالر فی کس کتنے ٹکٹ چاہئیں جلدی کرو' ٹکٹ ختم ہونے والے ہیں میں نے بٹوے سے رقم نکال کر میز پر رکھ دی اس نے دراز کھول کر ٹکٹ بک نکالی اور پانچ ٹکٹ الگ کر کے میرے حوالے کرتے ہوئے بولا پولی نیزین ایڈونچر کی بس ٹھیک سات بجے یہاں پہنچے گی آپ لوگوں کو گیٹ پر ہونا چاہئے بس دو منٹ رکے گی صرف دو منٹ انڈر سٹینڈ.....؟ میں اس کی بات ہی نہیں اس کی ذہنی سطح کو بھی بخوبی سمجھ گیا تھا اس لئے مزید گفتگو مناسب نہ سمجھی اور ڈائننگ ہال میں چلا گیا سب لوگ بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

''کہاں چلے گئے تھے؟'' مون نے پوچھا۔

ایک نظر شہر کو دیکھنے!''

''شام کو شہر کیا نظر آتا ہوگا!''

اہل شہر تو دیکھے جا سکتے ہیں''

لیکن تمہارے گلے میں پھولوں کے ہار نظر نہیں آ رہے؟'' سارا شوخی سے بولی۔

''غالباً اب پھول پروئے نہیں جاتے!''

'کیسا لگا شہر.....؟'' پیٹر نے سوال کیا۔

بہت خوبصورت! تم امریکیوں نے برطانیہ پر بڑا ظلم ڈھایا ہے کتنی تگ و دو کے بعد کیپٹن کک نے یہ جزیرے دریافت کئے تھے بیچارا جان سے بھی گیا اور دین سے بھی کم از کم پادریوں کا تو یہی خیال

ہے۔

بولا تم ان برطانیوں کو نہیں جانتے بہت چالاک ہیں آسٹریلیا کی طرح انہیں یہاں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا لہٰذا خود ہی چلے گئے.....!''

''ایسی بات ہوتی تو فاک لینڈ جیسے دور افتادہ جزیزے کیلئے ارجنٹائن سے جنگ نہ کرتے یہ انکی بدقسمتی تھی کہ ان پر انکل سام کی نظر پڑ گئی.....!''

ان سے اپنا ملک تو اب سنبھلتا نہیں دور افتادہ جزیروں میں کیا حکومت کریں گے غالباً وہ دن دور نہیں جب آئرلینڈ کی طرح سکاٹ لینڈ بھی علیحدہ ہو جائے گا۔

ایسی فضول بحث تو کسی لائبریری میں بیٹھ کر بھی کی جاسکتی تھی یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی جانی مجھے بڑی بھوک لگی ہے قسم سے.....!' سارا نے پیٹر کو جھاڑنے کے بعد پیار سے دیکھا۔

AMBIVILANCE اس کی انہیں اداؤں نے مجھے مارا ہے! یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ہم کھانا لینے بوفے ٹیبل کی طرف چل دیئے کھانے میں فریش سی فوڈ کے علاوہ ہوائین ڈشیں بھی تھیں اکثر کھانوں میں پائین ایپل اور پپیتے کا فیاضانہ استعمال کیا گیا تھا یہ دونوں پھل اس ریاست کی شناخت ہیں اور ان کی وسیع پیمانے پر کاشت کی جاتی ہے ہم نے جی بھر کر کھانا کھایا مون عام طور پر بسیاخوری سے اجتناب برتتی تھی۔ اس نے بھی پہلی بار دوسری پلیٹ استعمال کی کھانا کھانے کے بعد ہم لابی میں آ گئے پیٹر نے گرین ٹی کا آرڈر دیا کہنے لگا کھانا ہضم کرنے کیلئے یہ بہترین مشروب ہے گرم چنبیلی کی ہلکی سی خوشبو لئے ہوئے کیا تمہیں بھی پسند ہے.....؟''

کیا تم نے ابوالکلام کی غبار خاطر کا انگریزی ترجمہ تو نہیں پڑھا؟''

حیران ہو کر بولا یہ کون صاحب تھے؟ میں تو اس نام کا تلفظ تک ادا نہیں کر سکتا''

''امام الہند جو تمہاری سبز چائے کو ایک ایسا مشروب نشاط انگیز سمجھتے تھے جو طبع یورش پسند کو سرمستیاں عطا کرتا ہے اور فکر عالم آشوب کو آسودگیاں بخشتا ہے۔

ہنس کر بولا اتنی تعریف تو عمر خیام نے اپنی رباعیات میں شراب کی نہیں کی ہے۔ کیا تمہیں یقین

ہے کہ وہ سبز چائے ہی پیتے تھے؟''

''پیتے تو سبز چائے ہی تھے لیکن چسکیاں لے لے کر!''

مزید مسکرا کر کہنے لگا شاہ! تم اس موضوع پر ریسرچ کرو ہوسکتا ہے تمہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل جائے!''

سبز چائے پی کر مون نے پیٹر سے اگلے دن کے پروگرام کو پوچھا میں نے انہیں بتایا کہ ٹکٹ خریدے جاچکے ہیں اور بس صبح آٹھ بجے ہوٹل سے چلے گی اب وقت وقت پر تیار ہو جانا یہ نہ ہو کہ ہوٹل کے الارم بجنا شروع ہو جائیں..... پیٹر نے سارا کی طرف دیکھا اس نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔ مجبوری ہے مون کی ناراضی مول نہیں لی جاسکتی!'' رات کے گیارہ بجنے والے تھے ہم اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں آ گئے۔

صبح جب میں تیار ہو کر لابی میں پہنچا تو وہاں پیٹر اور سارا پہلے سے موجود تھے یقین نہیں آتا کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں ہوٹل کے ساگوان کے چوبی دروازے بہت قیمتی ہیں معاوضہ ہزاروں ڈالر تک پہنچ سکتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی پڑوسی ہرجانے کا دعویٰ کردے کہ اس کے پروگرام میں خلل ڈالا گیا ہے لہٰذا ہم نے رسک لینا مناسب نہ سمجھا۔

ہر چند کہ بات مزاح میں کہی گئی تھی مگر درست تھی ہرجانے کے معاملے میں امریکی نہیں چوکتے ایک ہوٹل کے کھانے کی پلیٹ میں مکھی دیکھ کر (یا ڈال کر) ایک حاملہ عورت نے دعویٰ کردیا کہ اس کو کراہٹ محسوس ہوئی ہے جس سے متوقع مولود کی صحت یا شخصیت پر ناخوشگوار اثر پڑسکتا ہے لہٰذا اسے دس لاکھ ڈالر ہرجانہ دلوایا جائے رقیق القلب جج نے ایک لاکھ ڈالر جرمانہ کیا آٹھ بجے مون اور کیتھی بھی آ گئیں ہم پورچ میں پہنچے تو بس ہمارے انتظار میں کھڑی تھی ڈرائیور نے ہمارے ٹکٹ چیک کئے اور کہنے لگا جہاں جی چاہئے بیٹھ جائیں سیٹ نمبر الاٹ نہیں کئے گئے فری سیٹنگ ہے ہم نے پہلی پانچ نشستیں سنبھال لیں کوئی ایک گھنٹے تک وہ مختلف ہوٹلوں کے چکر لگاتا رہا۔ بڑا تکلیف دہ عمل تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ تمام ہوٹلوں سے کئی گئی بکنگ مرکزی دفتر پہنچ جاتی تھی ڈرائیور کے پاس

مکمل فہرست تھی جس پر تمام مسافروں کے نام درج تھے نو بجے تک بس بھر چکی تھی لہٰذا ڈرائیور نے اسے سیدھی سڑک پر ڈال دیا منی بس میں کل چوبیس مسافر تھے ہمارے علاوہ چار نیوزی لینڈرز یعنی کیویز، تین آسٹریلین اتنے ہی کینیڈین ایک چینی، دو شکرانما آنکھوں والے عرب اور باقی امریکن تھے۔ ڈرائیور بڑا دلچسپ شخص تھا بے حد باتونی اس کی ماں جاپانی اور باپ امریکی تھا۔ ہوائی میں پیدا ہوا اور وہیں پروان چڑھا مائیک آن کرتے ہوئے بولا ..... ہائے فوکس .....!'' ہائے' ہائے!'' ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں ..... بس کی سواری کیسے لگی؟ NOT TO BAD ایک آسٹریلین بولا۔

کیا تم آسٹریلوی ہو؟'' اس نے گردن پھرائے بغیر پوچھا۔

بالکل درست لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا! آسٹریلوی نے فخر سے پوچھا اس قسم کی شستہ انگریزی صرف کانگرو ہی بول سکتے ہیں بس میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔

بولا یہ تو ایک سخن گسترانہ بات تھی نہیں تو ہم امریکن کونسی آکسونین انگلش بولتے ہیں زبانیں بھی جب ہوا کی طرح سمندر عبور کرتی ہیں تو اپنی لطافتیں پیچھے چھوڑ آتی ہیں اصل چیز کمیونی کیشن ہے یعنی اپنے خیالات اپنی بات دوسرے تک پہنچانا انگریزی تقریباً بین الاقوامی زبان بن چکی ہے لہٰذا اس وقت دنیا کو انگریزی معلّٰی کی نہیں بلکہ انگلش محلّہ کی ضرورت ہے میں بھی کہاں پہنچ گیا ہوں وہ مسکرایا دراصل مجھے سب سے پہلے اپنا تعارف کرانا چاہئے تھا۔

بہت پہنچے ہوئے لگتے ہو ایک طرح سے اپنا تعارف تو تم نے کرا ہی دیا ہے میں نے کہا پھر بھی کچھ پیشہ وارانہ تقاضے ہوتے ہیں کمپنی کے قواعد کے مطابق ہمیں اپنا نام اور کام تو بتانا ہی پڑتا ہے کیونکہ میں ڈرائیور کے علاوہ آپ کا گائیڈ بھی ہوں یعنی ٹو ان ون میرا نام گارفیلڈ ہے اور آج کا دن آپ کو طوعاً وکرہاً میرے ساتھ گزارنا ہے۔

گارفیلڈ تو امریکہ کا صدر تھا! وہی آسٹریلوی بولا۔

تھا.....! اتفاقات ہیں زمانے کے نام تو میرا بھی ماں باپ نے بڑا سوچ کر رکھا تھا کیونکہ یہ ان

کے بس میں تھا بس چلانا میرا مقدر ٹھہرا ایک امریکہ کا صدر بن گیا اور دوسرا گارفیلڈ ہوائی میں ڈرائیوری کر رہا ہے ایک کے ساتھ میں امریکہ کے کروڑوں عوام کی قسمت تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں ایک سٹیرنگ ہے جو زیادہ سے زیادہ چوبیس لوگوں کو بحرالکاہل کے حوالے کر سکتا ہے'' سواریوں کو ایک جھرجھری سی آئی پہلے بھی دو مرتبہ ایسا ہوا ہے لیکن خوش قسمتی سے اس حادثے میں مجھ سمیت سب بچ گئے صرف چند مسافروں کی ٹانگیں ٹوٹی تھیں اور ایک کا کان کٹ گیا تھا''

یہ پلیئر ٹرپ ہے یا تم ہمیں horror movie دکھا رہے ہو چینی مسافر نے احتجاج کیا بولا ۔حسن مزاح بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے لیکن اس کیلئے برتھ کنٹرول بہت ضروری ہے۔

کوئی سوال.....؟'' گارفیلڈ نے پہلی بار اپنی گردن پیچھے موڑی ۔ میں نے پوچھا کیا تم لوگ امریکہ سے الحاق کر کے خوش ہو؟

اکثر شاکی ہیں کہتے ہیں کہ ان کا کلچر روایات اور تاریخ مسخ ہو گئی ہے

لیکن تم تو ہوائی کے باشندے نہیں ہو ماں جاپانی 'باپ امریکن!'' پیٹر کے لہجے میں ہلکی سی حقارت تھی۔

بولا میں نے حقیقت بیان کر دی ہے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا''

سب سے پہلے بس کیولانی پارک جا کر رکی جو سابق ملکہ کیولانی کے نام پر رکھا گیا ہے پیٹر بتانے لگا کہ جزائر ہوائی میں سات بادشاہ ہو گزرے ہیں یہ آخری ملکہ تھی جس کے سر پر خود مختاری کا بھوت سوار ہوا اور بالآخر جلاوطن کر دی گئی وقت کی تنگی کے پیش نظر ہم نے بس میں بیٹھے بیٹھے ہی پارک کا نظارہ کیا اور پانچ منٹ بعد بس ڈائمنڈ کریٹر کی طرف چل پڑی ڈائمنڈ کریٹر کا نام برطانوی ملاحوں نے رکھا انہیں ہر گمنام جزیرے کو نام دینے کا بڑا شوق تھا۔ کیپٹن کک نے جنوبی بحرالکاہل کے کئی جزیروں کو خوبصورت نام دیئے ملاحوں کو یہاں ایک سبز رنگ کا پتھر ملا جسے وہ غلطی سے ہیرا سمجھے یہ کریٹر بھی دراصل لاوا اگلنے والی پہاڑی تھی جو ایک لاکھ سال پہلے پھٹا اور اس طرح زمین پر ایک میل ریڈیئس کا شگاف پڑ گیا 1900ء میں امریکہ نے اسے خرید لیا کریٹر میں کئی غاریں ہیں اور نیشنل گارڈز

کا ہیڈ کوارٹر ہے کریٹر کے عین وسط میں جا کر گارفیلڈ نے بس روک دی کہنے لگا آپ کے پاس دس منٹ ہیں اس کا اچھی طرح سے نظارہ کرلیں پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کیلئے پچالیس منٹ چاہئیں مجھے شاید زیادہ وقت درکار ہوگا کیونکہ پہاڑ پر پہاڑ آسانی سے چڑھتا اس کا اشارہ اپنے بھاری بھرکم جسم کی طرف تھا سب مسافر کوچ سے نیچے اتر گئے کریٹر گرینڈ کینٹین کی طرح پرشکوہ تو نہیں تھا پھر بھی حیرت انگیز تھا چاروں طرف پہاڑ جن کی بھربھری جلی ہوئی مٹی سے بارود کی بو آ رہی تھی کچھ سیاح چوٹی پر چڑھ اور اتر رہے تھے۔ پہاڑ کی مشرقی سمت میں وائرلیس کا بہت اونچا پول لگایا گیا تھا ہوائی کا مواصلاتی رابطہ اس کے ذریعے قائم کیا گیا ہے۔

جانی کیا خیال ہے کیوں نہ ہم پہاڑ کی چوٹی سر کریں؟ سارا نے پیٹر کو مشورہ دیا۔

''میں زندگی کے ہمالہ کی سب سے اونچی چوٹی سر کر چکا ہوں' اب یہ چھوٹی چھوٹی چوٹیاں نگاہ میں جچتی نہیں ہیں!''

''کہیں مجھے بنا تو نہیں رہے!'' اس نے مشکوک نگاہوں سے پیٹر کو دیکھا۔ ''چرب زبان تو تم مشہور ہو.....!''

''اسی لئے تو تمہارا ملاپ ہوا ہے۔'' کیتھ کہنے لگی' ''ایک چرب زبان ہے اور دوسرے کی زبان ویسے ہی گز بھر کی ہے!''

''دراصل چھوٹے قد کی وجہ سے ہر چیز تمہیں طویل نظر آتی ہے!'' سارا نے اپنی بات کی پیٹر سے تائید چاہی۔

''ہاں' کچھ ایسا لگتا تو ہے.....!''

''کیا تم HEN PECKED HUSBAND کی اصلاح سنی ہے تم پر بالکل صادق آتی ہے.....!''

''کیا ضرور تم نے جھگڑا کروانا ہے!'' پیٹر مسکرایا' ''کامیاب ازدواجی زندگی کا سراز ہی بیوی کی ہاں میں ہاں ملانے میں ہے!''

دس منٹ بعد گارفیلڈ نے تالی بجائی اور سب مسافر کوچ میں سوار ہو گئے۔ کہنے لگا ''مجھے افسوس ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے آپ پہاڑ پر نہیں چڑھ سکے میں پہاڑ کے کنارے پر گاڑی کھڑی کرتا ہوں آپ شہر کو دیکھیں یہ بہترین ویو پوائنٹ ہے!''

گارفیلڈ نے درست کہا تھا۔ جتنی بلندی سے دیکھا جائے سمندر کا حسن اور نکھرتا ہے۔ نیلگوں سمندر میں سفید دودھیا لہریں عجیب لگتی ہیں ایسے پتہ چلتا ہے جیسے غیض کے عالم میں اس کے سینے سے پھسل کر اچھل کر کناروں سے باہر نکلنا چاہتی ہوں لیکن جب ساحل کے قریب پہنچتی ہیں تو ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے لیکن اس وقت در توبہ بند ہو جاتا ہے اور واپسی کے سب راستے مسدود ہو جاتے ہیں اور ان کی ہستی کو کنارے کی خاموشی ہڑپ کر لیتی ہے۔ سمندر اور پہاڑ کے درمیان امیر لوگوں کے محل نما مکانات ہیں اور عین ساحل پر کہالہ مینڈرنگ KEHALA MENDRING ہوٹل ہے جہاں وغالیان ریاست' صدور' شہزادے اور ٹائیکون ٹھہرتے ہیں۔ صدارتی سویٹ کا کرایہ چھ ہزار ڈالر یومیہ ہے.... 365 کمروں کا یہ ہوٹل اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس کے کمروں کی کھڑکیوں سے ڈولفن' وہیل مچھلیاں اور دیگر سمندری مخلوق شفاف پانی میں صاف دکھائی دیتی ہیں۔

بڑا دلچسپ نظارہ تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کچھ دیر اور رکا جائے لیکن گارفیلڈ کا اصرار تھا کہ ابھی تو ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا کوچ خرگوش جزیرے کے درمیان میں سے گزری تو گارفیلڈ بولا' یہ Rabbit Island ہے۔ کسی زمانے میں برطانوی یہاں خرگوش پالتے تھے اور ظاہر ہے کہ کھاتے بھی ہوں گے کیا آپ نے کبھی خرگوش کا گوشت کھایا ہے؟ ایسے پتہ چلتا ہے جیسے آدمی کچھ کھا نہیں پی رہا ہو۔ جبڑے ہلتے ہیں مگر دانتوں کے درمیان کچھ نہیں آتا۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد کوچ ہنوما بیچ پہنچی۔ تین اطراف سے گھری ہوئی HUNAUMA BEACH کی اپنی انفرادیت ہے ساحل کے قریب ہلکے سبز رنگ کا پانی آئینے کی طرح شفاف ہے اس قدر صاف کہ سمندر کی تہہ میں' کورل ریف' اور چٹانیں صاف نظر آتی ہیں بیچ تک پہنچنے کیلئے پہاڑ سے کافی نیچے اترنا پڑتا ہے چٹانوں کو کاٹ کر سیڑھیاں بنائی گئی ہیں پس منظر میں پہاڑی بالکل بیون کی شکل کی ہے گارفیلڈ اس جگہ سے خاصا متاثر نظر آتا تھا۔ اس نے ہمیں

چالیس منٹ دیئے۔ ساحل پر سینکڑوں جوان لڑکیاں اور مرد سکوبا ڈائیونگ کر رہے تھے اس میں ایک خاص قسم کا ہیڈ گیئر پہنا جاتا ہے جو منہ کو بھی ڈھانپ لیتا ہے اور پشت پر رکھے ہوئے آکسیجن سلنڈر کی وجہ سے سانس لینے میں بھی کوئی دشواری نہیں آتی تیراک سمندر کی تہہ تک چلے جاتے ہیں اور سمندر کی رنگ برنگی مچھلیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں اس قسم کی تیراکی اب محض فن نہیں رہی بلکہ سپورٹس کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ البتہ ہوائی کی حکومت کو ایک تشویش لاحق ہوگئی ہے تیراک اپنے جسم پر TAN کرنے والا لوشن لگاتے ہیں جس سے میرین لائف کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔

سواریاں اتر کر ادھر ادھر بکھر گئیں کچھ تو ٹائیلٹ کی طرف لپکے اور باقی پہاڑی کی دیوار پر کھڑے ہو کر فوٹو گرافی کرنے لگے جگہ جگہ کیمرے کلک کرتے رہے فوٹو بھی کیا چیز ہے لمحے ساکت ہو جاتے ہیں..... یادگار..... اور اپنی موجودگی کی چشم دید شہادت۔ مون نے تجویز دی کہ پہاڑی سے نیچے اترا جائے۔ مزے کا مزا اور ورزش کی ورزش! سارا لپک کر گئی اور آئس کریم پارلر سے پانچ پیک لے آئی والز کی کارنیٹو.... میں نے کہا۔

''آئس کریم سے زیادہ یہ کولیسٹرول کریم ہے جو بالآخر دل کی رگوں کو جوڑ دیتی ہے۔''

''تو تمہیں چنتا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ بغیر کسی توقف کے بولی۔

''تمہارے سینے میں تو مجھے سوائے قلم اور کتاب کے کچھ نظر نہیں آتا!''

''مجھے اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔ اسی حساب سے کھاتی رہی تو پھول کر کپا بن جاؤ گی۔ ساری فگر خراب ہو جائے گی اور پھر یہ شخص جسے کیتھی نے بے دام خاوند کہا ہے' اتنا تابعدار نہیں رہے گا۔''

بولی'' یہ تین سو سیڑھیاں دیکھی ہیں۔ ان پر اترنا اور چڑھنا آسان نہیں اگر سالم گائے بھی کھائی ہو تو ہضم ہو جائے گی۔''

''چلو تمہارا استدلال مان لیتے ہیں۔ نو بیاہتا جوڑوں کو ناراض کرنا گناہ ہوتا ہے..... ''

بولی'' مجھ پر رحم نہ کھاؤ اور سیدھی طرح سے سب کے ساتھ نیچے اترو۔ نہیں تو میں پہاڑ سے دھکا دے دوں گی اور نیچے پہنچتے پہنچتے شناخت کی منزل سے بھی گزر جاؤ گے۔'' نیچے اترنے کا تو محض ایک بہانہ تھا

گھڑی دیکھی تو تیس منٹ گزر چکے تھے چند منٹ سکوباڈائیورز سے باتیں کرتے رہے اور پھر بھاگم بھاگ بے ہنگم سانسوں کے درمیان سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر پہنچے..... ہم پانچ منٹ لیٹ تھے تمام سواریاں کوچ میں بیٹھ چکی تھیں.... گارفیلڈ نے ہمیں تیز نظروں سے گھورا" میں نے نظارے کرنے کا مظورہ دیا تھا' نظارے لوٹنے کا نہیں کہا تھا۔"

"ہم کونسا انگلش چینل عبور کر کے آئے ہیں۔ بس آنا جانا ہی کیا ہے!"

"تو بھی کیا برا ہے!" وہ مسکرایا اور گاڑی کا انجن سٹارٹ کر دیا اس نے یوٹرن کاٹا اور کوچ چل پڑی۔

نصف گھنٹے تک خامشی چھائی رہی۔ سب کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ جلدی جلد تین سو سیڑھیاں چڑھنا مشکل ہوتا ہے بہر حال سمندر سے اٹھتی ہوئی تازہ ہوا اور خوشگوار موسم نے جلد ہی تھکن کو مار بھگایا اور ہم مخروطی BLOW HOLE تک پہنچتے پہنچتے بالکل تازہ دم ہو گئے۔ بیچ اس قدر چھوٹی تھی کہ عام حالات میں اسے بیچ کی توہمت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ گارفیلڈ ہمارے تاثرات کو بھانپتے ہوئے بولا" تم لوگوں کو شاید علم نہیں کہ یہ بڑی تاریخی جگہ ہے یہاں انگریزی فلم From here to eternity کا سب بے گرم سین فلمایا گیا تھا ڈیبرا کر کا برفاب جسم برٹ لنکاسٹر کے گرم ہاتھوں کی حرارت سے پھگلا تھا۔" پھر خود ہی ہنس کر کہنے لگا" لو سین تو یہاں روز ہوتے ہیں' فلمایا صرف ایک گیا تھا۔" مجھے سردار جی کا قصہ یاد آ گیا جن سے پیرس کے بازار حسن میں کچھ لیا نہیں بلکہ دیا گیا تھا ایک پنتھ دو کاج کہہ کر سردار جی دوسرے دن بھی آ ٹپکے۔ صبح جب انہیں دس ڈالر ملے تو وہ پھٹ پڑے۔ کل سو ڈالر اور آج صرف دس کام کی نوعیت نہیں بدلی' اوقات کار بھی وہی ہیں' پھر یہ ڈنڈی کس نے ماری ہے....؟" ایک دلال ہنس کر بولا Last Night you were on live T.V, Today you have been photographed گارفیلڈ نے جب جوش خطابت میں اس واقعے کی گرافک تفصیل بتانی شروع کی تو لیڈیز نے شرم سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"کتنے بے شرم لوگ ہیں۔ کیا اس قسم کی حرکتیں سر عام کی جاتی ہیں!" سارا نے پیٹر کی طرف دیکھا۔

"جس قسم کے لوگ ہوں گے یا پیشے ہوں گے وہ اسی قسم کی حرکتیں کریں گے تم کیوں دل چھوٹا کرتی ہو۔

تم نے کونسا ایکٹرس بننا ہے!'' پیٹر نے اسے تسلی دی۔

''بننا ہے.....! وہ ضدی بچے کی سرح مچل گئی'' لیکن اس قسم کی بے ہودہ اور لچر فلمیں سائن نہیں کروں گی!''

''تو بھوکی مروگی۔ جانتی ہو روم میں وہی کچھ کرنا چاہئے جو رومن کرتے ہیں۔''

کہنے لگی'' Fall of the Roman Empire اس قسم کی کہانیاں لکھنے سے ہوا تھا۔''

ایک بے حد موٹا بچہ حفاظتی دیوار پر چڑھنے کی ضد کرنے لگا۔ پہلے تو باپ اسے سمجھاتا رہا لیکن جب اس کی ضد روں روں میں بدل گئی تو والد نے اسے کندے پر اٹھالیا۔ بچہ اس قدر وزنی تھا کہ باپ کی کمر اس کے بوجھ سے دہری ہوگئی۔ باپ نے اسے کندھوں سے اتارنے کی کوشش کی لیکن بچے نے پیر تسمہ پا کی طرح اپنی ٹانگوں کی گرفت مضبوط کرلی۔ خاوند نے امداد طلب نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھا جو دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے چیونگم کھا رہی تھی۔ بولی'' دیکھا کتنا مشکل ہے بچے پالنا اب ذرا اندازہ لگاؤ بچے پیدا کرنا کتنا جان جوکھوں کا کام ہوگا۔''

''ایک چھوٹی سی غلطی کی اتنی کڑی سزا۔ کیا مجھے معافی نہیں مل سکتی' یقین کرو میں بہت شرمسار ہوں''..... وہ بھی کوئی کم زندہ دل نہیں تھا دونوں مسکرا دیئے اور بیوی نے اس کے قریب آکر بچے کی دوسری ٹانگ اپنے کندھے پر رکھ لی ..... آخر یہ دیکھنا کیا چاہتا ہے؟'' ماں قدرے حیران تھی۔

''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات Love Seen کا ذکر سن کر ابھی سے مچل گیا ہے' بڑا ہو کر ضرور کسی ڈیبرا کر کی زلفوں کا اسیر ہوگا۔''

''شریر کہیں کے.....!'' بیوی شرما گئی۔'' کیسی فضول باتیں کر رہے ہو۔ ابھی تو اس کے کھلونوں سے کھیلنے کے دن ہیں۔''

''ہر عمر کیلئے الگ الگ کھلونے ہوتے ہیں۔ یہ بنیادی بات کیوں نہیں سمجھتیں؟''..... بولی Male Chauvinism بیسویں صدی میں بھی مرد کی سوچ اور جبلت پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ بچے کو بڑی مشکل سے انہوں نے بہلا پھسلا کر نیچے اتارا۔ مار نہیں سکتے تھے کہ یہ قانون کی خلاف ورزی ہوتی۔ ان

معاملات میں قانون بہت سخت ہے.... ایک مشرقی دوست بتانے لگے کہ وہ اپنے دو چھوٹے بچوں کو لے کر بازار گئے۔ انہیں کار میں بٹھا کر خود آنکھیں سینکنے 'سیکس شاپ' میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو بڑا عجیب منظر دیکھا۔ ہر طرف پولیس کی گاڑیوں کی سرخ اور نیلی بتیاں جل رہی تھیں ان کی بیگم بھی کار کے قریب کھڑی تھیں۔

''کیا تم ان بچوں کے باپ ہو؟'' ٹریفک سارجنٹ نے غصے سے پوچھا۔ ''انہیں اس طرح اکیلا چھوڑنے کا تمہیں کیا حق تھا۔ اب تمہارا چالان ہوگا۔'' چالان ہوا۔ بیوی کے سامنے شرمسار ہوا۔ عدالت نے جرمانے کے علاوہ ایک سال کے پروبیشن پر رکھا۔ کمیونٹی ویلفیئر کلاسیں اٹینڈ کروائیں جہاں بچوں کی تربیت کے متعلق والدین کو بچوں کی طرح پڑھایا جاتا ہے۔

کوچ تھوڑی دیر کیلئے او۔ ہا۔ ہوگاؤں میں رکی۔ بڑا خوبصورت گاؤں تھا' تمام مکانات اور سڑکیں ایک خاص ترتیب سے بنی ہوئی تھیں ان میں سمڑی تھی۔ گارفیلڈ نے بڑے فخر سے بتایا کہ 1984ء کے لاس اینجلس اولمپکس میں سب پھول اس گاؤں سے گئے تھے.... گاؤں سے ملحقہ کونیٹ آئی لینڈ ہے جہاں امریکہ کا Marine Biology کا سب سے بڑا اسکول ہے۔

کوچ میں مکمل خاموشی تھی۔ مسافر مناظر میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ انہیں آپس میں باتیں کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ دنیا میں بڑی خوبصورت جگہیں ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کے مرغزار' سرسبز پہاڑ اور میلوں تک پھیلی ہوئی جھیلیں۔ ساؤتھ آف فرانس' کانز' نیس' مانٹی کارلو' روم کی عظمت گم گشتہ کے آثار۔ لیکن ہوائی کی اپنی شان ہے کئی اعتبار سے یہ ان علاقوں سے منفرد اور ممتاز ہے بائیں ہاتھ سرسبز پہاڑ' دائیں جانب حد نگاہ تک پھیلا ہوا سمندر۔ سڑک کے کنارے پر ناریل کے جھنڈ۔ ہوا میں ایک بے نام سی خوشبو۔ پہاڑ پر سخت سردی اور بالکل نیچے نیم گرم سمندر' ایک طرف موسلا دھار بارش ہو رہی ہے تو دوسری جانب بادلوں کا نام و نشان تک نہیں.... سارا اور پیٹر جو ایک دوسرے سے باتیں کرتے نہ تھکتے تھے اور جن کی نگاہیں ایک دوجے پر جمی رہتی تھیں وہ بھی باہر دیکھ رہے تھے گردنیں اور چہرے بڑی تیزی کے ساتھ دائیں بائیں اور آگے پیچھے گھوم رہے تھے۔

UPSIDE DOWN واٹر فال دیکھتے ہوئے ہم نوانو جنگل میں داخل ہو گئے بڑے گھنے اور مختلف اقسام کے درخت تھے ننھے منے پودے' کڑیل جوان اور سفید ریش بوڑھے جن کے ساتھ اسی قسم کے بڑے ہوئے رسے لٹک رہے تھے جنہیں پکڑ کر ٹارزن اچکتا ہوا میلوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کر جاتا ہے۔

گارفیلڈ نے پہاڑ کی چوٹی پر بس روکی۔ بہت تیز ہوا چل رہی تھی خواتین کو متنبہ کرتے ہوئے کہنے لگا ''ہوشیار رہنا اور اپنی اسکرٹس کو مضبوطی سے پکڑنا کیونکہ اگر یہ نہ بھی کھلے تو بھری بزم میں راز کی بات عیاں ہو جاتی ہے پچھلے ہفتے ایک شخص کی وگ اڑ گئی تھی''۔

گارفیلڈ کی باتوں میں لطیف سی فحاشی ضرور تھی' مگر حقیقت بیان کر رہا تھا۔ اس قدر مسلسل چلتی ہوئی تیز ہوا تھی کہ قدم بھی سنبھل سنبھل کر رکھنے پڑتے۔ ہر اٹھتے ہوئے قدم پر گمان ہوتا کہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اڑ کر وادی میں جا گریں گے یہ کوئی آندھی یا طوفان نہیں تھا بلکہ روزمرہ کا معمول تھا غالباً اسی لئے سارے پہاڑ پر کوئی آبادی نہیں تھی وادی کا نظارہ کرنے کیلئے ایک چبوترا بنایا گیا تھا جس کے اردگرد چند بنچ دھرے تھے اور لوہے کی مضبوط ریلنگ لگائی گئی تھی۔ پہاڑ کے نیچے وادی اور سمندر بغلگیر ہو رہے تھے سبزے کے اس وسیع سمندر میں سرخ چھتوں والے مکانات عجیب قوس قزح پیش کر رہے تھے۔

''جانی کیوں نہ ہم پہاڑ پر سے چھلانگ لگا دیں۔ مست ہوا ہمیں اڑا کر ان دیکھی وادی میں لے جائے گی۔ بہتی ہوئی ندی کا شور' اڈتی ہوئی کالی گھٹائیں' گنگناتے ہوئے جھرنے' لہلہاتے ہوئے کھیت' چہچہاتے ہوئے طیور' سرسراتے ہوئے پھلوں کے پیڑ..... ہم اور تم' تم اور ہم۔ نہ کوئی دکھ نہ کوئی غم... زندگی کس قدر حسین اور رنگین ہو جائے گی'' سارا پیٹر کے بازوؤں میں جھولتے ہوئے بولی۔

''بالفرض کسی کھائی میں لے گئی تو...؟''

''انسان کی سوچ مثبت ہونی چاہئے!''

''ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ تم ہراول دستے کی طرح پہلے پہنچ جاؤ' یہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یقیناً ایک نہ ایک دن چلا آئے گا'' کیتھی نے مشورہ دیا۔

''ہمارا جینا مرنا ایک ساتھ ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ بعد میں تم اپنے رومال کے ساتھ اس کے آنسو پونچھو

اور کار میں بٹھا کر ایل اے لے جاؤ!''

''تو بت یہاں تک پہنچ گئی ہے کیا اپنی سہیلی پر شک کرنے لگی ہو؟'' میں نے کہا۔

بولی ''شک سہیلی پر کم اور مرد ذات پر زیادہ ہے اس کا کوئی بھروسہ نہیں کسی وقت بھی موڑ کاٹ سکتا ہے۔''

گارفیلڈ نے پھرتالی بجائی۔ سب لوگ نپے تلے قدم اٹھاتے کوچ میں بیٹھ گئے اس نے کھڑے کھڑے گنتی کی اور پھر سٹیرنگ سنبھال لیا... ''شکر ہے!'' مائیک پر اس کی آواز گونجی۔ ''نہ کوئی مسافر اڑا ہے اور نہ کسی سواری کی.... اس نے عمداً فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔''

''یہ تحفظ بھی تمہاری وجہ سے ملا ہے!'' پکی عمر کے آسٹریلوی نے کہا۔

خوش ہو کر بولا ''وہ کیسے...؟''

''جب پہاڑ پر پہاڑ کھڑا ہو تو ظاہر ہے کہ اس سے ٹکرا کر ہوا ندامت ہی محسوس کرے گی۔''

''میری جوتی میرے ہی سر پر مار رہے ہو۔ مجھے یہ راز افشا نہیں کرنا چاہئے تھا!''

''یہ اظہار تشکر ہے، پتہ نہیں تم اسے غلط معنی کیوں پہنا رہے ہو!''

''اگر یہ شکریہ ہے تو پھر نہ جانے کانگرو طنز کسے کہتے ہیں!'' وہ مسکرایا۔

وہ ترنگ میں آ کر کوچ خاصی تیز رفتار سے چلانے لگا۔ چڑھائی کی نسبت اترائی بھی خاصی سخت ہوتی ہے اگر چڑھتے وقت گاڑی کی رگیں تنتی ہیں اور سانس پھولتی ہے تو اترائی کے وقت بھی اس کو رک رک کر چلنا پڑتا ہے۔ پہاڑ کا آخری موڑ کاٹتے ہوئے گارفیلڈ نے ایک دم بریک لگائی۔ تمام سواریاں اپنا توازن کھو کر ایک دوسرے پر جا گریں۔ نیوزی لینڈر کی ناک سامنے والی سیٹ سے ٹکرائی اور اس میں سے خون بہنے لگا۔

''کیا کرتے ہو۔ گاڑی دیکھ کر چلاؤ...!'' چینی مسافر چلایا۔ ''لگتا ہے تیسری بار کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔''

''دیکھتے نہیں سامنے سڑک پر خرگوش آ گیا تھا اس کی جان بچانے کیلئے مجھے بریکیں لگانا پڑیں...!''

''تو کیا ایک خرگوش کیلئے اتنی انسانی جانوں کو خطرہ میں ڈال دو گے؟'' چینی غرایا۔

''شاید تم یہ بات نہ سمجھ سکو۔ جہاں انسانی زندگی کیڑوں مکوڑوں سے ارزاں ہو انہیں سمجھانا ذرا مشکل ہوتا

ہے!''.... بات چونکہ تلخ ہوتی جا رہی تھی اس لئے میں نے مداخلت ضروری سمجھی.... کائنات میں جان قیمتی ہے چاہے انسان کی ہو یا جانور کی۔ بہر حال احتیاط لازم ہے۔ ذرا فرسٹ ایڈ باکس نکالو اور اس خون کو بند کرو جو ہمارے ہمسفر کی ناک سے مسلسل بہہ رہا ہے۔'' اس نے گاڑی کھڑی کر دی۔ سب سے معذرت کی اور نیوزی لینڈر کو ابتدائی طبی امداد دینے لگا۔

گارفیلڈ خاصا محتاط ہو گیا تھا وقتاً فوقتاً جو مزاحیہ جملے مائیک پر کستا رہتا تھا نہیں بھی اس نے اپنی پٹاری میں ڈال دیا۔ امریکی ہر بات برداشت کر سکتا ہے لیکن چینی کی ہرزہ سرائی ہضم نہیں ہوتی.... امریکہ سپر پاور سہی لیکن وہ بوتل سے نکلے ہوئے اس جن کو بڑی تشویشناک نظروں سے دیکھ رہا ہے... شخصی آزادیاں' آزادی رائے' جمہوریت' اعلیٰ انسانی اقدار .... بہت دلفریب نعرے ہیں' لیکن ان کے پیچھے ایک گہرا خوف بھی چھپا ہوا ہے ریاستوں کے تعلقات' باہمی چپقلش اور مناقشت کا اثر ان کے شہریوں پر بھی ضرور پڑتا یہی بات اگر کسی امریکی یا برطانوی نے کہی ہوتی تو گارفیلڈ آئی ایم سوری کہہ کر وہیں ختم کر دیتا لیکن یہی احتجاج کسی دشمن ملک یا چھوٹے ملک کی طرف سے ہو تو اسے یوں گھورتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں.... آ گئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا؟''

☆☆☆

ایک بجے کے قریب ہم مندروں کی وادی میں پہنچے۔ ہم جہاں کہیں بھی رکتے' ایسے محسوس ہوتا جیسے یہ جزیرے کا خوبصورت ترین مقام ہے لیکن جب آگے جاتے تو احساس ہوتا کہ یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ بوڈو مندر BYODO TEMPLE ایک امریکی نے بنایا تھا۔ اس نے بدھ مت اختیار کر لیا تھا۔ عام حالات میں کسی امریکی کا بدھ مت اختیار کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی خالصہ جین مت اختیار کر کے اپنی کرپان کو کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دے.... بوڈو مندر جاپان کے نو سو سال پرانے مندر UJI کا Replica ہے۔ مندر دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مہاتما کی تعلیمات کی روشنی اس کی روح تک پہنچی تھی اور اس نے محض تفنن طبع کی خاطر وہ مذہب اختیار نہیں کیا تھا۔ مندر بہت خوبصورت تھا۔ اندر جاپانی سنگ تراش ماسوزو انوئی INU MASOZO کے ہاتھ کا تراشا ہوا 9.2 فٹ کا مہاتما کا مجسمہ تھا۔ نو

سو سال میں لکڑی کا بنا ہوا یہ سب سے بڑا مجسمہ تھا۔ عالم استغراق میں مہاتما کے چہرے سے طمانیت اور نور جھلک رہا تھا۔ کپل وستو کا شہزادہ جس نے ابدی سکون کیلئے دنیاوی عیش و آرام کو تج دیا تھا... آج وہ شاندار محل نہیں ہے وہ خوبصورت شہزادی نہیں ہے جو اس کے دل کی دھڑکن تھی... نوکر چاکر' سپاہ سلطنت' سب نیست و نابود ہو گئے ہیں لیکن بدھ نہیں مرا... وہ ایک لمحہ' جس میں اس نے ازلی حقیقت اور سچائی کو پالیا تھا' امر ہو گیا ہے۔ ایک چھوٹی سی اقلیم پھیل کر روحانی ایمپائر بن گئی ہے جس میں کروڑوں قلوب مسخر ہو کر منور ہو گئے ہیں ان گنت اذہان کو جلا ملی ہے۔ کیا وہ کوئی پیغمبر تھا یا انسان.....؟ ہر پیغمبر بھی بنیادی طور پر انسان ہوا کرتا ہے..... انسان کامل..... کیونکہ یہی مصلحت پروردگار ہے' یہی مشیت ایزدی ہے مندر کی چھت پر پانچ فٹ قطر والی بہت بڑی گھنٹی لگی تھی۔ امن' شانتی اور ابدی سکون..... ہم مندر کے اندر گئے۔ ہر مذہب اور ہر قوم کے سیاح بڑی عقیدت کے ساتھ سر جھکائے کھڑے تھے ہم بھی کچھ دیر احتراماً خاموش کھڑے رہے... پھر نگاہ اٹھا کر جو دیکھا تو بنانے والے کی تخلیق کو داد دینا پڑی۔ مندر کی سامنے والی دیوار پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

"This temple is the Genious ofan Artisan 900 years ago. refleets the promise of a mythical bird. the pheon recreating spirtual hope

اس دنیا کو دارالمحن کہا گیا ہے دکھوں کا گھر۔ غالب نے قید حیات و بند و غم کو لازم و ملزوم ٹھہرایا تھا۔ موت سے پہلے بھی انسان غم سے نجات پا سکتا ہے اگر وہ باہر دیکھنے کی بجائے اپنے اندر جھانکنا شروع کر دے۔ کشف صرف اولیاء کو ہی نہیں ہوتا' صرف خلوص نیتی کی ضرورت ہوتی ہے نفی ہستی سے دل کی بستی آباد ہوتی ہے۔

مندر کے باہر بہت عمدہ لینڈ اسکیپنگ کی گئی تھی حد نگاہ تک پھیلی ہوئی۔ مناسب فاصلے پر پھولوں کی کیاریاں بنائی گئی تھیں... مندر سے ذرا ہٹ کر دائیں بائیں عیسائیوں اور بدھوں کے الگ الگ قبرستان تھے یہ عقیدہ بھی عجیب چیز ہے مر کر بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ عادت کے متعلق مشہور ہے کہ یہ انسان کی

قبر کا بھی سات مرتبہ طواف کرتی ہے۔عقیدہ خود قبر ہے.... ہر قبر پر پھولوں کا گلدستہ نصب شدہ گلدان میں سجا کر رکھا گیا تھا یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بدھوں کی قبروں پر اشیائے خورد ونوش کی فراوانی تھی ان کے عقیدے کے مطابق روحوں کو خوراک کی تلاش رہتی ہے ایک قبر پر بیئر کا کین اور چاولوں سے کشید کی گئی شراب رکھی تھی۔.... ''یہ کوئی تمہارا بھائی بند تھا!'' سارا نے پیٹر کو دیکھا۔''جو مر کر بھی نشہ کرنا نہیں بھولا! Habits die hard'' پیٹر نے اس کی تائید کی۔''لیکن اب تک جو سپلائی جاری ہے یہ تمہاری طرح کوئی وفا شعار بیوی ہی کر سکتی ہے۔''

بولی''جانی' تم ایک بار مر کر تو دیکھو' میں تمہاری قبر پر پوری بار کھول دوں گی۔''

''بیوی ہو تو ایسی...!'' پیٹر نے قہقہہ لگایا''اس دور میں ایسی وفا شعار بیوی کسے نصیب ہوتی ہے!''

ان قبرستانوں سے ملحقہ کتوں اور بلیوں کا قبرستان تھا۔ان کی قبریں انسانوں کی قبروں سے کم خوبصورت نہیں تھیں یہاں بھی عجیب اور دلچسپ کتبے لگے تھے.... میری پسی کیٹ' جو مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ گئی ہے... میرا دل جانی' نامی' جو ترنگ میں آ کر ایک بس کو ٹکر مار بیٹھا تھا... ہمارے لئے یہ حیران کن باتیں ہیں۔طرز عمل بھی مضحکہ خیز ہے یہاں بلی مر جائے تو اسے میونسپلٹی کی نالی میں پھینک دیا جاتا ہے اور اگر کتا گزر جائے تو اسے گٹر میں ڈال دیا جاتا ہے ٹوکیوں میں میں نے کتوں کا ہوٹل دیکھا ہے جن کی خدمت کیلئے دست بستہ مودب بہرے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

تین بجے ہم کا۔آ۔وا کی' کراؤ چنگ لائین ان' ریسٹورنٹ پہنچے تو سب کے پیٹ میں چوہے توڑ رہے تھے یہ غالباً وہ بدقسمت جانور تھے جو بوڈو کے قبرستان میں دفن ہونے سے بچ گئے تھے گارفیلڈ نے سمندر کے کنارے کوچ کھڑی کر دی۔کہنے لگا''ہم آدھا سفر طے کر چکے ہیں اب کچھ پیٹ پوجا ہو جائے''..... پیٹ بھی تو ایک قسم کا مندر ہی ہے' میں نے سوچا۔انسان شاید پیدا ہی پوجا کیلئے ہوا ہے۔

کبھی رکوع میں ہے خانقاہ کے آگے
کبھی سجود میں ہے کج کلاہ کے آگے

''کھانا کہاں کھانا ہے؟'' کینیڈین نے پوچھا... ''وہ سامنے پہاڑ پر بڑا خوبصورت ریسٹورنٹ لائن ان

ہے جہاں سوائے شیر کی چربی کے باقی سب کچھ ملتا ہے میں آپ کو ایک گھنٹہ دیتا ہوں جو جی میں آئے کریں۔ سامنے ریسٹورنٹ ہے اس کے پیچھے پہاڑ اور جنگل ہے اور پشت پر سمندر ہے.... ''وقتل ابال ختم ہو چکا تھا اور اس کی پرانی بشاشت لوٹ آئی تھی یہ کہہ کر وہ ریسٹورنٹ کی طرف چل پڑا اور ہم سب سنگل کالم میں اس کے پیچھے یوں چلے جیسے کوئی ملٹری پریڈ ہو رہی ہو....

بہت بڑا ریسٹورنٹ تھا جو لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کچھ لوگ ٹیبل خالی ہونے کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ ریسٹورنٹ کے مرکز میں ایک خوبصورت میز کے اردگرد چھ کرسیاں بچھی تھیں لیکن وہاں کوئی شخص نہیں بیٹھا رہا تھا.... گارفیلڈ ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا گیا اور وہاں بغیر اجازت کے بیٹھ گیا۔ ہمیں بڑی حیرانی ہو رہی تھی لیکن کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ماجرا کیا ہے! حیرانی پریشانی میں بدل گئی جب بیرے نے اس کو اٹھانے کی بجائے بیئر کا مگ اور باداموں کی پلیٹ فٹ سے اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔ گارفیلڈ نے بیئر کو اس طرح دیکھا جس طرح صراؤں میں بھٹکتا ہوا مسافر ٹھنڈے پانی کے چشمے کو دیکھتا ہے اس نے ایک ڈیک میں گلاس خالی کر ڈالا اور یوں تیزی سے بادام دانتوں کے نیچے دبانے لگا جیسے کھا نہیں گن رہا ہو۔ دوسرے مگ کے ساتھ بھی اس نے وہی بہیمانہ سلوک کیا اور باداموں کا قتل عام جاری رہا۔ بیرے نے جب بھنا ہوا مرغ' ٹی بون اسٹیک اور سلاد کا پورا باؤل اس کے سامنے رکھا تو ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا.... ہم نے ویٹر سے پوچھا کہ آیا اس نے ٹیبل ریزرو کرایا ہوا ہے... کہنے لگا ''آپ غالباً پہلی بار سفر کر رہے ہیں یہ میز کوچ کپتانوں کیلئے مختص ہے چونکہ ان کا روز کا آنا جانا ہے اس لئے ہمیں ان کی فرمائش اور پسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ ریسٹورنٹ کے مہمان خصوصی ہیں اور انہیں مفت کھانا دیا جاتا ہے۔''

پھر ہوٹل چلتا کیسے ہے؟'' مون نے پوچھا۔

''آپ لوگوں کی وجہ سے۔ راستے میں کئی ہوٹل ہیں' یہ ڈرائیور کی صوابدید پر ہے کہ مسافروں کو کہاں کھانے کیلئے اتارتا ہے چوبیس لوگوں کے بل میں ایک کا تو پتہ ہی نہیں چلتا۔'' کچھ دیر بعد ہمیں بھی جگہ مل گئی۔ وہی ویٹر مینو کارڈ لے آیا۔

بتانے لگا ''جس پہاڑی کے دامن میں یہ ریسٹورنٹ ہے اس کی شکل شیر سے ملتی جلتی ہے اس لئے موقع کی مناسبت سے اس کا CROUCHING LION INN رکھ دیا ہے۔ ویسے اس علاقے میں کوئی شیر نہیں رہتے۔''

مون پوچھنے لگی ''شاہ! کیا تمہارے ملک میں بھی شیر ہوتے ہیں؟''

''بہت زیادہ۔ سارا ملک ان سے بھرا پڑا ہے۔''

''واقعی؟ اس کا اشتیاق بڑھنے لگا۔'' ''کس نسل کے شیر ہیں۔ لائن' لیوپارڈ' ٹائیگرز....؟''

''بہت ہیبت ناک' بڑی بڑی مونچھوں' خونخوار نظروں اور موٹی توند والے...!''

''لیکن شیروں کی توند بڑی ہوتی ہے''

''ہمارے ہاں ہوتی ہے۔ ہم اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے ہاں ہر نسل اور ہر سائز کے شیر ملتے ہیں''۔

''پھر تو بہت گھنے جنگل ہوں گے جن میں یہ خطرناک درندے رہتے ہوں گے''۔

''حیران کن بات یہ ہے کہ ان کی اکثریت شہروں میں رہتی ہے۔ ویسے انہوں نے اپنے علاقے بانٹ رکھے ہیں۔ کوئی شیر پنجاب ہے' کوئی شیر سرحد' ترنگ میں آ کر کچھ شیر پاکستان بن گئے ہیں۔ یہ شکار کے بڑے رسیا ہیں بھوک نہ ہو تو پھر بھی عادت کے ہاتھوں شکار کرنے سے نہیں چوکتے۔ گوشت میں انہیں نوخیز ہرنیاں پسند ہیں۔ اگر کسی وجہ سے خود شکار نہ مار سکیں تو شکار مردہ کے بھی سزاوار ہو جاتے ہیں۔ ان کی دھاڑ بڑی دہشت ناک ہوتی ہے۔ جب اقتدار میں ہوں تو اس سے سارا جنگل اور بستیاں گونجتی ہیں۔ ان کی مار دھاڑ اور چیر پھاڑ دیکھنے والی ہوتی ہے۔ گوشت کے علاوہ ہر وہ چیز جس سے گوشت خریدا جا سکتا ہے ہضم کر جاتے ہیں۔ ان کی کچھاریں محلوں کو شرماتی ہیں۔ ٹھکانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ موسم اور رتوں کے ساتھ انہیں بدلتے رہتے ہیں۔ بدقسمتی سے اقتدار میں نہ ہوں تو پھر ان کی گرج حلق کی سرنگ سے باہر بھی نہیں نکل پاتی' وہیں پیچ و تاب کھا کر دم توڑ دیتی ہیں۔ بستیوں اور جنگلوں نے تو کیا گونجنا ہے ان کا اپنا وجود لرزہ براندام ہو جاتا ہے''۔

''بڑے عجیب شیر ہیں! مون مسکرائی'' وائلڈ لائف کی تنظیموں کو ان کی حفاظت کرنی چاہئے کہیں یہ نسل ناپید نہ ہو جائے''۔

''بظاہر اس کا کوئی امکان نہیں جس طرح ملکی وسائل بڑھتے ہیں ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ بظاہر چاہے کتوں کی طرح ہی کیوں نہ لڑیں اندر سے ایک ہوتے ہیں۔ مفادات کی جنگ اپنی جگہ لیکن نسلی تفاخر بھی آخر کوئی چیز ہے''۔

''شکر ہے ہمارے ہاں اس قسم کے شیر نہیں ہیں!'' سارا نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''نہیں تم بھی کسی نہ کسی دن شکار ہو جاتی'' کیتھی نے فقرہ مکمل کر دیا۔

''لیکن شاہ تو غزالوں کا ذکر کر رہا تھا!'' اس کی شریر نگاہیں مون پر لٹک گئیں۔

''تم شرارتوں سے باز نہیں آؤ گی'' مون نے اس کے گالوں پر ہلکی سی چپت رسید کی۔ اب کھانا منگواؤ۔ کوچ چلنے میں زیادہ دیر نہیں ہے''۔

''کھانا کھا کر ہم باہر نکلے تو موسم زیادہ خوشگوار ہو گیا تھا۔ بادلوں نے سورج کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا تھا۔ بیچ پر چند لوگ تیراکی کر رہے تھے۔ جب کوچ چلی تو گارفیلڈ کی آواز ایک دفعہ پھر مائیک پر ابھری۔'' مجھے امید ہے آپ لوگوں نے لذیذ کھانا انجوائے کیا ہوگا۔ بڑا اچھا باورچی ہے۔ کھانوں میں جان ڈال دیتا ہے''۔

''میں نہیں مانتا۔ پیٹر کہنے لگا۔ اگر کھانوں میں جان ہوتی تو ضرور احتجاج کرتے''۔

''وہ کیوں''۔

''آج اگر صدر گارفیلڈ یہاں موجود ہوتا تو بھی تمہاری قسمت پر رشک کرتا۔ اس قدر ٹہل سیوا اور آؤ بھگت تو وزیروں کو بھی نصیب نہیں ہوتی''۔

''تم نے کھانا بھی کھایا ہے یا صرف تفتیش کرتے رہو گے؟ اس نے قہقہہ لگایا''۔

''کھانا کیا خاک کھاتا۔ ہر اچھی ڈش تو تم ڈکار گئے ہو''۔

''After all, I am your couch captian'' وہ خوش دلی سے پھر مسکرایا۔ کپتان اور دیگر

کھلاڑیوں میں کچھ فرق تو ہونا چاہئے"۔

"یہ کچھ فرق نہیں بہت نمایاں فرق ہے"۔

"یہ چھوٹی موٹی سہولتیں ہر پروفیشن کے ساتھ منسلک ہوتی ہیں۔تم کل سے کوچ چلانے کا تہیہ کرو میں وعدہ کرتا ہوں کہ شام کا کھانا بھی پیک کروا کے بس میں رکھوادوں گا"۔

"تم بول بچن میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے" میں نے پیٹر کو سمجھایا۔

"کوئی خاص وجہ؟"

"مثل مشہور ہے کہ بارہ لفنگوں کو جمع کریں تو ایک کوچوان بنتا ہے۔بارہ کوچوان اکٹھے ہو جائیں تو ایک ٹیکسی ڈرائیور بنتا ہے اور اگر بارہ ڈرائیور مل بیٹھیں تو ایک بس ڈرائیور پیدا ہوتا ہے"۔

"Funny- Really very Funny" اگر بارہ بس ڈرائیور کو ملائیں تو کیا بنتا ہے؟

"ایک پولیس مین" ساری بس زعفران زار ہوگئی"۔

کوچ جب مارڈومیہ Mardomia فروٹ فارم کے قریب پہنچی تو ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی۔گارفیلڈ نے ایک مرتبہ پھر مائیک کے کان مروڑے۔"ہم مارڈمیہ فارم میں کچھ دیر رکیں گے۔پیشتر اس کے کہ میں اس کے خشک میوہ جات کی تعریف کروں۔میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ان کا کمیشن ایجنٹ نہیں ہوں۔نہ میں نے کوئی رشوت لی ہے البتہ کلو بھر ڈمیہ نٹس کی قسم نہیں کھا سکتا۔سبحان اللہ! کیا فروٹ ہے۔میوے کا میوا' دوائی کی دوائی۔کولیسٹرول کتنا ہی ہائی کیوں نہ ہو اس کی چند پھانکوں سے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔اس پر باقاعدہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ریسرچ ہوئی ہے۔بڑے تیر بہدف نسخہ ہے۔شوگر یوں ختم کرتا ہے کہ لبلبے پھرکی کی طرح پھرنا شروع کر دیتے ہیں۔کھانا اس طرح ہضم ہوتا ہے جیسے کھایا ہی نہیں تھا۔پھر اس کے ذائقے کا کیا کہنا۔لاجواب۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پستہ' بادام اور کاجو کو پیس کر یکجا کر دیا گیا ہو۔وہ ایک لمحے کیلئے مسافروں کا تاثر جاننے کیلئے رکا۔یہ تسلی کر کے کہ سواریاں ہمہ تن گوش ہیں کہنے لگا اس کی اصل خوبی تو میں بتانا ہی بھول گیا تھا۔ایک نوید مسرت۔شادی شدہ جوڑوں کیلئے' خون رگوں میں اسپ تازی کی طرح دوڑتا ہے' بدن میں بجلیاں سی کڑکتی ہیں اور ہر طرف گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ٹن ٹن' ٹناٹن' میر

حسن نے مثنوی سحرابیان میں چھپر کٹ کا منظر بیان کیا تھا۔ انشاءاللہ خان نے جھپ سے اس پر ایک بے رحم تبصرہ کر ڈالا۔ آج اگر وہ زندہ ہوئے تو اور اپنے گناہ گار کانوں سے گارفیلڈ کی لن ترانیاں سنتے تو یوں اپنے بے جا تنقید پر ضرور کف افسوس ملتے۔

والش فروٹ فارم کی پکی عمر کی مالکہ نینسی نے گارفیلڈ کو یوں گلے لگایا جیسے وہ گوشت پوست کا بنا ہوا انسان نہ ہو بلکہ ڈالروں کا توڑا ہوا۔ ''کتنی دیر لگادی تم نے۔ انتظار کرتے کرتے میں تو بوڑھی ہو چلی تھی فکر دامنگیر ہوئی کہ کہیں بیمار نہ پڑ گئے ہو۔ ہزار بار کہا کہ جسم پر چڑھی ہوئی پہاڑ نما چربی کا صدقہ اتار دو''۔

''یہ بیماری بھی تو تمہاری دین ہے۔ اس نے مسخرے پن سے اپنے دائیں ہاتھ کو سینے پر رکھا''۔

''شیر بڑا شیریر ہے۔'' نینسی نے ہماری طرف دیکھا ''مزاح کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا''۔

''چلو تم کہتی ہو تو میں اسے مذاق ہی مان لیتا ہوں۔ ویسے میں ہوں بڑا سیریس'' اس نے ٹھوڑی سینے سے لگا کر نظریں اس پر گاڑ دیں۔

''میں یہ جملہ گزشتہ پندرہ سال سے سن رہی ہوں۔ اظہار محبت میں کوئی جدت پیدا کرو''۔

''اتنی دیر ورد کرنے سے پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں تم کس مٹی سے بنی ہوئی ہو۔ کبھی کبھی یہ نٹس خود بھی چکھ لیا کرو''۔

''مارڈ میہ نٹس واقعی بڑے مزیدار تھے۔ کافی بھی خاصی ترکیب سے بنائی گئی تھی۔ نینسی نے ہر مسافر کی قمیص پر آئی لینڈ کی خوشبو Island Fargrance'' اور آخر میں مسافروں نے بھی نینسی کو مایوس نہ کیا اور دل کھول کر خریداری کی۔

والش فروٹ فارم سے دس میل کے فاصلے Turbo Hiltiq ہے۔ یہ بھی ہوائی کے مہنگے ترین ہوٹلوں میں سے ایک ہے۔ ساحل کی وجہ سے اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ہوائی کی زمین مہنگی ہے کیونکہ لوگ زیادہ ہیں اور جزیرے نسبتاً چھوٹے ہیں۔ دنیا کے نقشے میں یہ بالکل نقطے لگتے ہیں۔ ان پر ایک دم تیس کروڑ کی آبادی کا بوجھ پڑ گیا ہے۔ پھر ساری دنیا کے سیاح بھنوروں کی طرح یہاں منڈلاتے ہیں۔ کک ایڈونچر نے ایک رومان بخشا ہے۔ امریکہ کی پچاسویں ریاست بننے کے بعد اسے پبلسٹی ملی ہے۔ رہی سہی کسر جاپان کے

پرل ہاربر پر حملے نے پوری کر دی ہے۔ ویسے تو جنوبی بحرالکاہل میں بے شمار جزیرے ہیں۔ ٹاہیٹی' فیجی آئی لینڈ' کیلے ڈونیا' لیکن یہ جیول آف پیسفک ہے۔ دنیا کے ماتھے کا جھومر اور سر کا تاج ہے۔ ڈائمنڈ کریٹر کی پہاڑی کے نیچے جو محل نما مکانات ہیں ان کی قیمت ایک ارب روپے تک بھی ہے۔ ہوٹل کے قریب ہی دنیا کا سب سے بڑا ونڈمل ہے۔ ونڈمل کے نزدیک جان مورکن کی Ranch ہے۔ ریس اور پولو کے گھوڑوں کا بہترین اسٹڈ فارم۔ یہی گھوڑے جب ریس جیتتے ہیں تو کروڑوں میں بکتے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں ان کی مالش کرتی ہیں' ان کو تھپتھپاتی ہیں اور ان کو تھوتھنی پر اپنے سرخ لب رکھ دیتی ہیں۔ ایسے لمحوں میں کچھ کمزور لوگ خواہش کرتے ہیں کہ کاش وہ گھوڑے ہوتے۔ چند ایسے بھی ہیں جن کا گدھا بننے کو جی چاہتا ہے۔ ہر چند کہ اس کی وجوہ دوسری ہیں۔

ویمپیا پارک پہنچتے پہنچتے چھ بج گئے۔ یہ پارک سمندر سے ذرا ہٹ کر ہے۔ پہاڑ بھی کافی بڑا ہے۔ ونڈمل کی طرح اس پارک کو بھی اولیت کا شرف حاصل ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا بوٹنکل گارڈن' بلا مبالغہ یہاں چھ ہزار اقسام کے درخت ہیں۔ اگر درختوں کے نام درج کئے جائیں تو الگ سے کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ گھنے اونچے اور چھوٹے درخت بعض درختوں کے تنے اتنے بڑے ہمارے ہاں کے چھ پرانے برگدان میں سما سکتے ہیں اور پھر اس قدر اونچے کہ اگر ان کی چوٹیاں ثریا سے سرگرم سخن نہ بھی ہوں تو کئی ثریائیں ان کو دیکھ کر شرماتی اور لجاتی ہیں۔ پھل دار اور پھول دار دونوں قسمیں ہیں۔ آم کے بے شمار درخت ہیں جو بہت زیادہ ثمرور ہیں۔ پھل کا ذائقہ البتہ اتنا اچھا نہیں یعنی وہ مولوی مدن والی بات نہیں۔ انور ٹول' دوسہری' طوطا پری' لنگڑا' مالدہ' ان کا اپنا ذائقہ' خوشبو اور رنگ روپ ہے۔ آم کا صرف میٹھا اور کثرت سے ہونا کافی نہیں۔ مرزا غالب نے نہ جانے کس گھڑی یہ بات کہہ دی تھی آج اگر وہ زندہ ہوتے اور بالفرض کسی شہ کے 'مصاحب' نہ بھی ہوتے تو بھی اترا' اترا کر چل سکتے تھے کیونکہ ٹی وی اور ریڈیو نے ان کی آبرو کو چار سو' کو بکو پھیلا دیا ہے۔ اگر کسی اشتہاری کمپنی میں ملازمت اختیار کرتے تو بھی خس خاہ و برفاب آسانی سے میسر آ سکتے تھے اور وہ یخ بستہ کمرے کے فریج سے ٹھنڈے ٹھنڈے آم نکال کر ضرور کہتے' بھئی آم ہو تو انور ٹول' پتہ نہیں چچا خال ویمپیا پارک کیسے پہنچ گئے ہیں۔ دراصل وہ اس قدر قادر الکلام شاعر تھا جو زندگی کے ہر موڑ پر مرغزار' صحرا

اور ویرانے میں ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں

ابر کی چیز ہے ہوا کیا ہے

''پارک میں جیک فروٹ کے درخت بھی کثرت سے ہیں۔ یہ بہت بڑا پھل ہے جس کا وزن چار پونڈ تک جاتا ہے۔ مانکی' پاء بنیاٹری اور بے شمار اقسام''

''گارفیلڈ نے پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کر دی۔ یوں لگتا ہے کہ اندر کوئی میلہ لگا ہوا ہے۔ بولا'' پار کی جی بھر کر سیر کریں۔ آبشار دیکھیں' کلچرل پروگرام سے لطف اندوز ہوں' پھل کھائیں اور جو جی میں آئے کریں۔ جنگل گھنا ہے' موسم مہربان ہے' سرزمین الوہا (محبت) ہے۔ ایک یادگار سفر کے سب اسباب فراہم ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں بن پیئے بھی نشہ آتا ہے۔ بن چلے بھی آدمی پرواز کرتا ہے اور..... اور.....''

''بس کرو!'' چینی سیاح نے اسے ٹوکا۔ ''تم نے تو فلم چلا دی ہے۔ کچھ باتیں ہمارے مشاہدے کیلئے بھی تو چھوڑ دو!''

''اس کیلئے اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی! اندر جھانک لیتے.....'' اس نہ خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔ ''ڈرائیور کے علاوہ کمپنی کی طرف سے گائیڈ بھی ہوں۔ یعنی (ٹو ان ون) ٹورسٹ یقیناً کچھ نہ کچھ جاننا چاہتا ہے۔ اس کیلئے آواز میں لوچ پیدا کرنا پڑتا ہے' لہجہ ڈرامائی ہونا چاہئے۔ ہر شخص تمہاری طرح زیرک یا خشک مزاج نہیں ہوتا''

''پھر وہی تلخی! میں نے مداخلت کی۔ گارفیلڈ معلومات فراہم کرنے کا بہت شکریہ۔ شاید ضروری بھی تھیں لیکن وہ جو ایک محاورہ ہے Seeting is believing'' میرے خیال میں ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے کیونکہ قرص خورشید تیزی سے مغرب کی طرف ڈھلک رہی ہے۔''

''اوہ شوئر' شوئر اور اس نے بٹن دبا کر کوچ کے خودکار دروازے کھول دیئے۔''

''پارک کے مرکزی دروازے پر ہم نے ٹکٹ خریدے۔ امریکہ کا یہی کمال ہے کہ وہاں بات کرنے کے بھی پیسے دینے پڑتے ہیں۔ جگہ جگہ ٹال ٹیکس' پارکنگ کے پیسے' جنہیں دیکھنے کیلئے ٹکٹ' کاؤنٹی ٹیکس' ریاستی

ٹیکس اور فیڈرل انکم ٹیکس حتیٰ کہ ایئرپورٹ اور ریلوے سٹیشن پر سامان لادنے والی ٹرالی کے لئے بھی ایک ڈالر مشین میں ڈالنا پڑتا ہے۔ کچھ امیروں کو چھوڑ کر نوے فیصد آبادی اس اعتبار سے غریب ہے کہ ان کے پاس مہینے کی بیس تاریخ کو کچھ نہیں بچتا۔ تمام معیشت کی دستاویز بندی ہے۔ ٹیکس چوری کے تمام راستے مسدود ہیں۔ محکمہ ٹیکس جسے Internal Revenue Services (IRS)'' کہتے ہیں بہت مستعد اور بے رحم ہے۔ شاہ گدا' امیر وفقیر سب اس کی نگاہ میں ہوتے ہیں۔ کہیں اس کی ہیبت سے کوہسار چورہ کہیں اس کے پھندے میں جبریل وحور' ہالی وڈ کے ستارے اس کے تصور سے کپکپاتے ہیں۔ اس نے انہیں غالباً پہلی دفعہ باور کرایا ہے کہ حسن پر بھی ٹیکس لگتا ہے۔

ٹکٹ خرید کر ہم مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئے تو سامنے انفارمیشن ڈیسک نظر آیا۔ پارک کے متعلق ہر قسم کا لٹریچر اور معلومات کتابوں کی شکل میں دستیاب تھا۔ بڑی تفصیل کے ساتھ نقشہ بنایا گیا تھا جس میں سڑکوں کے نمبر اور بلاکس درج تھے۔ ان کے بغیر نیا آدمی راستہ بھول سکتا ہے۔ انفارمیشن ڈیسک کے آگے ایک کاریڈار تھا جو مرکزی ریسٹورنٹ تک جاتا تھا۔ ریسٹورنٹ کے باہر بورڈ پر لکھا تھا۔ بوفے لنچ آٹھ ڈالر فی کس' پندرہ کورسز بمعہ اسارٹیڈ لاد اور سویٹ'' ''گارڈ فیلڈ ہمارے ساتھ ہاتھ کر دیا۔ وہاں ایک کورس کے بیس ڈالر دینے پڑتے ہیں'' میں نے پیٹر کی طرف دیکھا۔

''بولا۔ مجھے پہلے بھی شک تھا یہ کمبخت ذرا سی طمع کی خاطر سواریوں کو بیچ دیتے ہیں''۔

''بوفے اور ٹیبل سروس میں آپ کو کوئی فرق نظر نہیں آتا'' مون نے اس کی طرف داری کی۔ ''اگر ہم لائن ان ریسٹورنٹ میں نہ جاتے تو شاہ سے شیر کی حکایت کیسے سن پاتے''۔

''ہر آدمی تمہاری طرح امیر اور شاہ خرچ نہیں ہوتا'' پیٹر اسے سمجھاتے ہوئے بولا'' یہ غریب سیاح سارا سال رقم پس انداز کرتے ہیں' اپنا پیٹ کاٹ کر پیسے بچاتے ہیں' ان کیلئے پیسے کی بڑی اہمیت ہے''۔

''تو انہوں نے ضرور ہوائی آنا ہے۔ گھر بیٹھ کر بھی ہوائی قلعے تعمیر کر سکتے ہیں''۔

''کم از کم اسے بتانا ضرور چاہئے تھا کہ آگے بھی ایک ریسٹورنٹ ہے پھر مسافروں کی صوابدید پر چھوڑ دینا کہ کس نے کہاں لنچ کرنا ہے۔ یہ بات پروفیشنل ایتھکس Professional Ethics'' کے زمرے

میں آتی ہے"۔

"اگر تمہارا استدلال مان لیا جائے تو پھر گارفیلڈ کو یہ بھی بتانا چاہئے تھا کہ کونسی کوچ سروس سستی اور بہتر سروس مہیا کرتی ہے۔"

"پیٹر بحث میں تم مون سے نہیں جیت سکتے" اس لئے بہتر ہوگا ہم سیر کیلئے نکلیں"۔

میں نے اسے مشورہ دیا۔

"ہاں تم جو اس کے ہمنوا ہو یہ بے چارہ کیسے جیت سکتا ہے" سارا پیٹر کی طرف داری کرتے ہوئے بولی"۔

"لگتا ہے، پیٹر نے تم پر جادو کر دیا ہے۔ اس کی ہر بات پر داد دینے لگی ہو! کیتھی بھی بحث میں شامل ہوگئی"۔

"جادو بھی وہ جو سر چڑھ بولتا ہے۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے ایک اچھا دوست کھو دیا ہے! مون مسکرائی"۔

"Never Ever" کہہ کر سارا اس سے لپٹ گئی۔

"پارک ہزاروں ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا تھا اور اس محدود وقت میں ممکن نہ تھا کہ سارے پارک کی سیر کی جائے۔ پارک سے آبشار دو میل کے فاصلے پر تھی وہاں تک پہنچنے کیلئے بڑے خوبصورت ٹریک بنائے گئے تھے جو جنگل کے بیچ سے گزرتے تھے۔ اس کے علاوہ ٹائروں پر چلنے والی مونو ریل سروس بھی تھی۔ وہ لوگ جو کسی وجہ سے چل نہیں سکتے تھے یا تھکے ہوئے تھے انہیں یہ سہولت مہیا کی گئی تھی۔ ہم نے ریل کے بجائے جنگل کا راستہ اختیار کیا جو مشکل ضرور تھا لیکن ایڈونچر اور شارٹ کٹ تھا۔ ٹریک چھوٹا ہونے کی وجہ سے ہم قطار میں چل رہے تھے۔ سب سے آگے پیٹر تھا اور سب سے پیچھے میں۔ سارا پیٹر کے پیچھے تھی وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اپنے پاؤں تیزی سے زمین پر پٹختے ہوئے چھک چھک کر رہی تھی شاید مونو ریل سے متاثر لگتی تھی"۔

"جب ہم آبشار پر پہنچے تو کافی لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے۔ سب نے ہمیں حیرت اور حسرت سے دیکھا۔ بوڑھے غالباً عمر رفتہ کو آواز دے رہے تھے اور جوان زہے روانی عمرے کے درسفر گزرد کا اصل مفہوم جان

گئے تھے۔ پچاس فٹ سے آبشار کا پانی نیچے گر رہا تھا جو گھٹا بڑھتا رہتا تھا۔ آبشاروں کے مناظر نے انسان کو ہمیشہ مسحور کیا ہے۔ شفاف پانی جب اپنی پوری طاقت کے ساتھ نیچے پتھروں سے ٹکرایا ہے تو سفید جھاگ ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے جوئے شیر بہہ رہی ہو۔ فضا سحر سامری کی طرح دھواں دھواں ہو جاتی ہے۔ پانی کے ٹھنڈے قطرے اڑ اڑ کر جب چہروں پر پڑتے ہیں تو ایک عجیب قسم کا سکون اور راحت محسوس ہوتی ہے۔ ہم اس خوبصورت نظارے میں محو تھے کہ مائیک پر اعلان ہوا کہ انکلوژر نمبر II میں مقامی ناچ ہیولا کا لیکی (Hulakalike)'' شروع ہونے والا ہے وہاں پہنچ جائیں۔ لوگ بادل نخواستہ انکلوژر نمبر II کی طرف چل پڑے کیونکہ وقت محدود تھا اور فطرت کے اس خزانے کو زیادہ دیر تک لوٹا نہیں جا سکتا تھا۔

عین وقت پر دور جنگل سے موسیقی کی آواز آئی جیسے کوئی آہستہ آہستہ دبے پاؤں چل رہا ہو۔ یہ آواز تیز ہو گئی۔ تیز تر ہوتی گئی اور پھر گھنگھرو بجنے لگے۔ دس مرد اور دس عورتیں اچانک قریبی (گھاس پھونس سے بنے ہوئے خیمے) سے باہر نکلے اور انہوں نے سٹیج پر آ کر ایک گانا گایا' ہوائی زبان میں.... وہ گانا جو کیپٹن کک کے سپاہیوں نے پہلی مرتبہ سنا تھا۔ الفاظ کا مفہوم سمجھ نہیں آ رہا تھا لیکن بروشر پر اس کا ترجمہ لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک قسم کا (Nostagia) تھا۔ شریف وحشی غالباً ناخوش اور بیزار تھا۔ مرمر کی سلوں سے.... وہ وقت جب خوراک عام تھی جب کوئی غم و آلام نہ تھا جب کوئی سامراج نہ تھا صرف فطرت کی حکمرانی تھی.... چلنے کیلئے دو پاؤں تھے۔ کھانے کے لئے دو ہاتھ' جہاں کوئی دست طمع دراز نہ ہوتا تھا۔ آج سب کچھ ہے لیکن کچھ بھی نہیں ہے۔ ہوائیں کثیف ہیں ان میں بارود کی بو آتی ہے۔ سمندر آلودہ ہے۔ پہاڑ سوگوار ہیں کہ ان سینے میں سرنگیں کھودی گئی ہیں اور لاکھوں ٹن لوے سے انہیں مصلوب کیا جا رہا ہے۔ یہی اس گانے کا مفہوم تھا۔ گانے والے ہوائی اصل باشندے تھے۔ آلات موسیقی بھی پرانے تھے۔ سمندر کے گھونگے سے بنی ہوئی نوڈ' ایک طلبا نما ڈرم اور بھالوں میں چھپے ہوئے گھنگرو' لباس بھی وہی تھا۔ نیم برہنہ' لڑکیوں نے سرخ اور زرد رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ ان اشجار پر شگوفے ثمر کے صاف نظر آ رہے تھے۔ مردوں نے گھاس سے بنے ہوئے لنگوٹ کس رکھے تھے۔ پھر ناچ شروع ہوا۔ تمام اعضا اس طرح تھرک رہے تھے جیسے کوئی

بھونچال آ گیا ہو جیسے تیز ہواؤں سے قد آور درخت سجدہ ریز ہو گئے ہوں۔ جیسے ہزاروں اسپان تازی سرپٹ ڈور رہے ہوں۔ پرانا وحشی کس قدر رشتہ زور تھا بلا کا جذبہ تھا۔ زبان ذریعہ اظہار ہے۔ الفاظ اندرونی کیفیات کو باہر لاتے ہیں لیکن اعضا کی بھی زبان ہوتی ہے۔ اعضا شاعری بھی کرتے ہیں۔ ایک نگاہ میں سینکڑوں معنی پوشیدہ ہوتے..... باڈی لینگویج آج کل سائنسی بنتی جا رہی ہے۔

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
تیری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

''ماحول اس قدر اثر انگیز تھا کہ تمام تماشائی پنڈال میں آ گئے اور ناچ میں شریک ہو گئے۔ مون میرا بازو پکڑ کر مجھے کھینچ لائی۔ میں نے لاکھ کہا کہ میں ڈانس نہیں کرتا۔ کہنے لگی ''کوئی بات نہیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے رہنا''۔

''جب ہم پارک سے نکلے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ پہاڑ اور جنگل بہت پیچھے رہ گئے تھے اور نسبتاً ہموار زمین شروع ہو گئی تھی۔ ہر طرف گنے کے کھیت نظر آئے۔ گارفیلڈ بتانے لگا کسی زمانے میں ہوائی سے چینی برآمد کی جاتی تھی لیکن آج کل ایسا نہیں ہے۔ اس کی واحد شوگر مل بند ہونے والی ہے۔ کوئی بھی کارخانہ زیادہ دیر نقصان پر نہیں چلایا جا سکتا۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں چینی اس قدر سستی ہو گئی ہے کہ اتنے دور دراز علاقے سے برآمد بہت مہنگی پڑتی ہے'' وہ کھنکارا...

''اب ہماری آخری منزل ڈول فارم ہے جہاں انناس کی کاشت کی جاتی ہے۔ انناس کا پودا اٹھارہ ماہ میں پہلا پھل دیتا ہے۔ 23 ماہ میں دوسرا 43 واں مہینے میں تیسری بار اترتا ہے۔ ایک ایکڑ میں 2700 پودے لگائے جا سکتے ہیں۔ 45 ماہ کے بعد پھل چھوٹا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کو اوپر سے کاسٹ دیتے ہیں لیکن جڑیں نہیں کاٹتے۔ اس کی بے شمار قسمیں ہیں لیکن برازیل بازی لے گیا ہے۔ سنگاپور، چین اور دیگر ممالک سے بھی پودے منگوائے جاتے ہیں۔ یہاں گنے کے علاوہ پپایا اور تربوز بھی کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔''

''تم امریکیوں نے دنیا کو بڑا متاثر کیا ہے'' میں نے مون سے کہا ''کسی زمانے میں بڑی محفلوں میں تربوز کھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اسے چھپ چھپا کر کھاتے تھے لیکن جب سے امریکی عوام نے اسے

پسندیدہ فروٹ قرار دیا اور یہ تربوز سے واٹرملین بنا ہے۔ ہر طرف واہ واہ ہو رہی ہے۔ بولی ''قدریں بدلتی رہتی ہیں'' کسی زمانے میں ہمارے معاشرے میں وائین پینا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن آج کل یہ ڈنر کا لازمی جز ہے۔ باقی رہی متاثر کرنے والی بات.... تو امریکی صرف متاثر کرتے نہیں بلکہ بسا اوقات ہو بھی جاتے ہیں''۔

''اس میں بھی غالباً مہربانی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے''۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ پتہ نہیں تم ہر بات کا جواب پہلے سے کیسے سوچ رکھا ہوتا ہے اور جس کا کوئی جواب ہی نہیں ہو؟''

''میری بات سچ ہوئی ناں۔ وہ شرما گئی''۔

''ڈول فارم پر ہم نصف گھنٹہ رکے۔ انناس کا جوس پیا اور ان کے مرکزی عمارت سے ملحقہ ماڈل فارم میں پھلوں کی کاشت دیکھنے چلے گئے۔ ہر کیاری کے ساتھ ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس میں پھل کی قسم' عمر' خصوصیات اور جس ملک سے پودا درآمد کیا تھا۔ اس کا نام لکھا تھا۔ مستطیل شکل کے کھیت تھے اور ایک ایکڑ میں چار مستطیلیں تھیں۔ ''کیا ڈول امریکی ہے؟ میں نے پیٹر سے پوچھا۔''

''تمام بگ بزنس امریکیوں کے پاس ہے۔ مقامی لوگ صرف وہی کام کرتے ہیں جو تم پارک میں دیکھ کر آئے ہو''۔

''گویا اچھے دنوں کو یاد ضروری نہیں۔ برے دنوں میں زیادہ دیر تک رویا جا سکتا ہے۔''

''صاف کیوں نہیں کہتے کہ ان کا مقصد سنور گیا ہے۔ خوشحالی نے خیمے گاڑ دیئے ہیں اور زندگی سہل ہو گئی۔''

''اس کا تو پتہ نہیں۔ البتہ جو بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کچی مچھلی اور باسی گوشت نہیں کھاتے۔ بیماری کی حالت میں جانوروں میں نہیں گھستے۔ رہنے کیلئے محل نہ سہی غاریں بھی نہیں ہیں۔''

''ہوٹل پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی' بتیاں جل چکی تھیں۔ سارا ہونالولو جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ بازار میں بہت بھیڑ تھی۔ غالباً سیاحوں کا نیا ریلا آیا تھا۔ ہوائی میں سمندر کی لہروں کی طرح سیاحوں کی بھی بہت لہریں آتی

ہیں"۔

"ڈنر کا کیا پروگرام ہے۔" پیٹر نے ہماری طرف دیکھا"۔

"نو ڈنر! سارا دن تو کھانے پینے میں گزرا ہے۔ کمرے میں ایک کپ آف کافی اور پھر گہری نیند' میں نے مشورہ دیا"۔

"درست ہے' سارا بولی لیکن حسین خواب دیکھنا نہ بولنا"۔

"کوشش کروں گا" یہ کہہ کر میں کمرے میں چلا آیا۔ کمرے میں آ کر میں نے کپڑے بدلے اور کھڑکی کھول دی۔ نم آلود ٹھنڈی ہوا کے لمس نے ساری تھکن دور کر دی۔ زیرو سکس (06) ڈائل کر کے روم سروس کو میں نے کافی لانے کیلئے کہا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ وائٹ یا بلیک۔

"سنو وائٹ۔" میں نے کہا۔

سروس مینجر مسکرائی "میں یہ اصطلاح پہلی دفعہ سن رہی ہوں۔ دراصل مغرب میں عام طور پر کالی کافی پینے کا رواج ہے یعنی دودھ کی کثافت سے پاک"۔

مولانا ابوالکلام آزاد بھی دودھ کے دلی دشمن تھے اور دودھ والی چائے کو لیچو پیچو قسم کی چائے کہتے تھے اور ایک دفعہ تو پنڈت جواہر نہرو کو بھی نصیحت کر بیٹھے کہ وہ اس سے اجتناب برتیں۔ پنڈت جی نے ہنس کر ان کی بات سنی اور دیگر باتوں کی طرح اسے بھی دوسرے کان سے نکال دیا۔ کالی چائے کے خلاف انہوں نے مدلل نفرت کا اظہار کیا ہے لیکن کافی کے معاملے میں مہر برلب ہیں۔ اگر اس پر بھی اظہار خیال کر دیتے تو شاید مجھے کافی کا آرڈر دینے میں سہولت رہتی۔ اہل مغرب بلیک کافی کو کیوں پسند کرتے ہیں اور وہ بھی بغیر چینی کے' اس قسم کی کم از کم مجھے سمجھ نہیں آ سکی۔ مقصد شوگر لیول اور کولیسٹرول کم کرنا نہیں اگر ایسی بات ہوتی تو پنیر اور مکھن کا بے دریغ استعمال نہ کرتے۔ دراصل یہ عادت کی بات ہے۔ لوگ اپنے آپ کو اسی رنگ میں ڈھال لیتے ہیں۔ آسٹریلیا میں ہمارا استاد تھیو جب ہمیں گرم دودھ میں کارن فلیکس کھاتے ہوئے دیکھتا تو بڑا حیران ہوتا۔ اس کے خیال میں سیریل صرف ٹھنڈے دودھ میں کھانا مناسب تھا۔ ایک دفعہ جب اس کی حیرانی پریشانی کی حد تک بڑھی تو میں نے الٹا سوال کر دیا "تم ٹھنڈے دودھ میں کیوں استعمال کرتے ہو؟"

''کیونکہ اس طرح یہ کرپسی ہو جاتے ہیں''۔

''اور گرم دودھ میں Tasty Tasty''۔ میں نے جواب دیا''۔

اس نے جواب جاہلاں خامشی کے مصداق مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔

پانچواں باب

کافی آ گئی تو میں نے حسب عادت سگار سلگایا کافی کے کپ سے نکلتی ہوئی دودھیا بھاپ' ہوائی سگار کا کا اروما' باہر ٹھاٹھیں مارتا ہوا وسیع و عریض سمندر اور شیرٹن کا آرام دہ کمرہ..... میں نے دنیا کے بہترین ہوٹلوں میں قیام کیا ہے بعض اوقات فرائض منصبی کے سلسلے میں اکثر احباب کی مہربانیوں کی وجہ سے اور کبھی کبھی اپنی جیب کو بھی ہوا کھلائی ہے۔ نیویارک کا وال ڈورف اسٹوریا' ویگاس کا ایم جی ایم گرینڈ' کینز کا کارلٹن' وٹل مانٹی کارلو کا وائٹ لیف ہوٹل' لندن کا ڈارچیسٹر' زیورچ کا دریائے لمحات کے کنارے کھڑا ہوا ہلٹن..... لیکن جو حسن' گرینجر اور سج دھج ہوائی شیرٹن کی ہے کہیں بھی نہیں۔ سگار کے کش' کافی کے گھونٹ' سمندری ہوا کا لمس..... کرسی پر بیٹھے بیٹھے مجھے اونگھ آ گئی۔ میں سو رہا تھا جا رہا تھا یا بیک وقت ان دونوں کیفیات سے گزر رہا تھا..... اچانک میری نظروں کے سامنے ایک ہیولا ابھرا۔ اندھیرا چھٹتا گیا اور نقش صاف اور واضح ہوتے گئے۔ یہ کیپٹن کک تھا جو میرے سامنے کھڑا تھا میں نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اسے دیکھا لیکن دوسرے لمحے سمندر سے بھی بڑی غم کی لہر نے مجھے دبوچ لیا۔

''مجھے تمہاری ناگہانی موت کا بڑا افسوس ہے۔ بحرالکاہل اپنے کھوجی محسن اور مربی سے محروم ہو گیا''۔

بولا ''ایسا ہونا ہی تھا تاریخ کی ناگزیریت Inevitability کو کوئی نہیں روک سکتا اگر میں اپنا مشن مکمل کیے بغیر مر جاتا تو مجھے بھی دکھ ہوتا میں ایک اعتبار سے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ سمندر کی سرکش موجیں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں' اپنے ہی بھائی بندوں کے ہاتھوں کا تمام ہو گیا!''

''تم نے یقیناً تاریخ کے سینے پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں آج جو ہم دنیا کو گلوبل ولیج کہتے ہیں تو لامحالہ نظریں تمہارے کارناموں پر پڑتی ہیں تم نے اڑھائی سو سال پہلے ہی اس دنیا کو بہت چھوٹا کر دیا تھا اور برٹش ایمپائر کو عظیم سے عظیم تر بنا دیا تھا۔

بولا ''اگر ہم اس حیات برق رفتار کو دیکھیں تو یہ وقت کے سمندر میں ایک بوند کی مانند ہے جو ہم سے پہلے تھے' جو ہمارے بعد آئیں گے سب پیوند خاک ہو گئے ہیں۔ لہٰذا چند سال ادھر ادھر کچھ معانی نہیں رکھتے اگر اس روز دست قاتل کسی وجہ سے رک بھی جاتا تو میں کتنا عرصہ جی لیتا۔ انسان کو لمحوں کا حساب رکھنا چاہیے ار اس زندگی کو امانت سمجھ کر گزارنا چاہیے!''

''تمہاری قربانی رائیگاں نہیں گئی دست قاتل کو تو کوئی نہیں روک سکا لیکن سرخی لب خنجر نے تمہیں امر کر دیا ہے!''

ایک سوگوار مسکراہٹ کے ساتھ بولا ''اگر مجھے سو بار بھی زندگی عطا ہو تو میں اپنے ملک و قوم کی خاطر قربان کر دوں گا جو لوگ برطانیہ کو مچھیروں کی قوم کہتے ہیں وہ یا تو تاریخ سے تعصب برتتے ہیں یا پھر اپنے خبث باطنہ کا ظہار کرتے ہیں۔ ان کیلئے طویل جدوجہد کرنا پڑتی ہے کیا تمہیں علم ہے کہ میں تین مرتبہ جنوبی بحرالکاہل کے سفر پر نکلا ایک دفعہ Tahaeti میں Trasit of Venus کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے دوسری مرتبہ میں نے آسٹریلیا' نیوی لینڈ دریافت کیے اور آخری مرتب بحرالکاہل اور بحرا اوقیانوس کے درمیان نزدیکی راستہ تلاش کر رہا تھا کہ ہوائی میں یہ حادثہ پیش آ گیا۔ ان دنوں سمندر سفر بہت مشکل تھا چھوٹے چھوٹے جہاز تھے جن کو سمندری طوفان اس طرح اچھالتا تھا جیسے پہلوان مگدر گھماتے ہیں۔ آج کل کی طرح ایئر کرافٹ کیریئر نہیں تھے جنہوں نے سمندر کی کمر دوہری کر دی ہے اور خطرے کی بو سونگھتے ہی SOS کے سگنل دینا شروع کر دیتے ہیں۔ ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا مشکلات کا'' کک نے اپنا پرانا پائپ

سلگایا..... ''جب ہم نے راس امید کراس کیا تو ملاحوں کی امیدیں دم توڑنے لگیں۔ واپس وطن جانے کی خواہش نے ان کے بازوؤں کو شل کر دیا کچھ بیمار پڑ گئے اور باقی ہمت ہار بیٹھے..... سکروی سمندری سفر کی سب سے بڑی لعنت' اس بیماری نے اس دور کے جہاز رانوں کی کمر توڑ دی تھی۔ میں نے اس کا مستقل علاج دریافت کیا۔ ملاحوں کی ہمت بندھائی اور نافرمانوں کو سخت سزا بھی دی..... نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک نئے عزم کے ساتھ روانہ ہوئے اور انہوں نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جن کا نتیجہ آج تمہارے سامنے ہے!''

''تم ایک معمولی انسان تھے ایک کباڑیئے کے ملازم..... میں احتراماً لفظ حقیر استعمال نہیں کرتا۔ تمہارا کام دکان کے شٹر گرانا' مالک کیلئے چائے پانی لانا اور کاک روچ مارنا تھا۔ اس ملازمت کے دوران تمہارا آخری کارنامہ مالک کی چوری کرنا تھا۔ اس قدر کارہائے نمایاں سرانجام دینے کا خیال تمہیں کیسے آیا''

''پیدائش کیسی کے بس کی بات نہیں ہوتی کوئی منہ میں چاندی کا چمچ لے کر پیدا ہوتا ہے تو کسی کے منہ میں لوہے کی سلاخ تک نہیں ہوتی لیکن بعد میں انسانی اپنی قسمت خود سنوارتا ہے میں تقدیر اور تدبیر کے فلسفے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا لیکن میرا ایمان ہے کہ تقدیر بھی اکثر ان لوگوں کی مدد کرتی ہے جو جستجو کرتے ہیں' جدوجہد کرتے ہیں۔ میرا بچپن یقیناً عسرت و تنگ دستی میں گزرا' میرا باپ ایک غریب انسان تھا یہ اس وقت کی بات ہے جب غریبی ایک گالی تھی۔ دشنام تصور ہوتی تھی' شاید آج بھی ہے۔ مجھے جو ملازمت ملی وہ ذلت آمیز تھی لیکن میرے اندر کا انسان مرا نہیں تھا۔ وہ ہر وقت مجھے للکارتا رہتا اٹھو اٹھو اور کچھ کر ڈالو..... چنانچہ میں نے اس ماحول سے بغاوت کر ڈالی..... ان فرسودہ روایات کو توڑا اور چوری کی۔ میکاؤلی نے کہا تھا ''ذرائع مقصد کا جواز ہیں Ends Justify means۔ شاید تم جیسے سرگشتہ خمار رسوم و قیود لوگ اس سے اتفاق نہ کریں لیکن ذرا سوچو تو اگر آج وہ نہ ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتا میں نے بحرالکاہل کے پانیوں کو مسخر کیا' سمندروں پر حکمرانی کی' آج آسٹریلیا' نیوزی لینڈ' بحرالکاہل کے جزیرے دولت مشترکہ کے ممبر ہیں۔ ایمپائر کا سورج غروب ہو گیا ہے لیکن افق سرخی اب بھی صاف نظر آتی ہے۔ ایک فانی انسان کو اپنی زندگی اور اس کے بعد اور کیا چاہیے؟''

''لیکن وہ جزیرے جہاں تم نے جام شہادت نوش کیا..... میں اس کو شہادت کہوں گا..... برطانیہ کے ہاتھوں سے نکل گئے اور آج ان پر انکل سام کا تسلط ہے؟''

''شاید ان کی اتنی اہمیت نہیں تھی اگر انکل سام آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ پر ہاتھ ڈالتا تو پھر دیکھتے کیا ہوتا۔ ویسے میں تمہیں ایک پتے کی بات بتاؤں؟'' اس نے سرگوشی کی۔ ''انکل سام اور ٹام.....! کیا تم انہیں الگ شمار کرتے ہو.....؟ وہ کونسی باتیں ہیں جو دو انسانوں کو دو قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر لے آتی ہیں۔ مشترک دشمنی اور مشترکہ مفادات..... یہ دونوں ملک ایک ہی تختے پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہیں۔ امریکہ لاکھ طاقتور سہی لیکن برطانیہ جتنا ذہین اور چالاک نہیں۔ علاوہ ازیں وہ مسکرایا After all we are cousions''۔

''تمہاری موت نے جہاں دنیا کو ہلا کر رکھ دیا وہاں ایک طبقہ خوش بھی تھا۔ لکر جی' پادری تمہیں دہریہ گردانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تمہیں اپنے اعمال کی سزا ملی ہے۔ تم نے انسان ہو کر دیوتا بننے کی کوشش کی۔ ہوائی کے لوگوں کو سجدہ ریز کیا اور اس طرح تمہیں اپنا سبو سرمست کر گیا''۔

''ایسی بات نہیں تھی!'' کک نے وضاحت کی ''میں رب المشرقین ورب المغربین کا ایک حقیر بندہ تھا جس نے اسے طاقت اور توانائی بخشی..... ہوائی کے لوگ تو سورج کو دیکھ کر سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔ سرداروں کو خدا مانتے تھے' ان دیکھی طاقتوں اور قوتوں پر یقین رکھتے تھے اس لیے ایک ایسے اجنبی کو دیکھ کر جس کے پاس بڑے بڑے جہاز تھے' بندوقیں تھیں اور جس کا رنگ گورا تھا' لباس ملٹی کلرڈ تھا' ان کا حیران ہونا قدرتی بات تھی۔ وہ مجھے اپنے خدا لونو کا اوتار سمجھتے' میں انہیں کیا کہتا کہ جھکو مت' اپنے عقائد بدل ڈاؤ' اپنی روایات سے انحراف کرو..... یقین کرو اجنبی مسافر!'' اس نے اپنا پرانا پائپ پھر سلگایا ''وہ مجھے پہلے دن ہی مار ڈالتے اور میری ہڈیاں عبادت گاہوں کی زینت پر جاتیں۔ وحشی کتنا ہی نوبل کیوں نہ ہو وحشی ہوتا ہے اسکی جبلتیں تبدیل نہیں ہوتیں!''

''لیکن تم جیسا زیرک انسان ان کے قابو میں کیسے آ گیا بالفرض تم نے سردار کو گرفتاری کرنا تھا تو زبردست فورسیلے کر جاتے۔ کم از کم لڑتے ہوئے تو مرتے یوں کسمپرسی کے عالم میں تو نہ رخصت ہوتے!''

''دراصل جب انسان کے دن پورے ہو جاتے ہیں تو اس کی عقل پر بھی دھند چھا جاتی ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کمزور لوگ یوں دست درازی پر اتر آئیں گے۔ احتیاطاً میں پھر بھی بارہ بندوق بردار ملاح ساتھ لے کر گیا تھا جنہوں نے بزدلی دکھائی اور بمع لیفٹیننٹ ولیم سن کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مجھے اپنی موت کا اتنا قلق نہیں لیکن انہوں نے یونین جیک کی تذلیل کی اور ایک عظیم ملک کے نام پر بٹہ لگایا''۔

کک کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

''کیا تم کوئی پیغام دینا چاہتے ہو؟''

''میری کہانی ہی میرا پیغام ہے۔ زندگی حرکت اور جہد مسلسل کا نام ہے۔ نامساعد حالات میں زندہ رہنے کا عزم''۔

''جس ملک و قوم کیلئے تم نے اتنی بڑی قربانی دی وہ آج کل نامساعد حالات کا شکار ہے۔ ایمپائر سکڑ کر ایک جزیرے تک محدود ہو گئی ہے اور جزیرہ اب مٹتا نظر آتا ہے!''

''تم اس قوم کو نہیں جانتے!'' کک نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ''انہیں زندہ رہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ تمام نو آبادیاتی طاقتیں بے عزت اور بے آبرو ہو کر کالونیوں سے نکلی ہیں۔ فرانس کی جو درگت ویت نام اور الجیریا میں بنی ہے تم اس سے آگاہ ہوں۔ ولندیزیوں کو یک بینی دو گوش انڈونیشیا سے نکالا گیا۔ جرمنی کے حصے بخرے ہو گئے۔ ہندوستان نے گوا پر قبضہ کرتے ہوئے پرتگیزیوں پر تھوکا تک نہیں..... لیکن میری قوم آنے والے حالات کا ادراک رکھتی ہے' اس نے صلح صفائی سے اپنے مفتوحہ علاقے چھوڑ دیئے۔ کسی قسم کی رسوائی کا سامنا نہیں کیا۔ نتیجہ تمہارے سامنے۔ برٹس کامن ویلتھ میں ستر ممبر ملک ہیں جن کا لیڈر برطانیہ ہے''۔ کک نے یہ کہہ کر ہاتھ ملایا مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھوں کی ہڈیاں کڑکڑا رہی ہوں۔ اس قدر مضبوط ہاتھ اس کے لہجے اور یقین کی طرح..... میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں کوئی ذی روح نہ تھا۔ باہر سمندر کی لہروں کا شور بڑھ گیا تھا..... ایک دم تاریخ اور تسف نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔

وہ موسم سرما کی ایک سہانی صبح تھی۔ 18 جنوری 1778ء کو HMS ڈسکوری Discovery اور ریزولیوشن Resolution حسب سابق سمندر کی نسبتاً ہموار موجوں پر رواں تھے کہ اچانک شمال مشرقی

حصے میں ایک جزیرہ نمودار ہوا۔ انہوں نے اسے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ دیکھا۔ وہ حریست مسرت میں بدل گئی جب اس کے قریب ہی شمالی سمت ایک اور جزیرہ نظر آیا۔ ملاحوں نے خوشی سے نعرہ بلند کیا Long Live The King لیکن موجوں کی تندی اور تیزی کی وجہ سے جہاز لنگر انداز نہ ہو سکے۔ رات کو جہاز غربی سمت کو ہے اور صبح تک انہیں تیسرا جزیرہ بھی نظر آ گیا۔ کیپٹن کک کو یہ دیکھ کر قدرے مایوسی ہوئی کہ ساحل پر کوئی ذی روح نہ تھا لیکن یہ فریب نظر تھا جب ریزولیوشن ساحل کے قریب پہنچا تو اچانک بھورے رنگ کے بے شمار لوگ اپنی چھوٹی کشتیوں میں سوار جہاز کی طرف بڑھے۔ کک کے جنوبی بحرالکاہل کے دوستوں نے اسے ان جزیروں کی موجودگی کے متعلق کچھ نہ بتایا تھا لہٰذا انہیں دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ان کے خدوخال اور لب ولہجہ سوسائٹی آئی لینڈ کے باشندوں سے ملتا جلتا تھا۔ اس وقت تک کک کو اس بات کا علم نہ تھا کہ وہ عظیم پولی نیشین تکون کے آخری سرے پر پہنچ گیا ہے جس کے جنوب مغربی کونے میں نیوزی لینڈ' جنوب مشرق میں ایسٹر آئی لینڈ واقع تھے اور اب وہ اوآہو O aho کوائی Kauai اور نی آہو Niihau کے مرکز میں کھڑا تھا جو ہوائی کے دائرے میں واقع تھے۔

کوائی کے باشندوں کا سلوک دوستانہ تھا نہ۔ انہوں نے کسی قسم کی مخاصمت کا اظہار نہ کیا لیکن ڈر خوف کی وجہ سے جہاز پر آنے سے بدکتے رہے اور اپنی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر تجارت کرتے رہے۔ کک نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ان کا دوست ہے دشمن نہیں۔ کک نے لوہے کے چند ٹکڑے رسے سے باندھ کر نیچے پھینکے اور انہوں نے اس کے بدلے مچھلی اور آلو اوپر پہنچائے۔ باوجود کوشش کے کوائی میں جہاز لنگر انداز نہ ہو سکے۔ چنانچہ کک نے ان کا رخ مغرب کی طرف موڑ دیا۔ بے شمار لوگ سمندری چٹانوں پر چڑھ گئے اور انہوں نے بھی ان جہازوں کو بڑی حریت وحسرت سے دیکھا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں جہاز کے قریب آتی رہیں اور اب کے بارٹریڈ میں میٹھے آلو' کیلے' گنے کے علاوہ زندہ سور بھی تھے۔

بالآخر ویمیا (Waimea) کے قریب جہازوں کو لنگر انداز ہونے کا موقع مل گیا۔ ویمیا 60 جھونپڑیوں کا چھوٹا سا قصبہ تھا۔ مقامی لوگوں کا خوف بھی کچھ کچھ زائل ہونے لگا تھا۔ چنانچہ ان میں سے چند ایک نے ہمت کی اور جہاز پر چڑھ آئے۔ یہ ان کیلئے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ انہوں نے زندگی میں تو اتنا بڑا جہاز دیکھا

تھا نہ ایسا لباس پہنا تھا۔ کک نے لکھا ''ان کی آنکھوں کی پتلیاں پھرکی کی طرح گھوم پھر رہی تھی۔ کبھی کسی ایک چیز کو دیکھ کر حیران ہوتے تو کبھی دوسری کو دیکھ کر عشق عشق کرا اٹھتے۔ جہاز پر چڑھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ کچھ لوگ سجدہ ریز ہو گئے۔ اکثریت کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہاں اور کیسے بیٹھیں۔ بعض لوگ پوچھنے لگے آیا انہیں جہاز میں تھوکنے کی اجازت ہے.....!''

کک پولی نیشین لوگوں کی عادات و خصائل سے پوری طرح واقفیت رکھتا تھا اور ان کی نفسیات' حرکات' سکنات کا وسیع تجربہ تھا۔ جتنا عرصہ اس نے State of Nature میں گزارا تھا اس کا یورپین فلاسفر احاطہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ لوگ خوبصورت تھے' خوبصورت جزیروں میں رہتے تھے اور من حیث القوم ان کا کردار یکساں نہ تھا۔ کچھ لوگ نیک' ایماندار اور محنتی تھے' جبکہ اتنے ہی دھوکہ باز' فریبی' چور اور بددیانت تھے۔ کک کیلئے پہلا مسئلہ انہیں رام کرنیکا تھا۔ وہ ذاتی طور پر اس وقت تک طاقت کے استعمال کے خلاف تھا جب تک اشد ضروری نہ ہو۔ اس کے آفیسرز کا خیال تھا کہ ''گربہ کشتن روز اول'' کے مصداق شروع میں ہی کچھ لوگ پھڑکا دیئے جائیں اور دہشت پھیلا دی جائے تو پھر انہیں قابو کرنا آسان ہوگا۔ کک کا استدلال یہ تھا کہ انسان اور جانوروں میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ ان کا آوارہ سوروں کی طرح شکار مناسب نہیں ہے۔ اس نے ایک جگہ لکھا:

''تین چیزوں نے انہیں ہمارا اچھا دوست بنا دیا ہے۔ ان کی بنیادی شرافت' ہماری طرف سے اچھا برتاؤ اور ہماری فائر پاور کا خوف اگر ہم ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کریں گے تو ان کا رویہ بھی مخاصمانہ ہوگا۔ پھر سو دو سو آدمی کتنی گولیاں چلا سکتے ہیں۔ یہ لوگ بہت زیرک ہیں انہیں اپنی عددی برتری کا احساس ہے اور ادراک بھی رکھتے ہیں!''

کک کا ایک بہت بڑا مسئلہ چوری تھا۔ ہوائی کے لوگ فطرتاً چور تھے۔ جہاز میں جو چیز بھی ان کے ہاتھ آتی سپاہیوں کی نظر بچا کر چرا لیتے۔ ہر چند کہ کک نے بڑی سخت نگرانی کا حکم دے رکھا تھا جب سپاہیوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو وہ جہاز پر سے کود گیا اور اپنی چھوٹی کشتی میں بیٹھ کر ساحل کی طرف چل پڑا۔ لیفٹیننٹ ولیمسن نے دیگر ملاحوں کے ساتھ اس کا تعاقب کیا اور پستول سے فائر بھی کیے لیکن وہ انہیں جل

دے کر ساحل پر کھڑے ہوئے ہجوم میں غائب ہوگیا۔ یہ چھوٹا سا واقعہ بعد میں بڑے المیے کی تمہید بن گیا۔ مقامی لوگوں کا ڈر آہستہ آہستہ زائل ہو رہا تھا جب بھی کوئی چھوٹی کشتی کسی کام کی غرض سے ساحل کی طرف آتی یہ اسمیں سوار ہو جاتے اور خوب اچھل کود کرتے اور دھما چوکڑی مشتی کرتے۔

جب جہاز لنگر انداز ہو گئے تو کک چند سپاہیوں کو معیت میں ساحل پر اترا۔ اس وقت تک مقامی لوگوں کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ بہت اہم آدمی ہے چنانچہ اسے دیکھتے ہی سارے لوگ سجدے میں گر گئے اور جب تک اس نے حکم نہ دیا اس حالت میں پڑے رہے۔ اس کے بعد اظہار عقیدت کے طور پر انہوں نے کک کو کیلے کا پا (ایک قسم کا کپڑا) اور پگ کا نذرانہ پیش کیا۔ کک نے بھی انہیں تحائف سے نوازا۔ اگلے دن کک پھر آیا۔ لیفٹیننٹ ولیم سن کو جہاز پر میٹھا پانی پہنچانے کا حکم دے کر وہ جہاز کے سرجن ولیم اینڈرسن اور آرٹسٹ جان ویبر کے ساتھ جزیرے کی سیر کو نکل گیا۔ راستے میں کیلوں کے باغات تھے' ناریل کے درختوں کے جھنڈ تھے' چلتے چلتے وہ اس ٹاور تک پہنچ گئے جسے انہوں نے جہاز سے پہلی بار دیکھا تھا۔ پچاس فٹ کا چوبی ٹاور جس کی بنیادوں میں پتھر بھرا تھا۔ ٹاور کے اوپر کیلے اور ناریل وغیرہ رکھے تھے۔ مقامی خداؤں کو خوش کرنے کیلئے خوراک کے علاوہ انسانی قربانی بھی دی جاتی تھی۔ کک نے کئی قبریں دیکھیں جہاں کنا کا کا پوؤں (قربانی کے انسانوں) کو دفن کیا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ اجنبیت کی دھند چھٹنے لگی۔ رفتہ رفتہ ملاح اور مقامی باشندگان ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔ الغرض بات کافی حد تک چوری سے یاری تک آ پہنچی۔ لوہا اہل ہوائی کیلئے نایاب چیز تھی۔ ایک کیل کے بدلے ایک خوبصورت عورت اپنا تن من دھن نچھاور کرنے کو تیار تھی۔ یہ ایک قسم کا بزنس تھا کیونکہ عورتیں خود بھی دیوانہ وار ان کی طرف لپکتی تھی اور کک کے سخت احکامات کے باوجود سپاہی بتقاضائے بشریت ان کو لے کر جہاز کو کونوں کھدروں میں چھپ جاتے۔ یہ بھی ایک عجیب قسم کی بارٹر ٹریڈ تھی۔ جنسی تسکین کے بدلے کوئی نہ کوئی بیماری (V-D) منتقل کر دیتے۔ باقی تجارت میں آلو' کیلے' ٹارا پھل' پرندگان شامل تھے۔ آلوؤں کا وزن حیران کن حد تک زیادہ تھا۔ 14 پونڈ کا آلو دیکھ کر ملاحوں کو بہت حیرانی ہوئی۔ خوبصورت پرندوں کے پروں سے بنے ہوئے سرخ اور پیلے رنگ کے کپڑے Helmet & clock بھی بہت

پسند کیے گئے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے لوہے کی بہت اہمیت تھی۔ مقامی باشندگان اس کا نام تو نہ جانتے تھے لیکن اس سے جو کام لیا جا سکتا تھا اس سے بخوبی آشنا تھے۔ خیال اغلب ہے کہ چونکہ ہسپانوی ملاح فلپینی اور میکسیکو کے درمیان سفر کرتے رہتے تو ان کے توسط سے لوہا کسی نہ کسی شکل اور کسی نہ کسی زمانے میں یہاں تک ضرور پہنچا ہوگا جب سپاہیوں کا خوراک اور عورتوں سے جی بھر گیا تو کک نے کچھ عرصہ کیلئے کھلے سمندر میں جانے کا حکم دیا۔ 23 جنوری کو زیرولیوشن کے لنگر اٹھانے کا حکم دیا۔ کئی دن تک اس کا جہاز کوائی اور نی آہو کے درمیان بھٹکتا رہا۔ سمندر کی سرکش موجوں نے ساے کوائی میں دوبارہ لنگر انداز نہ ہونے دیا۔

دوسرے جہاز ڈسکوری کا کیپٹن کلارک البتہ کچھ دن اور وہاں رہا۔ پہلی دفعہ مقامی سردار Alhs نے اس سے ملاقات کی سردار کو جہاز کی طرف آتے دیکھ کر مقامی لوگ بھاگ کھڑے ہوئے جو کسی وجہ سے وہاں رہ گئے وہ حسب دستور سجدے میں گر گئے۔ ہر چند کہ سردار کا رویہ دوستانہ تھا لیکن اس کے باڈی گارڈ بہت محتاط تھے۔ انہوں نے سردار کو جہاز پر چڑھنے سے روک دیا اور کیپٹن کلارک کو کہا کہ وہ آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرے جب کلارک نے آگے بڑھ کر مصافحہ کرتے ہوئے سردار کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کے حواریوں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی جیسے وہ کوئی بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہو۔ تحائف کا تبادلہ ہوا سردار نے اسے لکڑی کا بنا ہوا ایک بڑا پیالہ دیا جس پر انسانی انگلیوں کے نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ اس پیالے میں رسومات کے وقت آوا پیا جاتا تھا۔ کچھ دیر وہ دونوں اکٹھے رہے جب سردار رخصت ہوا تو اس کے لوگ ایک بار پھر اتنی تکریم برت رہے تھے جیسے بقوم کلارک پانی کا ایک نمکین قطرہ اسے تباہ کر دے گا۔

کک کا دوسرا پڑاؤ نی آہو میں ہوا یہاں کا ماحول بھی کوائی جیسا تھا۔ سپاہی نیم برہنہ عورتوں کو دیکھ کر پاگل ہو رہے تھے اور عورتیں ان کی چاہت میں دیوانہ وار لپکتی تھیں۔ کک کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے بعض ملاحوں نے انہیں مردوں کا لباس پہنا دیا۔ یہ بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھیں۔ انہیں پکڑ کر اپنے گھروں اور کھیتوں میں لے جاتیں اور ہر وہ حربہ آزماتیں جو اولاد آدم کو تخلیق آدمی کی طرف راغب کرتا ہے۔ کک کے سخت احکامات کی اخلاقی ضابطے کی وجہ سے نہ تھے وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان صاف ستھرے

بھولے بھالے معصوم لوگوں کی زندگیوں میں زہر بھر دیا جائے۔ ذاتی طور پر کک عورتوں کا دلدادہ نہ تھا۔ شراب بھی کم پیتا تھا۔ دراصل کار رہائے نمایاں کا نشہ ہی اس قدر تھا کہ اسے کسی دگر سہارے کی ضرورت ہی نہ تھی جب وہ واپس گھر پہنچا تو لندن کی ہائی سوسائٹی کی خوبصورت خواتین شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے گرد بھنبھناتی تھیں اور وہ ایک عجیب شان بے نیازی کیساتھ انہیں نظر انداز کر دیتا۔

کوائی کے مقابلے میں نی آہو کی آبادی کچھ زیادہ نہ تھیں۔ کہاں تیس ہزار باشندوں کا جزیرہ اور کہاں پانچ سو بکھرے افراد' کھانے پینے کی اشیاء وافر مقدار میں نہ تھیں۔ بہر حال کک نے اپنی ایک بکری' پیاز کے بیج اور تربوزPumkin انہیں تحفے میں دیئے اور جلد ہی وہاں سے رخصت ہو گیا۔

یہ بات کک کے مشاہدے میں آتی تھی کہ جنوبی بحرالکاہل کے جزیرےClusters میں تھے۔ یہاں بھی اب تک پانچ دیکھ چکا تھا اور باقیوں کی اسے تلاشی تھی۔ اس نے ان کا نام اپنے محسن اور مربی لارڈ سینڈوچ کے نام پر سینڈوچ آئی لینڈز رکھا۔

اہل ہوائی نے کک کو خاصا متاثر کیا۔ ہر چند کہ ٹاہیٹی کے لوگ ان سے زیادہ مہذب تھے اور بہتر زندگی گزار رہے تھے لیکن یہ لوگ بھی خاصے آرام میں تھے۔ خوراک کی فراوانی، حسن اور جوانی، فن حرب سے کافی حد تک آشنا، لکڑی کے بھالوں اور خنجروں کے ساتھ لڑائی کرتے۔ موسم بہت مہربان تھا کیونکہ درج حرارت 70 سینٹی گریڈ کے لگ بھگ رہتا اس لیے انہیں لباس کے لیے کوئی لمبا چوڑا اہتمام نہ کرنا پڑتا۔ اپنا زیادہ وقت یہ کھلی ہوا میں گزارتے۔ صرف رات کو سونے کے لیے اپنے خیموں میں چلے جاتے۔

کک صحیح طور پر اندازہ نہ لگا سکا کہ ان کا مذہب کیا ہے۔ پادری، مذہبی رسومات ادا کرواتے لیکن وہ بڑی مبہم تھیں۔ ٹاہیٹی کی طرح یہ بھی ان دیکھے خداؤں کی پوجا کرتے۔ ان کے خداؤں کی تعداد یقیناً بہت زیادہ تھی کیونکہ ہر سردار کا مرتبہ بھی کسی خدا سے کم نہ تھا۔ جب بھی اسے دیکھتے سجدہ ریز ہو جاتے۔ خدا اور عبادت کا تصور لازم و ملزوم ہے۔ کک یہ نہ جان سکا کہ یہ عبادت کرتے ہوئے کونسے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور کس قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

کیلاکیکوائےKELAKEKUA

1878ء کک کے لیے سخت سال ثابت ہوا۔ ان جزیروں کو خیر باد کہہ کر وہ اصل مشن کی طرف چل پڑا۔ اسے بحرالکاہل اور بحراوقیانوس کے درمیان راستہ (PASSAGE) تلاش کرنا تھا۔ یہ تلاش اسے بیرنگ اسٹریٹس (Bering St00raits) تک لے گئی۔ لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ سخت سردی اور برف نے ملاحوں کے اعصاب کو شل کر دیا۔ خوراک اس قدر کم ہوگئی کہ انہیں سمندر سے مچھلیاں پکڑ کر کھانا پڑتیں۔ موسم کا اثر جہاز کی شکست وریخت پر بھی پڑا۔ چلتے چلتے ایک مقام ایسا بھی آیا کہ کک کے جہازوں کے سامنے برف کی عمودی دیوار کھڑی ہوگئی۔ طوعاً وکرہاً اس نے واپسی کی ٹھانی۔ نامہربان موسم کی سختیاں جھیلتا اور گرجتی ہوئی سرد ہواؤں کے تھپیڑے سہتے وہ ہوائی پہنچ گیا۔ اب کے اس کے جہاز کوائی کی جگہ موائی (MUAI) کے جزیرے میں 1779ء میں لنگرانداز ہوئے۔ یہ جزیرہ کوائی اور نی ای یاو سے بھی بہتر تھا۔ گھنے درخت میٹھا پانی اور دس ہزار فٹ کی بلندی لیے ہوئے پہاڑ جو کسی زمانے میں لاوا اگلتا رہا تھا۔

جس شخص نے سب سے پہلے کلارک سے ملاقات کی وہ مقامی سردار کاہی کل (KAHEK IL) تھا۔ حسب دستور تحائف کا تبادلہ ہوا اور چند دنوں میں ہی مقامی لوگوں نے کک کا جہاز پھلوں، سبزیوں اور گوشت سے بھر دیا۔ موافق ہواؤں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کک جزیرے کی دوسری سمت North East Side (LEEWALD SIDE) پہنچ گیا۔ وہاں اس کی ملاقات سردار کالانی آپو (KALANIOPUU) سے ہوئی۔ اس کا ناک نقشہ اور ہیئت بڑی عجیب تھی۔ انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی سرخ آنکھیں۔ ڈھلی ہوئی عمر (Scaly Skin) جسم بید مجنوں کی شاخ کی طرح لرزتا ہوا۔ سردار اور دیگر لوگوں نے کوائی کی طرح کسی خاص حیرت کا اظہار نہ کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کو آمد کی پیش اطلاع مل چکی تھی۔ ان میں کچھ لوگ متعدی امراض کا شکار لگتے تھے۔ بیماری کے نشان ان کے چہرے اور جسم پر نمایاں تھے۔ کک نے انہیں دوا دی اور تحائف کا تبادلہ کیا۔

آخری جزیرہ جہاں کک اور اس کی پارٹی نے قیام کیا ہوائی تھا۔ ایک ماہ کی جدوجہد کے بعد جہاز لنگرانداز ہوگئے۔ ہوائی کے پہاڑ موائی کے پربتوں سے اونچے تھے۔ سترہ ہزار فٹ کی بلندی لیے ہوئے ان کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ یہاں بھی خوراک کی بھرمار تھی۔ ملاحوں نے جی بھر کر کھانا کھایا اور مقامی

عورتوں کے ساتھ دادعیش دیتے رہے۔ کک کے لیے انہیں روکنا ناممکن ہوگیا۔ جس چیز سے وہ ڈرتا تھا وہ دیگر یورپین ملاحوں کی وجہ سے وہاں پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ پہلے سے بیمار شخص مزید کیا بیمار ہوگا۔ لہٰذا کک نے چشم پوشی میں ہی عافیت سمجھی۔ مرد وزن دیوانہ وار جہازوں کی طرف بڑھتے رہے۔ جنسی آسودگی، تجسس اور چوری کی شدید خواہش، غالباً جہازوں پر اتنے ملاح نہیں تھے جتنے اور لوگ آ گئے۔ ایک ہزار کے لگ بھگ عورتیں ناچ گا کر سپاہیوں کا دل لبھا رہی تھیں۔ لوگ تحفے میں پھل، سبزی اور جانور لائے تھے۔ کئی مرتبہ ایسے محسوس ہوا جیسے زیادہ وزن کی وجہ سے جہاز ڈوب جائیں گے۔ کک کو تشویش لاحق ہوئی لیکن جب ایک شخص نے جہاز کا RUTHER چرایا تو اس کے وجود میں پہلی مرتبہ خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہوگئیں۔ اس نے چور کی کشتی پر ہوائی فائر کا حکم دیا۔ فائر کی گونج فضا میں بلند ہوئی۔ بارود کی بو چار سو پھیل گئی۔ کشتی چلتی رہی لوگ خوفزدہ کم اور حیران زیادہ ہوئے۔ کچھ روز یہ کھیل ہوتا رہا اور بالآخر کک کے جہاز کیلا ککوائے بے پر لنگر انداز ہوگئے۔

اگلے دن دو سردار کک سے ملنے جہاز پر آئے۔ ایک کا نام کانا اینا (KANAINA) اور دوسرا نوجوان پالیا (PALEA) تھا۔ دونوں خوبصورت تھے۔ فرق صرف قد اور عمر کا تھا۔ کانا اینا کا قد چھ فٹ تھا اور خاصا جاذب نظر تھا۔ انہوں نے تمام کشتیوں کو حکم دیا کہ وہ فوراً جہازوں کا گھیراؤ ختم کر کے واپس ساحل پر چلی جائیں۔ بادل نخواستہ لوگوں نے تعمیل کی اور جہاز کے آگے سے اپنی کشتیاں ہٹالیں۔ اگلے روز جزیرے کا ایک اور اہم شخص پادری کوآ (KOA) آیا۔ لیفٹیننٹ جیمز کنگ نے اپنی ڈائری میں اس کی شکل وصورت اور حلیہ بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے ''کہ اس کا ٹھگنے قد کے پادری کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں'' جسم Scaly تھا جو کثرت مے نوشی (AWA) کی وجہ سے تھا۔ کووا نے کک کے کندھوں پر سرخ شال ڈالی، قدرے جھکا اور ایک چھوٹا سا خنزیر پیش کرنے کے بعد لمبی تقریر کی۔ کک نے بھی اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور اسے کھانے کے ساتھ انگلینڈ کی عمدہ شراب پیش کی۔ لیکن وہ آدا پینے کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ بمشکل وائین اور وہسکی کے چند گھونٹ لے سکا۔ اگلے روز کوا کی دعوت پر کک اور ماہر علوم فلکیات بیلے (BAYLY) کیکوا گئے۔ ساحل پر ان کا چار لوگوں نے استقبال کیا۔ چاروں نے لاٹھیاں اٹھا رکھیں

تھی۔ جن کے سروں پر کتے کے بالوں کا گچھا لگا ہوا تھا۔ وہ آگے آگے منتر پڑھتے جا رہے تھے جو کک اور اسکے دوست کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ وہ صرف ایک ہی لفظ سمجھ سکے جو بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ اروئو یا نونو، چلتے چلتے وہ ایک بہت بڑے پتھروں کے بنے ہوئے چبوترے پر پہنچ گئے۔ یہاں بھی بے شمار لوگوں کے سروں کی کھوپڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ کووا کا مقصد محض انہیں اپنی عبادات اور قربان گاہیں دکھانا نہیں تھا۔ وہ دراصل کک کو اپنی مذہبی رسومات کے بعد ایک خاص مقام اور مرتبہ عطا کرنا چاہتے تھے۔ کچھ دیر تک کووا جنتر منتر پڑھتا رہا۔ کک کا بازو پکڑ کر اسے لکڑی کی بنی ہوئی کئی شبیہوں کے نیچے سے گزارتا رہا اور کہیں کہیں اسے بھی وہی الفاظ دہرانے کی تلقین کرتا رہا۔ کک گم سم رہی کرتا گیا جس کا اسے کہا گیا۔ ایک جگہ پر جا کر وہ سجدہ ریز ہو گیا اور کک کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی ماتھا ٹیکنے کے لیے کہا۔ حیران مگر ہوشیار کک نے ایک مبتدی طالب علم کی طرح اس کی تقلید کی۔ رسومات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو چلتا گیا۔ آخری رسم اس وقت شروع ہوئی جب مقامی لوگوں کا گروہ پنڈال میں داخل ہوا۔ وہ کھانا لائے تھے۔ بھنا ہوا سور، ناریل، سبزیاں اور POI۔ پادری نے ہاتھ اٹھا کر ایک بار پھر پندرہ منٹ کی یہی دعا مانگی جو لفظ نونو پر ختم ہوئی۔ آوا شراب بنانے والوں نے Pepper Root چبا چبا کر بڑے برتن میں ڈالنا شروع کیا۔ کک اور کنگ کو اس شراب کا گھونٹ بھرنے کے لیے کہا گیا جو انہوں نے بادل نخواستہ پیا۔ اس کے بعد ایک نوجوان پادری نے ان کے چہروں، ہاتھوں اور جسم پر آوا شراب کی تلچھٹ کی مالش کی۔ اس کے بعد انہیں تعفن زدہ خنزیر کے گوشت کا لقمہ پادری نے اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔ کک نے بڑی مشکل سے ابکائی روکی۔ رسومات ختم ہوتے ہی کک اور کنگ نے اجازت لی اور واپس اپنے جہازوں پر آ گئے۔

آخر ان رسومات کا مطلب کیا تھا۔ یقیناً وہ لوگ کک کو اپنے خدا یا خدائی طاقتوں کے مظہر LONO کا ہم پلہ سمجھ بیٹھے تھے۔ اور اس رسم کے ذریعے انہوں نے بھی ساکو اعلیٰ مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ کیونکہ اس رسم کے بعد جب بھی کک باہر نکلتا ایک پادری اس کے ہمرکاب ہوتا جو لوگوں کو سجدہ کرنے کی تلقین کرتا جاتا۔

کیپٹن کلارک اور جہاز کے دوسرے لوگ کک کے اس رویے سے خوش نہ تھے۔ لوگوں کو مطیع کرنا اور بات ہے اور ان کا مسجود بننا ایک الگ معاملہ تھا۔ وہ کرسچین تھے اور یقیناً اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ ”خدا

کے بیٹے" کی امت خود خدا بن بیٹھے۔ انہوں نے دبے دبے لفظوں میں اس کا اظہار بھی کیا۔ اور اشاروں کنایوں میں کک کو اس کے مضمرات سے آگاہ بھی کرتے رہے۔ لیکن کک ایک عجیب مخمصے میں پھنس چکا تھا۔ اس کے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندان والا معاملہ تھا۔ ذرا سی غلطی نے اسے ایسے مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں سے واپسی کا تصور کرتے ہی خطرے کی بے شمار گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی تھیں۔

لیفٹیننٹ کنگ کو سردار نے اجازت دے دی کہ وہ آلوؤں کے کھیت میں فلکی رسدگاہ قائم کر سکتا ہے۔ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ کوئی شخص اس کے نزدیک نہ جائے کیونکہ رسدگاہ کے قریب تھی۔ نتیجتاً کوئی شخص بھی ان کے قریب سے نہ گزرتا۔ اکیلے رسدگاہ میں بیٹھے ہوئے لوگ یہ سوچ کر سلگتے رہتے کہ ان کے دیگر ساتھی جہازوں میں دادعیش دے رہے ہوں گے۔

25 جنوری کو ہوائی کا حکمران کالانی آپو ایک بار پھر کک سے ملنے آیا۔ جولائی کے بعد یہ دوسری ملاقات تھی۔ اس کے ساتھ لونو کا پادری اعظم کاؤ تھا۔ سردار بڑے طمطراق کے ساتھ آیا تھا۔ اس کی معیت میں تین کشتیاں تھیں۔ کنگ لکھتا ہے ایک میں وہ خود سوار تھا، دوسری میں پادری اور چار مجسمے تھے، تیسری میں سبزیاں تھیں، پادری منتر پڑھ رہا تھا جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ محض کرسٹی کال نہیں بلکہ مذہبی رسومات ادا کی جا رہی ہیں۔ سردار کی سج دھج قابل دید تھی۔ اس نے رنگین چوغہ پہن رکھا تھا اور سر پر ٹوپی نما کوئی چیز اوڑھی ہوئی تھی۔ بتوں کو سرخ، کالے، سفید اور پیلے پروں سے ڈھانپا گیا تھا۔ بتوں کی آنکھیں کالے موتیوں کی بنی ہوئی تھیں اور منہ میں کتے کے دانت لگائے گئے تھے۔ تمام بتوں کے چہرے صاف نہیں تھے بلکہ کسی حد تک مسخ شدہ تھے۔ سردار کک سے گلے ملا، اپنا چوغہ اور ٹوپی اتار کر اسے پہنائی اور اس طرح اس کے ساتھ دوستی کا پیمان کیا۔ کک بھی بڑی گرمجوشی کے ساتھ اسے ملا اور اسے ڈنر کی دعوت دی جو سردار نے بڑی خوشی سے قبول کر لی۔

دوستی کی یہ فضا شاید زیادہ دیر تک قائم رہتی لیکن اہل ہوائی اپنی عادت کے ہاتھوں مجبور تھے جب بھی انہیں موقع ملتا وہ جہاز سے کوئی نہ کوئی چیز چرا لیتے۔ اور پھر تیزی سے سمندر میں چھلانگ لگا کر بھاگ جاتے۔ وہ اس قدر پھرتیلے، چالاک اور ماہر تیراک تھے کہ انہیں پکڑنا کک کے سپاہیوں کے بس کا روگ نہ تھا۔ گولی

چلانے سے ویسے ہی کک نے منع کر رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ چوری کے واقعات بڑھتے گئے۔ ان کی دیدہ دلیری اس حد تک بڑی کہ انہوں نے جہاز کے پیندے میں بھی کیلیں اکھاڑنا شروع کر دیں۔ نوبت باایں جا رسید کے سادھ بھی چور بن گئے۔ ملاحوں نے لذت شب کے لیے ان کی مدد کرنا شروع کر دی۔ کک کو بتایا گیا کہ اگر یہ سلسلہ کچھ دیر اور چلتا رہا تو جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ بالآخر 3 فروری کو کک نے کوچ کا حکم دیا۔ دونوں جہازوں کا عملہ 180 افراد پر مشتمل تھا۔ ملاحوں نے اپنا ساز و سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ روانگی کی اطلاع سن کر سارے جزیرے میں دکھ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لوگ جہازوں کو روکنا نہیں چاہتے تھے، لیکن ان کی خواہش تھی کہ کک وہیں رہ جائے۔ وہ اپنے لونو کی جدائی برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ انہوں نے کھلم کھلا اس خواہش کا اظہار بھی شروع کر دیا۔ چھ فروری کو جہازوں کے لنگر اٹھا لے گئے۔ ابھی جہاز تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ سمندری طوفان نے تباہی مچا دی۔ جہازوں کے لیے سفر جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ کچھ عورتیں جہاز میں رہ گئی تھیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ انہیں بھی دیار غیر لے جایا جا رہا ہے۔ تو انہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ محبت کے سب وعدے قسمیں دم توڑ گئے۔ وطن کی محبت ہر چیز پر غالب آ گئی۔ طوفان کی وجہ سے مقامی لوگوں کی Conoes ڈوب رہی تھیں۔ کک نے ہمدردی کے طور پر ان کو بھی جہاز میں بٹھا دیا۔ کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ واپس جزیرے میں جایا جائے اور طوفان کے ختم ہونے کا انتظار کیا جائے۔ اتفاق سے خوراک کے ذخائر بھی ختم ہونے کے قریب تھے۔ اس مرتبہ لوگوں میں پہلی سی گرمجوشی نہ تھی۔ کالانی آپو جا چکا تھا۔ ریزولیوشن کو طوفان نے خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ اس کی مرمت کے لیے کئی دن درکار تھے۔ جب کالانی آپو کو اطلاع ملی کہ کک واپس آ گیا۔ اس نے آتے ہی KAPU (ایک قسم کا مذہبی کرفیو) ختم کر دیا۔ اس پر مقامی لوگ ایک بار پھر جوق در جوق آنے شروع ہو گئے۔ کاروبار شروع ہو گیا اور سرجن میٹ کے بقول عورتوں کی منڈی بھی پھر لگ گئی۔ بظاہر حالات ٹھیک لگتے تھے۔ کالانی آپو کی دوستی شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ لونو کے پادری ہمہ وقت خدمت کے لیے کمر بستہ تھے۔ کالانی آپو کی دوستی شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ لونو کے پادری ہمہ وقت خدمت کے لیے کمر بستہ تھے۔ کانانیہ اور پالیا بھی مجسم محبت نظر تھے۔ عورتیں بھی سپردم بتو مائیہ خویش را، کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔ لیکن

چوری پھر بھی جاری تھی۔ جہاز کے حصوں کو مفلوج کیا جا رہا تھا۔ کچھ شریر لوگ انہیں شہہ دے رہے تھے۔ ہو سکتا ہے انہیں اجنبیوں کی نیتوں پر شک ہو..... کک ان تمام باتوں کو سنتا تھا۔ اس کا تجربہ ہی اس کا سرمایہ تھا۔ اس نے اپنے پہلے سفر میں ایک جگہ لکھا تھا۔

ان لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہماری اصل نیت کو جان سکیں۔ ہم بن بلائے مہمان کی طرح ان کی بندرگاہوں میں داخل ہوتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ سب کام امن و آشتی کے ساتھ ہو جائیں۔ اگر یہ مان جائیں تو درست نہیں تو ہماری بندوقیں انہیں ڈھیر کر دیتی ہیں۔ ان حالات میں وہ لوگ ہمیں غاصب نہیں سمجھیں گے تو کیا سمجھیں گے؟ محبت میل ملاپ اور اچھا برتاؤ ہی بالآخر انہیں اپنی غلطی کا احساس دلا سکتا ہے۔

چھوٹی چھوٹی چوریاں بالآخر رنگ لائیں۔ کک اور اس کے ساتھیوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا گیا۔ چند دن تک چوہے بلی کا کھیل چلتا رہا، جہاز سے چوری اور چور کا تعاقب، گرم الفاظ کا تبادلہ، دھینگ مشتی، لوگوں کا پتھراؤ، سپاہیوں کی طرف سے فائر۔ آخر کو وہ گھڑی آ گئی جس کا مشیت کو انتظار تھا۔ 14 فروری کو کیپٹن کلارک کو اطلاع دی گئی کہ اسکا کٹر (Cutter) چوری ہو گیا ہے۔ رات کو ایک شخص نے کشتی کے رسے کاٹے اور اس کو بھگا کر لے گیا۔ جب کک کو اطلاع دی گئی تو اس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ وقت آ گیا تھا کہ طاقت کا استعمال کیا جائے۔ عصا کی ضرورت تھی۔ کلیسی کے حربے ناکام ہو گئے تھے۔ یہاں کک نے دہری حکمت عملی سے کام لیا۔ اس نے مسلح پارٹی ساحل پر بھیجی اور حکم دیا سب کینوز کو پکڑیں۔ اگر کٹر واپس نہ کیا گیا تو ان سب کو تباہ کر دیا جائے گا۔ جہاز سے چند گولے بھی پھینکے گئے۔ کک نے اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ خود بھی ایک مسلح دستہ لے کر چل پڑا۔ وہ سردار کالانی آپو کو یرغمال بنا کر جہاز پر لانا چاہتا تھا۔ اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ خود نہ جائے کیونکہ اس طرح اشتعال پھیل سکتا تھا۔ لیکن اس نے ہر نصیحت یہ کہہ کر رد کر دی کہ یہ لوگ ایک بندوق کا سامنا نہیں کر سکتے۔ لونو کے پادریوں نے بیچ بچاؤ کرانا چاہا، انہوں نے کنگ جو اس وقت آبزرویٹری میں تھا اس سے پوچھا کہ کک آخر چاہتا کیا ہے؟ ''کچھ بھی نہیں'' کنگ نے جواب دیا۔ ''وہ صرف جہاز کا کٹر واپس چاہتا ہے۔'' کک نے بطور حفظ ماتقدم لیفٹیننٹ ولیم سن کو تین کشتیوں کے

ساتھ ساحل کے شمالی جانب کاولا گاؤں کی سمت بھیجا اور خود لیفٹیننٹ مولذروتھ (Moles Worth) فلپس کی معیت میں 9 مسلح سپاہیوں کو لے کر ساحل پر آ گیا۔ سردار سو کر اٹھا ہی تھا کہ اس نے کک کو اپنی دہلیز پر پایا۔ کک نے اسے چوری سے آگاہ کیا تو اس نے بتایا کہ وہ بے خبر ہے۔ اور اسکا چوری میں کسی طرح بھی ہاتھ نہیں ہے۔ کچھ تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ کک نے سردار کو کہا کہ وہ ان کیساتھ جہاز پر چلے تا کہ معاملہ کا حل نکالا جا سکے۔ سردار تیار ہو گیا، جب سردار سپاہیوں کے گھیرے میں جہاز کی طرف چلا تو یہ بات جنگل کی آگ کی طرح چار سو پھیل گئی۔ اس کے دو کمسن لڑکے آگے آگے دوڑنے لگے۔ اس کی بیوی کانی کاپولائی (Kane Kapolei) نے بین کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ دو ہزار کے لگ بھگ لوگوں نے نعرے مارنے شروع کر دیئے۔ ان کی شہہ پا کر اور بچوں کے اصرار پر سردار نے جہاز پر جانے سے انکار کر دیا اور ساحل سے بتیس گز کے فاصلے پر دھرنا مار کر بیٹھ گیا۔ کک نے مسلح آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ چٹانوں کے پیچھے پوزیشن لے لیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مجمعے کو حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں لیکن شور وغل میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کک کو پہلی بار خطرے کا احساس ہوا۔ ''ہم ان لوگوں کو قتل کیے بغیر جہاز پر نہیں جا سکتے!'' کک نے فلپس کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ اس سے بہتر ہے کہ واپس جہاز پر چلے جائیں۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ جیسے ہی کک مڑے لگا، دو آدمیوں نے آ کر خبر دی کہ ایک سردار کو کک کے سپاہیوں نے مار ڈالا ہے اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ تمام لوگوں میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ عورتیں اور بچے پیچھے ہٹ گئے۔ ایک شخص آگے بڑھا اور کک پر لوہے کی سلاخ سے وار کرنے کی کوشش کی۔ کک نے اس پر پستول کا پہلا فائر کیا جو خطا گیا۔ اتنے میں سردار فلپ کو خنجر مارا جس پر فلپ نے بندوق کا بٹ مار کر اسے زخمی کر دیا۔ اس دوران لوگوں نے چٹانوں کے پیچھے کھڑے مسلح سپاہیوں پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ انہوں نے جواباً کارروائی کی جس سے چار لوگ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ کک کشتی کے قریب پہنچ گیا۔ اتنے میں ایک شخص نے لوہے کی سلاخ سے اس پر پہلا وار کیا۔ زخمی کک نے فائر کر کے اسے وہیں ٹھنڈا کر دیا۔ جب وہ تیزی سے کشتی میں سوار ہو رہا تھا تو ایک شخص نے بڑی سرعت سے خنجر اس کی گردن میں اتار دیا۔ کک منہ کے بل پانی میں جا گرا۔ سارا ہجوم اس پر ٹوٹ پڑا۔ لاتیں، گھونسے، مکے، ڈنڈے، خنجر..... سمندر کا پانی سرخ ہو گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے بپھرے ہوئے لوگوں نے اس کے جسم کے بخیے ادھیڑ دیئے۔ فلپس نے زخمی حالت میں اپنے بچے کھچے سپاہیوں کو جمع کیا اور فائر کرتا ہوا تیزی سے جہاز کی طرف دوڑا۔ اس موقع پر لیفٹیننٹ ولیم سن نے بزدلی دکھائی۔ اس کی کشتی میں کئی مسلح سپاہی سوار تھے۔ اگر وہ بروقت پہنچ کر فائر کر دیتا تو شاید کک اس جانکاہ حادثے سے دوچار نہ ہوتا۔ بڑا دردناک منظر تھا۔ سمندروں پر حکمرانی کرنیوالے کمانڈر کی لاش بے بسی کے عالم میں پانی میں پڑی تھی۔ دور سپاہی اشکبار آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ لیکن قریب نہیں آ سکتے تھے۔ بندوق کی اپنی طاقت ہے لیکن جب ہزاروں لوگ مرنے مارنے پر تل جائیں تو پھر یہ بے اثر ہو جاتی ہے۔ غالباً کک سے پہلی بار ایک غلطی سرزد ہوئی جو آخری ثابت ہوئی۔ ہجوم کی نفسیات فرد کی نفسیات سے مختلف ہوتی ہے۔ ایک شخص چاہے کتنا ہی ڈرپوک اور بزدل کیوں نہ ہو، جب مجمعے کا حصہ بنتا ہے تو اس کا ڈر خوف بھاپ کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ اگر کک کو رائی بھر بھی اس امر کا گمان ہوتا کہ محض مٹھی بھر بندوقچی انسانی لہروں کو پیچھے نہیں ہٹا سکتے تو شاید کوئی اور حکمت عملی اختیار کرتا لیکن جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔

چل گیا کاتب تقدیر کا آزاد قلم
ہو گیا خون سے اک قصہ رنگین رقم

وہ شام بڑی غمگین تھی۔ کمانڈر کی موت نے سپاہیوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دل میں غبار تھا اور ہاتھوں میں ہتھیار تھا۔ بدلہ لیا جائے، اکثریت کی رائے تھی۔ لیکن کلارک نے صلح میں عافیت سمجھی۔ جہاز شکست وریخت کا شکار تھے۔ وطن بہت دور تھا۔ اور دشمن تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ آج کل کی طرح Rapid Fire والی رائفلیں نہیں تھیں۔ بندوق کو ہر فائر کے بعد لوڈ کرنا پڑتا تھا۔ فائر پر نالی گرم ہو جاتی تھی۔ ان حالات میں دشمن کو ہرانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ مصلحت سے کام لیا جائے۔ اور سردار سے مطالبہ کیا جائے کہ کک کی لاش اور جہاز کے آلات واپس کر دے۔

بڑی حیران کن بات یہ تھی جس شخص کو کل تک وہ خدا سمجھتے تھے، مقامی لوگ اس کی موت کا جشن منا رہے تھے۔ چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر وہ جہازوں کے گرد چکر لگاتے اور ملاحوں کو دیکھ کر فحش حرکات کرتے اور منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکالتے۔ صبح کو کنگ کشتی میں بیٹھ کر سفید جھنڈا لہراتا ہوا ساحل کے قریب گیا۔ کو آ

(KOA)اس سے ملنے آیا۔ کنگ نے ایک بار پھر کک کی لاش کا مطالبہ کیا اور ساتھ دھمکی بھی دی کہ اگر شام تک لاش واپس نہ کی گئی تو وہ سارا گاؤں تباہ کر دیں گے۔ کوآ نے وعدہ کیا کہ سردار سے کہہ کر وہ لاش واپس کر دے گا۔ مذاکرات میں تعطل اس وقت پیدا ہو گیا جس پتہ چلا کہ سردار غائب ہے۔ کک کی موت کے بعد وہ بھاگ کر ایک غار میں چھپ گیا تھا۔ جن لوگوں کو اس بات کا علم تھا وہ بھی لیت ولعل سے کام لے رہے تھے۔ جب کنگ بے نیل ومرام واپس لوٹا تو پہاڑ پر کھڑا ہوا ایک شخص برہنہ ہو گیا اور اپنی پشت اس کی طرف کر دی۔ کسی کی تضحیک کا یہ مقامی انداز تھا۔ غصے میں اس کی انگلی بندوق کی لبلبی تک پہنچی لیکن پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔

رات کو دو شخص ایک پوٹلی اٹھائے جہاز پر آئے۔ ان میں ایک وہی پادری تھا جو کک کے آگے احتراماً چلتا تھا۔ پوٹلی میں کک کی لاش کے کچھ اجزا تھے کنگ نے لکھا.....

''بنڈل کھلتے ہی خوف کی ایک لہر ہماری ریڑھ کی ہڈی تک پہنچ گئی۔ اوہ گاڈ! لفظ وہ منظر بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ کک کی لاش کے چند ٹکڑے خاک اور خون میں لتھڑے پڑے تھے۔ سر کاٹ کر سردار لے گیا تھا۔ باقی لاش کو مشتعل ہجوم نے قیمہ بنا دیا تھا سورج نکلتے ہی لوگوں نے منتشر ہونا شروع کر دیا جب ان کی کشتیاں جہاز کے قریب سے گزریں تو ایک بار پھر وہ بدتمیزی پر اتر آئے۔ ایک شخص نے ترنگ میں آ کر کک کا ہیٹ ہوا میں اچھالنا شروع کر دیا It is a limi کنگ چلایا اور انہوں نے ہجوم پر توپ کے چار گولے داغ دیئے کافی لوگ مر گئے اور سردار کا بھیجا کافی حامیہ زخمی ہو گیا سرداروں نے ایک بار پھر کنگ سے معذرت کی اور یقین دلایا کہ ان کا احترام کیا جائے گا۔ سرداروں کی یقین دہانیوں کے باوجود لوگ شرارت پر تلے ہوئے تھے۔ کک کے قتل نیا یک نفسیاتی فضا قائم کر دی تھی ہر چہ بادا باد کا سماں تھا جب ملاحوں کی پارٹی ساحل پر گئی تو کچھ لوگوں ن پھر پتھراؤ شروع کر دیا۔ وہ پتھر مار کر جھونپڑیوں کے پیچھے چھپ جاتے یا پہاڑیوں پر سے بھاری بھاری پتھران کی طرف لڑکا دیتے۔ اب کے سپاہیوں نے پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔ انہوں نے سب کو گولیوں کی باڑ پر رکھ لیا اور جو لوگ جھونپڑیوں میں چھپے ہوئے تھے انہیں بھی آگ لگا دی۔ سپاہی دو آدمیوں کے سر کاٹ کر جہاز پر لے آئے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ کک

کی موت بھی ملاحوں کی جنسی بھوک کم نہ کر سکی تھی۔ اس اندوہناک رات کو بھی عورتیں ان کے جہاز پر تھیں۔ جب کک کے ملاح جھونپڑیوں کو آگ لگا رہے تھے تو یہ خوشی سے تالیاں بجا کر MAIKA مائی کائی بہت عمدہ، بہت عمدہ پکار رہی تھیں۔

اب کے سفید جھنڈا لہرانے کی باری مقامی لوگوں کی تھی۔ سرداروں نے آ کر معافی مانگی اور کنگ کے عملے کو یقین دلایا کہ کک کا قتل کسی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایک حادثہ تھا جو بدقسمتی سے رونما ہو گیا۔ حسب دستور وہ پھر تحائف ساتھ لے آئے اور وعدہ کیا کہ کک کی لاش کے باقی ماندہ ٹکڑے بھی واپس کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ اگلے دن سردار ایک جلوس کی شکل میں سفید جھنڈا اٹھائے ہوئے آئے۔ آگے آگے کچھ لوگ ڈرم بجا رہے تھے۔

کلارک اور کنگ ساحل پر آئے۔ جسم کی باقیات کو انہوں نے احتراماً کلارتھ KAPA CLOTH میں لپیٹ کر رکھا تھا۔ جس پر کالے اور سفید پروں کی کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ جب انہوں نے کپڑے کو کھولا تو ایک بار پھر ملاحوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ کک کے ہاتھ کٹے ہوئے تھے جن میں سوراخ کر کے وحشیوں نے نمک بھر دیا تھا۔ کھوپڑی، نچلا جبڑا، بازو اور ٹانگ کی ہڈیاں اس کے علاوہ کمانڈر کی ذاتی اشیاء صندوق اور لباس بھی لوٹا دیئے گئے۔ رواج کے مطابق ان تمام چیزوں کو جہاز میں نیلام کر دیا گیا۔ کک کی تدفین بھی فوجی طریقے سے ہوئی۔ ساحل پر سپاہیوں نے توپ کے تین فائر کر کے اسے آخری سلیوٹ کیا۔ نیول بریل سروس پڑھی گئی اور پھر خاموشی کے ساتھ اس کی ہڈیوں کو سمندر کے گہرے پانیوں میں اتار دیا گیا۔ اس کے بعد تمام سرداروں (ALIIS) جہاز پر آ کر تعزیت کی اور اپنی قوم کی طرف سے معافی مانگی 22 فروری کو جہازوں نے لنگر اٹھائے اور وطن واپسی کا سفر شروع کیا۔

چھٹا باب

اگر ہوٹل آپریٹر مجھے ویک اَپ کال نہ بھی دیتی تو میں اٹھ بیٹھتا۔ میں سو نہیں رہا تھا محض آنکھیں بند کئے کرسی پر دراز تھا۔ تاریخ کے دھارے پر بہتے ہوئے مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس المیہ ڈرامے کا عینی گواہ ہوں۔ جیسے کک میری آنکھوں کے سامنے زندگی کی قید سے رہا ہوا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو پانچ بج

رہے تھے۔ سمندر کی موجیں بھی رات بھر دھما چوکڑی کے بعد سو گئی تھیں۔ دور کسی جہاز کی روشنیاں مدھم ستارے کی طرح لرز رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر جوگر پہنے اور سیر کے لئے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ برگد کے درخت کے پاس گزرتے ہوئے جب میں سڑک پر آیا تو کنارے پر دو نوجوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ایک نے نیکر اور ہاف سلیو کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور دوسری کا لباس دیکھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سمندر سے تازہ تازہ اشنان کر کے لوٹی ہو۔ ہوائی کے لوگ بھی سحر خیز ہیں۔ میں نے سوچا اور جب ان کے قریب سے گزر رہا تھا تو ان میں نیکر والی لڑکی نے جس کا قد لمبا اور جسم مناسب تھا مجھے آواز دی۔ میرے تیز قدم ایک دم رک گئے۔

کیا بات ہے؟ میں نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

Do your want sex اس نے میری طرف دیکھا۔

کیا مطلب.....؟ میں غالباً ذہنی طور پر اس قسم کی پیشکش کیلئے تیار نہ تھا۔

Am I speaking greek اب کے وہ دونوں مسکرا پڑیں۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے!

میں نے فوراً ہی بھانپ لیا کہ میں کن کے نرغے میں ہوں.....

کیا وقت دیکھا ہے.....؟ کس قدر پاکیزہ ماحول ہے۔

اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ کیا تم پانی کا گلاس وقت دیکھ کر پیتے ہو۔؟

لیکن میرا بٹوا کسی مفلس کے گالوں کی طرح پچکا ہوا ہے۔..... میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

اچھا جوک ہے جو شخص ہزاروں میل سفر کر کے ہوائی شیر ٹین میں ٹھہرے، وہ یقیناً ایک غریب انسان ہوگا۔

دونوں نے اب کے باقاعدہ قہقہہ لگایا۔

سپیدہ سحر پھوٹ رہا ہے۔ میرے جوگر اور ٹی شرٹ سے تم نے اندازہ کر ہی لیا ہوگا کہ میں کس مقصد کے لئے باہر نکلا ہوں۔

کوئی بات نہیں ہم انتظار کر لیتی ہیں۔ تمہارا کمرہ نمبر کیا ہے؟

میں نے مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ساحل کی طرف چل دیا۔ مجھے یہ دیکھ بڑی

حیرت ہوئی کہ شیر ٹین سے لے کر آؤٹ رگر ملیحہ ہوٹل تک اور اس کے ارد گرد بے شمار عورتیں کھڑی تھیں ٹولیوں کی شکل میں اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے لیکن بہت کم بھاؤ تاؤ میں مصروف تھے۔ گاہک کم تھے اور حسن کی فراوانی تھی۔ ایک بوڑھا امریکی کار میں بیٹھا چند جوان نیگرو لڑکیوں سے سودے بازی کر رہا تھا۔

میں ساحل کے ساتھ ساتھ سڑک کے کنارے چلتا گیا۔ چلتے چلتے میں اس پارک میں آ گیا جو میں نے پہلے دن شام کو دیکھا تھا۔ پارک میں اس وقت بہت کم لوگ سیر کر رہے تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ معاملہ کیا ہے۔ اس قدر خوبصورت ماحول' متعدل موسم اور سیر کے دلدادہ اہل مغرب! کیا یہ محض اتفاق تھا یا یہاں آ کر عادتیں بدل گئی تھیں۔

یہی سوال جب میں پارک میں بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے شخص سے کیا تو اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔ تم ہوائی کیا لینے آئے ہو؟ اگر مارننگ واک ہی کرنا تھی تو کیا گھر سے نکلنا ضروری تھا۔ میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے کہنے لگا" یہاں راتیں جاگتی ہیں اور دن بے چین سے گزرتے ہیں۔ ہر شخص فطرت کا اس قدر دلدادہ نہیں ہوتا۔ چند دن سیر نہ کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ زندگی میں کونسا بار بار ہوائی آنا نصیب ہوتا ہے۔ سیاح لذیز کھانے کھانے میں عمدہ شراب پیتے ہیں ساحل پر گھنٹوں نرم ریت پر لیٹے رہتے ہیں۔ شباب کی یہاں بہت فراوانی ہے۔ اس کا اندازہ تو تمہیں ہوٹل سے نکلتے ہی ہو گیا ہو گا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی ہے میں سحر خیز ہوں جہاں گرد ہوں' دنیا کے ہر بڑے شہر میں میں نے مارننگ واک کیا ہے لیکن اس قسم کا ماحول صرف یہاں دیکھا ہے۔ عموماً یہ کاروبار شب کی سیاہی میں ہوتا ہے۔

کہنے لگا اسے تم شفٹ سسٹم کہہ سکتے ہو۔ جس طرح ملوں میں مزدور شفٹوں میں کام کرتے ہیں' ٹیکسی ڈرائیور آٹھ گھنٹے کے بعد ڈیوٹی بدل لیتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کی کال گرلز نے بھی اوقات کار اور علاقے بانٹ رکھے ہیں۔ یہ بھی تو ایک الگ قسم کی محنت مزدوری ہے۔ شفٹ! اس کا لہجہ زہر خندہ ہو گیا۔

ہوٹل میں واپس آ کر میں نے شیو کی اور تیار ہو کر جب نیچے ریسٹورنٹ میں پہنچا تو سب میرا انتظار کر رہے تھے۔ لگتا ہے آج بہت لمبی سیر کی ہے؟ مون نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ہاں بہت دور نکل گیا تھا۔

لیکن تمہاری آنکھوں کی سرخی بتا رہی ہے کہ رات بھر جاگتے رہے ہو۔ سچ سچ بتاؤ کس کس سے ملاقات ہوئی

ہے۔سارا سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے چبھتا سا سوال کر ڈالا۔

بڑے قیمتی لمحے تھے۔کیپٹن کک سے بالمشافہ گفتگو ہوئی ہے۔

اوہ! واقعی! وہ سب حیرت سے اچھل پڑے۔کیا تمہیں روحوں کو بلانے اور ان سے بات کرنے کا علم آتا ہے۔

میں روحیں بلانے والا عامل نہیں۔شاید میرا تجسس اسے کھینچ لایا تھا۔

کیا کہا اس نے؟ پیٹر نے فرنچ ٹوسٹ میری پلیٹ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

کہہ رہا تھا کس نے کمایا کس نے اڑایا۔میں کچھ سمجھا نہیں؟ وہ واقعی حیران تھا۔

میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔مون بولی جو جزیرے برطانوی کمانڈر کک نے دریافت کئے تھے آج امریکیوں کے قبضے میں ہیں۔انہیں بھی آسٹریلیا کی طرح برطانوی نوآبادی ڈیکلیئر کر دیتا۔آخر کس نے روکا تھا اسے؟

شاید مقدر نے اس کے عزائم کی تکمیل نہ ہونے دی۔اتنی دور اور اس قدر جزیروں کو نوآبادی قرار دینے کیلئے سے تاج برطانیہ کی اجازت چاہیے تھی۔میں نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔

اگر ایسی بات ہوتی تو برطانیہ فاک لینڈ کے لئے کبھی ارجنٹائن سے جنگ نہ کرتا۔تم نے اس سے ضرور پوچھا ہوگا۔تم لکھاری لوگ اس قسم کے تکلیف دہ سوالات ضرور کرتے ہوئے۔سارا آملیٹ کی پلیٹ صاف کرتے ہوئے طنزاً بولی۔

تم آزمائش کا کا وہن جاری رکھو۔تمہیں ان تحقیقی باتوں سے کیا لینا دینا! کیتھی کو اسے لتاڑنے کا ایک اور موقع مل گیا۔

تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟ وہ کیتھی کو یکسر نظر کرتے ہوئے بولی۔

پوچھا تھا! اس نے وہی جواب دیا جو چرچل نے جنگ کے دوران جہاز کے غسل خانے میں نہاتے ہوئے روزویلٹ کو دیا تھا۔

کیا کہا تھا سروسٹن نے؟ کافی کا گھونٹ اس کے حلق میں اٹک گیا۔

یہی کہ اہل برطانیہ امریکیوں سے کچھ نہیں چھپاتے۔ رشتے دار جو ٹھہرے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ ڈر گئے تھے۔ مٹھی بھر سپاہی تیس ہزار متحرک لوگوں کے سامنے اس قسم کے اعلان کی جسارت نہیں کر سکتے تھے۔ جو انہوں نے آسٹریلیا میں کیا تھا۔ کہاں اسٹریلیا کے کالے بھجنگ ایب اور جینز اور کہاں ہوائی کے دبنگ پولی نیشین' مون نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

برطانیہ کے علاوہ فرانس اور سپین کی حریصانہ نگاہیں بھی ان جزیروں پر گڑی تھیں۔ کک سے بہت پہلے ہسپانوی ملاح فلپین جاتے ہوئے ان جزیروں سے گزرتے تھے اور انہوں نے ان کے نقشے بھی بنائے تھے۔ اگر ہم نہ ہوتے تو آج جاپان ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ پرل ہاربر کا قصہ تو تم نے سن ہی رکھا ہے۔

پرل ہاربر پر حملہ بھی تو امریکیوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ جاپانی جہازوں کا نشانہ ہوائی کے ناریل اور اناناس نہ تھے بلکہ وہ زبردست بحری بیڑہ تھا جو امریکہ نے یہاں کھڑا کر رکھا تھا۔

لوگ کچھ بھی کہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ امریکہ ان کا محسن ہے۔ بڑی مشکل اور ردوکد کے بعد امریکن کانگریس ان کو ریاست کا درجہ دینے پر تیار ہوئی۔ آج مچھیرے سپر پاور بن گئے ہیں۔

یہ ساری دنیا میں سینہ تان کر اور گردن اٹھا کر چل سکتے ہیں۔ کوئی ان کی طرف میلی انکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔

مون کے لہجے میں تفاخر تھا۔ کک کی موت نے تاریخ دانوں کو کافی دیر تک ورطہ حیرت میں ڈالے رکھا۔ اس قدر جہاندیدہ گرم وسرد چشیدہ شخص اتنی بڑی غلطی کر سکتا تھا؟ خطرات سے کھیلنا اس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ کئی دفعہ موت اس کی دہلیز تک پہنچ گئی تھی۔ اس کو ایک دفعہ ٹاہیٹی کے سرداروں نے گھات لگا کر مارنے کا پروگرام بنایا لیکن ایک عورت نے بروقت خبردار کر دیا۔ دوسری مرتبہ اس پر ایک شخص نے بالکل سامنے آ کر فائر کیا جو خطا گیا۔ تیسری مرتبہ وہ اس قدر بیمار ہوا کہ تمام ڈاکٹروں نے اپنی بے بسی کا اظہار کر دیا۔ قسمت اسے ہر وقت بچاتی رہی۔ وہ غالباً سوچ بھی نہیں سکتا کہ جو لوگ اس کی پوجا اور پرستش کرتے ہیں اور اسے اپنے خدا لونو Lono کا اوتار مانتے ہیں۔ وہ یوں اچانک دست درازی پر اتر آئیں گے۔ اس کی عمر باون سال ہو چکی تھی۔ طویل سفر کی صعوبتوں نے اسے کسی حد تک تھکا دیا تھا۔ اس کے Reflexes

کمزور ہوچ شروع ہوگئے تھے۔قوت برداشت بھی آہستہ آہستہ کم ہورہی تھی۔وہ اتنا دوراندیش بھی نہ رہا تھا جو قدرت کی طرف سے اس کے لئے سب سے بڑا عطیہ تھا۔ بڑے لوگوں کی زندگی میں اکثر ایسے لمحات آتے ہیں جب موت اور زیست میں ایک جست کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ ذرا سی لغزش یا تھوڑی سی کمزوری' معمولی سا ذہنی اپج کسی بہت بڑے المیے کو جنم دے سکتا ہے۔ کک کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جذبہ ترحم اور آداب جہاں بانی ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ اگر وہ بہ کشتن روز اول کے مصداق آتے ہی پچاس سو لوگوں کو ڈھیر کر دیتا تو شاید اسے وہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ اہل ہوائی بندوق کی طاقت سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ کک کے قتل کے بعد کنگ نے سارا گاؤں جلا دیا تھا۔ بے شمار لوگ مار ڈالے۔ لیکن ان لوگوں نے کوئی خاص مزاحمت نہ کی۔ یہ عمل پہلے بھی کیا جا سکتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ پادریوں نے اس کی موت کو مشیت ایزدی سمجھا۔ ان کے خیال میں ایک دہریہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اس نے وشواش گھات کیا تھا۔ ایک طرف سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنایا اور دوسری طرف اپنے مذہب اور روایات سے انحراف کیا۔

میں نے کہا کہ اپنے تعصب' کدورت اور نفرت کے باوجود پادری اس سے اپنا اصل مقام نہ چھین سکے۔ تاریخ اور آئندہ آنے والی نسلوں نے اسے ایک عظیم جہاز ران اور ہیرو گردانا۔ ایک ایسا شخص جو محب الوطن تھا۔ بنیادی طور پر انسان دوست تھا۔ عالی ہمت اور عالی حوصلہ تھا۔ جو بقول خود بہت دور تک جانا چاہتا تھا۔ ایسی بلندیوں کو چھونے کی خواہش رکھتا تھا۔ جہاں اس سے پہلے کوئی انسان نہیں پہنچ پایا تھا۔ موت کو تو ایک دن آنا تھا۔ سو آ گئی۔ کسی یورپی مہم جو کے لئے باون سال تک زندہ رہنا ویسے ہی بھی مشکل کام تھا۔ مر کر بھی وہ نہیں مرا' امر ہو گیا اور فرانسیسی جہاز راں لاپیروز کے الفاظ میں اس کے جانشینوں کے لئے سوائے اس کے کارہائے نمایاں پر عش عش کرنے کے کچھ بھی باقی نہ بچا۔

آج کا کیا پروگرام ہے؟ پیٹر نے کافی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔ یہ تو گائیڈ ہی بتا سکتا ہے۔ میں نے مون کی طرف اشارہ کیا۔

آج آخری دن ہے۔ مون کی آواز بھرا گئی۔ ہم پرل ہاربر جائیں گے۔ ایری زونا میموریل میں کچھ دیر رکیں گے۔ اسمبلی بلڈنگ اور شاہی محل دیکھیں گے۔ لوکل میوزیم دیکھتے ہوئے شہر کا چکر لگائیں گے۔ اس

وقت تک ظاہر ہے شام ہو جائے گی۔

مون نے بات ختم کی ہی تھی کہ ویٹر نے اطلاع دی کہ بس آ گئی ہے۔ ہم اٹھ کر کوچ میں بیٹھ گئے۔ جس قدر گارفیلد ہنا کٹا تھا شارلٹ اتنی ہی دبلی پتلی اور سمارٹ لڑکی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں اتنی بڑی بس کا سٹیرنگ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی۔ بس تقریباً بھری ہوئی تھی۔ شاید ہی کوئی ایسا سیاح ہو جو ہوائی آئے اور پرل ہاربر نہ دیکھے۔ دراصل امریکیوں نے اس ایسے کو اس قدر اچھالا ہے اور اتنے منظم طریقے سے سالہا سال تک پراپیگنڈہ کیا ہے کہ سیاح ایئرپورٹ پر اترتے ہی پوچھتا ہے کہ ہیرل ہاربر کہاں ہے۔ شارلٹ Native تھی لیکن سو فیصد ہوائیں خون نہیں۔ ماں ہوائی کی اور باپ اور امریکی ریاست کیلیفورنیا کا باشندہ' ان کے پیار کی نشانی شارلٹ جو ماں کی ملاحت اور باپ کا رنگ لے کر پیدا ہوئی۔ وہ دن دور نہیں جب ہوائی میں ایک شخص بھی پوری طرح لوکل نہیں کہلا سکے گا۔ جو روایات کک کے سپاہیوں نے ڈالی تھیں وہ آج بھی امریکن میرین اپنائے ہوئے ہے۔ اب لوہے کی کیل سے کام نہیں چلتا بلکہ پرت حقیر جسے ڈالر کہتے ہیں' حکمرانی ہے۔

عورتیں بھی اتنی فیاض نہیں۔ دیتے ہیں بادظرف قدح خوار دیکھ کر۔

شارلٹ نہایت شستہ انگریزی بولتی تھی۔ لہجے میں بھی ٹھہراؤ اور شیرینی تھی۔ گارفیلڈ کی طرح الفاظ کی کدال نہیں چلاتی تھی بلکہ ایسے محسوس ہوتا جیسے بات نہیں کر رہی گرم شیر پلا رہی ہے۔ ایسا دودھ جس میں چینی کی بجائے شہد ڈالا گیا ہو۔

پرل ہاربر کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ ہم نصف گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ البتہ سیاحوں کی قطار بہت لمبی تھی۔ سارا نے پھرتی جو یونیورسل اسٹوڈیو میں دکھائی تھی۔ یہاں کام نہ آ سکی۔ یہاں لنگڑا کر نہ چل سکتی تھی کیونکہ بے ساکھی پیٹری کی صورت میں اس کی بغل میں تھی۔ ایک گھنٹے تک لائن میں کھڑے ہو کر انتظار کرنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ سارے جسم کا بوجھ کبھی ایک ٹانگ پر کبھی دوسری ٹانگ پر ڈالنا پڑتا ہے۔ البتہ جوڑے خوش رہتے ہیں۔ چونچیں لڑاتے ہوئے ان کو وقت کا احساس نہیں رہتا۔

ٹکٹ لے کر ہم اندر پہنچے تو تیس منٹ تک ہمیں سینما ہال میں پرل ہاربر کی تباہی کی فلم دکھائی گئی پس پردہ

کمنٹری کرنے والے شخص کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ایسے پتہ چلتا تھا کہ بول نہیں رہا بین کر رہا ہے۔ ایک بہت بڑے ظلم اور تاریخی زیادتی کی داستان سنا رہا تھا۔ جاپان کا حملہ اچانک اور وحشیانہ تھا۔ 2001ء نیوی کے صملاح دیکھتے ہی دیکھتے فنا ہو گئے تھے۔ 223 فوجی اور ایک سو تین میرین بھی کام آئے۔ ایری زونا' اوکلوہاما' یوٹا کے علاوہ بتیس دیگر جہاز بھی ڈوب گئے۔ دشمن نے شب خون مارا تھا۔ جوابی کارروائی میں ان کے 39 ہوئی جہاز اور پچاس ہوا باز مارے گئے۔

فلم ختم ہوئی تو سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ کوئی سوال؟ اسی کمنٹیٹر کی آواز مائیک پر گونجی۔ لوگوں کے سوالات کیا تھے۔ تعزیت نامے تھے۔ ہر شخص اپنے دکھ درد کا اظہار کر رہا تھا۔ اپنی نفرت بانٹ رہا تھا۔ اس قدر ظلم اتنی بڑی بربریت! کیا وہ انسان تھے۔؟ وحشی' غیر مہذب میں نے دیکھا لڑکیوں کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی۔

آخری سوال؟ میں کھڑا ہو گیا۔

جوابی کارروائی میں ناگاساکی اور ہیروشیما میں کتنے لوگ مارے گئے تھے؟ سوال کیا تھا انہیں ایسے محسوس ہوا جیسے پرل ہاربر پر ایک اور حملہ ہو گیا ہو' یہ سوال غیر متعلقہ ہے اس کا پرل ہاربر سے کوئی تعلق نہیں! کمنٹیٹر کی آواز غصے سے تھرائی۔

''ہے اور بالکل ریلیونٹ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تاریخ کے ہر موڑ پر یہ سوال پوچھا جاتا رہے گا اور کسی نہ کسی دن، کسی نہ کسی کو اس کا جواب دینے پڑے گا!''

"It will not be me"

یہ کہہ کر اس نے مائیک بند کر دیا۔ پہلے کھسر پھسر پھر چہ میگوئیاں شروع ہوئیں جیسے ہر شخص اپنے آپ سے پوچھ رہا ہو اس پہلو پر تو ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ ایک پہلو یہ بھی ہے واقعات کی تصویر کا۔ جب ہم بوٹ میں بیٹھ کر ایری زونا میموریل دیکھنے چلے تو مون کہنے لگی ''شاہ! تم نے ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ لیکن اسے جواب دینا چاہئے تھا اس طرح اچانک مائیک بند کرنا بدتمیزی ہے۔''

''شاید آج تک ایسا سوال نہیں پوچھا گیا۔ اگلی دفعہ وہ تیاری کر کے آئے گا۔''

''بڑی حیران کن بات ہے تم امریکہ پر تنقید کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے لیکن امریکیوں سے پیار بھی کرتے ہو؟''

''میں امریکہ کا مداح ہوں، حواری نہیں۔ سچی بات کہنا اور سچی بات سننا صرف میرا ہی نہیں بلکہ ہر امریکی کا فرض بنتا ہے۔ آج ہم انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں، جمہوریت کا پرچار کرتے ہیں۔ جمہوریت کی شرطِ اولین ہی قوتِ برداشت ہے۔ بات کہنے اور سننے کا حوصلہ اور ہمت۔ والٹیر نے کہا تھا:

Though I may differ with what you have said, but I will de
to the last moment of my life your right of saying

ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ عوام کی سوچ اور حکومتوں کے رویے میں بعد المشرقین ہے۔ قومیت، وطنیت، مذہب اور اس قسم کے دیگر کئی نعرے لگا کر لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے۔ انہیں جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ہے۔ جب عوام آگ کے دریا سے گزر رہے ہوتے ہیں تو گنتی کے یہ چند لوگ اپنے محفوظ مورچوں میں بیٹھے ہوئے کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ رہے ہوتے ہیں۔ جاپان کے ساتھ جنگ کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ جب جنگل میں آگ لگتی ہے تو پھر وہ ہر خشک و تر کو جلا ڈالتی ہے۔ افراد اور قومیں بعض اوقات بڑے عجیب پندار مناصب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ میں..... اور ہم..... سب ہی فساد کی جڑ ہیں۔

We are the salt of earth --- we are born to rude -- war is
men what maternity is to moth

ہمچو ما دیگرے نیست۔ جب اس قسم کے نعرے لگیں گے، جب اسی طرح کا فلسفہ پروان چڑھے گا تو پھر تباہی اور بربادی کو کون روک سکتا ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی یقیناً کوئی اچھا فعل نہیں تھا لیکن اس کے جو کریہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوتا تو جنگ مزید طول پکڑتی اور شاید زیادہ لوگ مارے جاتے۔''

جب انسان نہ ماننے کے موڈ میں ہو تو پھر وہ ہزار دلیلیں دے سکتا ہے۔ لاکھ تاویلیں نکال سکتا

ہے۔ ذہن رسا کے گھوڑے جہاں تک چاہے دوڑا سکتا ہے اور ہر غلط کام کا کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر لیتا ہے۔

''یہ درست ہے'' مون کہنے لگی۔ ''اس لئے اس عمارت کو ہی کیوں نہ ختم کر دیا جائے جس کی بنیاد نفرت پر رکھی گئی ہو!''

بوٹ ایری زونا میموریل میں داخل ہو گئی۔ سو گز لمبائی اور بیس گز چوڑائی کی یہ یادگار بالکل سمندر کے درمیان بنائی گئی ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں ایری زونا جہاز بمباری کی وجہ سے ڈوبا تھا۔ دور سے یہ یادگار بھی بالکل جہاز کی شکل کی ہے۔ اسے لوگوں نے چندہ جمع کر کے بنایا ہے۔ لیکن اب اس کا انتظام امریکی نیوی کے سپرد کیا گیا ہے۔ بندرگاہ کے مرکز میں ایک ستون پر ان میرین اور ملاحوں کے نام درج ہیں جو اس روز مارے گئے تھے۔ ہم کافی دیر وہاں گھومتے رہے۔ سیاحوں کے کیمرے کلک کلک کرتے رہے ٹریجڈی سے قطع نظر یہ انسان کی جبلت ہے کہ وہ ایسی تاریخی جگہوں پر آ کر ایک عجیب قسم کی راحت محسوس کرتا ہے۔ شاید وہ اپنے آپ کو تاریخ کے حصار میں پاتا ہے۔ چشم تصور یقیناً ان لمحوں کی طرف جاتی ہے۔ جب پہلی مرتبہ فضا میں جہازوں کی گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی تھی، خطرے کے سائرن بجے تھے اور دیو ہیکل جہاز بے بسی کے عالم میں آہستہ آہستہ غرق آب ہوا تھا۔ قیامت صغریٰ کا سامان تھا۔ ملاحوں کی بے گور و کفن لاشیں سمندر میں تیر رہی تھیں۔

گائیڈ کہہ رہا تھا ''حملہ اتنا اچانک تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ہوائی کا گورنر Joseph B. Poindesxte اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ اس نے دھماکے کی آواز سنی۔ یہ دھماکہ کسی جاپانی بم کا نہیں بلکہ اس اینٹی ایئر کرافٹ فائر کا تھا جو امریکی کر رہے تھے۔ گورنر اس اعتبار سے خوش قسمت نکلا کہ اس کے اٹھتے ہی گولہ اس کے دفتر کے اوپر پھٹا۔ چند منٹ کی تاخیر مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ سیدھا ریڈیو سٹیشن گیا اور ڈیفنس ایکٹ کی رو سے ایمرجنسی کا اعلان کیا۔ فوج نے اسے مشورہ دیا کہ وہ فوری طور پر ریڈیو سٹیشن چھوڑ دے کیونکہ جاپانی پھر سے حملہ کر سکتے تھے۔ اس کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی جنرل والٹر شارٹ وہاں موجود تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ مارشل لاء لگا دیا جائے کیونکہ دشمن ہوائی میں فوجیں اتارنا چاہتا ہے۔ گورنر

نے فوری طور پر صدر روز ویلٹ سے رابطہ کیا جس نے بغیر کوئی لفظ ضائع کئے اسے حکم دیا کہ مارشل لاء لگا دیا جائے۔ فوجی احکامات بڑے واضح تھے۔ لوگوں کو بتایا گیا کہ فوجی قانون اور احکامات کی خلاف ورزی کی سزا بہت کڑی ہے۔ گورنر نے بڑی مشکل سے مارشل لاء کی کڑوی گولی نگلی لیکن جنرل سے بار بار پوچھتا رہا کہ مارشل لاء کب ختم ہوگا..... جنرل شارٹ نے جواباً کہا کہ اس کا انحصار دشمن کے رویے اور ارادے پر ہے..... اس وقت ہوائی میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے قریب جاپانی موجود تھے۔ ان کی اکثریت وہیں پیدا ہوئی تھی۔ من حیث القوم ان پر اعتبار نہ کیا جا سکتا تھا۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار جاپانیوں پر کڑی نگاہ رکھی جا رہی تھی۔ جنرل شارٹ اور دیگر فوجی حکام کو یقین تھا کہ ان میں بیشتر جاپان کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ان کی مدد، معاونت اور نشاندہی کے بغیر اس قدر ٹھیک ٹھیک نشانے لگانا ممکن نہ تھا..... جاپانیوں نے صرف فوجی اہمیت کے ٹھکانوں پر حملہ کیا تھا اور عدم اسول آبادی کو گزند نہ پہنچائی تھی حالانکہ ان کی لغت میں اخلاقیات یا رحم نام کی کوئی چیز نہ تھی اور وہ خشک و تر میں تمیز برتنے کے قائل نہیں تھے۔ چونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ شہر پر بمباری کی صورت میں جاپانی بھی مارے جائیں گے اس لئے انہوں نے اجتناب برتا تھا۔'' گائیڈ ایک لمحے کے لئے رکا اور اس نے گلا صاف کیا.....

''کیا سب جاپانیوں کو جیل میں ڈال دیا گیا تھا؟'' ایک سیاح نے سوال کیا۔

''ایسا ممکن نہ تھا۔ کیلیفورنیا کی طرح انہیں خاردار تاروں کے پیچھے بھی نہ رکھا جا سکتا تھا۔ صرف مشکوک افراد پکڑے گئے اور باقی بچنے والوں کی کڑی نگرانی شروع ہوگئی۔''

''ان کی اکثریت ہوائی میں پیدا ہوئی، اُن کا مستقبل اس سرزمین سے وابستہ تھا، انہیں جاپان کی مدد کر کے کیا مل جاتا؟'' ایک بوڑھا ولندیزی بحث میں حصہ لیتے ہوئے بولا۔

''تم اس قوم کو نہیں جانتے.....!'' گائیڈ کے چہرے پر ایک زہر خند مسکراہٹ ابھری۔ ''انہیں اگر سو سال تک خلا میں یا تہہ آب بھی رکھا جائے تب بھی ان کے خون سے لفظ جاپان نہیں نکالا جا سکتا۔ یہ قومیت کی انتہا ہے۔''

''ایک کی Curse دوسرے کی Blessing ہوتی ہے۔ میں ایسا کیوں سمجھوں۔ مجھے تو اپنے

ملک وقوم کو دیکھنا ہے۔ البتہ جاپانی ایسے سمجھے تو حق بجانب ہوگا۔"

"بالفرض جاپان پرل ہاربر پر حملہ نہ کرتا تو کیا امریکہ جنگ میں شامل نہ ہوتا؟" میری بھی دلچسپی بڑھنے لگی۔

بولا "میں کوئی فوجی یا بین الاقوامی امور کا ماہر نہیں ہوں لیکن بظاہر جاپان نے غلطی کی۔ امریکن حکومت کو فوری طور پر جنگ میں شامل ہونے کا جواز مل گیا۔ نہیں تو شاید کچھ وقت لگ جاتا۔ اور یہ تو تم جانتے ہی ہوگے کہ جنگ میں ہر لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔"

ہم کافی دیر ایری زونا میموریل میں گھومتے رہے۔ چار سُو سمندر تھا۔ اردگرد امریکن نیوی کے بے شمار جہاز کھڑے تھے۔ پس منظر میں ہوائی کا شہر نظر آرہا تھا۔ آدھا پہاڑ پر اور نصف نیچے ساحل تک پھیل گیا تھا۔ وائی کیکی بیچ سے لے کر ایری زونا میموریل تک پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ بائیں طرف ساحل سمندر ہے اور دائیں جانب شاپنگ آرکیڈ اور پلازہ بنائے گئے ہیں۔ ہوائی میں ایل اے یا سان فرانسسکو کی طرح بلند و بالا عمارات تو نہیں ہیں لیکن ایک امریکی شہر بہر حال اس کی عظمت اور امارت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جس جگہ لاکھوں سیاح ہر ماہ آئیں اور دل کھول کر خرچ کریں وہاں تجارت لامحالہ پھلے پھولے گی۔

بس چلتے ہی شارلٹ نے اعلان کیا ہماری اگلی منزل اسمبلی بلڈنگ اور پھر کنگ پیلس ہے۔ یہ کوئی زیادہ دور نہیں کیونکہ شہر بھی میری طرح مختصر ہے۔"

"اور تمہاری طرح چارمنگ بھی ہے....." بوڑھے ڈچ نے فقرہ مکمل کر دیا۔

"تھینک یو، انکل....." وہ سامنے لگے شیشے میں اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"مجھے انکل مت کہو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا ہے کہ میں شاید وقت سے پہلے پیدا ہوگیا۔" ساری بس زعفران زار ہوگئی۔

"کیا ہالینڈ میں حسینوں کی کمی ہے؟" کسی مسافر نے سوال کر ڈالا۔

"حسین ڈرائیور نہیں ملتے۔ مٹھاس کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا نمک بھی ضروری ہے۔ ویسے خوشگوار سفر کا مفہوم سمجھتے ہو؟" بوڑھا ترنگ میں آگیا۔

''اگر ہوائی آنا تھا تو جوانی میں آتے، تمہارا والہانہ استقبال ہوتا، اس عمر میں سوائے حسرتوں کے کچھ نہیں ملتا.....'' شارلٹ نے اسے چھیڑا۔

''حسرتوں کا شمار تو کیا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی ایک لذت ہے۔ جب میری عمر کو پہنچو گی تو جان جاؤ گی!''

''کیا اتنی دیر زندہ رہنا ضروری ہے۔ جواں مرگی کا اپنا لطف ہوتا ہے، ہر آنکھ اشکبار ہوتی ہے۔'' شارلٹ کو نوک جھونک میں مزہ آ رہا تھا۔

''نامراد لوگ پہلے بھی رخصت ہو سکتے ہیں..... ویسے زندگی کی قدر کرنی چاہئے کون سا بار بار اس جہان میں آنا ہے۔'' بوڑھے کا لہجہ فلسفیانہ ہو گیا۔

بس اسمبلی بلڈنگ کے اندر جا کر رکی۔ شارلٹ نے ہمیں آدھ گھنٹہ دیا، کہنے لگی چونکہ اجلاس نہیں ہو رہا اس لئے اس مختصر عمارت کو اس عرصے میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے..... اسمبلی بلڈنگ چھوٹی لیکن متاثر کن تھی۔ اس کی تعمیر میں ہوائی کے کلچر کی آمیزش تھی۔ ستون بہت بڑے بڑے پام ٹریز کی شکل کے تھے۔ باہر سیاہ جالی لگی ہوئی تھی جو لاوا اور آتش فشاں کے پھٹنے کی علامت تھی۔ ایوانِ نمائندگان اور سینٹ بلڈنگ کے درمیان ایک بہت بڑی Plaque لگی تھی جس میں فادر ڈیمینئل کا مجسمہ بنایا گیا تھا..... وہ ایک پادری تھا جو دکھی انسانیت کے خدمت کے لئے آیا تھا..... ''یہاں کک کا مجسمہ بھی ہونا چاہئے تھا!'' میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''تم تو جانتے ہی ہو، پادری اور کک ایک ساتھ کھڑے نہیں ہو سکتے۔ شاید آج تک ان لوگوں نے اسے معاف نہیں کیا!'' مون کے لہجے میں ترحم تھا۔

پیٹر کہنے لگا ''خدا بخش دیتا ہے لیکن بندگانِ خدا معاف نہیں کرتے۔ مذہب تو رواداری اور درگزر کا درس دیتا ہے لیکن اس کے اجارہ دار ایسا نہیں سوچتے۔''

''یہ درست ہے'' مون اتفاق کرتے ہوئے بولی، ''سیزر اور پوپ کی بحث بہت پرانی ہے۔ اصل مسئلہ اقتدار اور ہوسِ اقتدار ہے۔ بظاہر خدا سے لو لگانے والے، اندر ہی اندر خلق خدا کو سرنگوں کرنے کا

سوچتے ہیں، یہ لوگ اپنے دائروں میں نہیں رہ سکتے۔ کیا تمہارے ہاں بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ہماری عبادات مختلف ہیں، فلسفۂ حیات منفرد ہے، عبادت کا تصور دیگر مذاہب سے ہٹ کر ہے۔ دیگر مذاہب میں عبادت بھی ہے لیکن اسلام میں عبادت ہی ہے..... یعنی ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کی رضا یا اس کے بندوں کی فلاح کے لئے کیا جائے عین عبادت ہے..... دین اور دنیا الگ نہیں بلکہ ہر دنیاوی کام دینی دائروں میں رہ کر ہی ہوسکتا ہے۔''

''شاید پوری طرح نہیں.....!'' اب میں تفصیل میں کیسے جاتا۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو ہر زخم دکھایا جائے۔

ہم چلتے چلتے اسمبلی بلڈنگ کے اندر آ گئے۔ کافی گہما گہمی تھی..... مون نے پوچھا ''گورنر سے ملاقات کرو گے؟''

''شاید اب اس کی ضرورت نہیں۔ رات کیپٹن کک نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب گورنر میری معلومات میں کیا اضافہ کرے گا؟''

بشپ میوزیم دیکھتے ہوئے ہم شاہی محل پہنچے۔ میوزیم میں پرانی چیزیں رکھی تھیں۔ پرانے ہتھیار، آلاتِ موسیقی، خداؤں کے ٹوٹے پھوٹے مجسمے، پتوں اور جانوروں کے پروں سے بنے ہوئے سرخ اور زرد ملبوسات۔ کچھ بے نام اور گمنام تحریریں۔ دیمک خوردہ دستاویزات، پینٹنگز.....! یہ چیزیں دلچسپ تو ضرور تھیں لیکن انسان کو ورطۂ حیرت میں نہیں ڈالتیں..... کہاں پانچ ہزار سالہ پرانی تہذیب وثقافت..... فراعنہ مصر کی حنوط شدہ ممیاں، اہرام، اسفنکس، وادی لگزور، گندھارا آرٹ، موہنجوڈارو اور ہڑپہ، روم کے کھنڈرات، سکندر یونانی کے آلاتِ حرب اور کہاں دو سو سال کی مختصر تاریخ.....

آئی اولانی محل (IOLANIPALACE) بھی ونڈسر پیلس یا دلی کا ریڈ فورٹ تو نہیں تھا، لیکن مقامی تناظر میں خاصی محنت سے بنایا گیا تھا۔ چوبیس سیڑھیوں کے پلیٹ فارم اور بارہ رومن طرز کے ستونوں پر کھڑا ہوا یہ محل خاصا خوبصورت تھا۔ چالیس کمروں پر مشتمل یہ تین منزلہ عمارت 1892ء میں بنائی

گئی تھی۔ اس میں اب کوئی نہیں رہتا۔ تاریخی اثاثہ سمجھ کر حکومت نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ تمام سیاح اسے دیکھنے آتے ہیں۔ ٹکٹوں کی آمدن سے اس کی مرمت کی جاتی ہے..... کوشش کی گئی ہے کہ ہر چیز اپنی اصل حالت میں رہے..... بادشاہ اور ملکہ کا دربار، شب باشی کا کمرہ، شب باشی کا لباس، خوبصورت منقش پردے، ساگواں کی لکڑی کے بنے ہوئے پلنگ۔ دیگر ساز و سامان، زیورات، ہتھیار مختلف کمروں میں سجائے گئے تھے۔ جب سردار غار نما مکانوں سے نکل کر یہاں آئے ہوں گے تو انہیں یقیناً بڑی مسرت ہوئی ہوگی۔

ہم چلتے چلتے جب ملکہ کے بیڈ روم میں پہنچے تو سارا نے پیٹر کا بازو پکڑ لیا۔ وہ خاصی متاثر نظر آتی تھی۔

''جانی! ہم بھی ایسا محل بنائیں گے۔ بہت بڑا بیڈ روم۔ زربفت کے پردے، منقش اور پھولدار۔ میرے سینکڑوں نوکر ہوں گے.....!''

'اور پیٹر کی سینکڑوں داشتائیں.....!'' کیتھی نے اسے جملہ ہورا نہ کرنے دیا۔

''لیکن کل پہاڑ پر کھڑی ہو کر تو تم انجانی وادیوں میں جانے کی تمنا کر رہی تھیں۔ کیا ارادہ بدل گیا ہے؟'' پیٹر نے اس کی طرف دیکھا۔

''حالات کے ساتھ ساتھ اس کا مزاج بھی بدلتا رہتا ہے!'' اس کے بولنے سے پہلے ہی کیتھی پھر بول پڑی۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے، بچپن میں سانتا مانیکا کے ساحل پر یہ ریت کے گھروندے بنایا کرتی تھی۔ ایک دن اتفاق سے میرا پاؤں لگ گیا تھا تو اس نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا!''..... مون نے ماضی کے دریچوں سے جھانکا.....

''تم نے جان بوجھ کر اسے مسمار کیا تھا۔ یہ بچپن میں بہت شریر تھی نا ٹی گرل..... پتہ نہیں بلوغت میں پاؤں رکھتے ہی اس قدر سنجیدہ کیسے ہو گئی ہے؟''

''تم فکر مت کرو، جانِ من..... میں تمہارے لئے ریت کے گھروندے اور محل، دونوں تعمیر کروں گا.....!'' پیٹر نے اسے تسلی دی۔

''تم بس محل کی فکر کرو، ریت کے گھروندے میں خود بنالوں گی.....!''

''چلو تمہارا آدھا بوجھ تو ہلکا ہوا'' میں نے کہا، ''ایسی سگھڑ بیوی آج کل کہاں ملتی ہے.....!''

''سگھڑ سے زیادہ سادہ لوح لگتی ہے۔ محلوں اور گھروندوں کا فرق نہیں سمجھتی.....!'' پیٹر کے اس جملے پر سب مسکرادیئے۔

المونا شاپنگ سنٹر ہماری آخری منزل تھی۔ یہ ہونالولو کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر ہے۔ ساری دنیا کا سامان یہاں رکھا ہوا ہے۔ جیولری، کپڑے، کاسٹیلکس، الیکٹرانک گڈز، فوڈ، گروسری.....!'' کچھ خریدنا پسند کروگے؟'' مون نے پوچھا۔ ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد میں نے ایک چوبی مجسمہ چنا۔ ہوائی کا جنگجو سینہ تانے، اپنے نیزے کو پوری قوت کے ساتھ دشمن کی طرف اچھال رہا تھا۔ ہوائی کی نشانی..... چالیس ڈالر میں مہنگی نہیں تھی.....

○

جب ہم ہوٹل پہنچے تو شام کے چار بج رہے تھے۔ وائی کیکی بیچ پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ حسن اس قدر بے نقاب ہو چکا تھا کہ مزید کچھ دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ نوجوان بوڑھے سفید ریت پر لیٹے تھے۔ اکثر عورتوں نے اپنے آپ کو بکنی کی قید سے آزاد کرلیا تھا۔ شاید انسانوں کی طرح اعضا کا بھی اسیری میں دم گھٹتا ہے۔ یہ لوگ سمندر میں جا کر چند غوطے لگاتے اور پھر ریت پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتے۔ کچھ لوگ ہوٹل کے اوپن ایئر بار میں بیئر پی رہے تھے۔ کنارے پر سمندر کی سفید جھاگ اور ہونٹوں پر بیئر کی نرم جھاگ، دونوں ہیجان خیز تھیں۔ ہر شخص اپنے حال میں مست تھا..... کنکھیوں سے ایک دوسرے کو تاکا نہیں جا رہا تھا۔ کسی قسم کی فحش حرکات اور جملے بازی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ پرامن بقائے باہمی۔ مسائل وہاں کھڑے ہوتے ہیں جہاں بھوک ہو، پیٹ کی یا جنس کی..... یہ دنیا بھی عجیب ہے۔ ان گنت لوگ جنت کی تلاش میں بھٹکتے ہیں اور کچھ خوش نصیب اس میں رہتے ہیں..... غم و آلام سے دور، نہ فکر فردا نہ غم روزگار۔ ہوائی محض ایک جگہ کا نام نہیں ہے ایک خواہش بھی ہے۔ ایک لمس، ایک حسین خواب، جو دیکھتا تو ہر کوئی ہے لیکن تعبیر کسی کسی کی نکلتی ہے.....! میں کہاں پہنچ گیا تھا، کیسے پہنچ گیا تھا، کن لوگوں کا قرب حاصل ہو گیا تھا! کیا مجھے جنت

کی تلاش تھی یا میں جنت میں کھڑا تھا..... درحقیقت یہ دونوں میرے مسئلے نہیں تھے۔ میرا مسئلہ بڑا نازک اور گھمبیر تھا۔ مجھے اس جنت سے بہر طور باہر آنا تھا۔

ویک اینڈ تھا۔ ہوائی میں ہماری آخری رات تھی۔ شیرٹن ہوٹل میں ڈنر ڈانس کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ ہالی وڈ سے کچھ گلوکار خاص طور پر منگوائے گئے تھے۔ فائیو سٹار ہوٹلوں کی یہی خوبی ہے کہ وہ اپنے گاہکوں (جنہیں وہ پیٹرن کہتے ہیں) کی تفریح کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں..... مرکزی ہال کو خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ ڈیکوریشن اب بہت بڑا آرٹ بنتی جارہی ہے۔ یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ اچھے ڈیزائنر اور ڈیکوریشنسٹ کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ رنگوں کا امتزاج، خوشبوؤں کا چناؤ، بیک گراؤنڈ میوزک، کمپیئرنگ..... یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے پروگرام..... ہوٹلوں کو خوب سے خوب تر کی تلاش ہوتی ہے۔ جستجو و آرزو کا سلسلہ جاری رہتا ہے، کبھی ختم نہیں ہوتا..... ہوٹل شیرٹین، ساحل وائی کیکی، رقاص اور گلوکار ہالی وڈ کے۔ پروگرام میں جان پڑ گئی۔ لوگ خوب سج دھج کر آئے تھے۔ بن سنور کر بیٹھے تھے۔ ایسے پتہ چلتا تھا کہ سارا ہالی وڈ اڑ کر ہوائی پہنچ گیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کینز CANNES کی پرفیومریاں ساحل پر منتقل ہوگئی ہوں۔ مون، سارا اور کیتھی بھی بن سنور کر آئی تھیں۔ میں نے پہلی دفعہ مون کو اس قدر 'فارمل ڈریس' میں دیکھا۔ وہ خوش لباس ضرور تھی لیکن طبعاً سادگی پسند تھی۔ اس کی امارت میں نفاست تھی، غرور نہ تھا..... بناؤ سنگھار کی اسے عام حالات میں ضرورت ہی نہ تھی..... حسن و جوانی جب انگ انگ سے پھوٹ رہے ہوں، جہاں ہر رنگ متحرک ہوگیا ہو، وہاں ان مصنوعی سہاروں کی ضرورت ہی نہیں رہتی.....

پہلے کچھ گیت گائے گئے۔ پھر بیلے ڈانس ہوا اور اس کے بعد جوڑے لکڑی کے فلور پر آکر تھرکنے لگے۔ پیٹر اور سارا بھی ان میں شامل ہوگئے..... ''آج بھی نہیں.....!'' مون نے میری طرف دیکھا۔ ''اب دیر ہوگئی ہے''..... میں نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔

نصف شب تک محفل رقص و سرود جاری رہی۔ بڑی دیر تک لوگ سرخ شراب اور شمپین سے لطف اندوز ہوتے رہے..... پھر ڈنر کا اعلان ہوا۔ سی فوڈ ہی تھا لیکن باورچیوں نے خاصی محنت سے اسے مزید

لذیذ بنا دیا تھا۔ بوفے ڈنر تھا..... ہر طرف سفید براق لباس پہنے مؤدب بیرے کھڑے تھے۔ پچھلی رات کا چاند تھا۔ ہال کی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی تھیں۔ ایسے پتہ چلتا تھا کہ سمندر بھی ترنگ میں آ گیا ہے۔ اس کی سرکش موجیں ایک انگڑائی لے کر ہوٹل کی سیڑھیوں تک آتیں اور پھر کچھ سوچ کر واپس چلی جاتیں۔ دو بجے رات محفل اختتام کو پہنچی۔ تھکن اور شراب نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ لوگ لڑکھراتے، ہنستے مسکراتے اپنی محبوباؤں، داشتاؤں اور بیویوں کو بانہوں میں لئے اپنے کمروں کو چلے گئے..... اک دم سارا ہال سنسنان ہو گیا..... ہوٹل کی لابی میں، مون اور میں اکیلے رہ گئے۔

○

''آج آخری رات ہے؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔

''ہاں! آج آخری رات ہے!'' میں نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

''دل کرتا ہے جی بھر کر باتیں کریں! تمہیں نیند تو نہیں آ رہی؟''

''نیند کیسے آ سکتی ہے۔ آج مجھے بہت سا حساب چکانا ہے!''

''کیسا حساب.....؟''

''کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ تمام زندگی سمٹ کر ایک نقطے پر آ گئی ہو، اور وہ نقطہ آہستہ آہستہ مدھم ہوتا جا رہا ہو.....!''

''کیا تمہیں وہ لمحہ یاد ہے جب سانتا فے بار میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی.....؟''

''وہ لمحہ ہی تو ٹھہر گیا ہے۔ اس نے دل میں گرہیں سی ڈال دی ہیں!''

''کس قدر شوخ تھا تمہارا لب و لہجہ..... منفرد، شریر، بیباک اور پر یقین..... کیا اجنبیوں سے اس طرح باتیں کی جاتی ہیں؟''

''میں خود حیران ہوں اجنبیت کیسے ایک دم بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو گئی؟''

''بعض اوقات ایک جملہ ہی زندگی کی ساری کتاب پر حاوی ہوتا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے ہم بول نہیں رہے، کوئی فلم چل رہی ہے۔ ہر سوال کا جواب تمہارے پاس پہلے سے تیار تھا اور ہر جواب سے ایک

نیا سوال جنم لیتا تھا۔"

"اس کا کریڈٹ بھی تمہیں کو جاتا ہے۔ تمہیں دیکھ کر خیالات ایک پہاڑی جھرنے کی طرح بہتے ہیں، اِن میں ربط اور روانی آتی ہے، تمام تشبیہیں اور استعارے فرسودہ لگتے ہیں۔"

"کیا ایسا نہیں لگتا کہ ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں، پندرہ دن کا عرصہ ہوتا ہی کتنا ہے.....؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ اخلاص، مروت اور محبت میں گزرا ہوا ہر لمحہ برسوں پر محیط ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس اختصار ایام میں بھی ایک طوالت ہے اور انہیں دوام حاصل ہے۔"

"کاش تم یہاں کافی دیر ٹھہرتے.....!"

"کاش میں یہاں عمر بھر ٹھہر سکتا!"

"لیکن.....؟"

"کوئی ایک وجہ ہو تو بتاؤں۔ یہی ہماری زندگی کا المیہ ہے۔ کچھ لوگ سرگشتہ خمار رسوم و قیود ہوتے ہیں۔ شاید میں بھی ان میں شامل ہوں۔"

ہم باتیں کرتے کرتے باہر نکل آئے..... سوگوار چاند، ناگوار چاندنی، سمندر بھی شاید ناراض لگتا تھا۔ چپ چاپ، خاموش۔ سڑک کے دورویہ ناریل کے درخت سنتریوں کی طرح ایستادہ تھے۔ ماحول پر مکمل سوت تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ کوئی شخص یا گاڑی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

ہم کافی دیر چپ رہے۔ کافی دیر بے مقصد چلتے رہے۔ شاید اب کچھ کہنے کے لئے باقی نہ بچا تھا۔ صرف ہمارے قدموں کی چاپ فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی..... ہم چلتے چلتے بے ارادہ برگد کے درخت کے نیچے آ گئے..... بہت پرانا درخت تھا۔ بہت گھنا درخت تھا۔ اس کی شاخیں چار سُو پھیل گئی تھیں۔ چاند کی کوئی کرن گھنے پتوں سے چھن کر مشکل سے زمین تک پہنچ رہی تھی..... جب ہم بالکل نیچے آ گئے تو مون کھڑی ہو گئی۔ میں بھی ٹھہر گیا..... بولی "آنکھیں بند کرو.....!"

"وہ کس لئے".....؟.....

''سنا ہے اس کے نیچے کھڑے ہو کر جو دعا مانگی جائے قبول ہو جاتی ہے.....!''

''کیا تمہیں یقین ہے، ایسا ہی ہوتا ہے؟''

''ایسا ہی ہونا چاہئے۔ کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہو گی.....!''

ہم کچھ دیر آنکھیں بند کئے کھڑے رہے۔ خشوع و خضوع کے ساتھ۔ پھر ہم نے بیک وقت آنکھیں کھول کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''کیا دعا مانگی ہے.....؟'' اس نے مجھے پوچھا۔

''میں بھی یہی پوچھنے والا تھا۔''

''پہلے تم بتاؤ.....!'' وہ بچوں کی طرح مچل گئی۔

''سچ بتاؤں.....؟''

''بالکل سچ! اپنے ضمیر کو حاضر ناظر جان کر۔''

''میں نے ہر دعا تمہارے لئے مانگی ہے!''

''میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ کیا تھی وہ دعا.....؟''

''جب تک یہ چاند تارے قائم ہیں، جب تک سمندروں میں ایک قطرہ ہے آپ بھی باقی ہے، جب تک پھولوں میں رنگ اور خوشبو زندہ ہے، تم خوش و خرم رہو، تمہارا حسن اسی طرح دمکتا رہے۔ ت مہارا وجود یونہی مہکتا رہے۔ کامیابیاں تمہاری راہ تکتی رہیں.....!''

''بس کرو، شاہ! بس کرو!'' اس کا سر ڈھلک کر میرے کندھوں پر آ گیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے دور کہیں بادل گرج رہے ہوں، ہزار بجلیاں کڑک رہی ہوں..... لیکن برسات! میرے اندر ہو رہی ہو!

ہوائی ایئر پورٹ پر دو جہاز اٹل حقیقتوں کی طرح کھڑے تھے جنہوں نے مخالف سمتوں کو پرواز کرنا تھا۔ ایک نے ہانگ کانگ جانا تھا اور دوسرا ایل اے کے لئے پر تول رہا تھا..... بڑی بھیڑ تھی۔ مسافروں کا ریلا سمندری لہروں کی طرح آ جا رہا تھا..... سفر بھی کیا عجیب چیز ہے بعض لوگوں کے چہرے فرطِ مسرت سے تمتما رہے ہوتے ہیں اور کچھ حزن و ملال کی تصویر بنے ہوتے ہیں زندگی کے خارزار پر ہر کسی کو کسی نہ کسی

رنگ میں چلنا پڑتا ہے..... ہر شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانا ہوتی ہے۔ کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ یادیں چاہے کتنی ہی حسین کیوں نہ ہوں ان کے سہارے تمام عمر نہیں گزاری جا سکتی۔

اس انبوہ میں پانچ مسافر بھی دل گرفتہ تھے۔ چپ چاپ۔ روانگی کا اعلان ہو چکا تھا۔ فائنل کال کے سگنل آنا شروع ہو گئے۔

''زندگی میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے جب لفظ غریب ہو جاتے ہیں اور وہ آدمی کے جذبات اور احساسات کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ اس گھڑی میں بھی اپنے آپ کو کسی ایسی ہی صورت حال سے دو چار پا رہا ہوں.....!'' میں نے مون کی طرف دیکھا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی، صرف دیکھتی رہی۔

''پھر کب آؤ گے؟ ہم سب کو تمہارا انتظار رہے گا!'' مون نے الوداعی مصافحہ کیا۔

جب میں نے سفری بیگ اٹھایا تو وہ سب ایک ساتھ مجھ سے لپٹ گئے..... میں نے سوچا کہ اب میں ایک لمحے کے لئے بھی رکا تو پھر شاید ساری زندگی واپس جا نہ پاؤں گا..... میں نے جلدی سے باری باری سب کے ساتھ مصافحہ کیا اور جہاز تک پہنچنے والی سرنگ میں داخل ہو گیا۔

✿✿✿